احمد ندیم قاسمی





پڑاؤ

PAINTING BY MOOJID,PRINTING AT FUNOON PRESS LAHORE

رجسٹرڈ ایل نمبر ٧٥٧٩
ٹیلیفون نمبر ٣٢١٥٢٧

خاص نمبر



مدیر:

احمد ندیم قاسمی

تزئین: موجد

سالانہ چندہ
بذریعہ رجسٹری: ١٠٠ روپے
غیر ممالک سے: ٢٠٠ روپے

شمارہ: ٢٧
اکتوبر، نومبر ١٩٨٨ء

قیمت موجودہ شمارہ: ٦٦ روپے

مقامِ اشاعت: ٤۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

مندرجات

گاہے گاہے باز خواں

منظوم تراجم

نظمیں

افسانے

تراجم

لوک ادب

انشائیہ

تاثریہ

غزلیں

تبصرے

غزلیں

اختلافات

سرورق

موجد

پرڈاؤ (عمل : موجد)

حرفِ اوّل

ندیم

ہمارے مخاطب کون ہیں؟

یہ مسئلہ کہ ادیب اور شاعر کس سے مخاطب ہوتا ہے، اور مصور کس کے لیے تصویریں بناتا ہے، اور موسیقار کس کے لیے گاتا ہے۔ ادب، شعر، مصوری اور موسیقی کی طرح بہت پرانا مسئلہ ہے۔ قریب قریب ہر دور میں فنکاروں کے درمیان ایک ایسا طبقہ بھی رہا ہے جس کے نزدیک تخاطب کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ فنکار جب کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کا مقصد ابلاغ ہوتا ہے مگر یہ طبقہ ابلاغ ہی کا منکر ہے۔ اس کے باوجود چاہے وہ تسلیم نہ کرے، اسے بھی ایک AUDIENCE کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ تخلیق کی پیش کش بے معنی ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ابلاغ کے بغیر مخاطبین کی ضرورت ہی بے معنی ہے۔ یوں فنی تخلیق کے مخاطبین کا مسئلہ ہر مدرسۂ فکر اور ہر نظریے کے فنکار کا مسئلہ ہے۔ فن یقیناً فنکار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے مگر یہ شخصیت خلا میں نہیں بنتی۔ جبلت کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ماننا پڑے گا کہ فنکار کی شخصیت کو اس کا معاشرہ مرتب کرتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پھر ایک ہی دور اور ایک ہی معاشرے کے فنکاروں کی شخصیتوں میں اختلاف کیوں ہوتا ہے، تو یہ اپنے ردِ عمل کا معاملہ ہے۔ ایسے بھی ہیں جو راضی برضا رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں، ایسے بھی ہیں جو معاشرے کی غیر انسانی اور غیر حسین روایتوں کے خلاف بغاوت پر اتر آتے ہیں، اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ راضی برضا رہتے ہیں نہ بغاوت کرتے ہیں، اور ساری عمر ایک کشمکش، ایک تردد، ایک تذبذب کے عالم میں بسر کر دیتے ہیں۔ ردِ عمل کا یہی اختلاف فنکاروں کی شخصیتوں کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے مگر ہر شخصیت کو ہم اس کے معاشر کے حوالے ہی سے سمجھ پائیں گے۔ فنکار کو اس کے معاشرے سے الگ کر کے دیکھئے تو ساری دنیا کا نیا پرانا فن یوں نظر آئے گا جیسے اس پر اسرار بکھر گئی ہے۔

ہمہ گیر تحسین ناممکن ہے

فن کے مخاطبین کا مسئلہ چھیڑا جائے تو بیشتر فنکار جھینپتے اور شرماتے ہیں۔ دراصل وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ان کے فن کی اپیل کو ایک خاص جماعت اور ایک خاص گروہ میں محدود کر دیا گیا تو ان کے فن کی آفاقیت مجروح ہو گی حالانکہ اس میں جھینپنے کی کوئی بات نہیں۔ اس دور دراز کے زمانے سے قطع نظر جب انسان نے مختلف فنون میں اپنے جذبات کے اظہار کا آغاز کیا اور جب ہر فنی تخلیق متعلقہ فنکار کے پورے معاشرے کو متاثر کرتی تھی، معلومہ تاریخ کے ہر دور میں ہر بڑے فنکار کے مخاطبین کا حلقہ محدود رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے مخاطبین کا حلقہ بہت وسیع تھا مگر اس حلقے میں سے خواص خارج تھے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے تذکرۂ آبِ حیات میں اس کا تذکرہ کرنا بھی خلافِ تہذیب سمجھا ہے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اسے ایک بازاری شاعر قرار دے کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس کے برعکس غالب خواص یا اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے طبقے کا شاعر تھا اور اس کے زمانے کے عوام اس کے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ ذوق سے چھوٹا شاعر ہے کیونکہ شاہ کا استاد تو ذوق ہے۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا حلقۂ مخاطبین ہے اور کوئی فنکار ایسا نہیں ہے جو اپنے معاشرے کے ہر طبقے اور ہر سطح کو اپیل کرتا ہو۔ اس کی وجہ فنکار کا عجز نہیں۔ یہ بحیثیت مجموعی معاشرے کا عجز ہے۔ ایک ہی معاشرے کے چند افراد اگر اقبال کو سمجھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں اور دوسرے نہیں سمجھتے اس لیے متاثر بھی نہیں ہو پاتے تو اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اس دوسری قسم کے افراد کو ان کے معاشرے نے تعلیم، تربیت اور تطہیرِ ذوق کے وہ ذرائع مہیا نہیں کیے جو چند افراد کو مہیا کر رکھے ہیں۔ اسی طرح "اونچے" ذوق والے جو لوگ اختر شیرانی اور عدم کے اشعار پڑھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، انھیں بھی معاشرے ہی نے اور اس کی بعض نمائشی قدروں ہی نے اس حسِ لطیف سے محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے سب انسان غروبِ آفتاب کے منظر کو صرف اس لیے نہیں دیکھتے کہ یہ بے ثباتیِ حیات کی علامت ہے، بلکہ بعض لوگ اس لیے بھی دیکھتے ہیں کہ غروبِ آفتاب کا منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے اور اس میں رنگوں کی آمیزش بڑی پیاری ہوتی ہے اور اندھیرے اجالے کے اس ملاپ میں دل کی سطح پر کتنی کلیاں چٹکتی، کتنے پھول کھلتے اور کتنے ستارے ٹوٹتے ہیں۔

تعلیم اور تحسینِ فن لازم و ملزوم

میں سمجھتا ہوں کہ عوام ہم فنکاروں میں سے کسی کے بھی مخاطب نہیں ہیں۔ اب تک فن کاروں نے صرف یہ کیا ہے اپنی تخلیقات کے موضوعات عوامی زندگی میں سے منتخب کیے ہیں فن کی دنیا میں یہ بھی بہت ہی بڑا انقلاب ہے۔ مگر عوامی زندگی کو فن کا موضوع بنانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فنکار کے مخاطب بھی عوام ہی ہیں جب تک عوام اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہوتے اور جب تک ہمارے ہاں خواندگی کا تناسب صد فی صد نہیں ہو جاتا، فنکاروں کے مخاطبین محدود ہی رہیں گے۔ بحالاتِ موجودہ شاید ہی کوئی فنکار ایسا ہو جو عوامی AUDIENCE کو مجموعی طور پر متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ مخاطبین کی چند معذوریوں کے علاوہ خود فنکاروں کی چند مجبوریاں بھی ہیں۔ یہ مجبوریاں فنکار کو اس طبقہ سے ملتی ہیں جس سے وہ معیشتی طور پر وابستہ ہے، پھر اس ماحول اور مجلسی زندگی سے جس میں وہ اپنا بیشتر وقت گزارتا ہے، اور ان روایتوں سے، جن میں وہ پروان چڑھتا ہے۔

فن کار کا اپنے مخاطبین سے تعارف

فن کے مخاطبین کا مسئلہ یقیناً معاشرت اور تعلیم و تربیت اور پرورشِ ذوق سے وابستہ ہے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، فنکاروں کو اپنے مخاطبین کے حلقے سے متعارف ہونا چاہیے اور ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے کہ اس دور میں، جب فنون مکمل طور پر راج دربار سے آزاد ہو چکے ہیں، زیادہ سے زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ان کی حسن کاری سے متاثر ہو۔ مگر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ فنی تخلیق کے معیاروں میں کمی نہ آنے پائے۔ فنی معیاروں کی بعض خصوصیات بھی یقیناً اضافی ہوتی ہیں اور ہر فنکار انھیں بدلتا رہتا ہے مگر بحیثیت مجموعی یہ معیار انسان نے سیکڑوں صدیوں کی ریاضت سے حاصل کیے ہیں اور ہمیں انھیں آگے بڑھانا ہے، روندنا اور توڑنا نہیں ہے۔ ہم سب حقیقتِ اولیٰ کی تلاش میں ہیں مگر فنون کی دنیا میں یہ جھگڑا ہمیشہ چلا ہے اور آج بھی چل رہا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حقیقت کا یہ تصور بھی فن کاروں کے مختلف حلقہ ہائے مخاطبین کے مطابق مختلف ہے۔ میں کسی پر اپنی رائے ٹھونسنے کو گناہ سمجھتا ہوں مگر میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حقیقت اور فنی حقیقت میں فرق ہوتا ہے اور جہاں تک فنی حقیقت کا تعلق ہے وہ تلاشِ حسن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حسن کو آپ سچائی کہہ لیجیے، توازن اور انصاف کہہ لیجیے، نیکی اور محبت کہہ لیجیے مگر ہر بڑے فنکار کی تمام کد و کاوش اسی تلاشِ حسن، اسی حقیقت تک رسائی کی تگ و دو کا نام ہے۔ اگر فنکار اس ذہنی کد و کاوش میں معاشرے کے زیادہ سے زیادہ حصے کو شریک کر سکیں تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ جب تک معاشرہ اپنے افراد کو حصولِ تعلیم اور پرورشِ ذوق کی سہولتیں نہیں مہیا کرتا، فنکاروں کو اپنی سی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

وفیات

گذشتہ دس ماہ کے دوران میں علم و ادب اور شعر و فن کی جو شخصیتیں ہم سے چھن گئیں، ان کی فہرست، ہمیشہ کی طرح، اندوہناک حد تک طویل ہے ـــ پروفیسر سی اے قادر (تعلیم دان اور فلسفی) محترمہ جمیلہ ہاشمی (افسانہ نویس اور ناول نگار) میر مٹھا خاں مری (اردو اور بلوچی کی ایک درجن کتابوں کے مصنف) کلب علی خاں فائق (محقق) مجنوں گورکھپوری (نقاد اور افسانہ نگار) وقار انبالوی (شاعر و صحافی) ڈاکٹر جہانگیر خاں (ماہرِ تعلیم اور محقق) خلیل آتش (پنجابی کے شاعر اور اقبال کے متعدد شاہکاروں کے مترجم) احمد سعید (افسانہ نویس اور ناول نگار) اقبال ساجد (جدید غزل گو) رشید بھٹی (سندھی زبان کی تحقیق اور افسانہ نگاری کا ایک اہم نام) صدیق سالک (مزاح نویس ناول نگار) حسن اعرابی (شاعر) حسن حمیدی (شاعر) داؤد کمال (انگریزی کے شاعر اور اردو شاعری کے مترجم) سلیم جہانگیر (شاعر اور نقاد) ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی (شاعر اور نقاد) صحرائی گورداسپوری (شاعر) پروفیسر ظہور احمد اور ڈاکٹر عبدالمجید قریشی (ماہرینِ تعلیم) مولانا غلام محمد ہاشمی (شاعر اور سیاسی کارکن) غلام رسول طارق (شاعر) اور اجمل (اداکار) ـــ یہ سب گوہرہائے گرانمایہ ہم سے چھن گئے۔ ادھر پڑوسی ملک ہندوستان میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مورخ اور محقق) سید علی نقی المعروف نقن صاحب (ماہرِ دینیات و تعلیمات) محترمہ صالحہ عابد حسین (افسانہ نویس اور ناول نگار) خوشتر گرامی (ادبی مجلہ کے مدیر) اور ستیش بترا (افسانہ نگار) بھی رخصت ہو گئے۔ مشہور و معروف موسیقار جی ایم درانی بھی چل بسے جن کے گانوں نے ایک وقت میں پورے برصغیر پر حکومت کی تھی ـــ اور ابھی ابھی یہ روح فرسا خبر آئی ہے کہ کراچی میں کسی شقی القلب نے معروف ادبی شخصیت حضرت رئیس امروہوی کے سر میں گولی مار دی ہے اور چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے دعووں کے چیتھڑے اڑا دیے ہیں۔ ہم ان تمام بچھڑنے والے خواتین و حضرات کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

شبنم رومانی

اَللّٰھُمَّ لَبَّیک

(تاثراتِ حج و عمرہ)

جیتے جی اہلِ محبّت نے کفن پہنا ہے
خلعتِ فاخرہ اُتری ہے کہ میل اُترا ہے

"میرے اللہ میں حاضر ہوں" یہی کہنا ہے
یہی کہنا ہے کہ حاضر یہ ترا بندہ ہے

جائے تشکیک نہیں کوئی، یہ کیسی جا ہے!
"حرمِ نُور" کی جانب مرا دل کھنچتا ہے

میں ہوں اے پردہ نشیں! اور ترے گھر کا طواف
یہ مرا ذوقِ طلب ہے کہ ترا منشا ہے

عشق میں کارِ عبادت ہے مگر خود غرضی
سنگِ در کو ترے دیوانہ صفت چُوما ہے

درمیاں بندہ و آقا کے نہیں کوئی حجاب
ملتزم پر تو مری جان عجب نقشہ ہے

سُنّتِ مصطفوی، حُرمتِ ابراہیمی
لاکھ سجدوں کے برابر مرا اک سجدہ ہے

آبِ حیواں ہے ہر اک جرعۂ زم زم شبنم
آبِ زم زم مرے اشکوں کا ہر اک قطرہ ہے

ماں کے قدموں کی صدا گونج رہی ہے اب تک
سعیِ مشکور نہیں ہے تو محبّت کیا ہے؟

رات جس طرح گزرتی ہے سرِ محفلِ شوق
دن اُسی طرح سرِ دشتِ منیٰ گزرا ہے

وقفِ لازم کے مماثل ہے وقوفِ عرفات
جنّتی ہے وہی، اک پل جو یہاں ٹھہرا ہے

شبِ رحمت! شبِ نعمت ہے شبِ مُزدلفہ
جوہری ہے وہی، کنکر جو یہاں چُنتا ہے

مری قربانگہِ دل میں کوئی اور نہیں
خود وہ "میں" ہوں تہِ خنجر جو یہاں تڑپا ہے

اپنے ہی نفس پہ پتھراؤ کیا ہے میں نے
اپنے ہی ذہن کی شورش کا مجھے دھڑکا ہے

نفیِ صورت و تردیدِ انا کا ہے مقام
پیشِ محبوب کسی شئے کی حقیقت کیا ہے

اصطلاحوں میں ہے کیا، نام میں کیا رکھا ہے
ترا منکر ہے جو، اُس نے بھی تجھے مانا ہے

میرے خالق! میں بہت ناقص و ناچیز سہی
مگر اس پیکرِ خاکی میں تو اک دُنیا ہے

نعمتوں کو تری جھٹلاؤں تو ظالم ہوں بہت
ذہن بخشا ہے مجھے، نطق مجھے بخشا ہے

تُو جو میرا ہے، تو جنّت کی مجھے کیا پروا
میں جو تیرا ہوں، تو دوزخ کا مجھے ڈر کیا ہے

کوئی پُوچھے تو میں سمجھا نہیں سکتا، لیکن
میں نے ہر سمت اِن آنکھوں سے تجھے دیکھا ہے

میں نے ہر سمت اِن آنکھوں سے تجھے دیکھا ہے
کہ مرے پیشِ نظر آئینۂ طیبہ ہے

ہاں یہ طیبہ ہے، یہاں سر نہ اُٹھا کر چلنا
حرمِ محترم و جلوہ گہِ مولاؐ ہے

اِنھیں گلیوں نے قدم آپؐ کے چُومے ہوں گے
اِسی مٹی میں "چراغِ ابدی" رکھا ہے

لمحے لمحے پہ یہاں یادِ محمدؐ ہے رقم
ذرّے ذرّے پہ یہاں نامِ خدا لکھا ہے

اصل سے وصل کا احساس ہوا ہے کیا کیا
غیر کوئی نہیں، ہر شخص یہاں اپنا ہے

محمد اظہار الحق

حرم سے واپسی پر

(۱)

برونِ در نکلتے ہی بہت گھبرا گیا ہوں
میں جس دُنیا میں تھا کیوں اُس سے واپس آگیا ہوں
کوئی سیّارہ میرے اور اُس کے درمیاں ہے
میں کیا تھا اور دیکھو کس طرح گہنا گیا ہوں
مجھے راس آنہ پائیں گے یہ پانی اور مٹّی
کہ میں ایک اور مٹی سے ہوں اور مرجھا گیا ہوں
میں پتھر چُوم کر تحلیل ہو جاتا ہوا میں
مگر زندہ ہوں اور ہیہات! واپس آگیا ہوں
کہاں میں اور کہاں دربار کا جہل و تجبّر
مگر اک اسم کی تسبیح - جس سے چھا گیا ہوں

(۲)

متاعِ بے بہا آنسو زمیں میں بو دیا تھا
پلٹ کر جب ترا گھر میں نے دیکھا، رو دیا تھا
عصا در دست ہوں اُس دن سے، بینائی نہیں ہے
ستارہ آنکھ میں آیا تھا، میں نے کھو دیا تھا
زمانے، حُسن، ثروت ہیچ سب اُس کے مقابل
تہی کیسہ کو اُس پہلی نظر نے جو دیا تھا
پروں کی ارغوانی چھاؤں پھیلائی تھی سر پر
بہشتی نہر کا پانی مسافر کو دیا تھا
بس اک قندیل تھی جلتی ہوئی اپنے لہو میں
یہی نذرانہ دینا تھا حرم میں، سو دیا تھا

(۳)

دریچے کاخِ دل کے وا ہوئے ناگاہ میرے
میں تنہا تھا مگر تھے رفتگاں ہمراہ میرے
فرشتے لے چلے سوئے حرم تابوت میرا
کفِ افسوس ملتے رہ گئے بدخواہ میرے
یہاں میں محترم ہوں اور وہ نادم کھڑے ہیں
نظر مجھ سے چراتے ہیں وزیر و شاہ میرے
کہاں یہ چشمۂ کافور، یہ رحمت کی پیٹیں
کہاں وہ زندگی وہ روز و شب جانکاہ میرے
زمیں گردش میں ہے اس پر مکاں رہتا نہیں ہے
مگر اس سے نہیں آگاہ وارث، آہ میرے

(۴)

میں تھا قلّاش یا زردار، جو بھی تھا، وہیں تھا
کہ میرا اندک و بسیار جو بھی تھا، وہیں تھا
وہیں تھا ایک پتھر جس پہ تفصیلِ سفر تھی
یہ رستہ سہل یا دشوار جو بھی تھا وہیں تھا
وہیں میزان تھی اوزان لکھے جا رہے تھے،
اثاثہ کاہ یا کہسار جو بھی تھا وہیں تھا،
وہیں کم مائیگاں کے ناز اُٹھائے جا رہے تھے
میں شکوہ سنج و کُنجِ گفتار جو بھی تھا وہیں تھا
لہو میں اَن گنت شمعیں تھیں، آنکھوں میں دھواں تھا
یہ عالم ہجر یا دیدار جو بھی تھا وہیں تھا

وہیں مٹّی مری اظہار گوندھی جا رہی تھی
ازل کا اوّلیں دربار، جو بھی تھا وہیں تھا

احمد ظفر

حمد

پھُول نے لکھا کبھی دستِ صبا نے لکھا
بہتے پانی پہ ترا نام ہوا نے لکھا

آسماں نور ترا، تجھ سے زمیں روشن ہے
حرفِ مہتاب کہ سورج کی ضیا نے لکھا

تو سمندر میں ہے صحرا میں ہے کہسار میں ہے
خامشی نے تجھے دیکھا تو صدا نے لکھا

پھول ہنستے ہیں، مہکتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
فیصلہ جو بھی لکھا، تیری رضا نے لکھا

ہم گنہگار عنایت کے سزاوار ہوئے
جب مقدر کو ترے حسنِ عطا نے لکھا

آصف ثاقب

دُعا

جو چشمِ تر کو مری، محشرِ دعا کر دے
مرے خدا اب مجھے وہ رت جگا عطا کر دے
ہر ایک سانس کو تازہ ہوا کی بخشش دے
ہر ایک آہ کو اڈی ہوئی گھٹا کر دے
وفا کے عکس اُجاگر ہوں دوستوں کے لئے
مرے خلوص کو چہرے پہ آئینہ کر دے
میں مٹ چلوں تو مری خاک کھیت بن جائے
مری وفاؤں کو گندم کا ذائقہ کر دے
مرے خدا میں کھڑا ہوں تری عدالت میں
مرے لیے کوئی پیارا سا فیصلہ کر دے
میں ننگے سر ہوں کڑی دھوپ کے شراروں میں
تو کملی والے کا سایہ مجھے عطا کر دے

سیّد منیر

حمد

جب بھی تاریخ کا جلتا ہوا صحرا دیکھوں
تیری رحمت کی تمنّاؤں کا دریا دیکھوں

اپنا غم دیکھوں کہ یا رب غمِ دُنیا دیکھوں
وقت محدود ہے، حیران ہوں کیا کیا دیکھوں

ایک ہی نُور کی تنویر سے جاں روشن ہے
کہکشاں دیکھوں کہ دل میں ترا رستا دیکھوں

حُسنِ فطرت ہو کہ ہو سیرتِ انساں کا جمال
تیری آیات کا ہر حُسن میں چرچا دیکھوں

خود شناسی کا تقاضائے بصیرت ہے یہی
آنکھ کے نُور میں آلائشِ دُنیا دیکھوں

تابشِ توبہ سے جل جائے کثافت دل کی
جیسے بھٹّی میں پگھلتا ہوا لوہا دیکھوں

جس پہ، یا رب! تری نعمت ہو، ترا قہر نہ ہو
دل کے آئینے میں بس عکس اُسی کا دیکھوں

خشک سالی ہے، دعائیں ہیں، تہی دامن ہے
اِس زمیں پر بھی کوئی ابر برستا دیکھوں

تیز منجدھار کی لہریں بھی مرے ساتھ رہیں
ساتھ چلتا ہوا کشتی کے، کنارا دیکھوں

وسعتِ ارض و سما تیرے کرم سے پُر ہے
تہِ انبار کہیں اپنا بھی حصّا دیکھوں

وہ بھی دن آئے کہ انساں کی عدالت میں منیرؔ
ظُلم اور کبر کا بدلا ہوا چہرا دیکھوں

خاور اعجاز

حمدیہ

دن طلوعِ مہر کا منظر بنا دیتا ہے کون
رات ماہِ نور کی چادر بچھا دیتا ہے کون

کون رکھتا ہے دیارِ شوق پر دستِ صبا
حبس کے موسم میں بھی ٹھنڈی ہوا دیتا ہے کون

دشتِ ظلمت میں کرن آتی ہے کس کے حکم سے
پھر اُسے پیہم سفر کا حوصلہ دیتا ہے کون

کون ہوتا ہے پسِ پردہ، گماں کی دھند میں
اور پھر سارے حجابوں کو اُٹھا دیتا ہے کون

کس سے پردہ ہائے آگاہی میں ہے اک ارتعاش
رفعتِ افلاک سے ہم کو صدا دیتا ہے کون

ایک رُوحِ بے کراں جو ماورا ہم سب سے ہے
مرکزِ انوار جس کا رابطہ ہم سب سے ہے

مقبُول عامر

حمد

ہم اہلِ دشت پہ چھایا ہے سائباں کی طرح
کہ اُس کی ذات کشادہ ہے آسماں کی طرح

ہماری سمت سے کوتاہیاں ہُوئیں اکثر
وہ ملتفت ہے مگر یارِ مہرباں کی طرح

سوادِ شب میں بھی روشن ہے راستہ میرا
وہ میرے ساتھ ہے مہتابِ زرفشاں کی طرح

اُسی کے دم سے ہے زندہ یہ پیکرِ خاکی
کہ میرا اُس کا تعلق ہے جسم و جاں کی طرح

مہ و نجوم مرے ہمرکاب ہیں عامرؔ!
اکیلا شخص ہوں چلتا ہوں کارواں کی طرح

ریاض حسین چودھری

ایک آرزو

یہ آرزو ہے، سرِ حشر آپ فرمائیں
"کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ ہمارے شاعر کو
چراغِ عشق سجا کر ہتھیلیوں پہ ریاضؔ
کسی کو نعت ہماری سُنا رہا ہوگا
شبیہِ گنبدِ خضرا بنا رہا ہوگا
ہجومِ تشنہ لباں میں کہیں چھپا ہوگا
وہ بزمِ شعر میں جس نے چراغ مدحت کے
بڑے خلوص سے ہر طاق میں سجائے تھے
وہ عمر بھر جو تڑپتا رہا زیارت کو
وہ ہر گھڑی جو غلامی پہ ناز کرتا تھا
سگانِ کوُچۂ مدینہ سے پیار کرتا تھا
وہ جس کا سارا گھرانا تھا مفتخر اس پر
وہ جس کے بچے بھی ہم پر درود پڑھتے تھے
وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے تھے
اسی ریاضؔ کو جاؤ پکڑ کے لے آؤ!
کہو یہ اُس سے، تمہارے نصیب جاگے ہیں
کہو یہ اُس سے، اجازت ہے، اب چلا آئے
کہو یہ اُس سے، بیاض اپنی نعت کی لے کر
اور اپنے امّی و ابا کا ہاتھ تھامے ہُوئے
ہمارے دامنِ عفو و کرم میں آ جائے
کہو یہ اُس سے، گھرانے کے سارے بچوں سے
کہے کہ نعت سُنائیں ہماری محفل میں
وہ اپنے سارے قبیلے کو ساتھ لے آئے
ہم ان کے اشکِ ندامت کی لاج رکھیں گے
انھیں ہم اپنی شفاعت کی چادریں دیں گے

سندِ غلامی کی ان کو عطا کریں گے ہم
اور ان کے حق میں خدا سے دعا کریں گے ہم"

محسن بھوپالی

نعت

لازم ہے اس سے پہلے کہ نعتِ نبیؐ لکھوں
جو کچھ لکھا ہے، کچھ نہیں لکھا، یہی لکھوں

ق

پاسِ ادب میں جنبشِ لب کی کہاں مجال
اور شوقِ مدح اس پہ مُصر ہے، ابھی لکھوں
وہ کائناتِ علم ہیں، وہ علمِ کائنات
منجملہ صفات لکھوں تو یہی لکھوں

جو اُن سے آشنا ہُوا، حق آشنا ہُوا
آگاہیِ نبیؐ کو خدا آگہی لکھوں،

یارب عطا وہ ذہنِ رسا ہو کہ نعت میں
جو ماورائے فکر ہے، وہ بھی کبھی لکھوں

اس جزوِ نورِ کل سے ہے تابندگی تمام
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں

خالد اقبال یاسر

نعت

نبیؐ کی عظمتیں بھلا وہ کیسے جانتا نہ ہو
جسے نواگری میں ایک ہمنوا ملا نہ ہو

بندھے ہُوئے ہیں سارے اس کی شفقتوں کی ڈور سے
کوئی نہیں وہ جس کے حق میں کھل کے بولتا نہ ہو

مخالفوں کی منتشر صفوں میں ایک بھی نہیں
ہزار ظلم و جور سہہ کے جس کا دل بسا نہ ہو

بھرے جہان میں سوائے اس کے اور کون ہے
جو خیر و شر کے تول پر بشر کو تولتا نہ ہو

عذابِ پل صراط سے سلامتی اسی میں ہے
مرے لرزتے ہاتھ کے لیے اسی کا شانہ ہو

زمانہ خاک میں مجھے ملا بھی دے تو ہیچ کیا
جو اس کی پیشگوں میں میرے نام کا بھی خانہ ہو

خبر خدا سے ہر جہت کی اس کو ملتی ہے مگر
رسولؐ وہ ہے جو تمام راز کھولتا نہ ہو

کرن خفیفہ رزِ دل سے پھوٹتی ہے اس طرح
کہ جیسے میرے دل میں اس کے پیار کا خزانہ ہو

ثمینہ راجہ

۵

ایک طرف اونچے اونچے اور ہیبت ناک پہاڑ

دوسری جانب وحشت والی اور کالی دلدل

بیچ میں پھیلا   دور دور تک ایک گھنا جنگل

جنگل میں حیراں آنکھیں اور سہما دل

سہمے سہمے دل سے پوچھوں اب کیا ہے مشکل

ایک عجیب گلابی رستہ جاتا اس کے دوار

اعجاز رضوی

سچ

وہ جس نے ظلمت کے تپتے صحرا میں نور بویا
وہ جس نے وحشت کے جنگلوں میں شعور بویا
وہ روشنی کا کھلا سمندر
وہ جراتوں کا اک استعارہ

وہ ابنِ آدم کی کالی راتوں میں آنے والا
سحر ستارہ
نبیؐ ہمارا

محمود رحیم

نعت

خدا نے بھیجا ہے اُس کو، وہ اُس کا بندہ ہے
اور ایسا بندہ، خدا جس پہ ناز کرتا ہے
وہ ایک نام کہ جس نام کے حوالے سے
جوارِ جاں میں چراغاں سا ہونے لگتا ہے
وہ ایک جذبہ کہ جب بھی ورود ہو اُس کا
لہو کی ساری روانی میں دوڑ جاتا ہے
وہ ایک نور کہ جس کے سبب سے دنیا میں
زمیں سے تا بفلک ہر طرف اُجالا ہے
وہ ایک سحر کہ جس کو وجودِ برحق نے
ہر ایک شے میں زمانے کی پھونک ڈالا ہے
وہ ایک اسم کہ ہر اسم میں طلسم اُس کا
عقیدتوں کی رُتیں استوار کرتا ہے
وہ اک وجود کہ جس کی فضیلتوں کے لیے
خدائے عرش مکاں خود درود بھیجتا ہے
وہ ایسا حق ہے کہ جس کی گواہیوں کے لیے
تمام گزرے ہُوئے انبیا کا سلسلہ ہے
ہر ایک دن کے لیے روشنی ہے سورج کی
ہر ایک شب کے لیے صبح کا ستارا ہے
رحیم اس کا تصور ہے خوشبوؤں کی نوید
سوادِ روح میں کیا موسم آ کے اُترا ہے

(سعودی عرب)

ثاقب عرفانی

نعت

درخشاں منبر و مینار دیکھے
مدینے کے در و دیوار دیکھے

اُجالے، چاندنی، مہکار، شبنم
سرِ صحرا گل و گلزار دیکھے

گلاب و مشک و عنبر سے فزوں تر
معطّر کوچہ و بازار دیکھے

مسافت میں تھا اک کیفِ مسلسل
اگرچہ مرحلے دشوار دیکھے

نہ آیا لب پہ جب حرفِ تمنّا
مترجم آنسوؤں کے ہار دیکھے

لکھے گا خامۂ ثاقب کہاں تک
کرم جو جو سرِ دربار دیکھے

اخگر سرحدی

قائدِ اُردو ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم

چل بسا وہ کہ جو تھا، جانِ جہانِ اُردو
مدّتوں سوگ منائے گی زبانِ اُردو

کون تھا اُس کی طرح، اُردو زباں کا حامی
کون تھا اُس کی طرح، مرتبہ دانِ اُردو

عُمر بھر اُس نے اسے اپنا فریضہ سمجھا
وہ بڑھاتا ہی رہا، عظمت و شانِ اُردو

اُس نے تابندہ و پائندہ کیا اُردو کو
جلوہ در جلوہ ہوئی، تاب و توانِ اُردو

ضوفشاں دل میں وہ احساس کی لَو رکھتا تھا
آشکار اُس پہ تھا، سب حالِ نہانِ اُردو

اب کسے فکر ستائے گی، زباں اپنی ہو
کون سوچے گا بھلا سود و زیانِ اُردو

ہر طرف کتنی اُداسی ہے نمایاں اخگر
کتنے مغموم ہیں سب دیدہ ورانِ اُردو

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے خطوط — اخگر سرحدی کے نام

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

جناب محمد شریف اخگر سرحدی، انجمن ترقی اردو سرگودھا کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے ساتھ ان کے گہرے مراسم کی نوعیت ان خطوط سے واضح ہے جو انھوں نے "فنون" کو بطور خاص عطا کئے ہیں۔ ان خطوط کو اخگر صاحب کے دلی شکریے کے ساتھ شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ ادارہ

(۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء)

محترم و مکرم جناب اخگر صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف

آپ کا مکتوب پروفیسر چودھری عبدالقادر صاحب کے نام موصول ہوا۔ مندرجات سے آگاہی ہوئی۔ انھوں نے مجھے جواب لکھنے پر مامور فرمایا ہے۔

گزارش یہ ہے کہ ۵ راپریل ۱۹۷۶ء کی تقریب ختم کردی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی ہے کہ میں نے اسے خود نمائی اور خودستائی اور تماشائے رسوائی قرار دے کر اس کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اگر اس دن یا اس سے پہلے اردو کو اس کا مطلوبہ مقام مل جاتا تو اس میں ایک وجہ جواز نکل آتی کہ ایک سرگرم کارکن کی سعی سے کچھ تو ہوا لیکن اردو کے خلاف خود صوبہ پنجاب کے اردو ادبا کے ایک بڑے گروہ نے جو مہم جاری کر دی ہے اس کو دیکھ کر یہ تاثر لینا دشوار نہیں کہ سرکاری حلقے کو اب ایسی پشت پناہی مل رہی ہے جس کے ہوتے ہوئے اردو کے مسئلے کو کچھ دیر معلق رکھ کر بالآخر اسے بالکل ختم کر دینا ہی مدنظر ہے۔ ایسی منحوس صورت حال اس سے قبل پنجاب میں کبھی پیدا نہیں ہوئی تو پھر جشن چہ معنی؟

یہ بات میرے دعوائے بے غرضی کے بھی خلاف ہے۔ اور یہیں ممکن ہے کہ خود تحریک اردو کو بھی گزند پہنچے۔ اور یہ بھی مضحکہ خیز بات ہے کہ کسی شخص کے ستر سال تک پہنچ جانے کے واقعہ کو اتنی اہمیت دی جائے۔ لہٰذا یہ منصوبہ اب ترک کر دیا گیا ہے۔

البتہ تذکرۂ کارکنان اردو کی تدوین تقریباً مکمل ہو چکی ہے چند دنوں کے بعد اس کی اقساط مرتب ہو کر یکے بعد دیگرے آپ تک پہنچنی شروع ہو جائیں گی۔ یہ تذکرہ صرف پنجاب کے کارکنوں تک محدود نہیں رہے گا۔ البتہ آپ کے صائب مشورے کے تحت اس میں وہ حضرات شامل ہوں گے جنھوں نے انجمن ترقی اردو لاہور کے ساتھ تعاون کیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا جائے گا کہ ملک بھر کے دوسرے ادیبوں نے بھی اپنے اپنے طور سے اردو کی خدمت کی

خدا کرے آپ بہ صحت ہوں۔ خدا آپ کو بہ صحت اور تنومند رکھے۔ والسلام

نیاز مند سید عبداللہ

(۲۷ر فروری ۱۹۷۹ء)

محترم و مکرم جناب انگر صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ موسم کی تبدیلی سے آپ کی صحت پر خوشگوار اثر پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کلی عطا فرمائے۔

جسٹس رحمٰن ایک عظیم انسان تھے۔ میں نے ان کو ہر رنگ میں دیکھا اور ایک اعلیٰ پیکرِ فضائل پایا۔ اور اردو کے لئے تو وہ ہمہ تن خدمت تھے۔ راقم الحروف کی تو ساری زندگی ان کے احسانات کی داستان ہے۔ بڑے ہمدرد، غم گسار، ساتھ دینے والے قابل اعتماد دوست تھے۔

ان کے غم میں ـــــ ان کا ماتم منانے کے لئے ایک بڑے جلسے کا ارادہ کر رہا ہوں لیکن لوگ ملکی فضا کی مایوس کن صورت حال کے باعث بے دلی کا شکار ہیں۔ ہر کوئی مایوس دل شکستہ ہے۔ کچھ جوش نہیں پایا جاتا۔ تاہم میں کوئی صورت کروں گا۔ میں چاہتا ہوں معاون انجمنوں کا ایک روزہ اجلاس بلاؤں۔ اس میں کچھ اور باتیں بھی ہو جائیں مثلاً اردو کے نئے مسائل کے متعلق کچھ قرار دادیں ـــــ اور بڑا اجلاس ماتم رحمٰن کے لئے وقف کیا جائے۔

وہ تذکرہ محسنان و کارکنان اردو بھی بڑی اچھی چیز تھی۔ ہم سے اس کا اہتمام نہ ہو سکا ـــــ حکیم محمد سعید ایک شام ہمدرد ہمارے لئے وقف کردیں تو ماتم رحمٰن ہو سکتا ہے۔ اسی موقعہ پر ان سے ہمارا ایک وفد ملے اور ان سے امداد کی درخواست کرے۔ شاید اس طرح کوئی صورت نکل آئے۔ جب سے آپ بوجہ علالت نرم پڑے ہیں، میں بھی کچھ نرم ہو گیا ہوں۔ یار ان صادق کے بغیر یہ ہنگامے گرم نہیں رہ سکتے۔ جی چاہتا ہے ایک آدھ دن کے لئے سرگودھا پہنچوں۔ کچھ دل گرم ہو جائے۔ یوم رحمٰن کے سلسلے میں اپنے خیالات و تجاویز سے آگاہ کریں۔ سب عزیزوں سلام کہیئے۔

نیاز مند
سید عبداللہ

(۱۴ر مارچ ۱۹۷۹ء)

محترم و مکرم جناب انگر سرحدی صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔

ہارون الرشید تبسم صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے ان سے جواباً کہا تھا کہ میں تو صرف انگر صاحب سے ملنے کے لئے (اور ان کے ساتھ مل کر گھومنے پھرنے اور خاموشی سے واپس آجانے کے لئے) سرگودھا جانا چاہتا تھا، تاکہ لاہور کی طوفانی زندگی سے کچھ گھنٹے دور رہ کر زندگی کو بھی دیکھوں اور انگر صاحب کو۔

مگر میں ہمیشہ سے کچے ارادے کا آدمی ہوں۔ پھر بھی ـــــ شاید ـــــ۔

غریب اور بے کس اردو کے ساتھ جو شرمناک سلوک پاکستان میں ہوا، اس پر ضمیر کی ساری دنیا کو اشکبار ہونا چاہیئے۔ لاہور کے انگریزی اخبار نے جو ایک مہم "انگریزی بچاؤ" شروع کر رکھی ہے، ہر روز اس اخبار میں بے سرو پا دلیلیں انگریزی کے تقدس کے حق دی جاتی ہیں ـــــ اور انگریزی کا عاشق طبقہ مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ ہم جواب لکھ کر بھیجتے ہیں تو وہ چھاپا نہیں جاتا۔ یہ ممکن ہے سرکاری اشارے سے ہو رہا ہو مگر خود اخبار کے بھی یہی خیالات ہیں۔

اپریل کے ہفتۂ اول میں ایک کانفرنس کا ارادہ تھا مگر ابھی تک وسائل مہیا نہیں ہوئے۔ ارادہ تھا کہ اس میں جسٹس رحمٰن مرحوم کے لئے بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔ جو فیصلہ ہوا آپ کو اطلاع دوں گا۔

باقی احوال بدستور ہیں۔ خدا تعالیٰ سے فضل و کرم کا طلبگار ہوں۔ والسلام

نیازمند
سید عبداللہ

(۱۳ اگست ۱۹۷۹ء)

مکرم و محترم اخگر سرحدی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ملا ہے۔ بذریعہ ہذا آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔

۱۔ جناب عزیز اختر وارثی صاحب کو صدر مملکت نے ۵۰۰۰/- روپے کی رقم بغرض علاج چند دن قبل بھجوا دی ہے۔

۲۔ میں نے دوبارہ اکیڈمی ادبیات کو لکھا ہے کہ عزیز اختر وارثی صاحب کا سرکاری طور سے علاج کیا جائے اور کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے۔

اردو کانفرنس کے بعد باقی تو خاموش بیٹھ گئے مگر میں خاموش نہیں بیٹھا۔ جناب محمد یعقوب ہاشمی صاحب نے لاہور سے جانے کے بعد ایک مرتبہ بھی بات نہیں پوچھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب بھول بھلا گئے۔ کرنل ایوب مستعد آدمی ہیں مگر رفقاء کی کم ہمتی سے اتنے ناراض ہو جاتے ہیں کہ خود ہم پر ہی غصہ نکالنے کا ارادہ کرتے رہتے ہیں۔ گورنر صاحب پنجاب نے نہایت قطعی اور دوٹوک الفاظ میں تمام پنجاب کے دفتروں کی زبان اردو کر دی ہے مگر دفتروں میں اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا جا رہا ہے۔

محترم اخگر صاحب! اس پر کوئی تدبیر احتجاجی سوچ رہا ہوں۔ اگر کچھ ہو سکا تو کروں گا۔ ڈیڑھ سو سال سے جو کلر دلوں پر جما ہوا ہے وہ اب ان معمولی باتوں سے کیسے مٹے گا۔ اس کے لئے تو کسی عوامی تحریک کی ضرورت ہے مگر عوام کو سمجھانے کے لئے بھی تو کوئی بہت بڑی بارسوخ جماعت ہونی چاہیئے۔ میری اور اخگر سرحدی کی مثال تو محض ان قطروں کی ہے جو کسی درخت کے پتوں پر گرتے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔ والسلام

نیازمند
سید عبداللہ

(۱۳ نومبر ۱۹۷۹ء)

محترم و مکرم اخگر سرحدی صاحب۔ السلام علیکم

مزاج شریف

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ عزیز اختر وارثی صاحب کو بغرض علاج پانچ ہزار روپے کی رقم اکیڈمی آف لیٹرز نے دے دی ہے۔ باقی کوشش بھی جاری ہے۔ اردو کے متعلق کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ زیادہ خوش فہمی کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر بھی کام کرتے رہنا چاہیئے۔ درحقیقت اردو کو ابھی کچھ نہیں ملا۔ انگریزی کا تسلط بڑھ رہا ہے اور بڑھایا جا رہا ہے۔ والسلام

مخلص
سید عبداللہ

(۱۹ر جولائی ۱۹۸۰ء)

محترم و مکرم جناب، خگر سرحدی صاحب السلام علیکم

خدا تعالیٰ آپ کو صحت کامل عطا فرمائیں۔

چودھری نذیر احمد خاں قوت کا ستون تھے۔ جس مقصد کے ساتھ وابستہ ہوئے اس کے لئے تقویت کا باعث رہے اور بات یہ ہے کہ پرانے بادہ گسار اب تو اُٹھتے جاتے ہیں۔ یعنی ہمارے مقاصد کے نقطۂ نظر سے، ورنہ دنیا تو چلتی رہتی ہے اور لوگ بھی رواں دواں۔ وہی رونق، وہی چہل پہل ؎

خداوندا یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی ہزاروں اُٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے بہت سی رونق ختم ہو گئی ہے۔ حمید احمد خاں، ڈاکٹر خان اے رحمٰن، جسٹس رحمٰن اور اب نذیر احمد خاں ــــــ لے دے کر جسٹس انوار الحق ہیں۔ چند روز قبل، کراچی کی ایک اردو کانفرنس میں اردو کا نعرہ پھر لگایا۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔

مئی جون میں میری صحت بہت خراب رہی۔ میں کراچی بھی نہ جا سکا۔ اب بھی زیادہ اچھی نہیں لیکن اردو کا کام جاری ہے اس سے طبیعت ذرا بہل جاتی ہے۔ لوگوں نے میری جواں ہمتی کا اتنا چرچا کیا کہ اب کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوانی روٹھ کر رخصت ہوا چاہتی ہے۔ مکروہات (جو ہمیشہ ہی ہوئے ہیں) اب زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ بندے پر لازم ہے کہ شکر ادا کرتا رہے اور اپنے مولیٰ سے قوت کا طلبگار رہو۔

میں آج کل مقتدرہ کی ذیلی کمیٹی برائے زبان دفتری کا ناظم ہوں۔ اس حیثیت سے کچھ کام ہو رہا ہے لیکن دکھ یہ ہے کہ ۳۴ سال گزرنے پر بھی زبان یتیم ہے اور مزید یتیم بنائی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے اعلانات کے باوجود عملاً کچھ بھی نہیں۔

چند سفارشات صدر مملکت کے غور اور فیصلہ کے لئے مرتب کر کے چھپوائی ہیں۔ تین نسخے الگ ارسال ہیں۔ عزیزوں کو سلام

مخلص سید عبداللہ

(۲۷ر اگست ۱۹۸۰ء)

مکرم و محترم جناب اخگر صاحب۔ السلام علیکم، مزاج شریف

آپ کا خط ملا ہے۔ سابقہ خط بھی مل گیا تھا۔ جواب میں بوجوہ تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

کوہاٹ میں اردو کانفرنس کا خیال تو ٹھیک ہے لیکن ملکی فضا کچھ ایسی ہے کہ کوئی تحریکی کانفرنس اس وقت بے محل معلوم ہوتی ہے۔

مقتدرہ کے قیام کے بعد، صدر صاحب نے سب ذمے داریاں اردو والوں پر ڈال دی ہیں۔ اب اردو والے کہاں تک اپنے فرائض پورے کرتے ہیں اس کے نتائج کا ابھی انتظار ہے۔ لاہور کی حد تک میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ کراچی میں کیا ہو رہا ہے میں اس سے بے خبر ہوں۔ غرض یہ کہ کوہاٹ کانفرنس میں کچھ کہنے کے لئے مواد موجود نہیں البتہ مشاعرے وغیرہ ہو سکتے ہیں مگر مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ میں گرمیوں میں خاصا مضمحل رہا۔ اب بھی مکروہات کی وجہ سے طبیعت بے جوش ہے خدا آپ کو صحت کامل عطا فرمائے اور آپ میری صحت و عافیت کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔ جملہ احباب کی طرف سے سلام۔ مخلص، نیازمند

سید عبداللہ

(۹ ستمبر ۸۰ء)

مکرم و محترم جناب اخگر صاحب السلام علیکم۔ مزاج شریف

نامۂ مبارک ملا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اگر ہم خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو مغرب زدہ ذہن اس سے فائدہ اٹھائے گا لیکن میرے محترم یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ ہم خاموش ہو گئے ہیں۔ میں اس وقت نہایت انہماک سے مقتدرہ کی ذیلی کمیٹی برائے دفتری زبان کی تنظیم اور سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر کے آخر میں اور نومبر کے شروع میں کاروباری کانفرنس کا ارادہ ہے۔ سرکاری محکموں کے عہدہ داروں کو چٹھیاں جا رہی ہیں۔ دفتری زبان کے بارے میں ان کی سرگرمیوں پر سوال و جواب ہو رہے ہیں۔ غرض کہ کام بڑے زور سے جاری ہے۔ پشاور، سرحد اور دوسری جگہوں پر بھی کانفرنسیں ہونی چاہئیں لیکن میرا بذات خود ان تک پہنچنا ممکن نہ ہو گا۔

آپ نے سچ کہا کہ میرا جوش طبعی بھی اب پہلے کی طرح کا نہیں۔ میں کچھ بیمار بھی رہا ہوں اور کچھ پریشانیوں میں بھی رہا۔ اور اب بھی پریشان ہوں۔ آپ میرے لئے دعا کیا کریں اور میں آپ کے لئے دعا کرتا رہوں گا۔ عزیز شاہد مسعود بھی ایک روز آیا تھا مگر میرے گھر اس روز کانفرنس کے سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میں ملاقات نہ کر سکا۔ میری طرف سے معذرت کر دیجئے۔ باقی اردو کے متعلق سرکاری رویہ وہی ہے جو شروع سے آپ دیکھتے رہے ہیں لیکن کام کرنے والوں کو کام کرتے رہنا چاہیئے۔ والسلام

مخلص
سید عبداللہ

(۱۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

مکرم و محترم جناب اخگر صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ کوہاٹ، پشاور اور اکوڑہ خٹک کے سفر و سیاحت کا حال معلوم ہوا۔ مجھے تو زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ آپ کو خداوند تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی ہے اور طاقت بھی۔

میری ذاتی رائے میں اس وقت کسی کانفرنس کی ضرورت نہیں یعنی بسلسلۂ تحریک اردو — اس لئے کہ صدر مملکت نے مقتدرہ کی صورت میں ایک پیش قدمی کر دی ہے۔ اب کچھ عرصہ مقتدرہ کو کام کی مہلت دینی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ دفتر شاہی ان کانفرنسوں کو ہی بہانہ بنائے اور صدر صاحب کی رائے کو خراب کرے۔

میری صحت زیادہ بری نہیں اگرچہ کچھ زیادہ اچھی بھی نہیں۔ اس مرتبہ گرمیوں میں مجھ پر موسم کا مخالفانہ اثر پڑا۔ کام میں کرتا رہا مگر بے صحتی کے عالم میں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میری صحت کے بارے میں فکر مند ہیں۔ دعا کیا کریں۔ باقی رہی اردو کے مستقبل کے بارے میں میری مایوسی تو حضرت، مایوسی نہیں حقیقت ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو کی عزت و تکریم تو ہوتی رہے گی مگر یہاں کے اینگلو محمڈن اس کو سرکاری زبان کبھی نہ بننے دیں گے۔ لیکن ہماری طرف سے کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ میرے خیال میں کانفرنسوں کی بجائے اخبارات میں چٹھیاں لکھوائیے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اب گیارہویں بارہویں جماعت میں بھی اردو کے نمبر کم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے کام کرتے ہیں۔ دفعۃً ختم نہیں کرتے آہستہ آہستہ شاخیں کاٹ رہے ہیں کہ عام آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ بہرحال دیکھئے۔

جملہ احباب کو میرا سلام کہیئے۔ والسلام

نیاز مند
سید عبداللہ

(۷؍جولائی ۱۹۸۱ء)

محب محترم السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

خدا آپ کو صحت دے اور سرگرم کار کرے۔

آپ کے لکھے ہوئے تین مسودے مجھے مل گئے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان کی بنیاد پر اور آپ کے نام کی اساس پر مہم منظم کروں۔ اگرچہ قوم اور اہل ملک اور حکام سے کچھ زیادہ امید نہیں مگر چلیئے۔ نام ہی سہی۔ یا برائے نام ہی سہی۔ انجمن ترقی اردو لاہور کے خرچ پر، مگر انجمن سرگودھا کے نام سے اپیل شائع ہوگی۔ طبع ہونے کے بعد آپ کو کافی تعداد میں نقول بھجواؤں گا جن پر لوگوں کی بھی تائید حاصل کرنی ہوگی۔

باقی احوال بدستور۔ اب کچھ بہتر ہوں اور دفتر آنا شروع کر دیا ہے۔ دعا فرمائیں۔ عزیزوں کو سلام و دعا۔ نیاز مند

سید عبداللہ

(۱۲؍مئی ۱۹۸۲ء)

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم۔ مزاج گرامی

۲۳؍مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر نفاذ اردو کی منعقدہ تقریب کی روداد جو اخبارات میں شائع ہوئی تھی اس کی فوٹو کاپیاں ہارون الرشید کی طرف سے مجھے موصول ہوئی ہیں اور یہ میری وساطت سے صدر مملکت کو بھجوانے کا لکھا ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ آپ ہارون الرشید تبسم صاحب کو کہیں کہ وہ ہر کام آپ کے مشورے سے کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ جو کاغذات انھوں نے مجھے بھیجے ہیں وہ آپ کے مشورے کے بغیر بھیجے گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ انھیں سمجھا دیں گے شکریہ۔ میں ان کی مستعدی سے تو خوش ہوں لیکن ان کے طریق کار اور غیر محتاط تحریروں سے خوفزدہ ہوں، آپ انھیں ضبط میں رکھیں تو مناسب ہوگا۔ والسلام مخلص طالب خیریت

سید عبداللہ

(۲۵؍مئی ۱۹۸۲ء)

مکرم و محترم۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف

آپ کا عنایت نامہ مل گیا ہے شکر گزار ہوں۔

میانوالی کے حضرات کے ساتھ میں نے وعدہ کر لیا تھا لیکن اس اثنا میں چند ضروری امور پیش آ گئے۔

حکومت نے گزشتہ سال کے عمدہ فیصلوں کے برعکس جو ۲۴؍اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ہوئے تھے۔ یکم جون ۸۲ء کو ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ پھر رکھی ہے جس کے کاغذات کو پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ سابقہ سب فیصلوں پر گورنروں اور سکریٹریوں سے دوبارہ رائے حاصل کی گئی ہے ــــــ اور اس مرتبہ عجیب اتفاق یہ دیکھا کہ تمام عمدہ فیصلوں کے خلاف، اب اردو کے نفاذ کو ایک طرح کا خطرناک اقدام قرار دیا گیا ہے۔ میجر آفتاب صاحب بھاگے بھاگے ۱۹؍مئی کو لاہور پہنچے اور تدبیر کار پر گفتگو ہوئی۔ یکم جون والی میٹنگ میں میں اور میجر صاحب ایک طرف اور پندرہ سولہ سکرٹری صاحبان دوسری طرف ہوں گے۔ تالپور صاحب صدارت کریں گے۔ سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان بنوانے کے منصوبے ہیں۔ سرحد کے گورنر صاحب نے بہت مخالف لکھا ہے۔

اور سندھی کو زبان، دل قرار دینے کی سفارش کی ہے۔ صدر صاحب کے کسی اعلان کی بظاہر توقع نہیں۔

ان واقعات کے پیش نظر مجھے یہاں ۱۴ر مئی کو احباب کا ایک اجلاس طلب کرنا پڑا۔ اثر تو کچھ نہ ہوگا مگر کچھ کیا ہے، انجمن شہریان کے چند ممتاز اراکین سے صدر صاحب کو تار دلوائے ہیں۔ میں ۲۲ر مئی کو ایک اور میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تھا۔ اب ۳۱ر مئی کو دو دن کے لئے پھر جا رہا ہوں۔ ان حالات میں میانوالی کانفرنس مستقبل قریب میں ممکن نہیں۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو اکتوبر کے اوائل میں کچھ کریں گے فی الحال میرا جانا ممکن نہیں، اور سفر سے مجھے طبعی حجاب بلکہ تعصب بھی ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ دیگر حالات بدستور ہیں۔ میری صحت بفضلہٖ تعالیٰ ٹھیک ہی ہے مگر دیگر مکروہات بعض اوقات نڈھال کر دیتی ہیں۔ میرے لئے دعا کیا کریں۔ میں بہت عاجز آدمی ہوں۔ سب عزیزوں کو سلام کہیئے۔ والسلام

نیاز مند

سید عبداللہ

(۸ر جولائی ۱۹۸۲ء)

مشفق و شفیق و محب مکرم۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف

کرم نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں، آپ کی شفقت کا میرے دل پر گہرا نقش ہے اور خدمتِ اردو کے سلسلے میں تو میں آپ کو اپنا قافلہ سالار مانتا ہوں اور آپ کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں۔

میں دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی خدمت میں بڑے انہماک سے لگا ہوا ہوں اور میری آرزو ہے کہ یہ کام جلد ختم ہو اور اس کا اختتام بھی میرے ہی ہاتھوں ہو چنانچہ بہت محنت سے کام میں منہمک ہوں۔ خدا میری مساعی کو بارآور کرے۔ آپ بھی دعا کریں۔

یونیورسٹی کی سینٹ کے ایک فیصلے کے مطابق یونیورسٹی نصابات کو قومی اسلامی نصب العین کے مطابق بنانے کے لیے ایک بڑی کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے۔ مجھے اس کا چیرمین مقرر کیا گیا ہے، یہ دائرہ معارف والے کام کے ساتھ ساتھ ہوگا مگر اس سے الگ ہے۔ یہ بھی خدمت کا ایک میدان ہے۔ خدا کامیاب کرے، مگر اصل دائرہ معارف ہی ہے۔

اردو کے سلسلے میں، میں نہ مایوس ہوں نہ پُر امید۔ دراصل مجھے توقع کبھی نہیں ہوئی اس لئے مایوسی بھی نہیں ہوتی۔ ہمارا فرض ہے اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہیں۔ آگے خدا کی رحمت پر تکیہ ہے فقط۔ انشاء اللہ تعالیٰ ستمبر اکتوبر میں انیسویں سالانہ اردو کانفرنس ہوگی اور عوام میں کام کرنے کا ارادہ ہے۔ اونچے طبقوں میں کافی دلیل اپیل ہو چکی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا بیکار ہے۔ سب عزیزوں کو دعا و سلام

آپ کی صحت کا طالب

سید عبداللہ

(۲۹ر اگست ۱۹۸۲ء)

مکرم و محترم انگر صاحب السلام علیکم مزاج شریف

کرم نامہ ملا۔ شکریہ۔ آپ کی دوبارہ علالت کی اطلاع سے افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ شفا بخشے۔

میں کراچی ۵ر کی شام کو گیا۔ ۹ر کی دوپہر کو واپس لاہور آگیا تھا۔ وہاں کچھ کام ہوا لیکن میرے اندازے میں سب

بیکار ہے، ہماری قوم (جیسا کہ ہمارا شروع ہی سے خیال تھا) انگریزی اور انگریزیت پر فدا ہے۔ نفاذِ اردو کی امید کم ہے البتہ اس وقت تک دھوکے جاری رہیں گے جب تک یہ بالکل مردہ نہیں ہو جاتی۔ نماز لاہور میں بھی ہوئی۔ آپ نے بھی پڑھوائی مگر اخباروں نے خبر نہیں چھاپی کیونکہ اردو اخبار خود انگریزی سے مغلوب ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو نومبر کے آغاز میں اعتراف خدمت گزاران اردو کانفرنس کا ارادہ ہے تاکہ خادموں کے نام تو کم از کم زندہ رہ سکیں تفصیل سے جلد آگاہ کروں گا۔ سب عزیزوں کو سلام

نیاز مند طالب خیریت

سید عبداللہ

(۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء)

مکرمی و محترمی، السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں، آپ کا خیال درست ہے کہ دفتروں میں زیادہ تر کام انگریزی میں ہو رہا ہے۔ لوگ مغرب زدہ بلکہ انگریز ہوتے جا رہے ہیں۔ قومی جذبے کا فقدان ہے۔ بہر حال اپنے حلقۂ اثر میں اس نیک کام کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیئے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیئے

فی الحال کانفرنس کے انعقاد کے لیئے فضا سازگار نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے بھی اس بارے کوئی اعلان نہیں ہوا۔ مناسب موقع پر کانفرنس ہو گی انشاء اللہ۔ جب اچھے نتائج نکلنے کی امید ہو گی۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے والسلام

آپ کی صحت کا طالب، نیاز مند

سید عبداللہ

(۵ر اپریل ۱۹۸۳ء)

محترم و مکرم جناب اخگر صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

آپ لاہور تشریف لائے لیکن میں تین دن کے لئے کراچی گیا ہوا تھا۔ آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس ہوا۔ آپ نے صحت کی خرابی کے باوجود سفر اختیار کیا، بڑا کرم کیا۔ کراچی میں کتابوں پر ایک مذاکرہ تھا، میں اس میں شریک ہوا۔

اردو کے حالات بدستور ہیں بلکہ پہلے کی نسبت زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں تفصیل خط میں نہیں لکھی جا سکتی۔ اخباروں میں (جنگ میں) ایک مراسلہ چھپا تھا کہ حکومت نے ۱۹۸۳ء کو اردو کا سال قرار دیا ہے۔ میں نے اس کی بنیاد پر صدر مملکت کو تحسین کا تار دیا، لیکن اس کے جواب میں متعلقہ سرکاری محکمے نے مجھے اطلاع دی کہ مبینہ خط جعلی تھا اس لیے ۱۹۸۳ء کو سال اردو قرار نہیں دیا گیا۔ سخت حیرانی ہوئی۔

مقتدرہ کے پیش کیے ہوئے (برائے منظوری صدر صاحب) منصوبے کا بینہ ڈویژن میں پڑے ہیں۔ ادھر مقتدرہ کا نظام بھی بدل گیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ مقتدرہ کی سابقہ کمیٹی میں تین ماہ کے لیے عارضی توسیع ہوئی ہے مگر اس کا کام کیا ہے، کچھ معلوم نہیں۔ پبلک میں تاجر صاحبان نے انگریزی پرستی کی حد کر دی ہے۔ ہر شخص انگریزی کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کا زمانہ اور ہمارے نظریات کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اخبارات بھی اب اس معاملے میں تقریباً

غافل ہیں جنھیں ہم اردو کے احباب کہتے ہیں وہ خود بھی شک اور تذبذب کا شکار ہیں۔

ان حالات میں فی الحال انتظار مناسب ہے۔ جب تک بات واضح نہیں ہو جاتی کہ قوم کیا چاہتی ہے، اس وقت تک ہمارے کام بے محل اور منصوبے رائیگاں بلکہ مضر ثابت ہوں گے۔ میں آپ کی صحت کے لیے دست بدعا ہوں۔ نیازمند

سید عبداللہ

(۲۸ جولائی ۱۹۸۳ء)

محترم و مکرم اخگر صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

آپ کا مکتوب ملا، شکرگزار ہوں۔ آپ کی طبیعت کی ناسازی کا افسوس ہوا، مسلسل دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب تو میں بھی کچھ ڈھیلا رہنے لگا ہوں۔ مارچ اپریل سے کسل مندی کی تکلیف شروع ہوئی اب تک جاری ہے۔ تاہم دفتری کام بدستور جاری ہے۔ لیکن سرگرمیوں پر اثر پڑا ہے۔ چند روز قبل شدید گرمی نے سخت مضمحل کیا، صحت بہت متاثر ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر کار موسم، بارش نے بہتر کر دیا۔ غرض بیچارے انسان کی یہی سرگزشت ہے۔

اردو کا قصہ وہی پرانا ہے، حاکم لوگ آخری وقت تک اردو کے راستے میں فصیلیں کھڑی کرتے رہیں گے۔ کوئی امید کامیابی کی نہیں رہی۔ بڑے دعوے کے ساتھ بڑی باتیں ہوئیں مگر سب وقتی تھیں۔ جب تک کوئی سخت مجبوری نہ ہوگی اردو کو کوئی آنے نہیں دے گا۔ زیادہ مجبوری دیکھیں گے تو مزید خرابی کے لیے ایک آدھ ادارہ کھول دیں گے۔ اس طرح کچھ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے اور نوکریوں والے مستفید کیوں ہوں گے؟

باقی رہی پبلک سو اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ مشاعرے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں، ادیبوں کے لیے بس یہی کافی ہے۔ تاجر لوگوں نے انگریزی کلیتہً اپنا لی ہے۔ اے بی سی تک جاہل مگر دکانوں فرموں کے نام انگریزی۔

غرض اردو کا مسئلہ ختم ہے۔ یوں مشغلہ جاری رکھنا ہو تو جاری رکھا جا سکتا ہے مگر بے سود۔ پھر بھی کچھ ہمت ہے تو جاری رکھیے گے۔ آپ کے سلسلے میں جو تقریب ہو رہی ہے مبارک ہے۔ میری صحت نے اگر ساتھ دیا تو حاضر ہو جاؤں گا ورنہ کامیابی کے لیے سراپا دعا تو ہر وقت ہوں۔

باقی حالات بدستور ہیں، دیگر خاص امر لائق تحریر نہیں۔ سب احباب کو سلام و احترام۔ نیازمند

سید عبداللہ

(۱۷ مارچ ۱۹۸۴ء)

مکرم و محترم اخگر صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ملا ممنون ہوں۔

میں دفتر باقاعدگی سے جاتا ہوں لیکن کبھی طبیعت زیادہ ناساز ہو تو چھٹی کر لیتا ہوں۔ آپ کی ہمدردی اور غمگساری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اردو بیچاری اب زار و زبوں حالت میں ہے کوئی پرسان حال نہیں۔ فرنگ کے وابستگان انگریزی کے دامن سے وابستہ

ہیں، پھر بھی خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیے۔

خدا کرے موسم کی تبدیلی سے آپ کی صحت بہتر ہو گئی ہو۔ خدا اپنا کرم فرمائے۔ فرزندان و عزیزان کو سلام۔

نیازمند
سید عبداللہ

(۳۱ اگست ۱۹۸۵ء)

مکرم و محترم جناب اخگر سرحدی صاحب السلام علیکم۔ مزاج شریف

آپ کا کرم نامہ موصول ہوا، شکر گزار ہوں

حالات ایسے ہیں کہ گلہ کسی کا نہ کیجیے۔ سب وعدے فراموش ہیں۔ اب اور طرح کے مسئلے ہیں، جتنا کچھ ہو جائے غنیمت ہے۔

مرحومہ زینب کاکاخیل نے بہت ساتھ دیا۔ آخری عمر میں، میری ہی طرح مایوس سی تھیں، پھر بھی کام چونکہ طبیعت کا حصہ بن چکا تھا اس لیے کچھ کرتی رہتی تھیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔

قومی اسمبلی میں موجودہ وزیر تعلیم کے جوابات اردو کے بارے میں بس سرکاری قسم کی عذر معذرت ہے۔ ۱۹۸۸ء تک مکمل اردو کا حکومتی وعدہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ وہی پرانے بہانے، پرانے عذر۔ بس اب دعا کیجیے، دوا کی گنجائش کم ہے۔

سب عزیزوں کو سلام

مخلص
سید عبداللہ

(۱۴ جنوری ۱۹۸۶ء)

مکرم و محترم جناب اخگر سرحدی صاحب السلام علیکم۔ مزاج شریف

لیجیے اس خط میں آپ کو کام کی بات سناتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آئین ۱۹۷۳ء میں اردو کے نفاذ کی تکمیل کا آخری سال ۱۹۸۸ء لکھا گیا ہے لیکن قرائن سے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ ہدف بھی مشکوک سا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کو یقینی بنانے کے لیے کسی تحریک کی ضرورت ناگزیر معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تحریک خاموش ہونی چاہیے اور سراسر محبت کے اصول پر چلائی جائے اور کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے کسی جھگڑے کا جائز احتمال ہو۔ کانفرنسوں کا حربہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نہ صرف یہ کہ کارگر نہیں، اُلٹا ہمارے خلاف استعمال ہوتا ہے اسی لیے میں اتنا عرصہ خاموش رہا۔ بلاشبہ میری طبیعت بھی ناساز تھی لیکن ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بدقسمتی سے علاقائیت پسند ہماری کانفرنسوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے تھے لہٰذا اب طریق کار بدل دینا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے اخبارات بھی اب وہ اخبار نہیں جو ہوا کرتے تھے اور دیگر احوال بھی اب بدل گئے ہیں، لہٰذا محبت کے اصول پر ایک خاموش تحریک، جو دلوں سے اُٹھے اور دلوں تک پہنچے اور زیادہ فنڈ کی بھی محتاج نہ ہو۔

اس سلسلے میں، میں چند روز کے بعد کچھ سلپیں آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ آپ مزید خود چھپوالیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ آپ اپنے دوستوں تک پہنچائیں، دوست اپنے دوستوں تک، وہ اپنے دوستوں تک اور اسی طرح .... سلسلہ چلتا رہے۔

یہ طریق بظاہر سادہ اور یونہی سا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ بالآخر یہی طریقہ موجودہ حالات میں کارگر ہوگا۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہر شخص ۱۹۸۸ء کو تکمیلی سال نفاذ اردو سمجھنے لگے اور ۱۹۸۸ کے اعداد قومی مطالبے کے ترجمان بن جائیں۔

امید ہے اب آپ کی صحت کچھ اچھی ہوگی۔ سردیوں میں تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ شفا بخشے۔ آپ کے فرزندان عزیز آپ کا ہاتھ بٹائیں گے وہی کافی ہیں۔ زیادہ آدمیوں کی ضرورت بھی نہیں۔

نیازمند
سید عبداللہ

(یکم فروری ۱۹۸۶ء)

محترم و مکرم اخگر صاحب۔ مزاج شریف

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔

میں نے کچھ سلپیں (۱۹۸۸ء) چند روز ہوئے آپ کو بھجوا دی تھیں۔ امید ہے آپ کو مل گئی ہوں گی۔ چنداں امید تو نہیں لیکن وہی بقول آپ کے، کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ آئین ۱۹۷۳ء کی رو سے ۱۹۸۸ء میں اردو کی تیاری برائے نفاذ کے پندرہ سال پورے ہو رہے ہیں لیکن قرائن کہہ رہے ہیں کہ افسر شاہی اس اعلان کو ملتوی کر کے چھوڑے گی۔ اس لیے ۱۹۸۸ کی تحریک یا ہل چل جاری رہنی چاہیئے تاکہ حکومت کو معلوم ہو کہ لوگ خبردار ہیں۔ میں کانفرنسیں نہیں کروں گا اس میں بڑی مصلحتیں ہیں جن کے اشارے پہلے کر چکا ہوں۔ زبانی کبھی موقع ہوا تو عرض کروں گا۔ خاموش تحریک مناسب ہے۔

ہو سکے تو مزید سلپیں چھپوالیں۔ ممبران قومی و صوبائی اسمبلی اور کونسلروں میں تقسیم کریں، اور بھی جہاں تک ممکن ہو ۱۹۸۸ کے عدد کو سلوگن بنائیں۔

صحت اب بہتر ہے مگر زیادہ اچھی نہیں۔ دعا کیا کریں۔ میں آپ کے لیے دعاگو ہوں۔ والسلام

نیازمند
سید عبداللہ

علی اکبر عباس

صفیرِ شکست

اقبال ساجد کی موت پر

زندہ لفظ بنانے والے!
تم اپنے لفظوں کے ہاتھوں ٹوٹ گئے
تم کہ طُور نہیں تھے پھر بھی
تم پر نور کی لاٹ گری
جس کی آگ میں جلتے جلتے رفتہ رفتہ راکھ ہوئے
اور نظارہ کرنے والے بھی ـــ ایمان تو کیا لاتے
اپنی جان بچانے کا گُر جان گئے

تم نے شعر کا اسمِ اعظم پڑھتے پڑھتے
اُلٹا چِلّہ کاٹ لیا تھا
رس ہیرے کو چاٹ لیا تھا
اپنا سینہ چھلنی کر کے لوگوں کو دکھلاتے تھے
سورمتا جتلاتے تھے
زخموں پر تیزاب چھڑکتے تھے
اور جشن مناتے تھے

بھرے قبیلے سے کٹ چھٹ کر
اپنے الگ الاؤ کے اطراف میں تنہا ناچنے والے
تم جیسے ہی ہوتے ہیں
جو بے تال پٹخ کر پاؤں
جسم کو توڑ لگاتے ہیں
سر کے بھار گراتے ہیں
تمھیں سہارا دینے کتنے ہاتھ بڑھے تھے

لیکن تم
کنڈیالی مچھلی کی مانند
سب ہاتھوں کو زخمی کر کے
چھُوٹ گئے
زندہ لفظ بنانے والے!
تم اپنے لفظوں کے ہاتھوں ٹوٹ گئے

(منقول از روزنامہ نوائے وقت لاہور)

احمد ظفر

مُوجد

(لمحوں کا مصوّر)

میں دریدہ بدن
تیری خوشبو چمن در چمن
زخم سے پھول کی گفتگو
دل کے تالاب میں قطرہ قطرہ وہی بارشِ بے صدا
خواب پلکوں پہ رکھے ہُوئے ۔ جستجو
اور کسی دشتِ بے نام کے زرد پیڑوں کے سائے میں بیٹھے ہُوئے
اجنبی ہم سفر چار سُو

ایک تصویر بنتی بگڑتی ہُوئی میں نے دیکھی
مگر آئنے میں ترا عکس بھی میں نے دیکھا ہے ۔ اے ماہ رُو
رفتہ رفتہ کسی سائے میں ڈھل گیا ۔ کُو بکُو
ایک سایا جو میرے تعاقب میں ہے
صبح کے نم میں ہے، شام کے غم میں ہے گردشِ شب میں ہے
میری آزردگی کی جھلک اے فلک
کب تلک کب تلک

ہر ستم میرے حصے میں لکھے گا تُو
کس لیے خنجرِ بے بسی کے تلے سانس لیتا رہوں
کس لیے لحظہ لحظہ سسکتا رہے، میرا ذوقِ نمُو

گردشِ وقت میں، میں یہ کس سے کہوں ؟
کون ہے تُو، بتائے مجھے کون : میں کون ہوں
تیری رفتار موجِ صبا کی طرح
خوشبوؤں کے خزانوں کو شانوں پہ رکھے ہُوئے
ظلم ڈھاتی رہی، مسکراتی رہی
ایک دریائے سم، میری رگ رگ میں میرا لہو
تجھ پہ مرنے کی خُو، لفظ کی آبرو، یاد آتی رہی
میرے دل پر ہُوئی، نقشِ گمنام کی ہر عبارت رقم
اور میں وقت کے آنگنوں کا کوئی نغمہ گر
سازِ ہستی کے تاروں سے الجھا ہُوا
میں مصوّر رہوں گا ہمیشہ ترا، رِس رہا ہے مری انگلیوں سے لہو !

کلامِ فیض — ایک مطالعہ — (۴)

عزیز بن حامد مدنی

فیض کے کلام کا ایک حصہ ان کی ذات اور نجی زندگی کے گرد ایک ہالہ سا بناتا ہے جس میں عشق و محبت کے واقعات، انتظار، یادوں کی فضا خود ان کی بیماری کے دوران ذہن پر کھنچے ہوئے وجود و عدم کے خطوط ملتے ہیں۔ ہر شاعر کے یہاں ان قلبی کیفیات سے اس کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے مختلف انٹرویوز میں نہایت تفصیل سے اپنے مطالعے، سیاسی اور سماجی پس منظر اور بنیادِ فکر پر بات کی ہے۔ کچھ اشارے بھی کیے ہیں جو ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جوانی کے زمانے میں ایک نامعلوم سی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی:

> "جیسے آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اس کی صورت مختلف ہو گئی۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کی سی چیز محسوس ہونے لگی ہے۔ اس کیفیت کا کبھی کبھی بعد میں بھی احساس ہوا مگر اب نہیں ہوتا۔"

کیا یہ جوانی میں جنس کا اول شعور یا تخلیقی کرب کی بے تابی تھی۔ مگر اس وضع کی باتوں کی کسی تحلیل نفسی کا ان کی شخصیت اور کلام پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ اپنے گھر کی آس پاس کی فضا میں نکلتے ہوئے چاند کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

> "چاندنی بدبو اور گرد کے کوڑے کرکٹ پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پر اسرار منظر بن گئے تھے۔ شہر کی گلیوں، محلوں، کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ ہوتا تھا جیسے کوئی پرستان ہو۔"

ان کی ذاتی زندگی کے کئی گوشے بہت خوبصورتی سے ان کے کلام میں آئے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری منزل آتی جاتی ہے۔ ان کے مذاق کی درستی، طبیعت کا رخ، حسن پسندی، خواتین میں اٹھنے بیٹھنے کا مہذب طریقہ، جو انھوں نے ایامِ طفلی میں حاصل کیا تھا، ان کی شخصیت کے نکھار میں جھلک اٹھتا ہے۔ ایک اور موڑ پر ان کے کلاس فیلو اور دوست شیر محمد حمید لکھتے ہیں:

> "ہر معتدل آدمی کی طرح فیض پر بھی عشق و محبت کے حادثے گذرے ہیں۔ کچھ عام رومانیت کے معمولی واقعات ہیں جن کا دیرپا اثر ان کی ذاتی زندگی پر نہیں رہا۔ لیکن دو ایک وارداتیں اتنی شدید تھیں کہ فیض کے قلب و جگر کو برما کے رکھ گئیں۔"

آگے وہ لکھتے ہیں:

> "میرے نزدیک فیض کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ایلس جارج سے ان کی شادی ہے — فیض ایک لاابالی بے نیاز، بے وطن، خود فراموش سا نوجوان تھا — ایلس نے اس کی زندگی میں ترتیب و رسنوار پیدا کر دی۔ اس کی بے قرار روح کو ایک حسین قالب میسر آ گیا۔"

اس ساری ذاتی داستان میں قید کی تنہائی، ایک جلاوطنی کی فضا، اور ان کی بیماری کی مدتیں بھی ملتی ہیں، جو ہارٹ اٹیک تک گئی ہیں۔

عہد بہ عہد ان ابیات میں ان منزلوں کے نشانات ہیں:

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور — آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور — شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

ایک کیفیت یہ ہے:

وہ جس کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم — جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جس سے
وہ آرزوئیں کہیں کھو گئیں ہیں میرے ندیم — مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار — چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار — محبتیں جو فنا ہو گئیں ہیں میرے ندیم

ان کی مشہور نظم "تنہائی" جس کا تجزیہ اردو ادب میں موجود ہے، خود ایک بڑی کیفیت کی نظم ہے۔ ان کے قطعات میں عکسِ محبوب اور حسین ترین یادیں، محبت کی نرمیاں اور احساس کی شدتیں اس طرح سمٹ آئی ہیں اور اس کفایت الفاظ میں سموئی ہوئی ہیں جو ان کی نظموں میں نہیں آئی۔ ان کی تخلیقی رَو میں حسن کا تصور، جسم کا احساس۔ قرب کی آنچ، اور لذتیں۔ اتنی حسین ترکیبوں اور نئی تشبیہوں اور تہ خواب جاگے ہوئے نقوش میں ملتی ہیں کہ وہ ان کے کلام سے موجودہ شعراء کی جمالیات میں جھلک اٹھی ہیں۔ ان کی نظم "سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام" کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ شیریٔ لب اور خوشبوئے دہن کی حدیثیں بھی نقل ہوتی رہی ہیں۔ جیبِ عنبر دست اور وہ ساری ترکیبیں جو انھوں نے حسنِ نسوانی کے لیے دی ہیں نئے شعرا کی لفظیات میں داخل ہو گئی ہیں۔ ان کی نظم "زنداں کی ایک صبح" کا پہلا بند، خواب و بیداری کو یک دگر کرتا ہوا، ان کی تشبیہ سازی کی ایک مثال ہو گیا ہے:

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے
عکسِ جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

وہ مثالیں جو ان کی غزلوں میں ہیں ایک اپنی اہمیت رکھتی ہیں مگر اب ان کی تین نظموں کا تذکرہ ضروری ہے۔ دو نظموں کا

عنوان بھی ایک ہی ہے "کوئی عاشق کسی محبوبہ سے"۔ پہلی نظم "زنداں نامہ" میں اور دوسری "مرے دل مرے مسافر" میں ہے۔ ایک تیسری نظم ہے "جو میرا تمہارا رشتہ ہے"۔ پہلی دو نظمیں بڑی کیفیت کی ہیں۔ اور ان کی سمتیں بھی محبت کے احساس کے دو رُخ رکھتی ہیں اور دونوں میں محبوبہ کسی قدر محتاط فاصلے سے قرب کی ایک پختہ سمجھ کی منزل تک آئی ہے پہلی نظم میں ایک قرب کا حوالہ ہے۔ جو کئی منزلوں سے گذرا ہے اور ہر منزل پر اس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ بھی رہا ہے:

یاد کی راہگذر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشت فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانیں کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

عشق اس وہم کو رد کر کے ایک اور مرحلہ کو یاد کرتا ہے ــــ جہاں ایک اور رہگذر پھوٹ نکلے گی اور ساتھ چھوٹ جائے گا ــــ مگر وہ بات بھی جھوٹی جھلکتی ہے۔ اور "سایہ زلف کا اور جنبش بازو کا سفر" قائم ہے۔ اور ایسا کوئی اندھیرا نہیں آسکتا جس میں ان کا "ماہ رواں" ڈوب جائے۔ قرب یقینی ہے اور خدشات محض بیکار رہیں۔ ہاں اگر محبوب مصروفیت یا کسی کام میں محویت کے سبب توجہ اس طرف نہ کر سکے تو تسکین یوں دی گئی ہے:

تم سے چلتی رہے یہ راہ۔ یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

محبت کی یہ کیفیت سامنے کی نہیں ہے وہ یادداشت کی کھلتی ہوئی تہوں میں ان تمام منزلوں کی یاد دلاتی ہے جس سے عاشق گذر چکا ہے۔ دوسری نظم کی کیفیت بالکل دوسری ہے ــــ اور جانبین میں زندگی کی کئی منزلوں سے گذرنے کے بعد "آداب محفل" کا سا سلوک رہ گیا ہے ــــ بلکہ عشق میں ایک خاموش سپردگی آگئی ہے ــــ اور یہی وہ انسانی جذبہ ہے جو ہجر و وصال سے الگ محبت کی خو ہے:

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہیں ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو، اور جو نہ چاہو نہ سنو

اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو

ان نظموں کے بعد ان کی بیماری یا اس کے تاثر سے لکھی ہوئی نظموں کا مختصر سا ذکر۔ کیونکہ ان میں بھی ان کی لفظیات بہت بامعنی ہیں۔ یہ چار نظمیں ہیں۔ (۱) اس وقت یوں لگتا ہے (۲) آج شب کوئی نہیں (۳) ہارٹ اٹیک (۴) تم میرے پاس رہو۔ "ہارٹ اٹیک" کے چند مصرعے ہیں:

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بنِ مو سے ٹپکنا چاہا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گذرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

ایک اور نظم ہے جو ۱۴ مارچ ۸۲ء کو میو ہسپتال میں لکھی گئی ہے "اس وقت تو یوں لگتا ہے":

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ پہ شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا۔ نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

بسترِ علالت پر گذراں وقت کی یہ کیفیت جو چند اشاروں میں زندگی کے نشیب و فراز کی پوری داستان ہو سکے۔ اور اس بات پر ختم ہو رہی ہو کہ "تیرا کوئی اپنا۔ نہ پرایا کوئی میرا"۔ دل پر معلق موت کی ایک گھڑی کی گرانی کا کتنا پاکیزہ احساس ہے۔ موت کے تصور پر ان کی اور بہت اچھی نظم ہے۔ "جس روز قضا آئے گی"۔ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں عمر کی ایک سنجیدہ منزل پر پہنچ کر۔ شعرا کا ذہن موت کے تصور سے دوچار ہوا ہے۔ اور اس سلسلے کا کلام ہماری زبان اور دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اپنی زندگی کے حوالے سے

اور کبھی موت کے خوف کے واسطے سے عمر گریزاں پر بہت اچھی تنقیدیں بھی ہیں فیض نے بھی ایک اپنی طرز کا تصور پیش کیا ہے۔ زندگی کی طرح موت بھی ان کے لیے طلسمات کے در کھول رہی ہے۔ وہ جب آئے گی تو یوں آئے گی جیسے وہ اضطراب جو اوّلِ شب میں محبوب کے بوسۂ شیریں سے پیدا ہوتا ہے۔ یا اس کیف کی طرح جو آخرِ شب میں حجرۂ محبوب میں نغمۂ سیارگاں کی آخری جھنجھناہٹ کے نیند میں بسنے سے ہوتا ہے ــــــ اس خود کلامی میں ایک دوسرا رخ پیدا ہوتا ہے ــــ شاید وہ قاتل کی طرح آئے جس کی نوک سناں سے کوئی رگِ واہمہ درد سے چلانے لگے ــ مگر تصور کے دونوں رخوں پر حرفِ وداع ایک مقامِ شکر پر ختم ہوتا ہے۔ موت سے صلح پر داستان ختم ہوجاتی ہے:

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ وداع کی صورت
للہ الحمد۔ بہ انجام دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

بے ساختہ حافظ کا شعر یاد آجاتا ہے:

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد　　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

فیض کے کلام میں چند ایشیائی زبانوں کے شعرا کے ترجمے بھی ہیں۔ ان میں ناظم حکمت۔ رسول حمزہ۔ قاسم قلی خاں اور محمد علی سلمان ہیں۔ ناظم حکمت کے افکار کے نمونے حسب ذیل ہیں،

اکیلے جیو
ایک شمشاد تن کی طرح
اور مل کر جیو
ایک بن کی طرح

اس کی دوسری نظم ہے:

او میرے وطن او میرے وطن او میرے وطن
میرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
میرا آخری کرتہ چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
یا تھریا میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
وا میرے وطن وا میرے وطن وا میرے وطن!

داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ کے اشعار:

میرے آبا کہ تھے نا محرم طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوک شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوک شمشیر
روشنائی سے جو کرتا ہوں میں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

اور "صحرا کی رات میں" نوجوان قازقستانی شاعر محمد علی سلمان کہتا ہے:

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
برہنہ پا غول گیدڑوں کے لگا رہے ہیں
بنوں میں ٹھٹھے
ببول کے استخواں کے ڈھانچے
پکارتے ہیں
نہیں ہے شبنم کہیں نہیں ہے

سفید دھندلاتی روشنی میں
ہیں دشت کی چھاتیاں برہنہ
ترس رہی ہیں جو حسن انساں لئے کہ شبنم کا ایک قطرہ
کہیں پہ برسے
نہیں ہے شبنم کہیں نہیں ہے

یہ ترجمے بہت خوبصورت پیرائے میں ہیں اور ان شعرا کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایشیائی زبانوں کے شعرا ہونے کی حیثیت سے ان کے کلام میں اجنبیت بھی نہیں ہے۔ ماسکو کی ایک شام میں اسلوب، بحر اور شاعری کے طریقۂ کار پر ناظم حکمت نے فیض سے گفتگو بھی کی۔ ناظم حکمت نے ان سے کہا کہ "اصل میں ہر زبان کے روزمرہ بول چال کا ایک اپنا مخفی قدرے بکھرا ہوا آہنگ ہوتا ہے جس پر پوری توجہ دی جائے تو اس سے کئی طرح کے مترنم صوتی خاکے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ عوامی گیت تو خیر بہت واضح چیز ہے۔ لیکن اگر تم کسی بوڑھے شہری یا دیہاتی داستان گو سے کوئی پرانا قصہ سنو تو اس نثر میں بھی تمہیں اس زبان کا آہنگ ملے گا۔ کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی زبان میں اس کے فطری آہنگ اور ترنم کو دریافت کیا جائے اور شعر کی لَے کو اس سے قریب لایا جائے۔"

فیض کہتے ہیں کہ انھوں نے بعض نظموں میں یہ کوشش کی ہے۔ ان کی نظم "شام شہریاراں" گفتگو کے انداز میں، نثر میں بھی — ایک شعری آہنگ کی مثال ہے:

اے شام مہرباں ہو
اے شام شہریاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی — دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر — درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد — و غیظ و غم کی
اس دوزخی — دوپہر کے تازیانے

آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھل گئے ہیں
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
تیرے توشہ میں کچھ تو ہوگا
مرہم درد کا دوشالہ
تن کے اس انگ پر اڑھا دے
درد — سب سے سوا جہاں ہے

گفتگو کے لب و لہجے میں، جو لحاتی وقفے آتے ہیں ان سے اس نظم میں بھی ایک آہنگ پیدا ہوا ہے۔ فلسطینی بچوں کی لوری بھی اسی طرح کی ایک نظم

ہے "آشنک آباد کی شام" "بہار گئی" اور نظمیں گفتگو کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ سماعت کے لئے ان بحور کا انتخاب کیا گیا ہے جو روز مرہ کی بول چال سے ہیں۔ یہ نظمیں ان کی اپنی بنائی ہوئی لفظیات اور اسلوب سے بھی الگ ہیں۔ ایک مختصر سی نظم ہے ــــ کچھ عشق کیا کچھ کام کیا ــــ اس میں باتیں کرنے کا ہی انداز ہے:

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
اور آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

پاکستان کی ۳۷ سالہ زندگی میں ان کی تخلیقات کی مرکزی حیثیت تھی۔ ان کا نام ایشیائی ادیبوں میں بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ عہدِ فرنگ کے آخری دور سے اب تک فکری اعتبار سے معاشرے میں وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کے حامی تھے ان کے لب و لہجے کی شگفتگی، ہمارے عصر کا جوہر بھی ہے اور وقار بھی۔ ان کا کلام حجم میں نسبتاً کم مگر معنی میں وقیع ہے۔ تیس کی دہائی میں جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو اردو ادب کا ایک نیا افق سامنے آیا تھا۔ ۲۵ سال بعد انہیں کی کتاب "زنداں نامہ" کے دیباچہ میں سجاد ظہیر نے یوں لکھا ہے:

"بہت دنوں سے لوگ جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بد اندیش ہیں اردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ اردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ابھی تک جاری ہے۔ اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال ہی کو لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" ندیم قاسمی کی "شعلۂ گل"، سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار" احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید" اور مجنوں گورکھپوری کے "نقوش و افکار" منجملہ دیگر کتابیں اس دعوے کی شہادت میں کافی ہیں۔"

یہ تحریر ۱۹۵۶ء کی ہے جسے ۲۹ سال گذر چکے ہیں۔ اور اب سجاد ظہیر کی وفات کو بھی ایک مدت ہو چکی ہے۔ فیض نے انھیں یاد کر کے ایک بہت خوبصورت نظم کہی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

صبا اور اس کا اندازِ تکلم　　سحر اور اس کا اندازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے　　وہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی　　کریں اتمام دورِ جامِ ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو　　بڑھا دو شمع محفل بزم والو
پیو اب ایک جام الوداعی　　پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

اس "جامِ الوداعی" کے بعد ایک نیا عہد آ گیا۔ بہت سے تغیرات ایسے ہوتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کی قومی زندگی اور بدلی ہوئی معاشرتی ساخت کا کچھ اور رُخ ہو گیا ہے۔ شاید آج کوئی ایسی ادبی تحریک جو سبھی لکھنے والوں کے لئے فکر کا منبع ہو سکے آسان نہیں رہ گئی ہے۔ مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ فیض اور ان کے ہم عصروں نے اپنی تخلیقات میں پوری توانائی سے زندگی کے متحرک عناصر کو سمیٹا۔ اور ان کے لئے نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا سنگ بستہ پانی نہیں تھا۔ آج کی فضا میں بھی ان خیالات کے مضمرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ کا قانون اور اس کی منطق سامنے ہونے والے واقعات کے اندرونی تصادم میں نافذ العمل ہوتی ہے۔ ہر عہد کی فکر اسی کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ ادب و شعر میں اس سے ہٹ کر جو کچھ ہوتا ہے وہ فقط آرائشی

حیثیت رکھتا ہے نقش ونگار دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ مگر وہ فکر جو تاریخ کے تقاضے پوری کرتی ہے۔ ایک دور سے دوسرے دور تک آنے میں اپنے اندر جذب تخلیق ردّ کرنے نئے ذہنوں کے لئے مہمیز ہوتی ہے۔ فیض کا کلام اپنے اسلوب و لفظیات، اپنی فکر اور تہذیبی روایت میں یہ اثر رکھتا ہے۔ آخر کار شاعری کی بنیادی خصوصیت "زخمہ برتار رگ جاں می زنم" والی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں یہ خصوصیت خوش اسلوبی کا اپنا ایک زاویہ بھی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کی رمز آشناؤں میں تھے۔ گفتگو میں سلیقہ، کلام پڑھنے میں ایک خاص انداز جو اُن کی شخصیت کو عیاں کرتا ہے، سامعین میں حرف کا اعتبار پیدا کرتا تھا۔ محفلوں میں ان کا لہجہ ہمیشہ یاد آتا رہے گا۔ ان کی شاعری کا آہستہ خرام آہنگ خواب و بیداری میں، اچانک یاد آنے والی بات کی طرح ذہنوں میں جاگ اُٹھتا ہے۔ دس پندرہ سال کے فرق سے ایک نئی نسل کا قافلہ اپنی فکر کا ساز و سامان لے کر آجاتا ہے اور ٹھہرتا بھی اسی میدان میں ہے جہاں "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" اور "آگ بجھی ہوئی اِدھر" ہوتی ہے۔ اقبال کی وفات کے وقت وہ خود ۲۷ سال کے اور جوش چہل سال کی منزل پر تھے۔ آزادی کے بعد وہ ۳۶ سال کے تھے، اور تازہ واردوں کا ایک مجمع اپنا کلام لے کر آچکا تھا۔ جوش نے ۸۶ سال کی عمر میں اور انھوں نے ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے ہم عصر سردار جعفری، جذبی، ندیم آج بھی محو کلام ہیں اور ان کے بعد آنے والی نسل کے لوگ اور ان کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی ایک صف موجود ہے۔ ہر عصر ایک تازہ محاورہ اپنی نمود کے لئے وضع کرتا ہے۔ ان کی ابیات اس نمود کی ہمیشہ کے لئے شناخت رہیں گی۔

ابتدا میں یہ بات آئی تھی کہ ان کی زندگی کے اول دور میں ایک بڑی ادبی تحریک کے بانیوں میں وہ بھی تھے۔ اس تحریک سے پیدا ہونے والا رجحان، ہندوستان کی سیاسی آزادی، اس کے معاشرے کی شدید ناہمواری، اور بے سود توہمات میں الجھی ہوئی زندگی سے پیکار کا تھا۔ ادبی تحریکیں معاشرے کے پامال ہوجانے یا ان کے بے سکت ہوجانے کی بنا پر سیاسی اور نامیاتی تجزیوں اور ان کی روشنی میں بنتی ہوئی قدروں سے پیدا ہوتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں اجتماعی شعور کا فقدان، یا رجعت پرستی کے میلانات سے کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ عہد فرنگ کے باقاعدہ آغاز سے، سوائے اس تحریک کے جو سر سید احمد خاں اور ان کے ادبی رفقائے کار۔ حالی، شبلی اور نذیر احمد کے تخلیقی کاموں میں ہے، اور جس کی مرکزیت سر سید احمد خاں کی ذات تھی، یا لاہور میں نئی شاعری کے معماروں میں حالی اور آزاد کے سوا کسی اور تحریک کا وجود نہیں ملتا۔ اور یہ دونوں تحریکیں، ایک SOCIAL TRANSITION معاشرے کی طرزِ معاش میں تغیر کی نشانیاں تھیں۔ مگر فیض کے دور میں بیرون جات کی ہم عصر تحریکیں بھی اہم تھیں اور ادب میں ان کا اثر بھی نمایاں تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانس میں سوریلی تحریک اور بعد میں ایٹس اور ایلیٹ کے بعد آنے والے شعرا میں سوشلزم کی تحریک چلی تھی۔ انقلابِ روس سے پہلے، میکسم گورکی سے لے کر مایہ کوفسکی تک جس اضطراب کا احوال ملتا ہے وہ بھی ایک فکری تحریک سے ملتا جلتا ہے۔ عرب ممالک اور ایران میں بھی ایسی تحریکیں چلتی رہیں۔ ان سب کا تذکرہ ادب کی تاریخ میں شامل ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ولادت، یا کم از کم اس کی پیدائش کا بیج، انگلستان میں ہندوستانی نوجوانوں کے ذہنوں میں پڑا تھا۔ تیسری دہائی کے پس منظر میں اس کا جھکاؤ سوشلزم کی طرف فطری تھا۔ ہندوستان کی آزادی اور اس کی تہذیب اور معاشرے کو از سر نو مرتب کرنے کا خیال اسے ایک نئے انداز میں ڈھالنے کا خواب بزرگوں نے بھی دیکھا تھا۔ فیض کے دور میں یہ جذبہ زیادہ ولولہ انگیز تھا۔ مغرب میں جہاں جمہوریتیں قائم تھیں، ایک عام آدمی کی زندگی کو ایک نشیب سے کسی ہموار سطح تک لانا ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ آڈن، اسپینڈر اور ڈے لوئیس کے کلام میں اس احساس کی جھلکیاں موجود رہیں۔ فرانس میں وہی شعرا جن کے نام سوریلی تحریک میں سر فہرست تھے (RESISTANCE MOVEMENT) محاذ مزاحمت کے وقت عام آدمیوں سے اشتراک کے اس قدر قائل ہوگئے تھے۔

کہ سب نے سوشلزم کو اپنا نصب العین مان لیا تھا۔ ان سب ادبی تحریکوں کا رخ اپنے قومی مزاج کے مطابق تھا۔ بنیادی بات یہی ہے کہ کوئی بھی ادبی تحریک اپنے معاشرے کی ہلک، قومی مزاج، خیر و شر کے اس تصور سے جس کی جڑیں کئی صدیوں سے معاشرے میں ہوتی ہیں الگ نہیں ہوتی۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں بنیادی بات اپنی تہذیب اور ثقافت سے متعلق تھی۔ اس کی اول صف میں جو لوگ شامل تھے وہ اپنی پوری روایات سے آگاہ لوگ تھے۔ ان میں سے بیشتر کے سوانح یا ان کی تعلیم و تربیت کے مرحلوں پر جو تحریریں موجود ہیں وہ صاف اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ ہماری تاریخ کے سرچشموں سے محرمانہ واقفیت رکھتے تھے۔ نثر نگاروں میں خواہ خواجہ احمد عباس ہوں، عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری یا پروفیسر احمد علی ہوں یا شعرا میں فیض، مجاز، علی سردار جعفری، ندیم یا مخدوم یا راشد ہوں، ان سب نے ہماری روایات کے غالب عناصر کی روشنی میں اپنی تخلیقات میں دلیری، سخاوت، محبت و شجاعت کو جگہ دی ہے۔ ان کے عہد کی سیاسی فضا اور سماجی تغیرات سے پیوستہ یہ عناصر ادب کا کوئی بھی طالب علم تلاش کر سکتا ہے۔ ایسی تحریکیں تنقید کا ہدف بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی یہ ہوا۔ خود انگلستان میں جہاں بظاہر لکھنے کی بڑی حد تک آزادی ہے۔ نئے شعرا کے کلام سے اس دور کے بزرگ شعرا کے ذہن میں کئی سوالات اٹھے۔ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ بے شک نئے شعرا کے ذہن میں ایک الگ نوع کی کارکردگی ہے۔ بے شک انھوں نے ہمارے سماج کا چہرۂ مستعار نوچ کر پھینک دیا ہے میں (یعنی ایٹس) ان کی شاعری کو ایلیٹ اور خود اپنی شاعری سے زیادہ پسند کرتا ہوں ـــ ایٹس کے اختلاف کی خوبی ان کی بزرگانہ شفقت اور نرم مزاجی میں تھی۔ آگے چل کر انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اسپینڈر یہ کہتے ہیں کہ ایقان کی شاعری کو شخصیت کی شاعری سے برتر سمجھنا چاہیے مگر شاید یہ ایقان جس نے ان کے کلام میں گہرائی اور ہم نفسی کی فضا پیدا کی ہے سیاسی نہیں ہے بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں انسانی دکھوں کی سوچ کے مشکل فن نے انھیں مجبور کیا ہے کہ وہ ایک ایسی منزل تلاش کریں جو روزمرہ کے ہنگاموں سے دور ہو ـــ ایک ایسا خطہ جہاں کسی جن کا افسوں یا کسی محبوبہ کی عشوہ گری بھی نہ ہو، کوئی فردا ہو نہ دوش ہو۔ یہ تفسیر ایٹس کے ایک اپنے خیال کی مثال ہے جس میں نئے شعرا پر کڑی تنقید ہے مگر تحقیر نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ شعرا نے بھی ان مسائل پر غور کیا ہے۔ ایک بار سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے یہ مینی فیسٹو پڑھا اور خواہش ظاہر کی کہ سوشلزم کا لٹریچر وہ پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے کلام میں لینن اور مارکس کے افکار پر اشارات ہیں۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی نے فیض و مجاز کے بعد آنے والے شعرا پر ایک اپنے انداز کی شاعرانہ تنقید کی ہے "گیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس" ـــ ان کا لہجہ ذرا تیز ہو گیا ہے مگر اس سے مراد کوئی تضحیک نہ تھی۔

تحریکوں کی بات ہو رہی ہے تو فرانس کی سوریلی تحریک جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور جو ایک معکوس حقیقت پسندی سے ہی شروع ہوئی تھی وہ بھی ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک ٹیڑھی لکیر ہونے کے علاوہ اس میں ایک تخلیقی رو ضرور تھی ـــ سرریلزم ـــ ریلزم ـــ سے گذر کر ایک اپنا ماورائی تصورِ حقیقت رکھتا تھا۔ سیکڑوں پرفریب تشبیہوں کے ساتھ وارد ہوا اور امیج کی اہمیت وہاں سے چل کر نئی نئی مناسبتوں کے ساتھ عہد حاضر کے اسلوب کی بنیاد بن گئی۔ اس تحریک کے ساتھ ایک عارضی دور گذار کر وہ بے مثال شعرا جو اس کی صفِ اول میں تھے محاذ مزاحمت شامل ہو کر سوشلزم کی طرف آ گئے۔ رد ویغ دی، تو ذرا پہلے پہلے تھے مگر پال ایلوار، لوئی آراگون پال ویلنوس ژاکوب پرورت، آخری دم تک حقیقت پسند رہے، بلکہ ان کی تحریر سے ادب کی مقصدیت کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ پال ایلوار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے جب تمام شعرا سے اپنا حق سمجھ کر اس بات کی وضاحت کر دیں کہ وہ تمام لوگوں کی زندگی سے تعلق کی شرط کو ان سے ایک اشتراک کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اگر اسی نوع کی باتیں ہماری تاریخ کے پس منظر میں کہی گئی ہیں اور جن پر نظر رکھ کر مولوی عبدالحق اور پریم چند جیسے بزرگوں نے ایک دستاویز

پر دستخط کیے تو اسے ایک بہت وسیع سیاسی اور نامیاتی تقاضے کی بنیاد پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کیا وہ سب کچھ جو نثر و نظم میں بے گھر کا حوالہ واقعی نہیں ہے؟ کیا وہ سب باتیں جو سننے میں بُری معلوم ہوتی ہیں ہمارے حالات کا پرتو نہیں ہیں؟ اس برصغیر کی فضا میں جہاں مغربی طرز کی جمہوریت کی تربیت منظم اور غیر منظم سیاسی جماعتیں پا چکی ہیں کیا یہ سب باتیں ان کے سامنے نہیں تھیں؟

بہرکیف ان سب باتوں کی پرکھ کے بعد تان اس سوال پر آکر ٹوٹتی ہے کہ کیا کوئی شاعر، ناول نگار اور نقاد خود اپنی ذات سے کچھ نہیں ہوتا؟ کیا ایک مخصوص مزاج اور شخصیت کے بغیر۔ میر، غالب یا اقبال کا کلام ممکن تھا؟ اس کے جواب کے کئی رخ نہیں ہیں صرف ایک ہے۔ کہ شاعر کی ذات اور اس کی آگہی اپنی تعلیم و تربیت کے بعد اپنے وجدان میں منفرد ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں از خود عدل و انصاف کا اعلیٰ تصور ہی اسے کسی تخلیقی کام کی طرف راغب کرتا ہے مگر ہر نمائندہ کلام تاریخ کے موڑ پر اس دور کے غالب رجحانات سے منسلک پایا جاتا ہے۔ زندگی کا دکھ شاعر کے کلام میں ایک ذاتی دکھ بن جاتا ہے مگر وہ اپنے معاشرے سے پیوستہ رہتا ہے۔ وہ تحریر جو زندہ رہنے کی ایک بڑی مشق میں اپنی ذات کی شمولیت نہ رکھتی ہو یا جسے داناؤں نے اس عہد کے عصری تقاضوں کی حلفی تحریر کہہ کر معیار کا تعین نہ کیا ہو — وہ ادب کی تاریخ میں تو شامل ہو جاتی ہے مگر اس کا فکری حصہ نہیں بن سکتی۔

فیض کا کلام اردو ادب کا ایک لازمی فکری حصہ ہے — اس میں ان کی ذات کی شمولیت کے بغیر تخلیق کا امکان ہی نہیں تھا — خواہ وہ "نقش فریادی" میں چونکا دینے والا مصرع "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" ہو یا غبار ایام کی یہ ابیات ہوں۔ (یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم) جہاں پہ مژدۂ دیدارِ حسن یار تو کیا)۔ (نوید آمد روزِ جزا نہیں آتی) اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ فیض اپنی نفاست طبع کے لحاظ سے ہماری تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان کی شخصیت میں کسی طرح کی شاعرانہ بے راہ روی، فساد یا کج نہیں تھی جسے وہ اپنی ذات کی رنگ آمیزی کے لئے ضروری سمجھتے تھے، وہ کھلے ہوئے نرم مزاج کے آدمی تھے۔ ان کی فکر ان کا سماجی ادراک خود اپنی ذات کے توسط سے کسی برتری یا کمتری کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھا۔ ان کا شعور آگہی کی منزلوں تک گیا تھا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے معاشرے میں ایک ذوقِ سلیم، ایک حسن کاری، سوچ کی ایک رو پیدا کی ہے یہی اس بڑے پیمانے کے اندر جو تخلیقی ادب کا تقاضا ہوتا ہے، شاعر کی ذات کا مقام اعتبار پیدا کرتا ہے۔ ان کا اور ان کے ہم عصروں کا دور ایک مشکل تخلیقی دور تھا جس میں ان کی فکر، عشق، خلوص اور دوستی کے دروازے بھی کھلے اور نئے اسلوب اور لفظیات کے نقش بھی سامنے آئے جن کی ساخت و تعمیر پر بحث جاری ہے۔ زندگی کا ایک پورا تصور سامنے آتا ہے۔ "مئے لالہ فام" کی کشید ایک نازک عمل سے گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

فیض کا اسلوب و لفظیات یا ان کے ہم عصروں کے ان اجزا کا تجزیہ بلکہ اس عصر کے سارے اسالیب و لفظیات کا حلقہ جو اردو کے بڑے مستند شعراء سے اپنی ابتدائی نظموں کے سوا لب و لہجے میں الگ ہو گیا ہے کسی قدر توجہ چاہتا ہے۔ جدید اسلوب اپنے مواد کو سمیٹنے میں نئی ترکیب الفاظ، تشبیہ اور استعاروں کی نئی تلاش سے شروع ہوا — اس کے باوجود کہ وہ ہماری زبان کی ساخت ہی سے اخذ کیا گیا تھا۔ فیض، مجاز اور جاں نثار میں بھی مستند اسالیب کے دائرے میں رہتے ہوئے الفاظ کا برتاؤ دوسرا ہے اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ آخر اس جدید اسلوب کی بنیاد کیا ہے؟ پہلے تو معاشرتی زندگی کی نہج کے بدلنے کا وہ فرق ہے جو نئے سازوسامان، علم کی وسعت اور ضروریات کے باہمی رشتوں سے فکر کے نئے واسطے پیدا کر رہا تھا۔ ان نئے واسطوں کے لئے نظم و

نثر میں ایک اسلوب تلاش کرنا پڑا۔ کسی نے نیا اسلوب پالیا اور کسی نے نہیں پایا۔ اسی دور میں ہیئت کے تجربے بھی ہوتے رہے اور پختہ تر بھی ہوئے۔ دوم یہ کہ ان واسطوں یا توسط سے تصور (CONCEPT) حس (PERCEPTION) اور اصول (PRECEPT) میں تغیر آگیا۔ سوم یہ کہ جدید۔ شعری فکر۔ باہر کے اسالیب اور لفظیات کی روشنی میں نئے مطالبات کے لئے ایک شعوری کاوش میں لگ گئی جس کا ایک حصہ اکتسابی اور دوسرا تخلیقی تھا۔ فیض کے سامنے بھی یہ سارے مسائل تھے۔ اس پر انھوں نے اپنی رائے بھی دی ہے اور اپنے طریقۂ کار کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں ہماری اصناف سخن کی پابندی بھی ہے۔ لفظیات کا برتاؤ بھی وہی ہے۔ "نقش فریادی" کے پہلے اشعار، یا پہلی نظم کا مصرع اول اردو شاعری کے قلب سے ڈھلا ہوا نکلا ہے۔ ع

(خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو)

لیکن کتاب کے حصۂ اول ہی میں لب و لہجے کے بدلنے کی راہ ملتی ہے۔ حصۂ دوم کی پہلی نظم اور اس کا عنوان صاف پتہ دیتا ہے۔ اس میں آرائش بیان کا غلاف نہیں ہے۔ یہ بہت کھرا اور بے تکلف لہجہ ہے (مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ) اس کے بعد فیض کی شعری نفسیات کا یہ تقاضا ہو گیا کہ اس ابتدائی انحراف سے بتدریج خود ایک اپنا اسلوب اور لفظیات کی کارکردگی کی طرف رجوع کریں۔ فن کی یہ ارتقائی نمو دان کے یہاں تین سمتوں میں تقسیم ہوئی (۱) پہلی یہ کہ وہ ہماری روایات شعری سے الگ نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ اس میں عالمی شعری فکر کی کسی حد تک مطابقت ہو۔ (۳) تیسری یہ کہ ان کی لفظیات اور لغت۔ فراہم کردہ مضامین کی محض اشاریت ہو۔ ہماری روایات شعری کی پاسداری میں ان کی فکر اور اسلوب پر جن شعرا کا اثر ہے وہ سودا، غالب، حافظ، نظیری اور کسی قدر اقبال ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ اردو کے دوسرے شعرا خصوصاً حسرت موہانی کا مطالعہ ان کے ہاں نہیں ہے۔ شعرائے بیرون جات میں عہد وکٹوریہ کے اچھے شعرا ٹینی سن، براؤننگ اور اس صدی کی دوسری دہائی سے چوتھی دہائی تک کے فرانسیسی اور انگریزی شعرا ایلیٹ کے عہد سے اوڈن کے عہد تک خصوصاً پال ایلوار، لوئی اراگون اور پال دیسنوس کے مطالعے کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ان کے اسلوب میں اس مطالعے کا اثر جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے نہایت دلفریب اور خود اپنی زبان سے اخذ کیا ہوا ہے۔ ان کے اسلوب میں روانی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ عمیق فکر کے ادا کرنے میں بوجھل ہو جائے وہ اپنی لے بدل لیتے ہیں۔ ان کی نظموں کی ساخت میں پہلا بند اور پہلا مصرع اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ نظم کا سارا رُخ اسی میں آجاتا ہے (۱) مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ (۲) چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز (۳) پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں (۴) بول کہ لب آزاد ہیں تیرے (۵) دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں (۶) یہ رات اس درد کا شجر ہے (۷) گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں۔ وہ اپنی نظموں کی تعمیر میں بہت محتاط فن کار ہیں اور کسی نظم کے آغاز کی اہمیت پر اس اشارے سے اس کی ارتقائی صورت یا تکمیل پر کسی طرح کی بے توجہی نہیں ملتی۔ ان کے اسلوب میں الفاظ کی کفایت، اور نیم گفتہ اشارات بھی موجود ہیں مگر جہاں ان کا اسلوب کھلا ہوا ہے اور لفظیات زیادہ روشن ہیں معاصر کے اکثر شعرا کو بڑی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ ان کے کلام کے اس حصے میں، جو باہر کی شعری فکر کی روشنی میں اسلوب و لفظیات کا ڈھنگ ہے وہ بھی دو طریقوں کا ہے۔ اول "نقش فریادی" کے دوم حصے کی نظمیں۔ اور وقفے وقفے سے دوسری کتابوں کی نظمیں بھی ـــ کسی قدر تنظیم خیال۔ اور تعمیری تصور کے مطابق احتیاط سے کہی ہوئی ہیں۔ معین شدہ خیال اور زبان کے جذباتی پہلو کا اتصال شعوری ہے۔ پوری بات کا نقشہ شاعر کے ذہن میں ہے اور اسی کے مطابق نمو دے (اے دل بے تاب ٹھہر ـــ مشورش بربط و نے) دوسرے طریقۂ کار میں بادلوں کی طرح تیرتی ہوئی شبیہوں کے مختلف ٹکڑے ہیں جن میں غم و نشاط کی کسی حس سے [illegible] ایک برق کی لہر سی دوڑ جاتی ہے اور پورا سلسلۂ تعمیر سامنے آجاتا ہے جیسے ان کی نظم "ملاقات"۔ ان دونوں طریقوں کا

سے ذہن مغرب کی تکنیک کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اور ان کے ہم عصروں نے ہماری شاعری میں اسی طریقے کو برت کر ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ زبان آوری یا نطق کے مشرقی پیرایۂ سخن میں کوئی کمی تھی۔ مگر نئی حسیات کو ایک شبیہ دینا۔ جیسے آنکھیں آہن پوش ہوئیں۔ یہ رات اس درد کا شجر ہے۔ ایک نئی تخلیقی رَو ہے جو ان کے یہاں یک گونہ فصاحت سے موجود ہے۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ وہ خیال اور سماعت دونوں کے لئے لطافت کا باعث ہو بحث تکنیک یا طریقۂ کار ہی پر ہو رہی ہے اور ان کی خوبی یہ ہے کہ اس تکنیک سے تخلیق کردہ ابیات کو انھوں نے اپنی روایات کے اندر ہی سمو لیا۔ ان کے اسلوب میں بھی اجنبیت، گرانی یا ابہام نہیں ہے۔ خوش کلامی کی ایک مثال قائم کرنے میں ہم ان کی غزل اور نظم دونوں پر انحصار کر سکتے ہیں۔ اب یہاں ایک بہت نازک بات بھی آ رہی ہے۔ کوئی ایسا اسلوب جو شاعر کے ذہن اور ذات سے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا صرف اسی کے طریقۂ کار تک رہ گیا ہو، وہ ایک ذاتی اسلوب ہوتا ہے۔ وہ مستند اسالیب کی خصوصیات سے الگ ہوتا ہے۔ ذاتی اسلوب نقل مکانی کے لئے نہیں ہوتا۔ یہ صرف اسی شاعر کے ذہن اور ذات تک رہتا ہے — اور اس اسلوب کی سند اس وقت ملتی ہے جب اس کی فکر نے اس کی تخلیقات کو تاریخ ادب کے نئے باب کی حیثیت سے داخل کیا ہو فیض کے یہاں ان کے چند ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والے دو ایک شعرا میں یہ ذاتی اسلوب موجود ہے — فیض اپنے ذاتی اسلوب اور مستند اسالیب پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔

فیض کے کلام پر اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر یہ اردو ادب کے ایک تازہ فکری افق کی مثال ہے تو اس کی بنیادی فکر میں انسان اور کائنات سے اس کے رشتے کا کون سا زاویہ — وقت اور مقام کا کون سا تصور — مابعد الطبیعیات کے کس مکتبۂ خیال کی رَو ملتی ہے؟ تو اس کا جواب ان کے کلام کی اندرونی شہادت کی بنا پر یہ ہے کہ اس میں فلسفۂ تاریخ کا وہ شعور ہے جو انسان کو مسلسل جبر او ظلم کا ہدف سمجھ کر اسے اس بارگراں کی یاد دلاتا ہے کہ اس کی روحانی زندگی کسی دوسرے پیرائے میں شروع ہو سکے۔ انسان ایک ایسی آزادی کے بغیر محض صفر ہے۔ فیض کسی عمیق اور ادق ذات یا انا کی پیچیدگیوں کی طرف نہیں گئے۔ یہ ان کے عصر کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے سامنے فرد اور معاشرے کی تنظیم میں اس تضاد کو دو کرنا تھا جو سماجی ناہمواری سے پیدا ہو کر، صرف افراد ہی میں یہ فاصلہ نہیں پیدا کر رہا ہے بلکہ ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے پر برتر قرار دے کر آج بھی جنوب و شمال کی مجبت میں الجھا ہوا ہے۔ کسی معاشرے کا ترقی کی سعی نہ کرنا ایک مجہول حرکت ہے۔ اگر کسی برتر معاشرے کا اپنے معاشی وزن سے کسی بھی نحیف معاشرے کو ترقی سے روکنا ایک جرم ہے اسی وجہ سے تاریخ کے کئی بنتے ہوئے باب مسخ شدہ معاشروں اور پسے ہوئے افراد کا حوالہ ہو گئے ہیں۔ اگر انھوں نے اس موضوع کو اہم قرار دیا تو یہ تاریخ کا تقاضا تھا۔ ان کی فکر کی اساس یہی تھی۔

اب رہیں دوسری باتیں جو شاعر کا وصف سمجھی جاتی ہیں جیسے انسانی ہمدردی۔ جذبۂ عشق، محبتیں اور دوستیاں، اور ان صفات کا ادراک تو ان کا کلام تو ان خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ معاشرہ بھی ترقی پذیر ملکوں کے معاشرے کی طرح قدیم و جدید کی بحث میں مبتلا ہے اور یہ بات کہ تقویمی لحاظ سے ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں جس کے دروازے اکیسویں صدی پر کھلنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی پر اثر بات جو "گوش نصیحت نیوش" تک پہنچتی ہے وہ شاعر کا محاورہ ہوتا ہے۔ اور جدید کے حق میں فیصلہ کرنے کی مشورت ان کے کلام کی آبیاری سے نئی نسل تک پہنچ چکی ہے۔ کیا کوئی بالغ نظر دنیا کے تغیرات میں ایسی ہے کہ اس عظیم دور میں جب سائنس کے تجربات گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، بے اثر بیٹھی رہے۔ فیض کی شاعری میں انسان دوستی کی بنا پر جو اشارے ہیں اپنے معاشرے کے احوال پر جو تنقیدیں ہیں۔ وہ جو شاعر کا آخری دکھ ہوتا ہے کہ "شکستِ دل کی صدا کیا ہے" کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔

فلسفہ، نظریات، تاریخ کے اسباب جو کچھ بھی بتاتے ہوں، شاعری کی اصل یہی دکھ ہے خواہ کسی عہد، کسی زبان، کسی معاشرہ میں ہو۔ ان کی آواز عہد جدید کی سب سے زیادہ معتبر آواز تھی۔ ان کی فکر و نظر کا پس منظر جہاں نظریاتی بنیاد رکھتا تھا وہیں تاریخ کے وسیع تر تقاضوں سے بھی وابستہ تھا۔ ان کی شاعری میں ایک ذاتی عنصر، نرم مزاجی، خوش کلامی، دانش و داد کی ایک بصیرت، انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ اگر عصر حاضر کے بعض فکری مسائل پر راشد کے کلام میں ایک ساختہ نغمگی ہے تو ان کے یہاں تازہ تشبیہوں، کفایت الفاظ اور فکر کی سمیٹ ہے کہ دوسروں کے مقابل ان کا اثر دیرپا بھی ہے اور دل گداز بھی۔ کچھ لوگ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ ان قدآوروں کی فہرست میں جس میں میر و سودا، نظیر و انیس، غالب و اقبال آتے ہیں ان کا کیا مقام ہے؟ فکر جدید کی معنویت جو اقبال سے شروع ہوئی تھی، ان تک اور ان کے چند ہم عصروں تک ایک رخ بدل کر لازماً آتی ہے۔ شاعری میں فکر کا یہ سلسلہ تاریخ کے تقاضے سے بدلتی ہوئی سمتوں کا ہے جو تازہ افق پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ان کی فکر میں بالغ نظری، روایت کا پاس اور ایک تازہ نفسی اس نوع کی ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ ان کے کلام میں ہماری شاعری کی ایک ارتقائی منزل آتی ہے۔ ان کی شاعری ہماری تہذیب و تاریخ کی نمائندہ اور اس سے باہر نکل کر عصر حاضر سے وابستگی کی بنا پر۔ زندگی کی تمثیل میں پوری شرکت کی شاعری ہے۔

("شعر جدید کی حدیں" کا ایک باب)

محمود درویش کا ایک پیش لفظ اور چار نظمیں

ترجمہ : محمد کاظم

محمود درویش کی کچھ نظموں کے تراجم میں نے "فنون" کی پچھلی اشاعتوں میں پیش کئے تھے لیکن یہ سلسلہ میری کچھ دوسری مصروفیات کے باعث آگے نہ چل سکا۔ اب یہ پھر سے شروع کیا جا رہا ہے اور اس میں آئندہ عربوں کی جدید شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے رہیں گے۔ آج محمود درویش کے اُس پیش لفظ کا ترجمہ بھی دیا جا رہا ہے جو اس نے اپنے "دیوان" کے پانچویں ایڈیشن (نومبر ۱۹۷۰ء) کے لئے لکھا۔ اس کا یہ "دیوان" اس کی شاعری کے نو مجموعوں کے انتخاب پر مشتمل ہے جو اس نے خود کیا ہے، اور جس کی طرف اس کے پیش لفظ میں اشارہ بھی ملتا ہے۔ ان مجموعوں کا زمانہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۶ء تک ہے، اور اس عرصے میں محمود درویش کے اسلوبِ شعر میں واضح طور پر ایک ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں علامات کا استعمال بڑھتا چلا گیا ہے اور اس کی شاعری میں گہرائی اور ابہام کی کیفیت زیادہ دکھائی دینے لگی ہے۔ آج کی شروع کی تین نظمیں اس کے پہلے مجموعے "اوراق الزیتون" (۱۹۶۴ء) سے لی گئی ہیں جبکہ چوتھی نظم "ڈینیوب نیلا نہیں ہے" اس کے چوتھے مجموعے "العصافیر تموتُ فی الجلیل" (۱۹۷۰ء) سے لی گئی ہے۔ کہتے ہیں دریائے ڈینیوب جب تک صاف ستھرے اور اُجلے ماحول میں بہتا ہے اس کے پانی کا رنگ ہلکا نیلا رہتا ہے لیکن جب اس کا گرد و پیش میلا اور ناصاف ہو جاتا ہے تو اس کا پانی نیلا نہیں رہتا، سب کچھ مکدر ہو جاتا ہے۔ لورکا اور ڈینیوب کی نظموں میں چند ایک مصرعے ایسے ہیں جن کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں۔ میں نے ان کا ترجمہ اپنی تعبیر کے مطابق کیا ہے۔ کوئی دوسرا ان کا ترجمہ اپنی تعبیر کے مطابق بھی کر سکتا ہے۔

محمد کاظم

پیش لفظ

کوئی ایسی نئی بات تو میرے ذہن میں نہیں ہے جو میں اِس ایڈیشن کے پیش لفظ میں کہنا چاہوں، سوائے اس کے کہ میں اس مسرت کا اظہار کروں جس کا سرچشمہ میرے وہ بے نام قاری ہیں جو ایک غیبی تائید بن کر میرے اندر لکھنے کی ایک نئی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ میں یہ پوری طرح سمجھ نہیں سکا کہ کوئی نظم لوگوں کے وجدان میں کیوں کر اپنی جگہ بنا لیتی ہے، چاہے خود شاعر کسی بھی طرح اپنی اُس نظم سے دور جا چکا ہو۔ دوسری طرف کسی شعری تخلیق کا لوگوں کے لئے مبہم رہ جانا لکھنے کی ایسی کوششوں کا دوسرا نام ہے جن میں ہم ابلاغ کی شرائط پوری نہیں کر پاتے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شاعر کے مقبول ہونے کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں ابلاغ ہو گا، لیکن اس کا ابہام اور اجنبی پن مقصود بھی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں شعر کبھی کبھی ضائع ہو جاتا ہے —— اور کبھی ضائع نہیں بھی ہوتا۔

اب میں اپنے اُن بے نام قارئین سے کن الفاظ میں خطاب کروں، جو اس بات کی دلیل فراہم کئے دیتے ہیں کہ میری بعض شاعری

بھی ضائع نہیں ہوگی۔ ان کے اس رویے پر خوشی کا اظہار اسی صورت میں اہم ہو سکتا ہے کہ جب اس سے میرے اسلوب میں کوئی نئی بات پیدا ہو۔ چنانچہ میرے یہ قاری ہی دراصل میرے شعری سرمائے کے اس پانچویں ایڈیشن کی اشاعت کے ذمے دار ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو مجھے اپنے تجربات کا محاکمہ کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں اور مجھے یہ ادراک ہوتا ہے کہ ایک شاعر تاثیر سے کبھی دامن نہیں بچا سکتا کہ وہی تو عرضِ ہنر کے فائدے کا محسوس معیار ہوتی ہے۔

مجھے اور کیا کہنا ہے؟ ——— میرے خیال میں میں وہ باتیں دُہرانا چاہتا ہوں جو میں نے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت کہی تھیں، اور وہ یہ کہ "میں اپنے شاعرانہ لڑکپن سے شرمندہ نہیں ہوں لیکن لڑکپن ایک چیز ہے اور بلوغت دوسری چیز!" اور یہ واحد جواز ہے میرے اس اقدام کا کہ میں نے اپنے شاعرانہ جسم کے کچھ اجزا کاٹ کر پھینک دیئے ہیں۔ شاعر جب تک زندہ ہے اس کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے کلام پر نگاہ رکھے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ شاعر جو کچھ بھی کہہ دے وہ ایک دستاویز ہوتی ہے۔ ایک شاعر سے بہت سی حماقتیں بھی سرزد ہوتی ہیں، اور اس کے نصیب میں نشوونما کا جتنا امکان ہوتا ہے اتنا ہی اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے نمو و ارتقاء کو نگاہ میں رکھے۔ اُس کی اِس خواہش کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ جن چیزوں کو اس نے باقی رکھنے کے لئے چُنا ہے وہ ان پر نازاں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے اس منتخب کلام کے لئے اسے یہ منظور ہے کہ وہ لوگوں کی تنقید اور اظہار رائے کے لئے ان کے سامنے رہے۔ شاعر کا مکمل کلام تو اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے یا اس کا تخلیقی سوتا خشک ہو جاتا ہے اور شاعر کی یہ کوشش کہ اپنا مکمل کلام شائع کردے، اپنے تخلیقی بڑھاپے کے احساس کی ایک صورت ہو سکتی ہے ———

تاہم بعض ناشرین فن کے معاملے میں کمزور احساس کے مالک ہوتے ہیں، اور دوسری طرف بعض شعراء میں جھوٹی بقا کے معاملے میں شدید حساسیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ جلدیں جو شعراء کا مکمل کلام سموئے ہوئے ہوتی ہیں، ان کے لئے ایک سجا سجایا تابوت ثابت ہوتی ہیں ——— تو کیا آج میں بھی اپنے تابوت کی مدافعت میں کچھ کہنے چلا ہوں؟ نہیں، دراصل انہوں نے میرا وہ تابوت اس وقت تیار کیا جب میں یہاں سے دور تھا۔ میں اپنے اُس قدیم تابوت پر اپنا اعتراض اسی طرح ظاہر کر سکتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اپنا یہ نیا اور تراشیدہ تابوت پیش کروں!"

محمود درویش

وہ کفن میں لپٹا...... واپس آیا

ہمارے وطن میں لوگ حکایت کرتے ہیں
غم داندوہ کے لہجے میں
میرے ایک ساتھی کے بارے میں جو گھر سے باہر گیا تھا
اور کفن میں لپٹا ہوا واپس آیا
اُس کا نام تھا....
اُس کا نام کیا لینا
اس لفظ کو ہوا میں
داغ کی طرح تحلیل نہ ہونے دو
اسے ایک رِستا ہوا زخم ہی رہنے دو
جو منت کش مرہم نہ ہوگا
میں ڈرتا ہوں دوستو! .... ڈرتا ہوں اے یتیمو!
میں ڈرتا ہوں کہ ناموں کے ہجوم میں ہم اُسے
کہیں بھول نہ جائیں
میں ڈرتا ہوں کہ ہمارے دلوں پر لگے زخم
کہیں سو نہ جائیں
میں ڈرتا ہوں!

. . . .

میرے وطن میں لوگ میرے ساتھی کا بہت ذکر کرتے ہیں
گولیوں کے آتشیں زخم اس کے چہرے پر تھے
اور اس کے سینے پر!
یہ سب کیوں کر ہوا؟ اب اس تفصیل میں کیا پڑنا
میں نے بھی اس کے زخم دیکھے تھے
اور ان کی گہرائیوں میں دُور جھانکا تھا
"میرا دل بچوں کی طرف لگا ہے"

ماں چارپائی پر اپنے بازو پھیلائے کہتی تھی
دور جانے والے اس شخص کے دوستو!
یہ نہ پوچھو، وہ کب آئے گا؟
زیادہ سوال نہ کرو
بلکہ یہ پوچھو کہ کب
مردانِ قوم جاگیں گے؟!

شاعری کے بارے میں

کل ہم نے گیت گائے ایک ستارے کے جو بادل کے اُس
پار تھا،
اور نالہ و شیون میں ڈوب گئے
کل ہم نے ملامت کی چرخِ دولابی کو، اور چاند کو
اور راتوں کو..... اور تقدیر کو
اور ہم نے مہ وشوں سے اظہارِ الفت کیا
جب گھڑیال بجا، تو خیام نشے میں چور تھا
اور اس کے گیتوں کی مخموری پر
ہم بے نصیب ہو کے رہ گئے۔

... ...

میرے ساتھی شاعرو!
ہم ایک نئی دنیا میں ہیں
جو گذر گیا وہ فنا ہوا، آج جو بھی کوئی نظم کہتا ہے
ایٹم اور بادِ سموم کے اس زمانے میں
وہ پیامبر تخلیق کرتا ہے

-۲-

ہماری نظمیں بے رنگ ہیں
بے ذائقہ ... بے آواز
گر وہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک
روشنی لے کے نہیں جاتیں!

اور اگر خلقِ خدا ان کے معانی نہیں سمجھ پاتی
تو بہتر ہے ہم انھیں ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں بکھیر دیں
اور اپنے تئیں خاموشی کے حوالے کر دیں

-۳-

کاش یہ اشعار
ایک محنت کش کے ہاتھ کی چھینی ہوتے
یا ایک مجاہد کے ہاتھ میں بارودی گولہ
کاش یہ اشعار!

... ...

کاش یہ الفاظ
ایک کسان کے آگے چلنے والا ہل ہوتے
اور تن کا کپڑا، یا گھر کی چوکھٹ، یا صندوق کی چابی
کاش یہ الفاظ!

... ...

ایک شاعر کہتا ہے
اگر میرے شعر میرے دوستوں کو خوشی پہنچاتے ہیں
اور میرے اعداء کا دل جلاتے ہیں
تو میں شاعر ہوں
اور میں ـــــ شعر کہتا رہوں گا

لورکا

یہ لہو کا بھول معاف کرنا، اے لورکا
کہ تیرے ہاتھ میں تو سورج تھا
اور ایک صلیب جس نے شعلۂ سخن کی ردا پہنی تھی
کتنے اچھے تھے رات کے وہ سوار ... جو تمہاری یاترا کو آئے
ایک شہید مرد اور ایک شہید عورت کو لئے ہوئے!

شاعر اسی طرح ہوتا ہے
ایک بھونچال، اور ہوا اور موجوں کا طوفان ... اگر وہ گرج اُٹھے
ایک گلی دوسری گلی کے کان میں کہتی ہے "یہاں اس کے قدم پڑے تھے
بس اے سنگریزو، اُڑو اور اس کے پیچھے جاؤ"۔

شاعر اسی طرح ہوتا ہے
موسیقی اور دُعا کا سریلا لحن
اور نسیم کا جھونکا .. اگر وہ دھیمے لہجے میں بات کرے
وہ ایک حسینہ کا ہاتھ، لوہی ملائمت کے ساتھ تھامتا ہے
اور اگر وہ جلوس کرے، تو چاند اُس کا نشیمن ہوتے ہیں!

ہسپانیہ بڑی بدنصیب ماں ثابت ہوئی
اس نے اپنے کندھوں پر بال پھیلا دئے
اور کالی شام کے زیتون کی شاخوں پر
اپنی تلواریں لٹکا دیں

گیٹار نواز رات کو گلیوں کا پھیرا لگاتا ہے
اور چھپ چھپ کے گاتا ہے
اور تمہارے شعروں سے اے لورکا!
وہ شکستہ حال لوگوں کی نگاہوں کی خیرات جمع کرتا ہے

ہسپانیہ میں کالی آنکھیں ہر شے کو شبے کی نظر سے دیکھتی ہیں
اور محبت کا سخن گنگ ہے
شاعر، اگر کبھی بول پڑے تو
اپنی ہتھیلیوں میں قبر کھودتا ہے

بھولنے والے تمہارے لہو کی روشنی میں چلنا بھول گئے
تو چاند کی مسکراہٹیں بھی خون میں نہا گئیں
سب سے عالی نسب تلوار ... تمہاری زبان سے نکلا ہوا لفظ تھا
خانہ بدوشوں کے گیتوں[1] سے مستعار!

میڈرڈ کی آخری خبر یہ ہے کہ زخم بالآخر بول اُٹھے
کہ صبر کرنے والوں کا صبر اب چھلک جانے کو ہے
غولیاں کو انھوں نے رات کی تاریکی میں فنا کے گھاٹ اتارا،
اور سنترے کے پھول
بدستور اپنی مہک بکھیرتے رہے

میڈرڈ کی سب سے اچھی خبر غالباً وہ ہوگی
جو کل آئے گی!

ڈینیوب نیلا نہیں ہے

وہ اُس کو نہیں جانتی تھی
اور زماں
اس کے جسمِ بے جاں میں دریا کی مانند ٹھہرا ہوا تھا
وہ اُس سے کہنے لگی

---

[1] اشارہ ہے لورکا کے GYPSY BALLADS کی طرف

میرے ہاں مکاں[1] ہے

وہ دن بہت گرم تھا
اور دو نو پیار کرنے والے
ازلی تقویم سے مہ و سال کا حساب مانگتے تھے
جس میں گذرا ہوا کل بھی تھا
اور حال بھی!

وہ اسے نہیں جانتی تھی
لوگوں نے اس سے کہا: وہ دریا کی موج کے ساتھ تیرے گا
جو بحرِ روم آتی ہے
اور وہ جڑواں وجود تھے
دریا کے دو کنارے ... ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
یا ایک جگہ رُکے ہوئے
بنا ایک دوسرے کو جانے

وہ دن ایک کھیت کی طرح تھا
جس میں پژمردگی اور دردمندی تھی
وہ دونو ایک دوسرے کے قریب تھے
اور موت انھیں مارے دے رہی تھی
مگر وہ مل نہ پا رہے تھے

وہ اس کو نہیں جانتی وہ کون تھا
لیکن وہ اسے یوں اپنے اندر جذب کئے دے رہی تھی
جیسے وقت کی ریت پانی کو
ہجرت کے دو سال بعد
ہجرت ہی میں
وہ دونو مر گئے
بم کے پہلے ہی دھاکے میں
اور اس کے تنِ مردہ میں زماں
دریا کی مانند رکا ہوا تھا
وہ اس سے کہہ رہی تھی
میرے ہاں مکاں ہے

---

[1] اس نظم میں زماں اور مکاں انگریزی کے TIME اور SPACE کی مناسبت سے استعمال ہوئے لگتے ہیں۔

انڈالوجی —— (۲)

رشید ملک

۲- وید بحیثیت تاریخی مآخذ

انڈالوجی کی یہ عظیم الشان عمارت چار ستونوں پر کھڑی ہے :

۱- (و) لسانیات

(ب) وید اور ان سے ملحقہ ادب۔

(۱) براہمن (۲) آرنیاکہ (۳) اپنشد

(ج) دو عظیم الشان رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت

(د) دھرم شاستر اور سنسکرت کا ادب

۲- علم الاساطیر

۳- آریائیت اور اس سے متعلقہ مسائل

۴- علم الآثار

انڈالوجی کے ان چار شعبوں میں مرکزی حیثیت ویدوں اور ان سے ملحقہ مذہبی ادب ہی کو حاصل ہے۔ البتہ علم الآثار اپنا وجود علیحدہ رکھتا ہے اور باقی تینوں شعبوں سے اخذ کردہ نتائج کی نفی یا اثبات کرتا ہے۔ ان امور کے پیش نظر ویدوں کا ایک انتہائی مختصر تعارف ضروری ہے۔ یہ مرحلہ بڑا کٹھن ہے۔ اس موضوع پر پچھلے دو سو سالوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی انڈالوجی کے بڑے بڑے عالم ویدوں پر مسلسل اور متواتر لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں اور اب ہمارے ہاں بھی ویدوں سے، بالخصوص رگ وید سے استشہاد، استناد اور استنباط کا بے دریغ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اور روز تیز سے تیز تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے رگ وید کے ایک انتہائی مختصر تعارف کے بعد یہ دیکھیں کہ اس کی حیثیت بطور ایک تاریخی مآخذ کے کیا ہے۔

وید (علم) تعداد میں چار ہیں اور ان کی ترتیب زمانی یہ ہے :

رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید

کچھ لوگ اس کی ترتیب زمانی یوں بتاتے ہیں۔

رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید۔

ہمارے لیے ترتیب کا مسئلہ اہم نہیں ہے کیونکہ مندرجہ ذیل سطور میں توجہ کا مرکز رگ وید ہی ہوگا۔ ایک تو اختصار کے پیش نظر اور دوسرے رگ وید پر ملاحظات دوسرے ویدوں پر بھی آسانی سے منطبق ہو جاتے ہیں۔

رگ وید کے بارے میں میکس میولر کہتا ہے :۔

"وید سے زیادہ اکتا دینے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ آریائی بولنے والوں کا یہ پہلا لفظ ہے تو اس سے زیادہ دلچسپ بھی کیا ہو سکتا ہے؟

وید میں دوہری کشش ہے۔ اس کا تعلق تاریخ عالم سے ہے اور تاریخ ہند سے بھی ہے۔ جب تک انسان اپنی تاریخ میں دلچسپی لیتا رہے گا اور جب تک ہم اپنے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں ماضی کے نشانات محفوظ کرتے رہیں گے، کتابوں کی لمبی قطار میں، جن میں نوع انسان کی آریائی شاخ کا ریکارڈ ہوگا، پہلی جگہ رگ وید ہی کو ملے گی۔

(گرفتھ: ۱۹۷۶: ۱، ترجمہ راقم الحروف)

رگ وید اولین اور اہم ترین وید ہے۔ ۱۹۰۷ء تک اسے آریائی بولنے والے قبائل کی اولین دستاویز قرار دیا جاتا تھا۔ اس کتاب کے دس منڈل (دائرے، حصے) ہیں۔ اس کی نظموں کی تعداد ۱۰۱۷ ہے اور اگر اس میں وہ گیارہ نظمیں بھی شامل کر لی جائیں جو وال کھیلیہ کہلاتی ہیں، جو آٹھویں منڈل کے آخر میں ملحق ہیں تو نظموں کی تعداد ۱۰۲۸ ہو جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کی تعداد ۱۵۳۸۲۶ ہے۔ (رگ وید کی سمہتا (مجموعہ) کے ساتھ ملحق براہمن، آرنیاکہ اور اپنشد ان اعداد میں شامل نہیں ہیں)

کسی زمانے میں اس کے اکیس مختلف متن تھے جو اکیس شاکھاؤں (شاخوں، مکاتب) کے طور پر مروج تھے۔ ہم تک صرف یہ چار متن پہنچے ہیں:

۱۔ شاکلا۔ جو آج کل مروجہ متن ہے۔ گھوش کے خیال میں یہ اس متن کی بیشتر یہ ترتیب ہے۔ [موجمدار (ایڈیٹر) ۲۳۷]

۲۔ وش کلا، (بھا شاکلا) اس میں کچھ ایسی نظمیں شامل ہیں جن کے مصنفین کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غیر آریا تھے۔

۳۔ اشوالائینا۔ اس میں مذکورہ گیارہ وال کھیلیہ نظمیں شامل ہیں۔

۴۔ شانکھیانہ: یہ مکتب ان گیارہ نظموں میں سے کچھ کو قبول کرتا ہے اور باقیوں کو نہیں۔

پانچواں مکتب یا شاکھا، منڈوکیا ہے۔ اس کا متن دیگر متون کی طرح ہم تک پہنچ نہیں پایا۔ (واکر II : ۲۹۵)

ایک عالم کا خیال ہے کہ ان مکاتب کے متون کے کچھ ٹکڑے تو مستند متن میں موجود ہیں لیکن بیشتر ضائع ہو چکے ہیں۔ مستند متن ۳۰۰ ق م میں تیار ہوا۔ پسالکر کے مطابق اس میں ساری نظمیں شامل نہیں ہیں۔ [موجمدار (ایڈیٹر) ۲۴۱]

مستند متن بھی اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی تک اس مجموعے کی تقدیس کے پیش نظر ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے۔ یہ ساری مناجاتیں نسل در نسل زبانی منتقل ہوتی رہیں اور ان کو یاد کرنے کے شدید ضابطے تیار کئے گئے تاکہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہے (ڈانیلو: پہلا لیکچر) تاہم شاکھاؤں کی اولین بنیاد ان مناجات کے لحن پر رکھی گئی اور اس میں باوجود مستند تحریری متن کے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن یہ اختلافات وسیع ہوتے چلے گئے اور گانے کے ساتھ ساتھ یہ رگ وید کو پڑھنے، اس کی مناجات کی ترتیب، اس کے الفاظ، تشریح و تفسیر و تاویل پر بھی چھا گئے۔ ویدک کے الفاظ کے آہستہ آہستہ متروک ہو جانے کے عمل سے یہ اختلافات مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ مختلف علما یا خاندان ان شاکھاؤں کے بانی تھے۔

رگ وید کو اور دوسرے ویدوں کو بھی الہامی کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنسکرت میں ان سمہتاؤں کو شروتی (سنی ہوئی) کہا گیا ہے مطلب یہ کہ موجود تو یہ ازل سے ہی تھے لیکن مختلف مصنفوں نے انہیں دیکھ کر یا سن کر حاصل کیا۔ ایسے مصنفوں کو رشی (دیکھنے والا) کہا جاتا ہے۔ رگ وید کی مناجاتیں کئی رشیوں سے منسوب ہیں۔ ان میں براہمنوں اور کشتریوں کے علاوہ شودر مثلاً دگھا تماس، جمدگنی، کاکیوت

کانوا، نراسا دا ایسو، وا ما دیو، وشومتر وغیرہ شامل ہیں۔

رگ وید کے رشیوں میں خواتین بھی شامل ہیں جن میں چند نام یہ ہیں:

۱۔ رومو سا	مناجات نمبر	۱۰۱۲۶۰۷
۲۔ لوپا مدرا	مناجات نمبر	۱۰۱۷۹] (گرفتھ۔ ملحق ۱)
۳۔ ساشوتی	مناجات نمبر	۱۰۳۴ viii (صرف ایک شعر نمبر ۳۴)

جو اس نے اپنے شوہر کی مردمی کے لوٹ آنے پر کہا۔ (گرفتھ ۶، ۱۵ : ۳۹۰)

۴۔ گھوشا	مناجات نمبر	۳۹ × (واکر [ا] : ۵۵۹)

ان کے علاوہ بھی کئی اور خواتین کے نام ملتے ہیں:

رگ وید کی تشریح، تعبیر، تفسیر اور تاویل کے لیے کئی مکاتب فکر وجود میں آئے لیکن مندرجہ ذیل چار مکتب نہایت اہم ہیں:

۱۔ نائیروکت یعنی فطرت پرست

۲۔ اتہاسک : تاریخی

۳۔ یجنک : رسوماتی

۴۔ اکھیاتک : اساطیری (بدھ پرکاش : ۲۵)

یہ چاروں مکتب آج بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں نائیروکت اہم ترین ہے۔ یاسک (۵۰۰ ق م) اس کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے اپنے سات پیشرو تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس کا اہم ترین پیروکار سائین (۸۷ - ۱۳۲۰ء) تھا

علم الاساطیر کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکھیاتک مکتب بھی اب اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس علم پر مبنی ویدوں کی اساطیر کے نئے نئے معنی اب سامنے آنے لگے ہیں۔

شعبۂ آثار کی ترقی کی وجہ سے اتہاسک مکتب کو بھی تقویت مل رہی ہے۔ آریائی مسئلے کی پیدائش کے ساتھ ہی اے کوہن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آثارِ قدیمہ کو اگر ہم مذہبی کتب کی روشنی میں دیکھیں تو ہم یقیناً تاریخی حقائق کے زیادہ قریب ہو سکیں گے اور آثار کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے (ERE، ۲ : ۱۲)۔ کوہن ماہر لسانیات عالم اور علم الاساطیر کے تقابلی مطالعہ کا بانی تھا۔ علم الآثار سے وہ صرف تائیدی شہادت کا متمنی تھا۔ اس کے نزدیک آثار کی شہادت وقیع تھی لیکن ہمارے ہاں معاملہ اُلٹ ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی اور اساطیری شہادتیں زیادہ وقیع ہیں اور آثاری شہادت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وجہ سے انڈالوجی کے مسائل، خصوصاً نسلی معاملے اور آریائی زبان بولنے والے قبائل سے متعلق مسائل بہت الجھ گئے ہیں۔

رگ وید کے مکاتب کی بحث میں سب سے زیادہ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ انڈالوجی کی بنیاد آثارِ قدیمہ کے علاوہ مذہبی ادب خصوصاً رگ وید پر قائم ہے۔ رگ وید کے مکاتب کے ہر مفکر نے اس کتاب کو اپنے مخصوص زاویے سے دیکھا۔ علم لسانیات کے ماہرین نے اس کی زبان سے استنباط کیا۔ ماہرینِ تاریخ و ثقافت نے رگ وید کی مناجاتوں میں تاریخی واقعات اور انقلابات کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ ماہرینِ علم الاساطیر بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ہمارے ہاں کے مصنفین بھی ایسی تعبیروں میں مصروف ہیں۔ کئی دانشور اس کتاب کے بیان کردہ اساطیر کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کو تاریخ سمجھ کر اس زمانے کی تاریخ اور معاشرے کے خدوخال متعین کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ کئی حکماء نے اپنے مخصوص خیالات و نظریات کی فکری اساس اسی کتاب میں تلاش کی ہے۔ یہ سب کوششیں اکثر متضاد نتائج مرتب کرتی نظر آتی ہیں

جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے بارے میں واحد دستاویزی شہادت (رگ وید) سے متعلق کئی امور تصفیہ طلب ہیں۔ ان متضاد نتائج سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ تحقیق کا مطالبہ کتنا صحیح ہے کہ صرف لسانیاتی شہادت حتمی اور فیصلہ کن اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تائید کسی اور ذریعے سے خصوصاً آثار سے نہ ہو۔ انڈالوجی کے اکثر معاملات میں آثار کی شہادت قطعی ہے بشرطیکہ تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے۔

رگ وید کی زبان ویدک یا قدیم سنسکرت ہے۔ جس کے سمجھنے والے بہت کم تھے اور اب بھی بہت کم ہیں۔ چنانچہ رگ وید سے شہادت لیتے وقت اس کی زبان اور اس کا ابہام اور اس کتاب سے متعلق دیگر امور جن کی نشاندہی اس موضوع کے متخصصین اس صدی میں بار بار کر چکے ہیں، پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

یہ احساس بہت پرانا تھا کہ وید اپنے مفاہیم کھو رہا ہے، اس کے الفاظ متروک ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مناجاتوں کا سیاق و سباق پڑھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے چنانچہ اس بات کے تدارک کے لیے علم نائیروکت (صرف) وجود میں آیا جس کا اولین مقصد ویدوں کے قدیم الفاظ کے مادوں کی تلاش، ان سے اشتقاق، ان کا جدید و قدیم استعمال اور ان کے پرانے اور نئے مفاہیم کا تعین تھا۔ اس علم کو ویدوں کی تعلیم سے ملحق کر دیا گیا اور یہ ویدانگ یعنی ویدوں کا ایک انگ (حصہ) کہلایا۔ اس علم کی بنیاد نگھانتوؤں (فرہنگوں) پر تھی جو ویدوں کے متروک اور مبہم الفاظ پر ان کے مترادفات، جو ان کے ظاہری اور باطنی مفاہیم پر مبنی تھے، مشتمل تھے۔ چوتھی صدی ق م کے آخر تک ایسے پانچ نگھانتوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے ان کے ساتھ ہی انوکرمنیوں (انوکرمنی: قدموں کا شمار) کا سلسلہ چلا جن میں ویدوں کی مناجاتوں کی فہرستیں مرتب ہوئیں اور ان کے الفاظ اور اشعار کا شمار بھی درج ہونا شروع ہوا تاکہ ویدوں کے الفاظ ادھر سے ادھر بھٹک نہ جائیں اور الحاقی عناصر اور تحریف کے عمل کا، جو کافی عرصہ پہلے سے شروع ہو چکا تھا خاطر خواہ سد باب ہو جائے۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ یاسک (تقریباً ۵۰۰ ق م) اس علم کے اماموں میں سے تھا۔ اس نے کتاب "نائیروکت" تصنیف کی جس میں اس نے اپنے پندرہ پیشروؤں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نائیروکت کے خطوط پر ویدوں کی خدمت میں عمریں صرف کر دیں۔ ان میں ایک شخص کا نام شاکلیا تھا۔ وہ ایک ماہر نحوی، دینیات اور علم صرف کا عالم تھا۔ اسے علم نائیروکت کا بانی خیال کیا جاتا ہے "وِدو ید متر" اور "دیو متر" کے سے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرے عالم کا نام شاکپونی تھا۔ اس نے رگ وید کے کچھ حصوں کی تدوین کی اور ان کا فرہنگ تیار کیا۔ تیسرا مشہور عالم کونسا تھا۔ وہ ایک غیر مقلد فاضل تھا۔ اس نے دانشگاف الفاظ میں علم نائیروکت کو لاحاصل قرار دیا اور اعلان کیا کہ ویدوں کی تمام مناجات مبہم، بے معنی، بے ربط اور باہمی تضاد سے پُر اور جھوٹی ہیں۔ یاسک کی کتاب "نائیروکت" اس علم میں ایک سنگ میل ہے۔ اس میں تمام مبہم اور متروک الفاظ کے تذکرے کے علاوہ ان کے مادوں، مترادفات، مشتقات کی تلاش بھی کی گئی اور ان کے معانی کے تعین کی کوشش بھی کی گئی۔ یاسک نے صرف چند مناجات کی تشریح کی ہے اور ان کے الفاظ کے معنی، متبادلات و مترادفات کی نشاندہی بھی کی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اسی علم کا ایک اور متخصص سائین (۱۳۲۰-۸۷ء) تھا۔ اس کی مشہور کتاب "ویدارتھ پرکاش" ہے۔ اس میں سائین نے ہر لفظ کی تشریح دی ہے اور کئی جگہ یاسک سے اختلاف بھی کیا ہے۔ فی زمانہ ویدوں کی تشریح و تفسیر و تاویل کے لیے اس کی "ویدارتھ پرکاش" ہی نقطۂ آغاز ہے۔ میکس میولر نے اپنے کام کی بنیاد اسی کتاب پر رکھی تھی۔ دیگر حکما اولڈن برگ، پیری بلوم فیلڈ اور میور بھی اس کے پیرو کار ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ـــ یعنی نگھانتوؤں، انوکرمنیوں اور نائیروکتوں اور

ان کے عالموں کے باوجود ــــ نہ یاسک اور نہ ہی سائین ویدوں کے ابہام کو اور ان کی مناجاتوں کے اغلاق کو زائل کر سکے۔

علم نا ئیروکت کے ساتھ ویدک لوگوں کے چھ مکاتب فکر (فلسفہ) میں سے ایک نے یعنی ممانسا درشن نے بھی بڑی حد تک یہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد کر لی تھی کہ وہ ویدوں کو ترمیم و تنسیخ و تحریف کے خوفناک عمل سے محفوظ کرے اور جہاں تک ممکن ہو ویدوں کی اصلی حالت کو وقت کے ہاتھوں سے بچا سکے۔

فلسفے کے اس مکتب نے جس کا بانی جیمینی (۲۰۰ ق م تقریباً) تھا، ویدوں کی اساس قائم کی۔ اس فلسفے کی رو سے وید ازلی ابدی ہیں نہ یہ خالق ہیں اور نہ یہ مخلوق، نہ یہ حادث ہیں اور نہ ہی قدیم اور نہ ہی انھیں خارجی سہارے کی ضرورت ہے (اس لیے ان کی نظر میں خدا کا تصور بے معنی ہے) ممانسا درشن کا مقصد ویدوں کے متون کو محفوظ کرنا تھا اور مختلف متون کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں تحقیق کرنا تھا۔ اس لیے اسے ویدوں کی تفسیر و تحقیق کا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ اس فلسفے کے پیروکاروں کے لیے یہ تحقیق و تفحص اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ ویدوں کے منتروں کا موثر ہونا اس بات پر منحصر تھا کہ وہ صحیح طور پر پڑھے جائیں اور ایک ایک لفظ صحیح طور پر ادا ہو۔ ممانسا فکر کے مقاصد یہ تھے

۱۔ ویدوں اور صحائف کی تفسیر کے لیے قواعد مرتب کرنا۔

۲۔ ویدوں کے مبہم اور ناقابل فہم منتروں کی وضاحت کرنا اور

۳۔ ان مشکوک مبہم اور ناقابل فہم منتروں کی تشریح کے لیے قانون وضع کرنا۔ (داکرII: ۲: ۴۔ مجیب ۲۳۔ زمر ۵: ۶۰۔ چٹوپادھیائے: ۵۱ داس گپتا بھی ممانسا مکتب کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے [باشم (ایڈیٹر) ۱۹۷۵: ۱۱۴]

ویدوں کے ابہام کو دور کرنے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ موجودہ دور کے حکما بھی اس ابہام کو تسلیم کرتے ہیں۔ آج شاید ہی کوئی ایسا عالم ہو جو ویدوں پر حاوی ہونے کا یا ان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کر سکے۔

حکما ابھی تک اس کتاب کی تصنیف کی تاریخ کا تعین نہیں کر سکے۔ اس بارے میں جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تخمینے یا اندازے سے بڑھ کر نہیں۔ صرف اس کی زبان کو بنیاد بنا کر جو تاریخیں بتائی جاتی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔ تلک کے خیال میں رگ وید کا زمانہ ۵۰۰۰ ق م ہے۔ جیکوبی اس کی تاریخ ۴۰۰۰ ق م بتاتا ہے۔ ویبر کے خیال میں اس کتاب کا تعلق ۲۰۰۰ ق م سے ہے جب یہ آریائی زبان بولنے والے قبائل پنجاب میں اپنے پاؤں جما چکے تھے۔ کولبروک اس کتاب کی تاریخ کچھ ہزار سال پہلے مقرر کرتا ہے لیکن میکس میولر کہتا ہے کہ یہ ۱۲۰۰ ق م میں وجود میں آئی۔ میکڈانل کا بھی یہی خیال ہے۔ ان امور سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہ سب اندازے ہیں جو رگ وید کی اندرونی شہادت یعنی زبان کی بنا پر لگائے گئے ہیں۔ (میکڈانل: ۱۱، ۱۲) اور ان کو کوئی خارجی تائید حاصل نہیں ہے۔ بیا غاز کوئی کا کتبہ پروفیسر ہیوگو ونکلر نے ۱۹۰۷ء میں دریافت کیا تھا۔ حکما کی رائے ہے کہ یہ عہد نامہ ۱۴۰۰ ق م کے قریب وجود میں آیا۔ اور اگر ایسا ہے تو میکس میولر کا وہ بیان کہ رگ وید آریائی زبان بولنے والے کا اولین لفظ ہے اور جو ہم اوپر درج کر آئے ہیں محل نظر ٹھہرتا ہے۔

کچھ محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ لسانی بنا پر تو اس کتاب کی تاریخ ۱۰۰۰ ق م ٹھہرتی ہے لیکن نفس مضمون کے اعتبار سے کئی نظمیں بہت پرانی ہیں اور کچھ نظمیں بہت بعد کی ہیں۔ (میکڈانل اور کیتھ I: viii)

اس کتاب کی تاریخ کا اندازہ لگاتے وقت یہ امر ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس کی نظموں کی تعداد ۱۰۱۷ یا ۱۰۲۸ ہے۔ یہ ساری نظمیں ایک جگہ یا ایک ہی وقت پر تصنیف نہیں ہو سکتیں۔ مختلف رشیوں اور خاندانوں نے انھیں مختلف وقتوں

پر نظم کیا ہوگا اور یہ خاصا عرصہ طویل اور صدیوں میں ہونا چاہیے (رالپسن: ۲۷ – ڈاسن: ۱× اور ۳۴۵) نہ کہ برسوں پر۔ جس طرح آج کل ہم کسی کتاب کی تاریخ کا تعین کرتے ہیں اس طرح ہم اس کتاب کی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے۔ کوئی ایک سال یا ایک صدی اس کی تصنیف کا زمانہ قرار دے دینا عاقبت نااندیشی کو دعوت دینا ہے اور کئی اندالوجسٹ اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ فی زمانہ جو تاریخیں اس کے بارے میں مروج ہیں وہ محض سہولت اور ذہنی سہل انگاری کی بنیاد پر تعین کی گئی ہیں۔ تازہ رائے کے مطابق اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م سے لے کر ۴۰۰ ق م ہو سکتا ہے۔ (زیہنر ۱۹۷۶: ۱۴)

اس طرح ویدوں کے زمانے کے بارے میں ہمارے پاس کوئی توقیت نہیں اور اس شخص کے لیے جو ہندوؤں کو اور ان کی بات کرنے کی عادت کو جانتا ہے یہ امر یقینی ہے کہ ویدوں کے کسی متن کا غیر متوقع بھرپور انکشاف اگرچہ ہمارے علم میں اضافے کا باعث تو ہو سکتا ہے لیکن ویدوں کے زمانے کے بارے میں ہمارے موجودہ نظریہ میں کسی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتا" (اولڈنبرگ ۴۲) گھوش کے خیال میں اس کے پہلے تو منڈلوں کی توقیت کی ساری کوششیں ناکامی سے ہی دوچار رہیں [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۲۹] باشم کہتا ہے کہ اگرچہ دانشوروں میں اس کی متفقہ تاریخ تو نہیں لیکن یہ اغلب ہے کہ ان کو جمع کرنے کا عمل ۹۰۰ ق م میں اختتام کو پہنچا (زیہنر ۱۹۷۱: ۲۱۹)

دانشور ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ یہ نظمیں کہاں پر تصنیف ہوئیں۔ پسالکر نے اس اختلاف کو واضح کیا ہے۔ میکس میولر، ویبر اور میور کے خیال میں رگ وید پنجاب میں تصنیف ہوا۔ ہاپکنز اور گریفتھ کہتے ہیں کہ یہ انبالے کے نواح میں لکھا گیا۔ برنھوف، برنل، ہیوسنگ اور دیگر اسے پنجاب کی نہیں بلکہ ایران اور افغانستان کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ اسی مقام پر پسالکر گریفتھ کا مشاہدہ بھی پیش کرتا ہے جس کے مطابق کوئی مفروضہ طے کر لینا آسان ہے اور اس کے لیے کوئی شہادت بھی پیش کی جا سکتی ہے لیکن دقت یہ آن پڑتی ہے کہ اس کے مخالف مفروضے بھی اتنے ہی جائز ہیں اور حقائق اتنے نامکمل ہیں کہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۴۴]

پھر پسالکر خود بھی اپنی رائے دیتا ہے کہ پنجاب کے دریاؤں کے ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ ویدک لوگ پورے پنجاب کو جانتے تھے۔ اس لیے یہ کہنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ رگ وید کی بیشتر نظموں کی تصنیف ایران میں یا ضلع انبالہ میں ہوئی [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۴۴]

اس طرح اس کتاب سے استنباط کی صورت وہی ہو جاتی ہے جو موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی بربادی کا رشتہ آریاؤں کی آمد سے جوڑنے میں نظر آتی ہے۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور موضوعات پر ہری پرشاد رچناولی نے ۱۹۶۰ء میں بنگالی زبان میں ایک خوبصورت تقریظ لکھی تھی جو سنیتی کمار چیٹرجی کے رگ وید کے ترجمہ کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں بھی شائع ہوئی۔ اس میں یہ تمام نکات زیر بحث آئے ہیں اس تقریظ کا ایک سادہ اور آسان ترجمہ محولا بالا کتاب میں ملتا ہے (چٹوپادھیائے: ۲۰۶)

تمام ثقہ عالم اس بات پر متفق ہیں کہ ویدک مذہب پر بہترین شہادت ویدوں کی داخلی اور اندرونی شہادت ہے لیکن یہ داخلی شہادت کئی سوالوں کے جواب دینے سے معذور ہے۔ چیٹرجی کے مطابق رگ وید سے آریاؤں کے ہندوستان میں داخلے یعنی ایک نئے ملک میں داخلے کے احساس کی شہادت دستیاب نہیں ہوتی [موجمدار (ایڈیٹر) ۱۵۷] اس وجہ سے انڈالوجی کے حکما کے درمیان اختلافات اس بنا پر پیدا ہو چکے ہیں کہ ویدوں کی اس شہادت کی تائید میں خارجی شہادت کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر حکما دو گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ اول وہ علما ہیں جو ویدوں کو ان ہند یورپی اقوام کا مذہبی لٹریچر سمجھتے ہیں جو ان کی ہندوستان میں آمد سے پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اس لیے ان کے خیال میں تائیدی شہادت ہندوستان سے باہر تلاش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں علم لسانیات اور علم اساطیر سے انھیں امداد کی بہت توقع تھی پہلے ذکر آچکا ہے کہ اگرچہ سر ولیم جونز نے لسانیات

کے تقابلی مطالعہ کی ابتدا کی تھی لیکن اس کا بانی میانی جرمن عالم اے کوہن تھا، اس نے اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ آریاؤں کے بارے میں ان کے مذہب کے مطالعہ سے بھی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس خیال کو علمی جامہ پروفیسر میکس میولر نے پہنایا۔ اس نظریہ پر بحث آگے بھی آئے گی اور اس کی خامیوں اور نارسائیوں پر ہمیں ایک نظر ڈالنا ہوگی۔

دوسرے گروہ میں وہ حکما شامل ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ یہ وید ہندوستان اور صرف ہندوستان کی پیداوار ہیں اور ان سے استنباط کرنے کے لیے مقامی حالات و واقعات تاریخ اور مقامی محققین پر انحصار کرنا چاہیے اور ویدوں کے بعد مذہب یا فکر کے جو مکاتب وجود میں آئے ہیں ان کا ویدوں میں رشتہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے۔ یہ وہ مکتبِ فکر ہے جو ان کتابوں کو ازلی ابدی کلام سمجھتا ہے اور ویدوں کا کسی سرزمین سے متعلق ہونا اس مکتبِ فکر کے حامیوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ان کے خیال میں وید تخلیق کائنات کے وقت وجود میں آئے تھے اور اسی صورت میں یہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس مکتبِ فکر کے حامیوں کی اکثریت ہندو علما پر مشتمل ہے جو مغربی اندازِ فکر کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور اہمیت نہیں رکھتی۔

ان اختلافات کے علاوہ بھی چند مزید متنازعہ فیہ مسائل ہیں جو ویدوں کی تعبیر و تفسیر سے متعلق ہیں اور یہ اختلافات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں چند مکاتب فکر آج کل کی تحقیق کے بنیادی ستونوں کی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان ویدوں کے بارے میں یہ اعتقاد بنیادی ہے کہ یہ فطری قوتوں اور ان کے درمیان ایک رشتہ تلاش کرنے کی ایک جستجو اور ایک کوشش ہے جس سے ان فطری قوتوں کا ایک تصور قائم کرنا مقصود ہے۔ یہ نظریہ میکس میولر کا ہے اور تقریباً ایک صدی پرانا۔ اس نظریہ کے تحت میکس میولر نے ویدوں کی تفسیر میں فطری (نائیروکت) روایت کی پیروی کی جس کا تتبع ہمارے زمانے تک کے علمانے کیا۔ ویدوں کی یہ تفسیر اور اس کے باقی مضمرات آگے چل کر زیر بحث آئیں گے۔

میکس میولر کی قائم کردہ اس روایت کے خلاف ردعمل کے سرخیل برگینو، الفرڈ ہلڈ برانڈ اور ڈومیزل ہیں۔ ویدوں کے بارے میں ان حضرات کے خیالات کا ایک مختصر ترین خلاصہ یہ ہے۔

ان مذہبی رسومات کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے ویدوں کی اساطیر ایجاد کی گئیں۔ یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست ویدوں کی تحریف اور الحاقی عنصر سے ہے اور ویدوں کی قدیم ترین حصہ میں اس تحریف اور الحاقی عناصر کی نشاندہی آگے بھی کی گئی ہے۔

ان محققین میں سے کچھ اس خیال کے بھی حامی ہیں کہ یہ مختلف نژاد قبائل کی سیاسی کشمکش کی کہانیاں ہیں جن میں حکیم یوہمرس (قریب ۳۰۰ ق م) کے نقطۂ نظر کے مطابق سیاسی کشمکش میں کامیاب ہونے والے قبائل کے ہیرو دیوتاؤں کے مناصب پر فائز کر دیئے گئے۔ یہ نکتہ بھی اساطیر کی بحث کی ذیل میں آگے آئے گا۔

ویدوں کو فطری قوتوں یعنی گناہ و ثواب، نیکی اور بدی، صواب و ناصواب، روشنی اور تاریکی اور ثنویت کے دیگر مظاہرے جن سے رگ وید پُر ہے (گونڈہ ۱۹۷۴: ۳۲/۳۳) وغیرہ کی کشمکش کا آئینہ دار بھی گردانا گیا ہے۔

ہند یورپی اقوام کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں ایک عمودی تقسیم تھی اور یہ سماج تین طبقات میں انسانوں کو تقسیم کرتا تھا یہ طبقاتی تقسیم تمام ہند یورپی قبائل میں پائی جاتی تھی مثلاً روم، یونان اور ہند۔ اس عمودی تقسیم کے جواز کے لیے ویدوں میں مذکور دیوی دیوتاؤں کو ایک وسیلہ بنایا گیا ہے ان دیوتاؤں میں بھی وہی سماجی تقسیم منعکس ہوتی نظر آتی ہے جو ہند یورپی قبائل کے سماج میں تھی۔ اس بصیرت

افروز تعبیر کو پیش کرنے والا دیوزل ہے اس کے اس نظریہ میں ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ گہرائی اور گیرائی کے ایک حسین امتزاج کے علاوہ صداقت اور حقیقت کی کھنک بھی سنائی دیتی ہے۔ کیز۔ ڈبلیو۔ بول کے خیال میں اساطیر کے اہم وظائف میں مختلف مظاہر اور روایتوں کی تائید اور ان کا اثبات بھی پیش کرنا ہے۔ (معارف برطانیہ: ۱۲/۷۹۵) یہ بحث اساطیر کی ذیل میں اگلے باب میں بھی آئے گی۔

ایک اور مکتبِ فکر کے مطابق ویدوں کو وحدت وجود کا ایک مابعدالطبیعیاتی علامتی مظہر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ انڈالوجی کے کچھ ماہرین نے ویدوں کو اس سفید جادو سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے ذریعے مذہبی رسومات کے اجزائے ترکیبی اور کائنات کے عناصر میں ہم آہنگی مقصود ہے۔

ویدوں کی تدوین کے تاریخی مراحل پر بھی غور کیا گیا ہے۔ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ "وید تصنیف تو افغانستان کے علاقے میں یا اس سے باہر ہوئے لیکن ان کی تدوین پنجاب میں ہوئی۔ ڈانڈیکر کا خیال ہے کہ ان کی تصنیف تو ۲۴۰۰ سے ۲۰۰۰ ق م میں بلخ کے علاقے میں ہوئی لیکن پجاریوں کے ذریعے اس کی نظرِ ثانی، اس کے مطالب کا اخفا اور مختلف شاکھاؤں یا خاندانوں میں ان کی تقسیم اور ان کی ترتیب سات دریاؤں کی سرزمین میں ہوئی۔ ایجرٹن اس کے لسانی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بعد میں آنے والے مصنفین نے جنھوں نے ویدوں پر نظرِ ثانی کی، دانستہ طور پر ایک قدیم اور متروک زبان استعمال کی جو مروجہ زبان سے مختلف تھی۔ اور اس عمل میں بہت سارا غیر آریائی مواد ویدوں میں داخل ہو گیا۔ پرزی لیوسکی (PRZYLUSKY) نے ویدک فکر میں تین مختلف ثقافتی سطحوں کی نشاندہی کی ہے۔ (۱) آسٹرو ایشیائی (۲) میسوپوٹیمیائی اور (۳) آریائی۔ وہ ان کو بحری، ثلاثی (TRIADIST) اور ثنویت پر مبنی کائناتی تصورات کہتا ہے۔ جب سورج کو ایک پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے تو یہ آسٹرو ایشیائی تصور کا اظہار ہے۔ جب اسے ایک پہیا یا چکر کہا جاتا ہے تو شہری میسوپوٹیمیا کا تصور برسرِ کار ہوتا ہے اور جب اسے گھوڑا کہا جاتا ہے تو آریائی تصور برسرِ عمل ہوتا ہے .... وید مقام آغاز نہیں بلکہ یہ عروج کا مرحلہ ہے۔ مناجات محض باہمی متضاد رسومات و عقاید کا مجموعہ ہیں جن کو توسیع، تاویل اور بسا اوقات بالکل تبدیل کرنے کے بعد ایک مصنوعی عالمانہ آمیزش تیار کر لی گئی ہے۔" (بدھ پرکاش: ۶۲، ۶۳)

افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سارے مباحث انگریزی زبان میں بالتفصیل نہیں ملتے۔ انگریزی داں طبقہ جو انڈالوجی کا عمیق مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے خاصا بدقسمت ہے اور ہمدردی کا مستحق۔ تاہم ان مباحث کی چند جھلکیاں اور اجمالی خاکے کہیں کہیں انگریزی تراجم میں نظر آ جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اصل "وید" "اَ" وید تھا (واکر II: ۳۲۴،۳۲۵) اس کے متن میں کافی کاٹ چھانٹ ہوئی اور موجودہ رگ وید اسی کاٹے چھانٹے ہوئے اور مسخ شدہ متن پر مشتمل ہے۔ رگ وید اور دیگر ویدوں کے اکٹھا ہو جانے کے بعد بھی بحران کا عمل جاری رہا۔ یہ بات کتابوں کے متون اور ان کے اکٹھا ہو جانے کی روئیداد سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک مرحلے پر یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ مختلف متنوں پر مبنی ہر ایک وید کا ایک مستند نسخہ تیار کیا جائے۔ اس کوشش نے بھی تحریف کے عمل کو تقویت دی کچھ حصے تو بالکل ضائع ہو گئے اور جو باقی بچ گیا وہ حشو و زوائد سے معمور، تابع مقصد اور بے ترتیب ہے۔ ان تمام امور کی موجودگی میں یہ نظریہ کہ وید ازلی ابدی ہیں اور یہ تحریف کے عمل سے مامون ہیں محض ایک وہم ہے۔ (رینو: ۳)

برہمنوں کے ذمے مذہبی امور تھے اور اب بھی ہیں، اپنا سماجی مرتبہ بلند تر کرنے کے مقصد سے انھوں نے ویدوں

کے کئی حقائق مسخ کیے جن میں ویدوں کے خصوصاً رگ وید کے متن بھی تھے۔ کئی حقائق کو پردۂ اخفا میں رکھا۔ رگ وید میں تحریفیں کیں۔ کہیں دیوی دیوتاؤں کے ناموں میں تبدیلیاں کیں تو کہیں لوگوں کے نام بدل دیئے اور کہیں مقامات کے نام بدل ڈالے تو کہیں تاریخی ادوار میں ردوبدل کر دیا۔ اپنی مقصد براری کے لیے افسانے اور حقائق کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا اور یہ تمام کارروائیاں برہمن ازم کے احیا کے دوران ہوئیں۔ اسی زمانے میں رگ وید میں مزید الحاقی عناصر در آئے اور یہ اتنی بہتات میں ایں کہ حکما کے خیال کے مطابق پورا ویدک لٹریچر کیا مذہبی اور کیا غیر مذہبی نئے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔

رگ وید میں کئی گھناؤنی جعل سازیوں کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ رگ وید میں ایک نظم ہے (R X ، ۹۰) جسے پرش سکتا کہتے ہیں۔ یہ واحد نظم ہے جس میں ذات پات کا ذکر آیا ہے (گرفتھ ۱۹۷۶: ۶۰۳) یہ نظم ذات پات کے نظام کا سنگ بنیاد ہے۔ ڈاکٹر امبیدکر کا خیال ہے کہ یہ پوری نظم اور کئی اشعار الحاقی ہیں (امبیدکر: ۴۵) کولبروک کی نظر میں "یہ نظم اپنے اسلوب، وزن اور زبان میں ان نظموں سے مختلف ہے جن کے ساتھ اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا لہجہ یقیناً جدید ہے۔" (داگر I، ۳۶۳) اور ان دونوں کے بعد پچھلی صدی میں سنسکرت کے فاضل اجل اور آریائیت کے بہت بڑے مبلغ پروفیسر میکس میولر کا اس نظم کے بارے میں فتویٰ ہے کہ "بلاشبہ اس نظم کی ہیئت، اسلوب اور بندش قطعاً جدید ہے۔" (داگر ۳۶۳) اور یہ محض اتفاق نہیں کہ رگ وید کے الفاظ کے اس گھنے جنگل میں لفظ "شودر" صرف ایک ہی دفعہ یعنی پہلی اور آخری دفعہ صرف اس نظم میں ہی واقع ہوتا ہے۔

میکس میولر ایسی ایک اور جعل سازی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ برہمنوں نے لفظ اگری (Agre) کو اگنیہ میں تبدیل کر دیا تاکہ بیوہ عورتوں کو آگ میں زندہ جلانے کا جواز پیدا ہو سکے جعل سازی کا یہ عمل مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں بھی جاری رہا۔ اور سنسکرت زبان کی کوئی نظم یا شہ پارہ ایسا نہیں جسے تبدیل نہ کیا گیا ہو یا اس میں کوئی ترمیم نہ کی گئی ہو۔ ..... ایسا کوئی صحیفہ نہیں جس میں افسانہ یا خود ساختہ تاریخ نہ داخل کی گئی۔" (دھرم تیرتھ: ۱۲۵) ایک اور ہندو محقق پسالکر کے خیال میں رگ وید کے مختلف متن ہم تک نہیں پہنچے [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۴۱]

ڈاکٹر امبیدکر بتاتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ایک مقدمہ جیتنے کے لیے برہمنوں نے سمرتی (قانون) تبدیل کر دیا۔ (داگر I: ۳۶۴)

ویدوں کی اور خصوصاً رگ وید کی شہادت ان تمام کوائف کے پیش نظر مشتبہ، غیر موثر اور مشکوک ہو جاتی ہے تاآنکہ کسی خاص نکتہ پر ہمارے پاس تائیدی شہادت کسی اور ذریعے سے موجود نہ ہو۔

اس امر کی وضاحت کے لیے کچھ مثالیں پیش ہیں۔ یہ مثالیں آج بھی انڈالوجی کے اہم مسائل میں شمار ہوتی ہیں۔

۱۔ پہلا مسئلہ وادی سندھ سے متعلق ہے۔ اس تہذیب کی دریافت کے وقت (۱۹۲۴ء) ساہیوال (اس زمانے کا منٹگمری) سے چودہ میل کے فاصلے پر ہڑپہ قصبے کے قریب ایک شہر کے آثار دریافت ہوئے۔ میکڈانل اور کیتھ کے ویدک انڈکس چھپنے تک (۱۹۱۲ء) لفظ ہری یوپیا (RV, VI ، ۲۷، ۵) کے بارے میں صرف قیاسات تھے اور کہا جاتا تھا کہ یہ یا تو کوئی دریا ہے یا کوئی مقام (میکڈانل اور کیتھ I، ۲۹، ۳۱۶ اور II ۴۹۹)۔ بنگال کے ایک صاحب نے جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی مارچ ۱۹۲۸ء میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہڑپہ رگ وید کا ہری یوپیا ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے محکمہ آثار کے سربراہ سر مارٹیمر وہیلر نے فتویٰ دے دیا کہ ہڑپے کا ہری یوپیا ہونا غیر ممکن نہیں (وہیلر ۱۹۶۸، ۱۳۱) اور قلم کی ایک جنبش سے ہری یوپیا کو ایک شہر قرار دے دیا۔ اگرچہ وہ یہ بتانے سے قاصر رہا کہ رگ وید کا ہری یوپیا تو دریائے یویاوتی کے کنارے

واقع ہے اور اس دریا کی ابھی تک شناخت نہیں ہو سکی۔ اور ہڑپہ دریائے راوی کے کنارے واقع ہے جو رگ وید کا جانا پہچانا دریا اراوتی ہے۔ اس مثال سے رگ وید سے طریقہ استنباط اور ایسی شہادت کی افادیت واضح ہو جاتی ہے۔

دوسری مثال رگ وید میں ۵۲ دفعہ استعمال میں آیا ہوا لفظ "سرسوتی" ہے۔ رگ وید کے آغاز میں ہی پہلے منڈل کی تیسری مناجات کے دسویں شعر (RV.I-3-10) میں اس لفظ سے مراد سرسوتی دیوی ہے۔ جس کو ویدک عہد کے بہت بعد علم و فن کی دیوی قرار دیا گیا اور جسے تصویر میں "واچ" جو نطق کی دیوی ہے کے برابر خیال کیا گیا۔ (گرفتھ: ۳)

لیکن بیشتر یہ لفظ ایک دریا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ اپنے علاقے کا بہت بڑا دریا تھا (RV.II-41-16) اور سمندر تک جاتا تھا (RV.III-96-2 اور ۸ و RV.VI-61-2) اس کے کنارے کئی بادشاہ (RV.VII-95-2) اور پانچ قبیلے آباد تھے۔ (RV.VI-61-12)۔

رگ وید میں ۳۱ دریاؤں کا ذکر ہے۔ کئی دریا مثلاً سندھ (سندھو)، جہلم (وِتستا)، چناب (اشکنی) اور راوی (اراوتی اور پاروشنی) بیاس (ویاس)، ستلج (ستودری) کی شناخت ہو چکی ہے۔ اسی طرح سواستو (دریائے سوات)، کبھہ (دریائے کابل)، کرم (دریائے کرم) دریائے گومل (گومتی) بھی شناخت ہو چکے ہیں۔ دریائے گنگا اور جمنا کا ذکر ان کے موجودہ ناموں سے ہی رگ وید کی ندی ستوتی (X:75:5) میں آتا ہے لیکن اہم ترین دریا یعنی وہ دریا جس کو رگ وید اہم ترین قرار دیتا ہے۔ ہم اس صدی کے آغاز تک شناخت نہیں کر سکے۔ رگ وید میں جو "اشارے" دیئے گئے ہیں وہ کافی نہیں۔ پھر اس مسئلہ میں ایک اور الجھن آن پڑتی ہے۔ شمال مغرب کے کئی مقامات کے نام برعظیم کے مشرق میں دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً دریائے گومتی ہمیں لکھنؤ میں بھی ملتا ہے۔ انگہ (ایک گاؤں)، وادی سون سکیسر میں ملتا ہے اور ساتھ ہی یہ صوبہ بہار ضلع بھاگل پور اور مونگھیر پر مشتمل ایک علاقے کا نام بھی تھا۔ یہ ایک قبیلے کا نام بھی تھا۔ (ڈی سی سرکار ۸۹)

ان الجھنوں کی وجہ سے رگ وید کے مفسرین نے سرسوتی کی شناخت کی جو کوششیں کی ہیں وہ ناکام رہی ہیں۔ سرسوتی کو دریائے سندھ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (راتھ، زمر، لڈوگ اور گرفتھ) اسے دریائے ستلج کا ایک معاون بھی قرار دیا گیا ہے (میکس میولر اور لاسن) اسے بلوچستان کے دریائے اندراب سے بھی تعبیر کیا گیا ہے" (الفریڈ ہلی برانڈ) اسے دریائے جیحون یا آمو دریا سے بھی ملایا گیا ہے" (میکڈانل اور کیتھ II ۴۳۴-۴۳۷) بالآخر یہ مسئلہ اس صدی میں جا کر حل ہوا اور وہ بھی علم الارض کی وساطت سے۔ اس علم کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق دریائے سرسوتی کا منبع کوہستان شوالک میں انبالہ ضلع کی سرحد پر واقع پہاڑ سومور ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے جمنا اور مغرب میں دریائے ستلج ہے۔ ادھا بدری کے میدان میں بہتا ہوا بھوانی پور اور بل چھپر سے گزر کر یہ ریت میں گم ہو جاتا ہے لیکن کرنال کے قریب یہ پھر نمودار ہوتا ہے۔ دریائے گھگھر جو ۱۲-۷۷ : ۳۰ کے مقام سے نکلتا ہے۔ ایک سو دس میل کا فاصلہ طے کر کے پٹیالے کے علاقے میں رسولا کے مقام پر اس سرسوتی سے جا ملتا ہے۔ اس مقام سے آگے اس دریا کو ہاکڑا کہتے ہیں اور اس کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں یہ کافی بڑا دریا رہا ہوگا۔ یہ پرانی ریاست بیکانیر میں ہنومان گڑھ کے قریب پھر گم ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اس کے ساتھ اور دریاؤں اور نالوں کے ملنے کے بھی آثار ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شاید دریائے جمنا کی کوئی شاخ ہو جو دریائے سرسوتی سے جا ملتی ہو بھٹنیز اور سرسہ کے مقام پر اس میں دریائے سرہند جس کے آثار روپڑ تک ملتے ہیں، آن ملتا ہے۔ سرسہ لفظ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ سرسوتی ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے یہ خیال بھی ہے کہ دریائے سرہند اصل میں دریائے ستلج کی ہی گزرگاہ تھی۔ بعد میں ستلج نے اپنا راستہ حسب عادت بدل لیا۔

بیکانیر کے علاقے میں دریائے ہاکڑا کا خشک پاٹ چار سے پانچ میل تک چوڑا ہے۔ اس کے راستے کی مٹی بھی اس کے کناروں کی مٹی سے علیحدہ دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کناروں پر اجڑی ہوئی بستیوں کے آثار ہیں۔ سر آرل سٹین اور دیگر لوگوں نے ان بستیوں کا جائزہ لیا ہے اور مندروں اور گھروں کے آثار کا پتہ چلایا ہے۔ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑوں کی ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے برتنوں اور وادیٔ سندھ کے زمانے کے بعد کے برتنوں میں خاص مماثلت پائی جاتی ہے۔

یہ دریا بہاولپور کے علاقے سے بھی ہو کر گزرتا ہے۔ اس علاقے میں یہ ہاکڑا یا دھند کہلاتا ہے۔ یہاں سے یہ سندھ کے مشرق میں نارا سے جا ملتا ہے اور پھر رن آف کچھ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ راستہ آج بھی موجود ہے۔

مہابھارت اور منو کے زمانے (۶۰۰ ق م ۔ ۱۰۰ء) کے قریب اس دریا کا بالائی حصہ خشک ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے شاید دریائے جمنا کا اپنا رخ تبدیل کر لیتا تھا۔ لیکن بہاولپور اور بیکانیر والا حصہ سکندر کے حملے کے وقت (۳۲۶ ق م) موجود تھا۔ یہ عربوں کی آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ ان کے جہاز رن آف کچھ میں سے گزر کر اس دریا کے ذریعے سندھ تک پہنچتے تھے۔ ارضی تبدیلیوں کی وجہ سے رن کا بہت سارا علاقہ اونچا ہو گیا، سمندر پیچھے ہٹ گیا اور رن ایک دلدل بن گیا۔ ٹاڈ کے خیال میں دریائے سرسوتی پہلی دفعہ ۱۰۴۴ء میں خشک ہوا۔ تیسری اور آخری مرتبہ یہ تیرھویں صدی کے وسط میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو گیا اور اس کی آبادیاں اس کے اطراف و اکناف سے ہجرت کر گئیں۔ (میکڈانل اور کیتھ [I]: ۴۳۴ تا ۴۳۷، سرکار ۴۸، ۴۹، کرشنن ۲۶، ۲۷)

اس پوری داستان سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ رگ ویدی شہادت پر اس وقت تک انحصار کرنا غلط ہے جب تک کہ اس شہادت کو کسی اور علم سے تائید حاصل نہ ہو۔ صرف لسانیات پر بھروسا کرنا اور وہ بھی اس زبان کی جو آج کل متروک ہو چکی ہے اور جس کو سمجھنے والے اب خال خال ہی ہیں، کتنا گمراہ کن اور اذیت ناک ہو سکتا ہے یہ دریائے سرسوتی کی داستان کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔

۳۔ تیسری مثال سوم رس کی ہے۔ ویدک عہد سے بہت پہلے ویدک عہد کے دوران اور اس کے بعد آریائی قبائل کے ہاں سوم رس کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ کسی پودے کا رس تھا جو پتھروں پر پیس کر نکالا جاتا تھا۔ دودھ، دہی اور گھی کے ساتھ اس نشہ آور مشروب کو مختلف النوع قربانیوں کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ رگ وید کا پورا نواں منڈل صرف سوم رگ کے لیے مخصوص ہے اس میں ۱۱۴ نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ چھ مزید نظمیں بھی اسی سوم رس سے متعلق ہیں۔ پھر اس کی اہمیت کا اندازہ مزید اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اندر اور اگنی کے بعد سوم رس تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ یہ رس ایران میں بھی ہند یورپی قبائل استعمال کرتے تھے اور اوستا میں اس کا ذکر "ہوم" کے نام سے آیا ہے۔

اس اہمیت کے باوجود اس پودے کی یا اس سے کشید دسوم رس کی کوئی صحیح تاویل یا تعبیر پچھلے تین ہزار سالوں میں نہیں ہو سکی۔ سوم رس کی بے شمار تاویلوں میں چند کا ذکر انتہائی مختصر طور پر کیا جاتا ہے تاکہ قاری رگ وید کی شہادت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر خود قائم کر سکے۔

(۱) وہ پودا جس سے سوم رس کشید کیا جاتا تھا ناقابلِ شناخت ہے۔ (واکر [I]: ۴۱۸)

(۲) سوم رس کو آبِ حیات مانا گیا ہے اور یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اس کا پینے والا دیوتاؤں کی طرح امر ہو جاتا ہے۔ (واکر [I]: ۴۱۸ ورالنس: ۳۰)

(۳) اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بھنگ کا پودا ہے۔ اس کو بیل نما پودا بھی کہا گیا ہے جس کے ڈنٹھلوں سے یہ رس

نکالا جاتا تھا۔ (ڈانیلو ۱۹۶۴ء: ۶۶)
(۴) سوم رس کو الکحل کی ایک قسم بھی مانا گیا ہے۔ (روتھے: ۲۹، ۳۰)
(۵) لیکن باشم اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں یہ الکحل سے مبرا ہے کیونکہ اسے تیاری کے فوراً بعد بھی پی لیا جاتا تھا اور الکحل پیدا ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہے اور وہ وقت اس رس کو نہیں ملتا اس محقق کی نظر میں یہ بھنگ ہی کا پودا ہے۔ (باشم ۱۹۵۴ء: ۲۳۵، ۲۳۶)
(۶) اندر دیوتا اس رس کا بڑا رسیا تھا اور وہ اس کے خم کے خم لنڈھاتا تھا۔ اس نسبت سے اسے دیوتاؤں کا درجہ بھی دیا گیا ہے۔ چاند کے ساتھ بھی اس کا ناتا جوڑا گیا ہے۔ اور یہ ذکر ویدوں کی مندرجہ ذیل نظموں میں ملتا ہے:- Rv. iv. 15.6., Rv. vi. 5.11., Rv. ix 6.7.
(۷) اپنشدوں میں اسے مادہ منویہ بھی مانا گیا ہے (میکس میولر (مترجم) II: ۸۶) اور سمادی گھوڑے کا مادہ منویہ بھی مانا گیا ہے۔ "براہم ودیا" کتاب۔ جو برہمنوں کے آپس کے مناظروں اور مباحث پر مبنی ہے، اس موضوع پر مختلف ویدوں سے یہ حوالے دیتی ہے۔ Rv I. 164. ; Rv viii. 29.; Av ix. 9; Av ix. 10.

یہ ہیں کچھ تعبیریں سوم رس کے بارے میں جن سے رگ وید کی شہادت پر انحصار کرنے سے خطرناک نتائج مرتب ہونے کا احتمال صاف نظر آتا ہے اور رگ وید کی شہادت پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔ ان تعبیروں میں اب ایک اور تعبیر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ابھی تک محققین کے زیر غور ہے اجمالاً اس تعبیر کے بارے میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ رابرٹ گارڈن واسن رجو پیشے کے لحاظ سے ماہر کلاہ باراں ہے اور کھمبیوں کا خصوصی مطالعہ کرتا ہے) کی تحقیق کے مطابق سوم رس کا یہ پودا بھی کلاہ باراں یا اس کی مختلف اقسام میں سے کوئی مخصوص قسم ہے اور اس سے نکلا ہوا رس ہی سوم رس ہے۔ واسن نے یہ نظریہ بڑی شد و مد اور دلائل و براہین کے ساتھ اپنی کتاب میں پیش کیا۔ یہ کتاب لندن سے حال ہی میں شائع ہوئی۔

مصنف نے بڑی تحقیق و جستجو، تجربات اور سائبیریا کے لوگوں کے رسم و رواج اور رہن سہن سے استنباط کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کھمبی رگ وید میں بیان کردہ سوم رس کے اوصاف سے عین مطابق ہے اور اس کے رس میں جو اجزا ہیں وہ نشہ آور ہیں۔ یہی رس زمانہ قبل از تاریخ میں مذہبی قربانیوں میں استعمال ہوتا تھا اور بعدہٗ ویدک عہد میں بھی یہ مستعمل رہا۔ اس نظریہ کو آج کل بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ جان برو نے اس کتاب کے موضوع کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے جو سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز کے جرنل میں شائع ہو چکا ہے (شمارہ XXXIV سال ۱۹۷۱ء، ۳۳۱-۳۶۶) انڈالوجی کے ماہرین کی توجہ کا مرکز آج کل یہی نظریہ بنا ہوا ہے۔ ماہر علم الانسان لیوی سٹراس نے بھی اس نظریہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ (جلد دوم ۲۲۲-۲۳۷) اس کے خیال میں سوم رس کو چھاننے کے لیے رگ وید میں علامتی طور پر تین چھلنیوں کا ذکر آتا ہے اور وہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ پہلی چھلنی تو خود یہ پودا ہے۔ دوسری چھلنی بھیڑوں کے اون کی ہوا کرتی تھی لیکن تیسری چھلنی کی کوئی وضاحت نہیں ہو پائی۔ اس سوال نے حکما کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ رگ وید کے مبہم علامتی بیانوں سے یہ نکتہ واضح نہیں ہو پاتا تھا۔ رگ وید کی نظم (RV.X.۷۴، ۴-۳) یعنی دسویں منڈل کی چوہترویں نظم کے چوتھے شعر نے اس کتاب کے مترجموں کو بہت پریشانی میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ اور اس مصرعے کے کئی مختلف تراجم ہو چکے تھے۔ رینو نے اپنے ترجمے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کا اردو زبان میں مفہوم کچھ یوں ہے: "یہ دیوتا اپنے پھولے ہوئے مثانوں سے تیزی سے (سوم رس) خارج کرتے ہیں۔" چنانچہ سوم رس کے رگ وید

میں بیان کردہ خواص اور اوصاف اور سائبیریا کے رہن سہن کے پیش نظر واسن اس نظریہ پر پہنچا کہ تیسری چھلنی انسان کا خود اپنا جسم ہے جس میں کھمبی کا رس صاف ہو کر پیشاب کے طور پر خارج ہوتا ہے۔ انسانی جسم سے گزرتے وقت اس میں کئی الکلی نما چیزیں جسم میں جذب ہو جاتی ہیں اور کئی ایسی چیزیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں جس سے یہ مزید نشہ آور ہو جاتا ہے۔ واسن نے اس تیسری چھلنی کی تشریح اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷ تا ۲۹ پر کی ہے۔

سوم رس کی اس تعبیر کی تائید سائبیریا کے لوگوں کے رہن سہن سے بھی ہوتی ہے۔ سائبیریا کسی زمانے میں آریائی قبائل کا وطن بھی قرار دیا جا چکا ہے وہاں کھمبی کے استعمال کے دو طریقے ہیں ایک تو اس کی اپنی حالت میں، اور دوئم کھمبی کھانے کے بعد پیشاب کی صورت میں۔ رگ وید سے اس امر کی تائید مزید اس کی نظم ۵-۳-۲-۲۔RV.IX.۷۴ سے ہوتی ہے۔

پروفیسر لیوی سٹراس کے خیال میں اگر سوم رس کی یہ توضیح صحیح ثابت ہوتی ہے جس کے امکانات بہت قوی ہیں تو اس سے بہت سی باتیں واضح ہو جاتی ہیں:-

(۱) ابھی تک سوم رس کے پودے کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ اس تعبیر سے یہ قضیہ ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رگ وید بہت سی قدیم یادداشتوں پر مبنی ہے (لیوی سٹراس II: ۲۳۰) اور اس حد تک قدیم کہ ویدک عہد کے آتے آتے اس کے ہزاروں الفاظ متروک ہو چکے تھے یا اپنے صحیح مفاہیم کھو چکے تھے جس کی وجہ سے نابیر دکت روایت چلی اور میمانسا درشن کے کچھ اصول مرتب ہوئے۔ یہ بات حقائق کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اس نظریہ سے دیکھیں تو سوم رس صرف ایشیائی آریائی قبائل ہی کے ہاں نہیں بلکہ یہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا یوریشین "کلٹ" تھا۔ (لیوی سٹراس: ۲۳۱) اور اگر یہ صورت ہے تو اس نظریہ کو مزید تقویت ملتی ہے کہ رگ وید ۱۲۰۰ ق م کے اردگرد کی کتاب نہیں بلکہ اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب یہ قبائل ابھی اپنے مخرج سے نہیں نکلے تھے۔ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ خود اس قسم کے مذاہب کی بنیاد نشہ آور اور فریب نظر پیدا کرنے والی اسی کھمبی پر ہی ہو۔

(۳) تیسری بات جو نہایت اہم ہے اور انڈالوجی کے طالب علموں کے لیے بہت معنی خیز ہے وہ یہ امر ہے کہ ویدک عہد کے لوگ ان قربانیوں کی اہمیت اور ان پر پڑھے جانے والے منتروں کے الفاظ کے معانی سے بالکل بے خبر ہو چکے تھے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایسا پودا جس کے بیان سے رگ وید کا پورا دسواں حصہ پُر ہو اس کی شناخت ہم کرنہ پائیں۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ قربانیوں اور رسومات کی ادائیگی اور ان سے متعلق لسانی بیانوں میں بہت فرق آچکا ہے

ان مشاہدات و ملاحظات سے رگ وید کی شہادت کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے۔ ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کی شہادت کو بغیر کسی تائیدی شہادت کے سنجیدہ مطالعہ کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے اور جو لوگ صرف اس پر تکیہ کرتے ہیں وہ غلط نتائج مرتب کر کے قاری کو گمراہ کرنے کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں چنانچہ مذہبی کتب سے اس قسم کی شہادت پر لیوی سٹراس نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

> "درحقیقت یہ ہے کہ ہمیں کئی ایسے حقائق کا پتا ہے جہاں مقامی خیال ان اشخاص، اشیا اور واقعات کو جو کسی زمانے میں حقیقی ہوتے تھے اور جن کے لیے بعد میں جغرافیائی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر معاشرے میں کوئی عملی افادیت نہیں رہتی، فطرت کے ورا پہلے

جاتے ہیں۔ معاشرہ اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اپنے نظریات میں ماضی کی یادوں اور ان کی پرانی یا گزشتہ افادیت کو ہم آہنگ کر سکے۔" (ہیوی سروس II: ۲۱۹، ۲۲۴، ۳۲۵)

ویدوں کی شہادت سے استنباط کرتے وقت یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کسی زمانے میں اس کتاب کے کئی متون تھے ،صرف یہی ایک امر ویدوں کی شہادت کو نا قابلِ قبول بنانے کے لیے کافی ہے۔ (ابوقے: ۲۷، چٹو پادھیائے: ۳۲)

۴۔ لیکن اندر دیوتا کا معاملہ ان تمام موضوعات سے زیادہ اہم ہے اور جتنا یہ اہم ہے اُتنا ہی اُلجھا ہوا بھی ہے۔ ہندوستان میں داخلے کے وقت آریاؤں کا اہم ترین دیوتا اندر تھا جس کی توصیف میں رگ وید کا پہلا منڈل (تقریباً پورے کا پورا) تصنیف ہوا ہے۔ جتنی دعائیں اس دیوتا سے منسوب ہیں کسی اور دیوتا سے منسوب نہیں ہیں۔ یہ رگ وید کا زمانہ انڈالوجی کے ماہرین نے ۱۵۰۰ ق م یا ۱۲۰۰ ق م فرض کر لیا ہے، اور اگر یہ درست ہے تو ہمیں ایک مشکل اور آن پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ باغاز کوئی کا کوئی عہد نامہ جس میں آریاؤں کے باقی تین دیوتاؤں کے ساتھ "ان۔ دا۔ را" یعنی اندر کا نام بھی آتا ہے حتمی طور پر ۱۳۵۰ ق م قرار دیا گیا ہے۔ اگر اندر کوئی شخص تھا جو اپنے کارہائے نمایاں کے بعد دیوتاؤں کے منصب پر فائز ہوا تو اسے اس عہد نامے سے چند صدیاں پہلے ضرور ہونا چاہیئے تھا تاکہ اس کے بارے میں اساطیر بنانے کے لیے کچھ وقت مل سکے چنانچہ اس طرح باغاز کوئی کے عہد نامے کی حتمی تاریخ اور رگ وید کی مقرر کردہ زمانے یا تاریخ میں اختلاف کی وضاحت کیسے کی جائے۔

اساطیر کی تہہ میں اترنے کے لیے اہلِ دانش نے کئی راستے اختیار کیے ہیں۔ ان کی تفصیل تو خیر بعد میں اساطیر کی ذیل میں آئے گی۔ یہاں یہ بتانا مقصد ہے کہ ان طریقوں میں چند کا اگر اندر کی اسطورہ پر اطلاق کریں تو ذہن کے خیال میں مندرجہ ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اگرچہ یونانی اساطیر اور ہندی اساطیر میں بہت فرق ہے، لیکن اندر استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔ جنگ میں اس کا دشمن ورترا صیغہ مجیرا ہے۔ اور اندر کا اپنا لقب "ورتر کا قاتل" ہے لیکن اس صیغے میں ورتر کے عمومی معنی میں رکاوٹ۔ مدافعت اندر گرینوچ کے مطابق "طاقت" ہے۔ اس لیے اندر لازمی طور پر مدافعت کی قوت کو تباہ کرنے والا ہے۔ ورتر جو عالم پر محیط ہے پانیوں کو قید کرنے والا ہے اور اس طرح خشک سالی پیدا کرتا ہے، ایک راکھشس تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ورتر ۹۹ قلعوں کا مالک بھی ہے جس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ وہ انسان بھی ہو سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو اس اسطورہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ اندر ان ۹۹ قلعوں کو مسمار کرتا ہے ورتر کو قتل کرتا ہے، پانیوں کو کھول دیتا ہے۔ سورج چمکنے لگتا ہے اور مویشی آزاد ہو جاتے ہیں۔

اس اسطورہ کا تین طریقوں یا سطحوں پر حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اندر آریاؤں کا جنگ کا دیوتا ہے اور ورترا ان کے خلاف ایک دفاعی قوت ہے جس کا سر کرنا لازمی ہے۔ یہ وہ پہاڑیا چٹانیں، وہ قلعے ہی ہو سکتے ہیں دریا جو بند ہیں، وادی سندھ ہی کے دریا ہو سکتے ہیں اور مویشی سورج کی اسطوری کرنوں کی بجائے مویشی ہی ہو سکتے ہیں جن کو آریاؤں نے آزاد کیا۔

(۲) یہ طوفانی بادلوں کی اسطورہ ہے جس میں ورترا امساکِ باراں یا سوکھے کا راکھشس ہے اور اندر کی گرز وہ گرج ہے جس کے بعد بادل چھٹ جاتے ہیں، بارش شروع ہو جاتی ہے۔ تاریکی چھٹ جاتی ہے اور سورج چمکنے لگتا ہے۔

(۳) یہ تکوینی قانون جو عارضی طور پر بگڑ چکا ہو، کی تسند کے ذریعے بحالی کی داستان ہے۔ ورتر کے پانی بند کر دینے سے Chaos میں Cosmos در آتا ہے۔ اس تکوینی قانون کو اندر پھر بحال کر دیتا ہے۔

ان تینوں طریقوں میں سے اسطورہ کو کوئی مکمل طور پر حل نہیں کرتا اور نہ ہی ہمیں یہ توقع کرنی چاہیئے۔ (یہ اقتباس نامکمل ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں زہنر: ۱۹۷۶: ۲۲ تا ۲۷)

اسی اسطورہ کے بارے میں ڈاکٹر بدھ پرکاش اپنی فاضلانہ تحقیق کی بنا پر یوں کہتے ہیں:

(۱) اندر آریاؤں کی علامت ہے اور یہ ان کی ہم عصر شخصیت تھی۔ اندر ایک قدیم شخصیت تھی جس نے اپنی بہادری اور کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد دیوتا کا مرتبہ حاصل کیا۔

(۲) ورتر داس اور داسیوں کی علامت ہے۔ یہ وادیٔ سندھ کے باشندے تھے۔ بلکہ حقیقت میں ورتر کا لفظ یہاں کے پروہت راجہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

(۳) وادیٔ سندھ کے یہ ورتر بڑے تپسوی اور زاہد تھے۔ اور دیوتاؤں کے چہیتے تھے۔ جادو کے علم و فن سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے آسوریوں سے تعلقات بہت گہرے تھے اور ان کا قتل براہمنوں کے قتل کے برابر تھا۔

ورتر نے آریاؤں کو رگ (رگ وید) سامان (سام وید) اور یاجوس (یجروید) کا علم عطا کیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تینوں سمہتائیں یعنی رگ، سام اور یجروید اپنی صورت، نظام اور ترتیب میں واضح طور پر غیر آریائی ہیں۔ (بدھ پرکاش: ۲۵ تا ۶۱)

لیکن آپٹے کا خیال ان سب سے مختلف ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے اس اسطور کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

(۱) اس اسطور میں گرج دار طوفانوں اور بارشوں کا ذکر نہیں ہے اور اس قصے میں بادلوں کا کوئی خاص کردار نہیں ہے۔

(۲) پانیوں کے آزاد ہو کر بہنے کو گھوڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے اس لیے اس سے مراد بارش کا پانی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ گھوڑوں کی طرح افقی طور پر نہیں بہتا۔

(۳) اندر کی گرز (وجر) دھات کی بنی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گرنے والی بجلی ہے۔

(۴) اندر اگر واقعی طوفانوں اور بارش کا دیوتا ہے تو برجانیا دیوتا فالتو ہو جاتا ہے۔

(۵) یورپی اساطیر کی مماثلت کی بنا پر اشارے ملتے ہیں کہ ورتر سے جنگ ہندوستان میں نہیں ہوئی بلکہ کشمیر یا شمالی مغربی ممالک میں ہوئی۔ ان ممالک میں شدید سردی کی وجہ سے پانی جم جاتا ہے۔ ورتر کی اسطور کی ایسے ہی علاقوں میں تشکیل ہو سکتی ہے۔

(۶) دوپہر کی قربانیاں اور چڑھاوے خاص طور پر اندر اور اس کے ہم کار ماروت کے لیے ہوتے تھے۔ اس لیے اندر غالباً نصف النہار کا سورج ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہی وہ شروع شروع میں روشنی کا دیوتا قرار دیا جا سکتا ہے۔

[موجمدار (ایڈیٹر): ۳۷۰-۳۷۲]

گنگا گورو یونیورسٹی کے سنسکرت اور ہندوستانی مطالعات کے سابق پروفیسر بیوٹن سن (وفات ۱۹۷۹) جنھوں نے ہندو اساطیر، کیلنڈر، ادب اور بھگتی تحریک کے راہنما رامانج پر قابلِ احترام کام کیا ہے۔ اندر کی اسطور کو رگ وید کی مرکزی اسطورہ قرار دیتے ہیں۔ اندر کا ورتر کو جو مانسون کی بارش کو روکتا ہے، قتل کرنا انتہائی اہم ہے کیونکہ ہندوستانی زراعت میں مانسون ایک انتہائی اہم عامل ہے۔ اسطور میں جو اشارہ کیا گیا ہے اس کا تعلق ہندوستان کے ہر باشندے سے ہے۔ رگ وید میں اس اسطور

کو امراء کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور مانسون کے برسنے کو ایک کونیاتی عمل خیال کیا گیا ہے جس کا تعلق پورے مانسون کمپلکس سے ہے۔ اندر ہواؤں کا بادشاہ ہے۔ ان کا مالک ہے۔ وہ ان مانسون کی ذمہ دار ہواؤں کا بھی مالک ہے۔ اس کے ہتھیار بجلی اور گرج ہیں۔ انہی سے وہ ورتر کو قتل کرتا ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے اسے سوم رس کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ وہ جنگ کا دیوتا بھی ہے۔ غیر آریائی مقامی لوگوں کو شکست دینے کے لیے اس سے استدعا کی جاتی ہے۔ یہ سارے اہم معاملات ہیں۔ یعنی بارشوں کا بروقت اور بہتات میں آنا، جنگ میں کامیابی اور آریا لوگوں کا ہندوستان کو فتح کرنا ــــ یہ سب اندر کی اسطور میں مرکزی نکات ہیں۔ (EB 8 929)

باشم کے خیال میں اندر کی اسطورہ میسوپوٹیمیا کی اساطیر سے اخذ کی گئی ہے جس کا ماخذ ہندوستان میں فراموش کر دیا گیا۔ (باشم ۱۹۵۴، ۸۰۰)

اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ اندر نام نہیں بلکہ منصب سے ہے اور یہ منصب موروثی ہے۔ یہ منصب حملہ آور فوج کے سردار کے لیے مخصوص تھا۔ (بھٹا چارجی: ۲۸۱)

یہ ہیں کچھ تاویلیں اور تعبیریں صرف ایک اسطور کی۔ اور اندر سے متعلق اس اسطور کی ساری تاویلات ہم نے یہاں درج نہیں کیں۔ صرف چند نمونے پیش کیے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ ہمارے دانشوروں کا یہ کہنا کہ اندر نے دراوڑوں کے شہر کے شہر برباد کر دیے تھے ایک کمزور بلکہ کمزور ترین تاویل ہے اور اس پر تاریخ کی سر نو ترتیب کے لیے انحصار کرنا عالمانہ طریق کار نہیں۔

لفظ آسور بھی رگ وید کے مطالعہ میں بہت اہم ہے اور اس کے مفاہیم بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ رگ وید کے آغاز میں یہ ورون دیوتا کا جو کائنات میں تکوینی قانون کا نگراں ہے۔ ہم مرتبہ دیوتا تھا۔

"میں کورون، بادشاہ ہوں، مجھے اسور کا وقار تفویض کیا گیا ہے۔ اور میں ورون، اندر بھی ہوں"۔ (زیمنز: ۱۹۷۵، ۲۷)

آسور غیر مجسم، روحانی الوہی شخصیت ہے جو ژند کا اہورا ہے (گرفتھ: ۱۹۳۶، ۱۱ حاشیہ ۱۴-۲۴ حاشیہ ۳۶۷ حاشیہ ۳ اور دیگر کئی مقامات)

یہ لفظ ژند میں آہور ہو جاتا ہے اور پھر آہورمزدا میں مدغم۔ اس لفظ کو لفظ سور سے متعلق بھی خیال کیا جاتا ہے، سور شراب تھی جس کے آریا بہت شائق تھے۔

آسور کو اسیریا کی تہذیب سے بھی جوڑا گیا ہے۔ اسیریا کے بادشاہ سورا سنی پال اور آسور نذر پال سے ملایا گیا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ اسیریا کے ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو آریاؤں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں آن کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ آہن گری میں ماہر تھے اور آریاؤں سے علوم میں کہیں آگے تھے۔ (بدھ پرکاش ۳۶-۳۸ اور باشم ۱۹۵۴، ۲۳۶ اور ۳۱۸۔ میکڈانل ۱۸۹۷: ۱۵۶) بعد میں آسور سے مراد راکھشس ہو گیا جو ورتر کے ساتھ مل کر آریاؤں کے خلاف لڑتے رہے۔

آپٹے کے خیال میں آسورا کو کسی قبیلے سے وابستہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۵۰] لیکن پسالکران کو داتوا، ناگا، نشادہ، داس اور شا کا قبیلوں کی طرح قبیلہ ہی خیال کرتا ہے۔ [موجمدار (ایڈیٹر): ۳۱۳]

پنی یا پانٹری بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے جس کے مفاہیم کا تعین ایک مشکل کام ہے۔ (میکڈانل ۱۸۹۷، ۱۵۶۔ گرفتھ ۱۹۷۶، ۲۱: حاشیہ ۱۱، میکڈانل اور کیتھ I، ۷، ۴۲) پسالکر تو بہت واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ان پنی یا پانٹری لوگوں کا تشخص ابھی تک نہیں ہو سکا [موجمدار (ایڈیٹر): ۲۴۹]

داس اور داسیو بھی ویسے ہی قبائل ہیں جن کا کوئی تشخص نہیں ہو پایا۔ لوگ اپنی اپنی تعبیرات پیش کرتے ہیں، کوئی انہیں

دراوڑوں سے ملاتا ہے۔ کوئی بھیلوں سے یا گونڈوں سے یا اور قبائل سے۔ لیکن ابھی تک کوئی متفقہ علیہ تاویل سامنے نہیں آئی اس ضمن میں بھی محولہ بالا دانشوروں سے استناد کیا جا سکتا ہے۔

ان حالات میں رگ وید کو یا کسی اور وید کو تاریخ کی ترتیب کی بنیاد بنانا ایک انتہائی کمزور اور خطرناک عمل ہے جس سے اجتناب یا احتیاط کی اشد ضرورت ہے۔

یجروید

یہ آریائی زبان بولنے والوں کا دوسرا وید ہے۔ اس کا بہت سا حصہ رگ وید سے ماخوذ ہے۔ لیکن اصلی متن سے اس کا اختلاف بھی ہے اور یہ اختلاف کافی نمایاں ہے۔ اس کا کچھ حصہ نثر پر مشتمل ہے اور بہت بعد کا اضافہ ہے۔ اس وید کا جغرافیائی ماحول بھی رگ وید سے مختلف ہے بجائے پنجاب کے دریاؤں کے اس وید میں ستلج، جمنا اور گنگا کا ذکر نمایاں ہے۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ پجاریوں کے لیے ضابطوں کی ایک کتاب ہے جس کی قربانیوں کے وقت شدید پیروی لازمی تھی۔ قربانی کی جگہ کا انتخاب، آگ جلانے کے لیے "ویدی" کی تعمیر اور اس کی بناوٹ، پہلے دن کے چاند پر اور چودھویں کے چاند پر قربانیاں اور اشومیدھ یگیہ کے بارے میں اصول ضابطے اور ہدایات اس وید کا خاص موضوع ہیں۔ ان ضابطوں اور ہدایات میں اختلاف کی وجہ سے اس وید کی کئی شاکھائیں وجود میں آئیں اور پاتنجلی (۲۰۰ ق م) کے زمانے میں ایک سو سے زیادہ شاکھائیں تھیں۔ اب صرف دو ہیں۔ ان شاکھاؤں کے اختلاف اس کے متن کی وجہ سے نہیں تھے، بلکہ ان کی بنا ان مناجات کی ترتیب اور تنظیم تھی۔ تیتریہ سمہتا جسے کالا یجر وید بھی کہا جاتا ہے تیسری صدی ق م میں موجود تھا۔ یہ اس وید کا قدیم ترین حصہ ہے۔ یجر وید کے اس حصے کو مختلف ٹکڑوں کا ناقابل ہضم مجموعہ" بھی کہا گیا ہے۔ اس مجموعے میں منتر اور براہمن حصے میں واضح امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔ گھوش بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ [موجمدار (ایڈیٹر) ۲۳۱] اس کو کالا اس کے ابہام کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ سفید یجر وید کہلاتا ہے۔ اس حصے کو رشی واجسنیہ نے مرتب کیا۔ یہ حصہ کالے یجر وید سے زیادہ منظم ہے (ڈاکر II: ۶۱۳، ۶۱۴)۔ گھوش اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ اس کتاب کی تاریخ کا تعین ابھی تک الجھا ہوا مسئلہ ہے اور لسانیاتی بنیادوں پر اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا [موجمدار (ایڈیٹر) ۲۳] یجر وید کے کالے حصے سے چار اپنشد منسلک ہیں: (۱) تیتریہ (۲) کٹھا (۳) تیری اور (۴) شویت اسوتر سفید یجر وید کے دو اپنشد ہیں: (۱) برہدرانیاکہ اور (۲) ایشا۔

سام وید

یہ تیسرا وید ہے اس میں ۱۵۴۵ اشعار ہیں اور سوائے ۷۵ اشعار کے تمام کے تمام رگ وید سے لیے گئے ہیں۔ اس اخذ کردہ مواد میں بعض تو پوری کی پوری مناجات ہیں بعض رگ وید کی مناجاتوں کے ٹکڑے ہیں اور بعض صرف ایک آدھا شعر۔ قربانیوں کے پیش نظر ان مناجاتوں کی ترتیب بھی مخصوص ہے اور رگ وید میں ان مناجاتوں یا اشعار کی ترتیب مختلف ہے۔ یہ اختلاف بعض اوقات تو توضیحی ہے اور بعض اوقات متعلقہ شعر یا مناجات رگ وید کے تقابل پر اس سے بھی پرانی لگتی ہے (گرفتھ ۱۹۲۶: ااا)

کسی زمانے میں اس کے ایک سے زیادہ مختلف متن تھے لیکن ہم تک صرف تین ہی پہنچ سکے ہیں (۱) کوتھامہ: یہ متن گجرات میں مستعمل ہے (۲) رانائینہ: اس کی پیروی مہاراشٹر کے علاقے میں ہوتی ہے (۳) جیمینیہ: کرناٹک میں مقبول ہے۔

اس وید کی مناجات کے مخاطب سوم، اندر اور اگنی ہیں۔ اس کتاب کے ماہرین کی نظر میں اس وید کی نظموں کی ادبی حیثیت زیادہ نہیں ہے اور رگ وید سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے ان کی کوئی تاریخی اہمیت بھی نہیں ہے۔ چونکہ یہ مناجات پڑھی نہیں بلکہ گائی جاتی تھیں اس لیے سام وید کی غنائی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس سے متعلق شکشاؤں میں موسیقی سے متعلق بہت مواد

ملتا ہے۔ جیراز بھائی کے تجزیے کے مطابق رگ وید کے زمانے میں موسیقی کے صرف تین سُور استعمال ہوتے تھے۔ [باشم (ایڈیٹر)، ۲۱۳]
لیکن سام وید میں ہمارا سکیل نہ صرف مکمل ہوا بلکہ موسیقی کے ارتقا کے اصول بھی معین ہوئے جن کا ایک انتہائی مختصر خلاصہ یہ ہے :

۱۔ سام وید نے ہمارے غنائی سکیل کی تکمیل کی۔
۲۔ موچھنا کا عمل جس کے تحت سکیل کے کسی سور کو غنائی تالیف کا مقام آغاز بنایا جا سکتا ہے، کے اصول مرتب ہوئے۔
۳۔ سام وکار اور اس کے چھ اصولوں کو بطور عمل کے تسلیم کیا گیا۔
۴۔ اگر سام وید کے مناجات گاتے وقت تال استعمال نہیں ہوتی تھی لیکن لے کا تصور موجود تھا اور اس کے تین درجے تسلیم ہو چکے تھے۔
۵۔ موسیقی کی ایک انوکھی رسم جس کے ذریعے ہاتھ کی انگلیوں سے سوروں کا اظہار کیا جاتا تھا، اسی زمانے میں مروج ہوئی۔ (گوتم : ۲-۴)

سام وید سے صرف دو اپنشد متعلق ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں :

(۱) چھندوگیہ اپنشد، جس کے مصنفین میں سے مشہور و معروف سندیلیہ ہے جس کا قول "تت توم اسی" بہت مقبول ہے۔
(۲) کینا یا کینو اپنشد جو جیمینی براہمن کا دسواں باب ہے۔

اتھروید تاریخی لحاظ سے یہ ہندوؤں کی چوتھی کتاب ہے۔ اس کا تقریباً چھٹا حصہ منظوم مناجاتوں پر مشتمل ہے جو رگ کے پہلے، آٹھویں اور دسویں منڈل سے ماخوذ ہیں۔ اس کا دوسرا چھٹا حصہ نثر ہے۔ اتھر وید کا موضوع مخصوص ہے۔ اس میں جادو، ٹونے، ٹوٹکے، جھاڑ پھونک اور گنڈوں کے طریقے دیئے گئے ہیں۔ اس حصے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں ان منتروں اور عملیات کا مقصد خیر ہے۔ علاج، معالجہ اور عافیت ـــــ ان سے بخار، مرگی، کوڑھ، یرقان، زچگی، بانجھ پن، نامردی کا علاج، اولاد نرینہ کے حصول میں کامیابی اور عشق و محبت میں کامیابی ہیں۔ ایک ایسا منتر بھی ہے جس کے پڑھنے کا مقصد گھر والوں کو سلا دینا ہے تاکہ عاشق اپنی محبوبہ کے گھر بغیر خوف کے داخل ہو سکے۔

اس کا دوسرا حصہ "ابھی چار" ہے۔ اس میں دشمنوں کو برباد کرنے کے لیے منتر اور عملیات درج ہیں جن کا مقصد دشمنوں میں بدبختی پھیلانا، دشمن کو نامرد بنانا، سوکن کو ہمیشہ کے لیے بانجھ رکھنا وغیرہ ہیں۔ ان منتروں میں جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں جنسی اختلاط کے بارے میں عبارات ملتی ہیں جن میں سے کچھ تو فحش نگاری کی گھناؤنی مثالیں ہیں۔ پجاریوں اور پجارنوں کے جنسی اختلاط کے بارے میں گفتگو انتہائی قبیح طریقے سے اس کی تفصیلات بیان کرتی ہے۔ جنسی اختلاط کو علامتی طریقے سے بھی واضح کیا گیا ہے اور اسے دو لکڑیوں کو اوپر نیچے رکھ کر رگڑنے سے آگ پیدا کرنے کے عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ ویدک ادب میں بار بار دہرائی گئی ہے۔

اس وید کو برہم وید بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ قوانین اور ضابطے دیئے گئے ہیں جن کی قربانی کے وقت پابندی براہمنوں اور پجاریوں کے لیے لازم تھی۔ برہمنوں کے احترام اور ان کے سماجی مراتب کے حق میں اس وید میں بہت مواد ہے۔

اس کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ متخصصین کے خیال میں اس کے مصنفین میں ایک اتھروان تھا جو ایک ایرانی مجوسی تھا، ایک اور مصنف کا تعلق آریاؤں سے ماقبل کے زمانے سے تھا۔ اس وید کو جمع کرنے والا بھی آریاؤں سے قبل کا ایک رشی انگی سارا تھا۔ اس نے اس مجموعے کو مرتب کرنے کے لیے رشی ویاس کے حوالے کیا۔

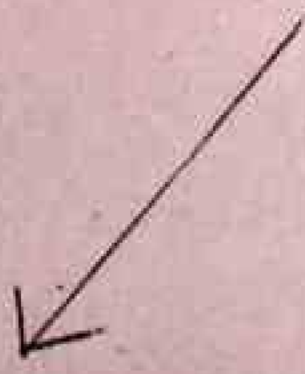
دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ منو اور شاید ۲۰۰ ق م سے ۱۰۰ء تک کے زمانے تک اس کو آریاؤں کے مذہبی صحائف میں شامل نہیں کیا گیا۔ منو نے بھی اس کتاب کو بطور وید قبول نہیں کیا اور احترام کے اس رتبہ سے جس پر رگ، سام اور یجر وید فائز تھے، اس کو محروم رکھا۔ یہ خیال تھا کہ پہلے تین وید آگ، ہوا اور سورج سے حاصل کیے گئے ہیں۔ چندوگیہ اپنشد ایک اہم اپنشد ہے۔ یہ بھی اتھر وید کا ذکر نہیں کرتا۔ بدھی جاتکاؤں میں بھی صرف تین ویدوں کا ہی ذکر ہے اور اتھر وید کا یہیں کوئی نشان ان میں نہیں ملتا۔ میکس میولر کا خیال بھی یہی ہے کہ وید حقیقت میں تین ہی تھے۔ چوتھے یعنی اتھر وید کا اضافہ بعد میں ہوا۔ (واکر I.۹۴)

محققین کا خیال ہے کہ جب پہلے تین وید تیار ہو رہے تھے اس وقت اتھر وید کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ بہت بعد کی کتاب ہے اس وجہ سے صدیوں تک اس کتاب کو وید کا درجہ نہیں دیا گیا۔ جنوبی ہند کے علما آج بھی اس کتاب کی حیثیت بطور ایک وید کے مشکوک خیال کرتے ہیں (زیہنر ۱۹۷۶-۳۸)

دوسری طرف ایسے محقق ہیں جو اپنی توجہ اس کے نفس مضمون پر مرکوز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آریائی قبائل کی ہند میں آمد سے پہلے کی کتاب ہے۔ (زیہنر ۱۹۷۶: ۳۸) بندھاد کر نے اپنی کتاب Some Aspects of Ancient Indian Culture. 1940. میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اتھر وید کا تعلق آشوریوں کے عقاید و عملیات سے بہت مضبوط ہے۔ کچھ دانشور اس میں مجوسی اور "دریتیا" مذہب کی باقیات بھی دیکھتے ہیں۔ بال گنگادھر تلک نے اس میں کلدانی الفاظ بھی تلاش کیے جن کا تعلق مجوسیت سے ہے۔ شاید اسی مجوسی نسبت ہی کی وجہ سے آریاؤں نے نجومیوں کو اپنی مذہبی قربانیوں سے دور رکھا۔ نجومیوں کو شرادھوں تک میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ طبیبوں سے بھی یہی سلوک روا رکھا جاتا تھا کیونکہ ان کو بھی مجوسیت سے متعلق خیال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اور لسانی اعتبار سے اتھر وید کو ہندوؤں کی تمام کتابوں سے قدیم تر خیال کیا جاتا ہے۔ آپٹے کے خیال میں اس کا منتروں والا حصہ لسانی اور عروضی اعتبار سے اگرچہ رگ وید سے بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کئی الفاظ جو صرف اسی وید سے مخصوص ہیں تاریخ سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں [موجمدار (ایڈیٹر) ۱، ۴۰۷] چنانچہ اس کی نسبت ہندوستان کے قدیم قبائل سے جو آریاؤں کی آمد سے پہلے یہاں آباد تھے جوڑی جا سکتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اتھر وید ایک بے مثل کتاب ہے جس میں آریاؤں سے قبل کے عقاید، مذاہب، رسوم و رواج کا بڑا حصہ ہے جس کو آریا متاثر نہ کر سکے۔

موجودہ صورت میں آنے سے پہلے اس کتاب کے دو متن تھے اس وقت صرف پائپیلاد اور شونا کہ ملتے ہیں۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ راتھ نے اتھر وید کا وہ نسخہ جو Tubingen نسخہ کہلاتا ہے، دریافت کیا تھا۔ یہ پائپیلاد متن ہی تھا جو راتھ کو اکٹھا مل گیا تھا۔ اتھر وید کے ساتھ منسلک اپنشدوں کے نام یہ ہیں:

(۱) منڈکا (۲) منڈوکیہ (۳) پرشنا (واکر II ۵۳۳-۵۳۹)



BIBLIOGRAPHY

1. Ambedker, B.R., — Who Were Shudras, Bombay, 1946
2. Basham, A.L., — The World That Was India London, 1954
3. -------(ed)., — A Cultural History of India, Clarendon Press, London, 1975
4. Bhattacharji, Sukumari., — The Indian Theogony, Cmabridge University Press, 1970.
5. Bouquet, A.C., — Hinduism, Hutchison University, Library, London, 3rd impression 1966.
6. Budha Prakash, — Political & Social Movements in the Ancient Punjab, Lahore, 1976.
7. Chattopadha. Debiprashad, — Indian Philosophy, Peoples Publishing House, Delhi, Reprint 1972.
8. Danielou, Allain, — The Vedic Hymns, First Lecture of a Series of Twelve Lectures on the Music of Orient & Occident. Unesco, 1960.
9. Dawson, John., — A Classical Dictionary of Hindu Mythology Religion, Geography, History and Literatures, Manu Publication, New Delhi, Reprint 1978.
10. Gonda, J., — The Dual Dieties in The Religion of the Vedas, North Holland Publishing Co. London, 1974.
11. Griffith, T.H. Ralph., — The Hymns of the Rgveda (ed.) Shastri, Motilal Banarsidas, Delhi, Reprint 1976.
12. ----------------------., — Hymns of The Samaveda, Lazarus & Co. Benares, 1926.
13. Gautam, Dr. M.R., — The Musical Heritage of India, Abhinav Publications, New Delhi, 1980.
14. Krishnan, S.N., — Geology of India and Burma, Niggilesthan, Madras, 1960.
15. Macdonall, A.A., — History of Sankrit Literature, London, 1900.
16. --------------., — Vedic Mythology, Straussburg, 1897.
17. ------------and Keith, A.B., — Vedic Index of Names and Subjects 2 Vol. MLBD., Reprint, Delhi, 1982.

18. Majumdar, R.C. (ed)., The Vedic Age, Allen & Unwin, 3rd Impression, 1957.
19. Mujeeb, M., Tareekh-i-Tamadan-e-Hind, (Urdu) Progressive Books, Lahore, 1986.
20. Max-Muller, (tr)., The Upanishads (2 Vol.) Dover, New York, Reprint, 1962.
21. Oldenberg, H., Ancient India, Its Language & Religion, Calcutta, Reprint, 1962.
22. Rapson, E.J., Ancient India, Cambridge, 1914.
23. Rawlinson, H.G., India, A Short Cultural History, The Crescent Press, London, Paperback 1965.
24. Renou, Louis., The Religion of Ancient India, London.
25. Sircar, D.C., Studies in Geography of Ancient and Medieval, India, Motilal Banarsidas, New Delhi, 1971.
26. Levy-Straus, Claud., Structural Anthropology, Penguin, London, 1978, Vol. II.
27. Tirath, Swami Ram., The Menace of Hindu Imperialism, Lahore, 2nd. ed. 1946.
28. Walker, Benjamin., The Hindu World 2 Vol. Allen & Unwin, London 1968.
29. Wheeler, Sir Mortimer., Early India and Pakistan, Thames & Hudson, London, New Impression., 1968.
30. Zaehner, R.C., Hinduism, O.U.P. Reprint 1976.
31. ------------ (ed)., The Concise Encyclopedia of Living Faiths, Hutchinson, London, 2nd ed. 1971.
32. Zimmer, H., Philosophies of India, (ed) Joseph Campbell, Bolingen Series XXVI, Pantheon Books, New York, 2nd printing 1953.

شبلی اور نقادانِ شبلی

ڈاکٹر حنیف فوق

شبلی اردو ادب کی دیو قامت ہستیوں میں سے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس سلسلے کا نشانِ ارتباط بھی ہیں جو شیخ احمد مجدد الفِ ثانی کے اندیشۂ اول سے لے کر شاہ ولی اللہ، سر سید اور اقبال کے افکار بلیغ سے توانائی پاتا ہوا، تصورِ پاکستان تک پہنچتا ہے۔ شبلی نے اپنے عصر کی بیداری کو جذب کیا اور برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ شبلی عصرِ حاضر کی تاریخ میں اس دصنی تبدیلی کو بھی پیش کرتے ہیں جو مختلف حیثیتوں اور صورتوں سے عالمِ اسلام کا حصہ بن گئی تھی۔ شبلی کے تخلیقی جوہر نے ادبی، تنقیدی، تاریخی، فکری اور تہذیبی، غرض کہ مختلف سمتوں میں اثر دکھایا ہے لیکن ان سب میں جستجو اور اجتماعی جہت کا احساس ہوتا ہے۔ شبلی کو رومانی نقاد، مسلمانوں میں پہلا یونانی اور برصغیر میں تاریخ کا معلمِ اول کہنے سے بھی حالاتِ عصر کے وہ مختلف گوشے سامنے نہیں آتے، جن کے وہ ترجمان رہے ہیں۔ ایک طرف شبلی کی ذات سے سیرت، سوانح نگاری، تاریخ، تنقید، انشا پردازی، مقالہ نگاری، سفرنامہ، شاعری، مکتوب نگاری، اور ترجمہ کے مختلف اصناف کو فروغ حاصل ہوا اور دوسری طرف قدیم و جدید کے تضاد و امتزاج کو پیش کرتے ہوئے ان کی روایت دوستی اور تعقل پسندی نے فکر و فن کے نئے چراغ روشن کئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تمام ادبی و فکری سرگرمیاں ایک عملی رخ رکھتی تھیں اور اس برصغیر کی سیاسی و تہذیبی زندگی میں اس طرح پیوست تھیں کہ بعد کی نسلوں کے لئے بھی دائرۂ نور بن گئیں اور آج بھی حالات و تصورات کے فرق کے باوجود اُن سے نظر کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔

شبلی اس خیال کی عملی نفی کرتے ہیں کہ تاریخ مردہ سیاست ہے اور سیاست زندہ تاریخ ہے۔ اُن کی تاریخ نگاری میں اپنے دور کی سیاسی زندگی کے تصورات جیتے جاگتے نظر آتے ہیں اور ان کی سیاست صدیوں کی تاریخ سے رہنمائی پاتی اور مسلم ثقافتی و تصوراتی تشخصات کا آئینہ دکھاتی ہے۔ ان کی بصیرت ان سادہ لوحوں کی بصیرت سے مختلف ہے، جو مردہ کتابوں کے چند بوسیدہ جملوں سے تعبیرِ ادب یا فہمِ تاریخ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شبلی اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے اس کی ان متحرک اور مخصوص صورتوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں جو حال کی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے تصورات حال سے ماضی اور ماضی سے حال کی جانب سفر کرتے ہیں اور دانشِ مستقبل کی نوعیت رکھتے ہیں۔ وہ برطانوی اقتدار کے خلاف برصغیر کی تمام قوموں کے مشترکہ محاذ کے قائل ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو قومی تشخص کا وہ شعور عطا کرتے ہیں کہ جو اس برصغیر میں ان کی عددی اقلیت کی تلافی، عالمِ اسلام کی وسیع تر یک جہتی سے کرتا ہے۔

مسلم تاریخ و تمدن اور مسلم تہذیبی مظاہر، شبلی کی علمی سرگرمیوں کے محرک رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے عصری تقاضوں، عالمِ اسلام کی وسیع صورتوں اور برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی ضرورتوں کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ان کے لئے ایک فرد پوری ہیئتِ اجتماعی کو روشن کرنے والا نقطہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ الفاروقؓ سے اورنگ زیب عالمگیر تک یہی روشن نقطے ملتے ہیں۔ وہ غزالیؒ ہوں، ابو حنیفہؒ ہوں، مامون یا زیب النساء، ان افراد کے واسطے سے شبلی اجتماعی تصورات

تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے اس سلسلے کا مرکز، نور اور ان کی اپنی سعی کا خاتمہ بالخیر خود رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔ شبلی نے اقبال سے پہلے مولانا روم کی شاعری کے حرکی تصورات کو پہچانا اور انھیں متکلمین کی صف میں جگہ دی ہے۔ ان کی ادبی تاریخ اور تنقید میں بھی خواہ شعر العجم ہو، موازنہ انیس و دبیر ہو، یا بیانِ خسرو، وہ لفظ و معنی کے رشتے سے تہذیبی تخیلات تک رسائی چاہتے ہیں۔ وہ مسلم تاریخ کا خواہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ہو یا دیگر تاریخی مضامین، ایک عصری نہج سے مطالعہ کرتے ہیں، اس لئے جب وہ شعر کی زبان میں کہتے ہیں کہ "داستان ہائے پاستان تا چند" اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

زین بساطِ کہن جو بہ جیزم   پیکرے تازۂ برانگیزم
رسم دیرینہ را برانداز م   در سخن طرحِ دیگر اندازم

تو یہ ان کے رجحانِ تاریخ کی نفی نہیں بلکہ ان کے تصورِ تاریخ کی وضاحت ہے۔ یہی تصورِ تاریخ انھیں ماضی کے انبار سے مستقبل پر اثر انداز حال کا سرمایہ فراہم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی ان نظموں سے لے کر جن میں بلقان کے سیلاب بلا اور کشتگان کانپور کا ذکر ہے، ان کی ان غزلوں تک میں کہ جن میں بقول حالی خمارِ چشمِ ساقی ملا ہوا ہے۔ عصری میلانات کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

شبلی کی فکر ایک اعتبار سے اس انگریزی سامراجی فکر کا جواب بھی ہے جو خود ان کے دور میں "عظیم تر برطانیہ" کا تصور پیش کر رہی تھی (سر چارلس ونٹورتھ ڈلکے (۱۹۱۱-۱۸۴۳) یا محکوم ملکوں کے باشندوں کو "نو گرفتار، آدھے بچے اور آدھے شیطان، کج خلق آدمیوں" کا روپ دے کر اپنی برتری ثابت کر رہی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ (۱۹۳۶-۱۸۶۵)۔ لیکن شبلی کی تحریریں محض جوابی یا معذرتی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کی اپنی تاریخ و تہذیب سے تعلق کی مثبت بنیادیں بھی ہیں۔ وہ مسلم تاریخ کے سلسلہ اکابر کو پیش کرتے ہوئے نہ اجتماعی بہبودی کے تصور سے دور ہوتے ہیں اور نہ سماجی اعمال کی معنویت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کی مسلم اکابر کی سوانح، تاریخ نگاری، ادبی اکابر کی سوانح، ادبی تنقید اور ادبی تاریخ نگاری میں، وہی روح کارفرما ہے جو ان کے فلسفۂ کلام کی محرک ہے اور جسے اپنے دور کے سیاسی و اجتماعی اضطراب کے ساتھ ساتھ مسلم روایات کے شعور نے فعال بنایا ہے۔ وہ بڑے آدمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی معاشرے کو مدنظر رکھتے ہیں کیونکہ یہ مسلم فکر کا اہم رخ رہا ہے۔ مسلم تاریخ نگاری کی روایات میں ابن خلدون کی تاریخ نگاری ہی سے علم عمرانیات کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر مسلمانوں کا تصورِ تاریخ جہاں اس تصورِ سرابِ تاریخ سے مختلف رہا ہے جس کے اعتبار سے لاتناہی وقت کے پس منظر میں تاریخ کا سفر محض فریب یا مایا کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں اس تصورِ عذابِ تاریخ سے بھی الگ حیثیت رکھتا ہے جس میں تاریخ انسان کو صرف دکھ جھیلنے اور اذیت سہنے کا کردار عطا کرتی ہے۔ مسلم تصورِ تاریخ انسانی اعمال کو پُر معنی اور نتیجہ خیز قرار دیتا ہے۔ شبلی کی تاریخ نگاری جہاں تاریخ کے انسانی تشخص کو نمایاں کرتی ہے، وہاں اس میں ان کی اپنی بعض تحدیدات کے باوجود دورِ حاضر کے جمہوری رجحانات کا عکس بھی ملتا ہے۔ شبلی نے عصری علمی ترقی کے لحاظ سے مغرب سے استفادے میں مضائقہ نہیں سمجھا ہے اور ان کی تحریروں میں جدید علم عمرانیات سے حاصل کردہ نقوش جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مغرب کی سامراجی فکر کو رد کرتے ہوئے بھی شبلی مغرب کی علمی ترقی کے قائل ہیں۔ خود برصغیر کا مسلم معاشرہ اس دور میں مغرب کے رد و قبول کی منزلوں سے گزر رہا تھا اور یہ سلسلہ آج بھی باقی ہے۔ چنانچہ شبلی کی تحریریں اور بہ حیثیتِ مجموعی ان کی فکر برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنی تموجات کو پیش کرتی ہے اور ماضی و حال کے انطباق سے مستقبل کی نئی جستجو کا سنگ میل بن جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی جستجو ان حدود کی پابند رہتی ہے جنھیں سرسید کی فکر سے علیحدگی نے کچھ نئی جہتیں دیں تو کچھ تنگ بھی کر دیا تھا۔

مختلف سیاسی اور فکری محرکات کے درمیان، اپنے تشخص کی جستجو نے بالآخر برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئے سیاسی عمل کی راہ دکھائی جہاں ذات پات کے قیود سے آزاد معاشرے کے قیام کی خواہش انھیں ایک نئی مملکت کے تصور کی جانب لے گئی۔ وہاں نوآزاد اور ترقی پذیر ملکوں کے اتحاد کی ضرورت نے اشتراکِ عمل کی نئی بنیادیں فراہم کیں اور انسان دوستی کے تصور کو آگے بڑھایا۔ قدیم و جدید تہذیبی تصورات کی آویزش و امتزاج سے نئے تہذیبی نقوش بن رہے اور مستقبل کے نئے خاکے ابھر رہے ہیں لیکن ان خاکوں کے بنانے میں فکرِ شبلی کا جو حصہ ہے، اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید، شبلی اور اقبال ہمارے تہذیبی اور فکری منظرنامے کے روشن نشانات ہیں۔

شبلی نے اپنے دور کی ادبی، فکری اور علمی زندگی میں اتنا بھرپور حصہ لیا تھا کہ ان کے زمانے میں اور ان کے بعد ان کی ذات اور ان کی تخلیقات کی حمایت اور مخالفت میں ایک بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو نہ دیو، نہ فرشتہ، محض ایک انسان سمجھتے تھے، لیکن ان کی تحریروں کے تنوع اور خود ان کی رنگارنگی نے انھیں ادب میں موضوعِ بحث بنائے رکھا۔ جہاں شبلی کی انتہائی ستائش ملتی ہے، وہاں ان پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔ مداحان و نقادانِ شبلی کی تحریریں اب خود اردو ادب کا ایک سیر حاصل موضوع بن گئی ہیں اور "شبلیات" کے اس ذخیرہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

دراصل شبلی کے نقادوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ان کے طرزِ نگارش کے شیدا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شبلی کا اندازِ تحریر گوناگوں ادبی خوبیوں کا حامل ہے اور اس میں ان کی شخصیت اور علم دونوں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن یہ مطالعۂ شبلی کا محض ایک رخ ہے۔ کچھ وہ ہیں جو انھیں علی گڑھ اور سرسید کے واسطے سے دیکھتے ہیں اور بے جا طرفداری اور ناروا مخالفت کو راہ دیتے ہیں۔ معاصرانہ اختلافاتِ نظر کے امکان کے باوجود شبلی نے نیرنگِ خیال، حیاتِ سعدی اور تہذیب الاخلاق کو اردو زبان کا گنجینہ قرار دیا تھا اور حالی کی بڑائی یہ ہے کہ وہ شبلی کو ادب اور مشرقی تاریخ کا مخزن قرار دیتے ہیں لیکن حالی کو بھی شبلی کا حریف سمجھا گیا ہے اور شبلی پر قلم اٹھانے والوں میں سے بعض ان کے یا حالی کے ادبی مرتبہ کو کم یا زیادہ کرنے میں کوشاں رہے ہیں اور اس لئے ایک کے مقابلے میں دوسرے کو اٹھانا یا گرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض شبلی کی اسلام اور عالمِ اسلام سے وابستگی کو ان کا غیر منسلک ذاتی کارنامہ سمجھتے ہیں اور ان خارجی حالات یا متوازی کوششوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن سے شبلی کی نظر کو روشنی ملی تھی۔ کچھ شبلی کی ذاتی زندگی کے بعض حوالوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور ان ہی سے اپنی تحریر کو جاذبِ توجہ بناتے ہیں۔ جہاں شبلی کی بڑائی ثابت کرنے کے لئے ان کے بعض مداح سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک اور وقار الملک ہی نہیں آزاد، نذیر احمد اور حالی کے مقابلے میں ان کی برتری جتائے بغیر نہیں رہتے وہاں بعض نقادوں کے نزدیک حالی نے پرانی تنقید سے الگ ہو کر نئی تنقید کی ابتدا کی لیکن انھیں شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔ بعض ان کی تحریروں کو فرسودہ بتاتے، کچھ انھیں نیم عالم سے بھی کم قرار دیتے، اور کچھ ان کی تحریر کی رنگینی کے قائل ہوتے ہوئے بھی انھیں ہماری معاشرت میں ناکام دریزاد قرار دیتے۔ نئی روشنی کو سمجھنے سے قاصر بتاتے اور رجعت پسند ٹھہراتے ہیں۔ ایک جانب بعض مداحِ شبلی کی تربیتِ ذہنی میں سرسید اور تحریکِ سرسید کے اثر سے قطعی منکر ہیں، اور شبلی کی وسیع ذہنی فضا کو ان کی ذاتی اپج قرار دیتے ہیں تو دوسری جانب فکرِ سرسید سے شبلی کے انحراف کو محض ان کی خودنمائی اور ذاتی انا کا مسئلہ قرار دینے والے بھی موجود ہیں۔ بعض نقادوں نے شبلی اور سرسید کے اختلاف کو محض دو مزاجوں کا اختلاف کہا ہے اور بعض نے دونوں کے اختلاف سے زیادہ ان کے مداحوں کے اختلاف سے تعبیر کیا ہے۔ شبلی کی تحریروں کے علاوہ ان کے مزاج کے بعض رنگوں نے بھی مزاجوں کو برہم کیا ہے۔ شبلی پر ذاتی الزامات کی فہرست طویل ہے جس میں حسد، نرگسیت، شخصیت پرستی، جاہ پسندی، منافقت، غرض یہ کہ متعدد سنگین عیوب شامل ہیں۔ اس کے برخلاف شبلی کو خوش اوصاف، بونوں میں قدآور، جامع الکمالات، یکتائے فن، ایک دبستان اور نابغۂ روزگار کہنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ دراصل یہ تنازعہ خود اس امر کی

دلیل ہے کہ شبلی نے اپنے زمانہ کی فکر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور یہ اثرات اب تک محسوس کئے جا رہے ہیں۔
شبلی کی شخصیت میں مشرق کی روایات علمی اور مغرب کے اجتہاد فکری کو نئی آمیزش دینے کی جو صلاحیت تھی اس سے اردو ادب کے متعدد گوشے روشن ہوئے ہیں لیکن ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور نجی شخصیت کی رنگا رنگی کا جائزہ لینے میں صحیح توازن قائم نہ رہے تو قدم قدم پر مغالطہ کے امکانات ہیں۔ شبلی اور شبلیات کے مطالعہ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شبلی کا ادیب، فلسفی، مورخ، انشاپرداز، سیرت نگار، شاعر، علوم اسلامیہ کے ماہر، متکلم، نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے جائزہ لیتے اور ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی فکر کے مرکزی نقطہ کی تلاش کی جائے کہ یہ نقطہ ہیئت اجتماعی کے مستقبل کے خوابوں کا اشارہ ہے اور اسی کے اثر سے شبلی نے برصغیر کے باہر عالم اسلام کی جانب دیکھا ہے۔ دراصل فکر شبلی کا ان کے عصر سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر خود مطالعۂ شبلی ناقص رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شبلی کا مطالعہ، مستقبل کی جانب رخ رکھنے والی حریت خواہی کا مطالعہ ہے اور ان کی فکر سے نہ صرف مسلمانوں کی ارتقائی فکر روشن ہوتی ہے بلکہ وہ صورتیں بھی سامنے آتی ہیں کہ جب برصغیر ہی نہیں تمام عالم اسلام میں ذہنی بیداری نئی شمعیں جلا رہی تھی اور سامراجیت کے خلاف وسیع محاذ کی صورت میں انسانی جدوجہد نئے، مثبت فکری اور عملی پیکروں میں ڈھل رہی تھی۔

جنم روپ — ایک ناول

شاہین مفتی

دس برس پہلے چھپنے والے نظموں کے ایک مجموعے "بدن دریدہ" نے علمی و غیر علمی، ادبی و مذہبی، صحافتی و ریڈیائی حلقوں میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ لوگ اس قدر چونکے —— اس قدر کہ حیرت سے فہمیدہ ریاض کا منہ دیکھنے لگے۔ مصنفہ اور شاعرہ کو بغاوت کا علمبردار گردانا گیا۔ پھر ایک لمبی چوڑی شریفانہ یلغار کا موسم شروع ہوا۔ نفسیاتی طبی، مذہبی اور تاریخی حوالوں سے اُس کی شاعری اور نثر کو فحش قرار دیے جانے کا موسم جس میں مصنفہ کی ذات پر بہت کچھ اچھالا گیا اور اُس کی کتابوں پر (جن کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں) تعزیراتِ پاکستان کی اخلاقی حدبندیاں عائد کرنے کے فتوے جاری کیے گئے۔ نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ ہم پاکستانی اس فرقۂ جاریہ کے ہاتھوں اپنی ایک عظیم لکھاری کو شعوری اور لاشعوری طور پر ملک بدر (اس کی بہت سی قسمیں اور معیارات ہیں) کرنے میں آخر کار کامیاب ہو گئے[1]۔ فہمیدہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اُس نے کہا تھا:

اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے

اور کچھ پوچھے

اس مردانہ معاشرے میں اول تو اللہ کا اقلیما سے مخاطب ہونا ہی بعید از قیاس ہے اور اس سے آگے پوچھنے والا سنگین مذاق! توبہ توبہ!! اقبال کا مشہور زمانہ مصرعہ دیکھیے ع

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

فرق صاف ظاہر ہے۔ اقلیما "بندہ" نہیں، صرف "بندی" ہے بلکہ بندی دان۔

دس برس بعد اقلیما اپنے آپ کو توڑ توڑ کر، جوڑ جوڑ کر کشور ناہید کی کتاب "عورت خواب اور خاک کے درمیان" ظاہر کرتی ہے۔ کشور نے "اقرارِ گناہ" کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے اردگرد عورت کے مسائل کا گنشالسٹ تھا، موتناز تھا مجھے فرامیڈین تھیوری کے خلاف زندہ رہنا تھا، مجھے عورت کے وقار ایسے وعدہ آلود لفظوں کے کہرے سے نکل کر زندگی تلاش کرنا تھا مجھے ایسی کتھا کھولنا تھا جس کے آغاز میں انجام کا اندازہ کبھی نہیں ہوتا ہے۔"

المیہ وہی کہ فہمیدہ بولے تو فحش نگار، کشور بولے تو یہ الزام کہ:

"عورت ہے مگر تمامتر انداز مردانہ ہیں۔ مردوں کی طرح ہنستی، باتیں کرتی، مردوں سے ہاتھ ملاتی اور مردانہ قسم کے لطیفے سناتی ہے۔ میں تو اپنی بیوی کو اس سے اکیلے ملنے نہیں دیتا ہوں۔"

---

[1] تازہ اطلاع کے مطابق فہمیدہ واپس پاکستان تشریف لے آئی ہیں —— ادارہ

اسی سلسلے میں اور بہت سے ناموں کے ساتھ ساتھ دو معتبر نام واجدہ تبسم اور عصمت چغتائی کے بھی ہیں لیکن آزادی کے باعث اب وہ نئے قارئین کے لئے پرانی ہو چکی ہے۔ حوالہ تو امرتا پریتم کا بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ کچھ اصحاب اور اعصاب پر گراں گذرے۔

بہرحال حیرت اور استعجاب کا لمحہ ہے کہ دس برس پہلے جب پاکستانی معاشرہ بہت سے لوگوں کے کہنے کے مطابق اسلام سے بے بہرہ تھا "بدن دریدہ" یا اسی قماش کی دوسری کتابوں پر حرف زنی کی جاتی تھی بلکہ انگلیاں اٹھانا عین جہاد تھا اور کئی شرفاء ایسے بھی تھے جو نصوح کی طرح اپنے بیٹے کلیم کے کتب خانے کو آگ دکھا کر ثواب کماتے تھے۔ عہد حاضر تک آتے آتے اس لمحے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ گذشتہ تین چار برس کے نثری اور شعری ادب کا جائزہ لیجیے۔ خدا کی شان دکھائی دیتی ہے۔ پوچھنے والے پوچھتے ہیں۔

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

جواب میں سارے حوالے مغرب سے قلم زد کئے جاتے ہیں۔

تاہم اس لمبی چوڑی تمہید اور بے شمار جملہ ہائے معترضہ کے بعد کہنا صرف یہ ہے کہ فہمیدہ، کشور، یا نو اور دوسری بہت سی "اقلیماؤں" کو تہنیت ہو کہ ان کے عہد کا مرد، عورت کو فرد تسلیم کرنے لگا ہے اور اس کے بارے میں اسی طرح سوچنے لگا ہے جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں کر چکی ہیں۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر انور سجاد کے طبعزاد ناول "جنم روپ" کی عورت کوئی مخصوص عورت نہیں۔ وہ اس معاشرے کی تھکی ہوئی دبی ہوئی عورت ہے۔ دھرتی کی طرح آسمان اور موسموں کے عذاب سہتی ہوئی، کائنات کی طرح لامتناہی اور ایٹم کی طرح سمٹی ہوئی، آدمیوں سے کٹ کر پتھر سے وصال مانگتی ہوئی، اصلی اور خالص مرد کی متلاشی، تحفظ اور محبت کے بے ریا خواب دیکھنے والی، نئے سپوتوں کو جنم دینے کی خواہش مند، حلق سے پھنس پھنس کر نکلتی مکارانہ ہنسی والی جادوگرنی مسرت کی متلاشی، کسی کی نہ گذاری ہوئی زندگی بسر کرنے والی مجبور و مقہور ہستی "وہ چلتی ہے آہستہ آہستہ منوں بوجھ اٹھائے سر تنا ہوا، تلاش نفی کرنے والوں کا خار دار جنگل، تلاش شہر کی رگوں میں دوڑتی سورج پچھلی جنم کی شہادت آسمانوں میں ڈھونڈنے کا موسم نہیں"، وہ بھاگتی پھرتی ہے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر میاں پوترو، میاں پوترو، میاں پوتر پکارتی اور اپنے مرد کو آوازیں دیتی ہوئی "آؤ کہ پہاڑوں سے اتر کر میدانوں میں پھیلے دریاؤں کی زرخیز مٹی ایک بار پھر معجزے کو جنم دے ــــ آؤ! آؤ! آؤ!"

تم کو معلوم کیا تم کو معلوم کیا
تم نے جانے مجھے کیا سے کیا کر دیا
میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
بیکراں تاکراں ایک انمٹ خلا
یوں ہی بھرتی تھی میں
زیست کے ذائقے کو ترستی تھی میں
تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا
پھوٹتی ہے مرے جسم سے روشنی

....

خاک پر بسنے والے بشر کو مسرت کے جتنے بھی نغمے سنائے گئے
سب رشی، سب منی، انبیاء، اولیاء
خیر کے دیوتا، حسن نیکی خدا
آج سب پر مجھے
اعتبار آ گیا
(لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا)

ڈاکٹر انور سجاد نے "جنم روپ" کی بنیاد جنس اور سماج کے بنیادی رویوں پر رکھی ہے۔ مرد اور عورت کے رشتے کو کائنات کا مرکز بنایا ہے اور محبت کو ــــــ اصلی، سچی اور خالص محبت کو تخلیق کا استعارہ قرار دیا ہے۔ انسانوں کے درمیان ہم آہنگی مرد اور عورت کے درمیان ہم آہنگی، معاشرتی اقدار کے درمیان ہم آہنگی، کائنات کی ہر وجود روح اور مادے کا مظہر ہے ان سب کے درمیان توازن، یہی وہ ابدی سچائیاں ہیں جو کسی فوق البشر یا انسانِ کامل کی پیدائش میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

مصنف نے اپنے عہد کی ناآسودہ، سکڑی ہوئی، جکڑی ہوئی، غیر فطری، تکلف زدہ اور ریاکارانہ زندگی بسر کرنے والی عورت کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جس مرد کا نقشہ کھینچا ہے وہ تخلیق کے جوہر سے ناآشنا ہے۔ "ان کے وجود اپنی پوری کوشش کے باوجود زمین میں جڑ نہیں پکڑتے۔" چنانچہ اس عہد کی عورت سوچتی ہے:

"وہ کون ہے کہاں ہے میرے ساتھ نہیں تو اُسے کیسے پاؤں کہ اُس کے کندھوں پر سر رکھ کر اُنھوں اور وقت کی گردن سے پھندا اتار کے راکھ کر دوں۔"

مگر:

"چاروں جانب بے تعداد گھورتی آنکھیں، ہر آنکھ فرعون کی، خاوندی کا دعویٰ لئے، اُس کی کوکھ پر ثبت جیسے حجری نقوش وہ اپنے خاوند کی شناخت کیسے کرے، دیواروں میں چنی نظریں، وہ سوچتی ہے کیا دیوار میں چنی نظروں کو رہا کرانے کے لئے دیوار کا گرا دینا ضروری نہیں تاکہ گود خوابوں سے ہری ہو۔"
"گوشت پوست سے بنے اپنے ہی قد کاٹھ کے گڈے کی بانہیں اُسے سمیٹ لیتی ہیں، بے جان گوشت کا گڈا۔"

فہمیدہ کہتی ہے:

میں کہ بنتِ ہجر ہوں
مجھ میں ایسی آگ ہے
میں کہ میرے واسطے
وصل بھی فراق ہے

تاہم کہانی کے اختتام پر گبھرو جوان تلوار سونتے اپنی ماں کے ماتھے پر آئے دھڑکتے پسینے کو اپنے ہونٹوں میں سمیٹ کر اپنے باپ کے لہو کا ذائقہ چکھتا ہے۔ دمادم صدائے کن فیکون کہیں نہیں، میاں پوتر وکا جنم خاک کے پردے سے انسان کے نکلنے کا دشوار عمل ہے۔ تکلیف دہ، اذیت ناک، خواب اور خوشبو میں لپٹا، کثافت سے اٹا ہو، نرگس کی ہزاروں سال رونے والی آنکھ کا دیدہ ور اور شاعری کی زبان میں:

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

"اُس کا سر فخر سے تن جاتا ہے، میاں پوتر و میرا بیٹا۔"

ناول میں کہانی، پلاٹ، آغاز، عروج، انجام ہر چند کہیں ہے کہیں نہیں ہے۔ کئی مقامات پر مصنف نے بڑی شاعرانہ اور تصوراتی زبان استعمال کی ہے۔ اپنے علم اور معلومات کو خوبصورتی سے یک جا کیا ہے، لیکن کہانی کی عدم موجودگی اور ربط داکائی کا مفقود ہونا ناول کے تاثر کو مجروح کرتا ہے (ہو سکتا ہے مصنف ان تمام چیزوں کو غیر ضروری سمجھتا ہو اور اس نے جان بوجھ کر پانی کو گدلا کر دیا ہو تاکہ وہ گہرا اور عمیق نظر آئے) تاہم پبلک کی سہولت کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ "جنم روپ" کے تجریدی قصے کا اختصار اور ابہام ایک بھرپور تخلیقی عمل کی خواہش ہے، جو نئے سپوتوں کو جنم دینے کا استعارہ ہے۔

سارا ناول لہو کے تلذذ، کراہت اور امتلاء میں ڈوبا ہوا ہے، یہاں تک کہ خوبصورت تراکیب، اچھی اچھی اور بڑی بڑی باتیں اور حسین مناظر اور خواب زا فضائیں بھی اس کثافت کی مقدار کم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

فلیپ پر مصنف کے یہ الفاظ درج ہیں:

"میں نے یہ ناول ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے اور یہ ناول اپنی زندگی سے بڑھ کر اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ یہ ماضی سے چھٹے بغیر حال کے حوالے سے مستقبل کا سواگت کرے۔"

ایسی کتاب جس کا قاری اُسے پڑھتے سمے اپنے آپ سے، مصنف سے، کتاب سے، موضوع سے، الفاظ سے، جذبات سے متنفر ہو جائے کیا حقیقتاً ماضی کے بغیر مستقبل کا سواگت کر سکتی ہے؟ زمین کی اتھاہ سے جواب آتا ہے:

دھک، دھک، دھک، دھک!

تخلیقی فیصلے کا شاعر

نوازش علی

مجید امجد کی شاعری کو سمجھنے کی بنیادی کنجی لفظ 'فیصلہ' ہے۔ اس نے یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ تصورات، وہ تجربات اور وہ جذبات جو پہلے سے شاعری میں آ چکے ہیں، چاہے اس کی اپنی شاعری میں ہوں یا دوسرے شعرا کے ہاں منظوم ہو چکے ہوں اس کے لیے حرام ہیں۔ تکرار اُس کی شاعری کی شریعت میں کفر کا درجہ رکھتی ہے۔ اُس کے ہاں جو پیرایہ ہائے بیان اور تصورات و افکار پہلے نظم ہو چکے ہیں، وہ انھیں دوبارہ نظم نہیں کرتا۔ امجد انتہا درجے کی تکمیل پسندی کا قائل ہے۔ نظم تو ایک طرف وہ غزل میں بھی نئی ہیئت، نئی ردیف اور نئے قافیے کے نت نئے تجربات کرتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "مجید امجد کی غزل۔ ہیئت اور اظہار کا تنوع" مطبوعہ "ماہ نو" اکتوبر ۱۹۸۵ء)، وہ دلِ منت گزار کو ایک ہی بار سیراب کر لیتا ہے اور اپنی تمام حسرتیں ایک ہی جگہ پوری کر لیتا ہے۔ نوکاری اور نو آفرینی اس کی شاعری کا مذہب ہے۔ وہ خالص نیستی سے تخلیق کرتا ہے کیونکہ وہ طبعاً بلکہ فطرتاً ایک ہی راستے کو وہ دوسری بار قطع نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے اس کی شاعری خود اپنی فیصلوں کو توڑنے اور بیکراں ہو جانے کی ایک شدید آرزو کا اظہار ہے۔ امجد کی شاعری بنیادی طور پر اظہار کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے ہر لمحہ ایک نئے اظہار کا، ایک انوکھے اور یکتا اظہار کا متقضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے ہر شعر اظہار کا ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ اظہاریت پسندوں کی طرح کسی شاعرانہ شخصیت کا قائل نہیں جس کا اظہار اپنی شاعری میں کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا خود پرست نہیں کہ اسے مستقل یہ احساس ہو کہ اس کے دل کی واردات ابھی تک ان کہی ہے اور ہمیشہ اَن کہی رہے گی۔ اس کی شاعری میں ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ لامحدود حسرتِ اظہار ہے۔ اس کے سامنے حقیقت ہر لمحہ ایک نئے ہیولے میں آتی ہے اور اس ہیولے کو اپنی شاعری میں سمو دینا، اس کا مسئلہ ہے۔ ایسے لمحے اُس پر اکثر و بیشتر گزرتے ہیں جب اس کے لیے حقیقت اور ہیولے ـــ جسم اور رُوح ـــ عرض اور جوہر ـــ آپ اور کائنات ـــ نظم اور غزل میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا مسئلہ اظہار ہے۔ حقیقت اور تخیل کی ابلہ فریبیاں، وجود کا سحر اور حیات کی مرموزیت امجد سے اپنے اظہار کا مطالبہ کرتی ہے اور اس اظہار کے لیے وہ نت نئے تجربے کرتا ہے لیکن اس کا کوئی تجربہ نامکمل اور خام نہیں ہوتا۔ اس کی شاعری محض ہیئت کے تجربات ہی کو پیش نہیں کرتی بلکہ مواد، ہیئت اور اظہار کے نت نئے وسائل ایک وحدت میں ڈھل کر مکمل اظہار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے ہاں ہیئت محض ذریعہ نہیں بلکہ یہ طریقِ فکر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہمیشہ زیرو پوائنٹ سے اپنا کام شروع کیا:

بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوچتے دن اور جاگتی راتیں

ان کا حاصل:
ایک یہی اظہار کی حسرت

مجید امجد کسی بھی مسئلے کے تخلیقی، شعری اور انسانی تجربے کو پیش کرنے والا شاعر ہے۔ مسئلہ اور مسئلے کا تخلیقی تجربہ دو الگ چیزیں ہیں۔ تخلیقی تجربے میں ایک طرف تو آدمی کے اندرونِ ذات کے سارے اسرار و رموز اور پیچیدگیاں بھی شامل ہوتی ہیں تو دوسری طرف خارجی دنیا میں معاشرتی قوتوں کے علاوہ دوسری کائناتی قوتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ امجد شعری اور انسانی تجربے کی ہمہ گیری، پیچیدگی اور اسرار کا شاعر ہے۔ وہ کسی سماجی، سیاسی و معاشرتی مسئلے کو صرف ایک عہد اور مقام کا مسئلہ نہیں سمجھتا، اسے صرف انسانی تاریخ کا بھی مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ آدمی اور کائنات کے اُن بنیادی رازوں کی پیچیدگی سمجھتا ہے جو ظاہر تو زمانوں اور زمینوں میں ہوتے ہیں، لیکن اُن کا سرچشمہ کہیں، اور ہوتا ہے:

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
کون اس گتھی کو سلجھائے دنیا ایک پہیلی
چونا گھولتے، چھالیا کاٹتے، کتھا گھولاتے گزری
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی
سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
دو کڑوی سانسیں لیں، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
پھر اس کے بعد نہ پوچھو، کھیل جو ہونی کھیلی
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری
پنواڑی کی ارتھی اٹھی۔ بابا، اللہ بیلی

ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن، ٹھن ٹھن، چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پہ جل جائے، دوسرا آئے
(پنواڑی)

سڑک کے موڑ پہ نالی میں پانی
تڑپتا، تلملاتا جا رہا ہے
نہ جانے کس گھاٹ پہ جا رہا ہے
وہی مجبوریِ افتادِ مقصد
جو اس کی کاہش رفتار میں ہے
مرے ہر گام ناہموار میں ہے
چمکتی کار فرّاٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا
اُٹھا، اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی، افتادگی بھی
متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی
(طلوعِ فرض)

مجید امجد نے سماجی، سیاسی اور معاشی سوالوں کا شعری تجربہ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس کی شاعری پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان سوالوں کو نظریہ سازی کے ذریعے سے سمجھا اور سمجھایا نہیں جا سکتا۔ امجد کی شاعری صرف معاشی اور معاشرتی صورت حال کا تخلیقی تجربہ ہی نہیں ہے۔ اس تجربے کی یافت میں اُس انسانی آزادی کی آگ بھی ہے جو کسی انسانی صورت حال کا محاکمہ بنتی ہے۔ اس مد سے دیکھیں تو امجد محاکمے، انسانی تصدیق و گواہی اور تخلیقی فیصلے کا شاعر ہے۔ اور یہ تخلیقی فیصلہ اس نے اپنے زندہ ضمیر و شعور کے داخلی اور انفرادی سرچشموں سے حاصل کیا ہے لیکن وہ شعر کہتے ہوئے خود کو دریافت نہیں کرتا۔ اسے پوری طرح

سے وہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اسے کیا کہنا ہے۔ اس کی تو ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اسے کہنا ہے، وہ کیسے کہا جائے۔ مجید امجد کبھی یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ اسے کیا دریافت کرنا ہے؟ اور کیوں کرنا ہے؟ وہ تجربے کے باطن میں پوری آزادی سے اترتا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس تجربے کو اپنے تمام تر تضادات، اپنے تمام تر انتشار کے باوصف کس طرح مربوط اور ہم آہنگ کرتا ہے یعنی وہ زاویۂ نظر کا فیصلہ کرتا ہے اور جب وہ ایک ایسا زاویہ نظر پا لیتا ہے جس سے حقیقت کا امکانی حد تک مکمل ترین احاطہ ہو سکے تو پھر وہ اظہار کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ تجربے کے مابعد اور ماقبل کو ایک لڑی میں پرو سکنے کا مقام ہے:

کبھی سفر ہی سفر میں جو عمرِ رفتہ کی سمت — پلٹ کے دیکھا تو اڑتی ہے گردِ فردا بھی

تو روشنی کے ملیدے میں رزق کی خاطر — میں روشنائی کے گودے میں آب و ناں کے لیے
ترس رہے ہیں سدا خشت خشت لمحوں کے دیس — جو میرے دل میں ہے اس شہرِ بے مکاں کے لیے

تاریخی حقیقت اور کونیاتی حقیقت کے منتشر اجزا کے اندر تنظیم و ربط تخلیق کرنے کی ذمہ داری انسانی شعور کے سر ہے۔ انسانی شعور کا کام اور کارنامہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ تاریخی اور کونیاتی عمل کا ایک غیر جانبدار مبصر ہو۔ اس کا کام ان کے معانی کی تلاش بھی ہے، صرف معانی کی تلاش ہی نہیں بلکہ معانی کی تخلیق بھی ہے اور معانی کی تخلیق، عملِ خیر میں خلاقانہ تخیل کے وسیلے سے ایک زندہ اور لحظہ بہ لحظہ حرکت پذیر ایمان کی بنا پر ہی ممکن ہے۔ یہ ایمان، اپنی ذات اور جوہر میں انسانی وجود کی حقیقی آگہی ہے اور اس آگہی کا اعلان بھی ـــــ سارے نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی جرأت کا حامل اعلان۔ امجد کے ایمان میں یہی وہ بارِ امانت ہے جسے اٹھانے سے پوری کائنات نے انکار کر دیا تھا۔

اے شاطرِ ازل ترے ہاتھوں کو چوم لوں — قرعے میں میرے نام جو دیوانہ پن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ — میں اپنی زندگی انھیں دے دوں جو بن پڑے

کائنات کی اصل حقیقت اور انسان کی اصل حقیقت عین یک دیگر ہیں۔ انسان متن ہے اور کائنات اس متن کی شرح۔ تخلیقی عمل کی ایک صورت تو وہ ہے جسے عام طور پر مذہبی عبادات سے موسوم کیا جاتا ہے اور دوسری شکل وہ ہے جسے بالعموم شاعری کہہ کر مذہب سے باہر کی چیز قرار دیا جاتا ہے جبکہ درحقیقت شعری تجربہ اور شعری تجربے کا اظہار عین یک دیگر ہوتے ہوئے انسانی ذات اور جوہر، عبادت اور صلوٰۃ ہی کی ایک دوسری شکل ہے:

میتوں کو لحد میں کلپائے — ہو سکے سجدہ اک ادا، یہ خیال

یہیں یہ دفن ہے وہ صاحبِ سخن، کہ جسے — سکوتِ سینۂ یک چوبِ نے میں ڈوب گیا
نظامِ دنیا نے، — صدا بھی مرگِ صدا،
ہزار مرتبہ عرضِ نوا کی دعوت دی — پکارتی رہیں پیہم کراہتی صدیاں
مگر وہ اپنی فصیلِ خیال میں محصور — اور ایک گونج بھی اُن کی نہیں صدا انداز
رہِ زمانہ سے دور — یہ گنبدِ الفاظ!
خروشِ برقِ سرِ نیستاں سے بے پروا — یہ کرم خوردہ اساطیر کا بلند الوند

یہ سب درست مگر پھر بھی اک سوال ہے آج
جواب کا محتاج
کوئی بتائے کہ اس وقت کیا کرے انساں
جب آسمان کی آنکھوں سے روشنی چھینیں
ستم کی سنگینیں
یہی سوال، اب اس قبر کے اندھیروں میں
ہزار رینگتے کیڑوں کی سرسراہٹ ہے،
اجل کی آہٹ ہے:
مقدروں کے دھوئیں سے ابھرتے رہ گیرو
نشان اس کا مٹاتے چلو زرِ پا سے
جبینِ دنیا سے

(صدا بھی مرگِ صدا)

انسانی ذمہ داری اور فیصلہ کی آزادی دونوں موت کے مقابل جہد آزما ہوتی ہیں۔ موت صرف جسم کی فنا کا عمل نہیں، زمانے کی بیرونی شکل زد میں آکر کائنات سے منہا ہو جانے کی مجبوری کا نام ہی نہیں، بلکہ مرگِ احساس اور مرگِ باطن کا نام بھی ہے۔ اصلیت اور کلیت کے مقابل نہ آسکنے اور اصلیت و کلیت کی آگہی نہ رکھ پانے اور اس آگہی کے بے ریا اظہار کامل اور صدیق اظہار تک نہ پہنچ پانے کا نام موت کی کلپاہٹ ہے۔ باطنی حیات اور شعوری حیات کے دوسری جانب آباد ہونے اور آباد رہے چلے جانے کی حقیقت اور جسم کے لحد میں اترنے اور اتار دیئے جانے کی حقیقت، دراصل ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے میں جھلک جھلک جاتی، ایک دوسرے کو کاٹتی اور ایک کی تصدیق کرتی اور ایک دوسرے کی عنان گیر بنتی ہیں۔ اصلیت سجدہ وجود کی جوہری سچائی کو بر سرِ عمل آنے اور اور بر سرِ عمل دیکھنے کی صدیق خواہش و کوشش کا نام ہے۔ سجدے سے محرومی باطنی اور بیرونی منطقوں میں نشوونما پانے والے حرص اور خوف کے سانپوں کی افزائش ہے:

پھر تو سب ہمدرد بہت افسوس کے ساتھ یہ کہتے تھے
خود ہی لڑے بھنور سے کیوں زحمت کی؟ ہم جو بیٹھے تھے

کمینگیوں اور خباثتوں، شہوات اور اغراض کے مقابل انسانی فیصلہ جس طرح رسوا ہوتا ہے اور جنگ سے بچ نکلنے یا جنگ کے اندر رہتے ہوئے بہت سی قربانیوں سے علیحدہ رہنے کی کوششوں کی جس ہار کو ہم اپنی جیت سمجھتے ہیں، امجد کی پوری شاعری جیت کے اشتہار دینے والی اس ریاکاری کے خلاف ایک مسلسل جنگ ہے۔ امجد اس جنگ میں جھوٹے اور چھوٹے ہم عصر شعراء کی طرح صرف دوسروں کے باطن کی دوئی، شرک اور ریاکاری کے خلاف ہی لڑتا اور لہولہان ہوتا دکھائی نہیں دیتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور زیادہ صحیح لفظوں میں اس سے آگے جا کر خود اپنے اندر کے شرک، دوئی اور نفاق سے جنگ آزما ہوتا ہے۔ امجد کی نظمیں اور غزلیں اس جنگ کی صرف اطلاعات نشر نہیں کرتیں بلکہ خود یہ جنگ اس کے ایک ایک مصرعے، ایک ایک لفظ، ایک ایک ترکیب، ہیئت اور مواد، بحر اور آہنگ، لہجے اور فضا کی ہر جلی و خفی لہر میں زندہ نظر آتی ہے ؎

وارِ دنیا نے کیے مجھ پر تو، امجد، میں نے اس گھمسان میں
کس طرح جی ہار کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

امجد کی مخصوص لغت، اس کا ذاتی محاورہ، اس کی تمثالیں اور اس کی تراشیدہ تراکیب اس جنگ کے ہتھیار ہیں۔ اس جنگ کا آغاز اور فیصلہ ہیں ؎

سلام اُن پہ تہہِ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

امجد کے وجود اور شاعری میں یہ جنگ ایک جھوٹی اور مفروضہ جنگ نہیں، خیالی اور وہم کی اختراع نہیں، تجربے کے

برعکس تجربے کا نیم جاں امکان نہیں بلکہ ایک قطعی، ٹھوس، حتمی اور یقینی واقعہ ہے۔ اسی لیے یہ جنگ صرف غصہ، نفرت، احتجاج، تلخی، مایوسی، ٹھکن اور اسی طرح کی معلوم و نامعلوم ان گنت نفسی اور عملی شکلوں سے شروع نہیں ہوتی اور نہ ان پر ختم ہوتی ہے۔ اس جنگ کا اصل اصول وہ صدق اور وہ اطاعت کامل اور وہ طاہر و طیب فیصلہ ہے جس کے بغیر کوئی جنگ اپنی پوری کلیت اور اپنے آخری نتائج تک نہیں لڑی جا سکتی۔ انسانی وجود اور کائنات میں ایک میں یک دیگر بن کر جینے والی طیب و طاہر سچائی حیات کا واحد استعارہ ہے اور اس استعارے کا حکم، رضا اور خواہش ہی انسانی فیصلے کا رہنما ستارہ ہے۔ مجید امجد کا سارا شعری سفر اسی رہنما ستارے کی روشنی میں ہوتا دکھائی دیتا ہے ؎

جن کے لہو سے نکھر رہی ہیں یہ سرسبز ہمیشگیاں — ازلوں سے وہ صادق جذبوں، طیب رزقوں والے تھے

یہ کس کے اذن سے ہیں، اور یہ کیا زمانے ہیں — جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی

عموماً زمانے کو آج تک ایک ایسی بے رحم حقیقت سمجھا گیا جس سے اوپر اٹھنا اور جس کو ختم کرنا ہمیشہ انسان نے اپنی زیست کا حاصل جانا ہے۔ زمانہ ایک دشمن ہے جو گھات میں رہتا ہے اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس دشمن کے حملوں سے کسی طرح کلیۃً محفوظ ہو جائے اور اس طرح حیاتِ ابدی کا سامان کرے۔ امجد کے ہاں بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسے حیاتِ ابدی سے ان معنی میں کوئی واسطہ نہیں۔ اسے تو زمانے میں ایک اسرار اور حسن دکھائی دیتا ہے۔ زمانے کی مرموزیت اسے عالمِ تحیر میں ڈال دیتی ہے:

اکثر گردِ سخن سے نہ ابھرے
وادیٔ فکر کی لیلاؤں کے

جھومتے محمل!

طے نہ ہوا ویرانۂ حیرت (حرفِ اول)

اسی عالمِ تحیر میں وہ اپنا جواز تلاش کرتا ہے اور اپنے جواز کے لیے زمانے کے اثبات کو لازم جانتا ہے لیکن اس بات کو یوں نہ سمجھا جائے کہ اس کی ذات زمانے کی محتاج ہے یا زمانے کا اس سے باہر کوئی ایسا وجود ہے جس سے اس کی شخصیت کے تار و پود بکھرتے یا مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا شعور متعین جدلیاتی سانچوں میں نہیں ڈھلا۔ اس کی جدلیات خالصتاً انسانی جدلیات ہے۔ اور یہ انسانی جدلیات نیکی اور بدی کے ازلی اور غیر متبدل مطلق تصورات کی باہمی آویزش سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ نیکی اور بدی امجد کے ہاں ڈھلے ڈھلائے غیر ذی روح تصورات نہیں ہیں۔ یہ اخلاقیات کے وہ سانچے نہیں ہیں جن میں روحِ انسانی کو طوعاً کرہاً ڈھالنے کی معاشرتی جدوجہد کی جاتی ہے۔ امجد نیکی اور بدی کو زندہ حقیقتیں سمجھتا ہے، صرف سمجھتا ہی نہیں ان کا انتہائی زندہ احساس رکھتا ہے۔ امجد کے نزدیک وجودِ نیکی اور تاریخی عمل مکمل طور پر ایک چیز ہے۔ انسانی خیر و شر کا سارا نظام نسبتی باہر سے دیکھنے والوں کے لیے تاریخی عمل کا نام حاصل کرتا ہے۔

تاریخ ایک طرف تو انسان کے حقیقی باطن میں اترنے کا عمل ہے دوسری طرف فطرت اور بیرونی صورتِ حال کو سمجھنے اور رخ پانے کا نام ہے۔ مگر آدمی اکثر و بیشتر فتح کے نام پر شکست سے دوچار ہوتا ہے اور یہی شکست انسانی احساس کا بنیادی زخم ہے۔ امجد کی شاعری اس زخم کی زبان ہے۔ شکست صرف تاریخی جبر نہیں، انسانی فیصلے کی جزا اور سزا ہے۔ اس طرح تاریخ صرف ایک مادی اور میکانکی حرکت کا نام نہیں رہتی، ایک انسان اور سب انسانوں کے احساس و عمل کی میزان بن جاتی ہے۔ اس میزان میں خوشی اور دکھ تلتے ہیں اور ان کے حقیقی معانی ایک دوسرے کی نفی نہیں رہتے بلکہ نفی و اثبات اور اثبات و نفی کی منزل سے گزرتے ہیں۔ اس منزل سے گزرنے کا عمل

مرنے سے پہلے حشر و نشر کا منظر پیش کرتا ہے۔ امجد کی نثری نظم صرف نظریہ نہیں رہتی اور صرف نظریے سے شاعری پیدا بھی نہیں ہوتی۔ امجد کے ہاں تاریخ انسانی عمل کے پھیلاؤ کا نام ہے۔ یہ انسانی عمل ہمارے مادی اور معاشی و معاشرتی، سیاسی و سماجی پیمانوں سے تولا اور ناپا نہیں جا سکتا، البتہ ان پیمانوں کی تشکیل میں اس انسانی عمل سے روشنی ضرور حاصل کی جا سکتی ہے۔

موت دراصل زندگی ہی میں اس سوال اور چیلنج کا نام ہے کہ تاریخی عمل میں صدق و کذب کا تناسب کیا ہے اور اس تناسب کا مآل کیا ہے؟ اور مآل کے مقابل ہمارے وجود کے معانی کیا ہیں۔ ان معانی کا انکشاف انسانی شعور کے عذاب و ثواب کی تشریح کرتا ہے ؎

کیا پستیوں کی ذلتیں، کیا عظمتوں کے فیض — اپنے لیے عذاب جداگانہ چاہیے

عذاب و ثواب کے منظر، سونے اور جاگنے، روٹھنے اور منانے، لوگوں کے قریب آنے اور ان سے دور ہٹنے، صبح کو سیرِ بوستاں کو جانے اور نہ جانے، تہذیب کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی ساری صورتوں پر محیط ہے ؎

آنکھوں میں اٹھے رُخ کی نزدیکیوں کے ساتھ — ایسا بھی ایک دُور کا یارانہ چاہیے

بچا کے رکھا ہے جس کو غروبِ جاں کے لیے — یہ ایک صبح تو ہے سیرِ بوستاں کے لیے

غروبِ جاں کے حادثے کے اِدھر اور اُدھر انسانی شعور کا دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ جانا، وجود کا بنیادی المیہ ہے۔ صبحِ بوستاں کائنات کے حسن کی دستگیری بھی ہے اس آگہی میں شرکت کا عمل بھی، اس عمل کا انعام بھی اور انعام سے محرومی بھی۔ اس انعام سے محرومی موت سے پہلے موت کا انعام ہے۔ موت سے پہلے موت کا انتخاب، موت کے بعد کی برتر زندگی سے محرومی ہے۔ اس برتر زندگی کا شعور نہ رکھنا اصل موت ہے، اس موت پر فتح پانا انسانی شعور کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے بھاگنا غفلتوں کی نیند ہے۔ غفلتوں کی نیند پہلا اور آخری کفر ہے۔ اس کفر کی سزا زندگی کا جہنم ہے۔ لحد میں میت کا کہنا ہے ؎

ذرا تنکو و دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ ہو تو چاہے

ساحر لدھیانوی کی کہانی ایک پرانے دوست کی زبانی (۲)

فیض الحسن چودھری

اب میں ساحر کے والد سے ایک مختصر اور دلچسپ ملاقات کا حال بیان کروں گا۔ یوں تو ساحر کبھی کبھی اپنے والد کے بارے میں بڑے مزے کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ اور ہم نے کئی مرتبہ اسے کہا بھی کہ یار کبھی کبھی مل آیا کرو، لیکن وہ کبھی ملاقات کے لیے رضامند نہ ہوا۔ لودھیانہ کے چوڑا بازار کے ایک بہت پررونق چوک میں، میں، مرتضٰے اور ساحر ایک شام ایسے ہی چہل قدمی کر رہے تھے کہ چودھری صاحب سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ مجھے اور مرتضٰے کو جب بھی کبھی وہ نظر آتے تو ہم مؤدبانہ سلام عرض کرتے اور وہ بھی ہمیں خوب اچھی طرح پہچانتے تھے کہ ہم ان کے فرزند ارجمند کے یارِ غار ہیں، وہ بھی پیار سے ملتے اور حال احوال پوچھتے تھے۔

اس شام انہوں نے خاص طور پر اشارہ کر کے ہمیں بلایا ساحر انہیں دیکھتے ہی نظر بچا کر دوسری طرف چل پڑا۔ میں نے کھینچا تانی کی کہ آؤ یار، آخر تمہارا باپ ہے۔ ذرا مل ہی لیں۔ خاص طور پر جب انہوں نے بلایا بھی ہے۔ لیکن ساحر نہ مانا اور یہ کہہ کر کہ میں فلاں سوڈا واٹر کی دکان پر تمہارا انتظار کرتا ہوں، تم مل آؤ، چلا گیا۔ خیر ہم دونوں چودھری صاحب سے ملنے چلے گئے۔ سلام دعا کے بعد چودھری صاحب نے پہلی بار اپنے بیٹے کا ذکر چھیڑا۔ پوچھا "عبدالحئی کیسا ہے؟" ہم نے کہا، فرسٹ کلاس ہے، آپ کو مبارک ہو آپ کا بیٹا بہت اچھے شعر کہنے لگا ہے اور کالج چھوڑ سارے شہر بلکہ لاہور تک اس کی نظموں کی دھوم ہے۔ ایک نظم تو ریڈیو پر کسی مغنیہ نے گائی بھی ہے "تب چودھری صاحب کو قدرے احساس ہوا کہ ان کا بیٹا عام چھوکرا نہیں بلکہ خاص قابلیت کا مالک ہے۔ کہنے لگے اسے کہو کہ یہ شاعری ویری چھوڑ دے۔ اس کے لکھنے کا شوق پورا کرنے کا میں انتظام کرائے دیتا ہوں۔ ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ ہم سوچ رہے تھے شاید کوئی علمی اخبار رسالہ جاری کرنے کے لیے اخراجات فراہم کرنے کی پیش کش کریں گے۔ لیکن چودھری صاحب نے ارشاد فرمایا کہ تم مولوی فتح دین جالندھر والے کو جانتے ہو؟ ہم نے کہا کہ جانتے تو نہیں لیکن سنا ہے بہت امیر آدمی ہیں اور ان کا بیٹا فخرالدین ہمارے کالج میں پڑھتا ہے اور اس کا سوٹ کالج میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ بولے "ہاں، وہی انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے ایک اخبار گجر گزٹ نکالا ہے جالندھر سے اور انہیں ایک اچھے ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔" ہم سمجھ گئے کہ چودھری صاحب اور مولوی فتح دین کی "گجر" رگ پھڑک اٹھی ہے۔ ہم نے کہا "جی ہاں، ہم پوری کوشش کریں گے کہ ساحر یہ کام سنبھال لے۔ لیکن اس نے تو ابھی بی اے بھی نہیں کیا۔" بولے، "چھوڑو۔ بی اے پاس تو ہیں بیسیوں ایڈیٹری کے لیے مل جائیں گے۔ یہ عہدہ اسے میری وجہ سے مل سکتا ہے۔" ہم نے چودھری صاحب کو اپنی طرف سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کوئی ادبی اخبار رسالہ نکالیں تو ہم ساحر کو راضی کر لیں گے۔ لیکن ہماری وکالت چودھری صاحب کو پسند نہیں آئی۔ ہم رخصت لے کر واپس سوڈا واٹر کی دکان پر آگئے اور ساحر سے دو ملک شیک وصول کرنے کے بعد پوری گفتگو سنائی۔ پھر ہم لوگ بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

اس کے بعد کبھی کبھی ہم ساحر کو نفس چٹکی لینے کی خاطر کہتے کہ میاں تم صرف گجر گزٹ (جسے ہم بگاڑ کر "گجٹ" کہتے تھے) کے ایڈیٹر ہی بن سکتے ہو۔ پوئٹ لاریٹ شاعرِ عظیم یا فلاں فلاں بننے کے خواب چھوڑ دو۔ وہ بھی غضب کا فقرے باز تھا۔ مجھے اکثر کہا کرتا تھا "آج سے

دس سال بعد میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بمبئی میں سب سے عظیم فلمی نغمہ نگار ہوں گا۔ میرا بہت بڑا بنگلہ ہو گا۔ چمک دار خوبصورت بڑی کار کار پورچ میں کھڑی ہو گی اور تم لودھیانہ سے اپنی مدقوق بیوی کے ساتھ، جس کی گود میں ایک عدد مدقوق بچہ ہو گا، میرے بھیجے ہوئے تھرڈ کلاس کے ریلوے ٹکٹ پر مجھے ملنے آؤ گے۔ میرے گیٹ کا دربان بڑی مشکل سے تمہیں اندر آنے کی اجازت دے گا۔"

ساحر کو فقرے بازی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ آغا حشر کے کئی ڈرامے اسے یاد تھے اور گفتگو اور بحث کے دوران تو ایسا فقرہ چست کرتا کہ دوسرے کا منہ بند ہو جاتا اور حاضرین بے حد محظوظ ہو کر داد دیتے۔ فقرے بازی کے مقابلے ہمارے درمیان اکثر ہوتے تھے کبھی ہم اور کبھی ساحر جیتتا تھا۔

ہر انسان کی نفسیاتی ساخت کی اساس بچپن کے اعمال اور تجربات کے ساتھ ساتھ والدین کے اچھے بُرے سلوک پر بھی ہوتی ہے۔ معصوم عبدالحئی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اور جن ذہنی تلخیوں میں سے اسے گزرنا پڑا وہ ظاہر ہیں۔ جس بچے کو زندگی بھر باپ کا دستِ شفقت، پیار اور بھروسہ نہ مل پایا اس کی قلبی حالت کیا ہو سکتی ہے ہر بچے کی شخصیت کی ساخت، بچپن کے جذباتی تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔ ساحر یقیناً بچپن سے ہی بے انتہا ذہین اور حساس تھا۔ لہٰذا اس کے کردار کے نفسیاتی پہلوؤں کو بالتفصیل کھنے کے بعد یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ اس کی زندگی میں تلخیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

کالج کے زمانے میں وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ زندگی میں پھول کم اور کانٹے زیادہ ہیں حالانکہ بظاہر اس کا شمار اچھے کھاتے پیتے طلبا میں ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ ہمیشہ بہت اچھا لباس پہنتا تھا اور کھانے پینے کے علاوہ دیگر اخراجات کے لیے بھی اس کی جیب میں ضرورت سے زیادہ پیسے ہوتے تھے لیکن اس کے پس پردہ جو تلخ تجربات ہیں وہ اس کی شاعری میں بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ شکستہ خاندان، باپ اور ماں کے درمیان نفرت کی خلیج، بچپن کے خاندانی ماحول میں بھی اسے ماں باپ کے حقیقی رشتہ داروں مثلاً چچا، تایا، بڑے یا چھوٹے بھائی بہن، ماموں خالاؤں وغیرہ سے کوئی شفقت اور محبت نہ ملی۔ ماں کی طرف سے اسے دو ماموں ملے۔ ایک محمد شفیع (الہ آباد والا) ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کا ایک قریبی عزیز یا غالباً ماں کی طرف سے بہت قریبی رشتے میں ماموں یا شاید حقیقی ماموں خالصتاً "مخنث" تھا اور وہ طائفہ انہی کے گروہ میں شامل تھا۔ اس کا نام تو ہمیں معلوم نہیں لیکن کبھی کبھی وہ ساحر اور اس کی والدہ یعنی اپنی بہن کو ملنے آیا کرتا تھا۔ اور ہم نے اسے ان کے گھر میں دیکھا بھی ہے۔ اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ساحر خود بھی جنسی طور پر اسی مرض کا شکار تھا۔ عین ممکن ہے کہ اسے یہ کمزوری ماں باپ کی طرف سے ورثے میں ملی ہو۔

میں یقیناً دعوے کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ سو فیصد حقیقت ہے لیکن بہت سے واقعات اسکی اس کمزوری کے غماز ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے بے شمار عشق کئے۔ لیکن ہر عشق کا انجام ناکامی کا دھواں بن کر اُڑ گیا۔ چنانچہ امرتا پریتم نے "رسیدی ٹکٹ" میں لکھا ہے "سالا خواب بُننے کی بات کرتا ہے۔ بننے کی نہیں۔ مزید یہ "سالا جولاہا، ساری عمر خواب بُنتا رہا، کسی کا خواب نہ بنا۔" یہ فقرے امروز میں شائع ہو چکے ہیں۔ امرتا نے تو کھلے الفاظ میں اس کی بے پناہ محبت کا اعتراف کیا ہے اور میں اسے امرتا کی بہت بڑی عظمت اور دلیری کہتا ہوں۔

اس کا سب سے پہلا مشہور معاشقہ جس کی پاداش میں اسے کالج چھوڑنا پڑا اور جس کا ذکر تفصیلاً پہلے کر چکا ہوں، ناکامی پر منتج ہوا۔ اس ناکامی کے ایک اہم پہلو کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔ آنجہانی عزیب پرکاش نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ساحر کی ملاقات کئی بار رات رات بھر تنہائی میں ایشور کور سے کرائی اور وہ بھی بند کمرے میں۔ اور یقیناً ساحر اس پر جان دیتا تھا۔ اور ایشور کور بھی اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ ناکامی اور شدید ناکامی! آخر ایشور کور بے چاری اپنے پہلے عاشق کے ساتھ جو کہ اس کا خالہ زاد تھا، بمبئی چلی

گئی اور وہاں اس سے شادی کر لی۔

کمال کی بات ہے کہ ساحر اپنے ہر عشق کی ناکامی کو اپنی فتح قرار دے کر اس پر ایک نظم لکھ دیتا تھا جو کہ بے حد حسین اور بلند پایہ نظم قرار پاتی تھی۔ ساحر ٹریجڈی کا بادشاہ تھا۔ قدرت نے اسے بلند پایہ شاعرانہ صلاحیتیں عطا کیں اور خود اس کی شخصیت کی بہت بڑی عظمت یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے تلخ تجربوں کو نہایت خوبصورتی اور سچائی کے ساتھ اپنی نظموں، نغموں اور غزلوں میں آسان اور عام فہم الفاظ کے ساتھ بڑا عظیم شاعرانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے عالمگیر دکھ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

ساحر کی شاعری جس میں روایتی قسم کی غزلیں، رباعیات، نظمیں بھی ہیں اور ادب برائے ادب کی آئینہ دار تخلیقات بھی، عظیم نظمیں، فلمی نغمے اور گیت بھی ہیں، ان سب کا صحیح جائزہ لینے کے لیے میں اپنے آپ کو صحیح نقاد نہیں کہتا۔ اس لیے کہ میں خود ادیب یا نقاد نہیں ہوں۔ یہ عہد حاضر اور مستقبل کے ادیبوں اور نقادوں کا کام ہے۔ میں تو صرف ان کے استفادے کے لیے اس کی زندگی کے بارے میں بہ حیثیت ایک بہت قریبی اور پیارے دوست کے جو کچھ جانتا ہوں، پیش کر رہا ہوں۔ کسی بھی فنکار کو اس کی زندگی کے تجربات سے کاٹ کر نہیں پرکھا جا سکتا اور میں سو فیصد سچے اور حقیقی واقعات سپرد قلم کر رہا ہوں۔

میرے خیال میں اس کی دیگر ان گنت تلخیوں کے علاوہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ اسے روایتی TRADITION AL TYPE OF ACADEMIC EDUCATION قسم کی اعلیٰ تعلیم نہیں مل سکی۔ اعلیٰ تعلیم سے میرا مطلب یونیورسٹی کی ڈگریاں ہرگز نہیں ہے۔ میں نے اسے لڑکپن اور عنفوان شباب کے دور میں بہت قریب سے دیکھا ہے اس کی تخلیقی قوتوں سے میں بخوبی واقف ہوں۔ اور اس کی مجبوریاں اور کمزوریاں بھی ہم سب قریبی دوست جانتے تھے۔ میرے خیال میں اس کی صلاحیتوں کو پنپنے اور پورے عروج پر پہنچنے کے لئے مواقع اور سازگار حالات نہیں مل سکے۔

کالج کے زمانے میں بہت جلدی ناتجربہ کاری کی عمر میں ہی اپنی مجبوریوں کی بنا پر اس نے زندگی کا منزل مقصود جسے میں ہر پڑھے یا نوجوان کا ذہنی تخلیقاتی مینار کہتا ہوں، فلمی نغمہ نگاری کو مقرر کر لیا۔ اگرچہ وہ اپنے اس مقصد میں بے حد کامیاب رہا لیکن میرے خیال میں ساحر لودھیانوی جو کچھ بھی بنا یا بن کر رہ گیا، اس سے کہیں بہتر اور عظیم تر شاعر اور آرٹسٹ بن سکتا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ساحر کو معقول اور مناسب قسم کا ماحول اور بہتر درجے کے رفیق اور مشیر مل پاتے تو اس کا آرٹ، شاعری اور دیگر تخلیقات بہت بہتر اور عظیم تر ہوتیں۔

مثلاً اس وقت میرے ذہن میں فیض احمد فیض جن کے ساتھ بہ حیثیت شاعر وہ اکثر اپنا مقابلہ کیا کرتا تھا، آ رہے ہیں۔ فیض یقیناً ہمارے دور کے، بلکہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرزا غالب کے بعد اردو زبان کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ چٹکلا یاد آ گیا۔ ایک ملاقات میں یہ بات میں نے سردار جعفری کی موجودگی میں کہی تو جعفری جوش عقیدت میں چلا اٹھے اور کہا "بھئی بات تو آپ نے بہت صحیح کی ہے لیکن ایک گزارش ہے کہ آپ میرا نام تو درمیان میں سے بے شک کاٹ دیں لیکن خدارا غالب اور فیض کے درمیان میں ڈاکٹر اقبال کو ضرور رکھ لیں"۔ میں نے جواب میں کہا "چلو آپ کے کہنے اور سفارش پر رکھ لیتے ہیں" لیکن اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ سردار صاحب کو ڈاکٹر اقبال کا جنون تو خیر ہمیشہ سے ہے۔ ان دنوں چونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کا صد سالہ یوم ولادت منانے کے کام میں مصروف تھے اس لیے انہیں یہ خیال آیا ہوگا۔

ہاں تو فیض صاحب کے رتبے اور درجے کو سمجھنے کے لئے ان کی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی تعلیم، ماحول، نشو و نما، خاندانی پس منظر اور ان کے حلقۂ احباب کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا دوست ساحر بھی محض فلمی نغمہ نگاری کو منزل مقصود بنانے کی بجائے

اگر اپنی نگاہ کو بلند رکھتا تو اس بلندی پر پہنچنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

اب ۱۹۴۷ء سے پہلے کے چند واقعات سنیے۔ "تلخیاں" کا پہلا ایڈیشن جو ساحر نے خود اپنے پلّے سے پیسے خرچ کر کے لودھیانہ سے شائع کرایا، وہ اسے معراج پر پہنچنے کے لیے زینے کے پہلے قدم سے ہی کہیں اوپر لے گیا۔ اب لاہور کے پبلشرز جن میں خصوصی طور پر چودھری برادران یعنی ادب لطیف کے چودھری برکت علی اور سویرا کے چودھری نذیر احمد اور اب ان کے دوسرے ادارے جن کے مالکان حنیف رامے اور چودھری بشیر احمد تھے، سبھی کی نظریں ساحر کی منظومات کو شائع کرنے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ ہر مشاعرے میں ساحر کو داد دینے والوں میں اکثریت کالج اور سکولوں کے طلبا ہی کی نہیں بلکہ ان میں محنت کش طبقے کے عوام کے علاوہ اہل دانش بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن ساحر ایک طرف تو ادبی شاعری میں اپنا سکہ منوانے میں کامیاب رہا، دوسری طرف فلمی نغموں کا بھوت جو اس کے اندر بُری طرح سے گھسا بیٹھا تھا، اسے آخر بمبئی لے ہی گیا۔

انہیں دنوں ہمارا راہبت عزیز دوست حمید اختر جو ادبی دنیا کی "صحرا نوردی" کر رہا تھا، قسمت آزمائی کے لیے بمبئی جا پہنچا۔ وہاں ترقی پسند اشتراکی نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصہ گروپ بن گیا۔ یہ سب ذہین اور انقلابی ادیب اپنی دنیا میں مگن نہایت کامیاب جدوجہد میں مشغول تھے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ ۱۳ اگست کی رات ۱۲ بجے اور ۱۴ اگست کی صبح کی پہلی کرن کو کوئی نہیں بھول سکتا۔ قیام پاکستان کے بعد ہماری سیاست، معاشرتی زندگی، ثقافت، علم و ادب اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر جو اثر پڑا اور انقلاب آئے، اس پر بحث کرنا میرا کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار ماہرین سیاست، شاعر اور ادیب لکھ چکے ہیں، لکھتے رہتے ہیں اور یہ عمل آئندہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ افسوس کہ آج تک کسی معقول مورخ نے صحیح واقعات واضح اور نمایاں شکل میں نہیں پیش کیے۔ لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ آئندہ تیس یا چالیس سال بعد کا مورخ یہ فریضہ ضرور سرانجام دے گا۔

۱۴ اگست کو ۱۲ بجے رات لاہور ریڈیو سٹیشن نے گھڑی پر بارہ بجنے کی ٹن ٹن نشر کی تو ہمارے مکان (لودھیانہ) کے اردگرد ہندوؤں کی نالیاں کھلی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرے میں گولیوں کی شائیں شائیں اور کبھی کبھی بموں کے دھماکوں نے ہمیں پیغام آزادی دیا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آنے والی صبح آزادی کی روشنی ہمارے نصیبوں میں نہیں ہے۔ ساری رات کے جگراتے کے بعد صبح ہوئی تو ۱۰ بجے کے قریب پھر گولیوں کی آواز اور بموں کے دھماکے شروع ہو گئے۔ مکان کی سب سے اوپری منزل پر سر چھپا کر اِدھر اُدھر کا نظارہ کرنے پر دور دور مکانوں کے جلنے کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ ہم کنبے کے سب افراد جن میں میری ہمشیرہ، بہنیں اور دو بھائی شامل تھے، دیوار پھلانگ کر اپنے ہمسائے ہندو موہن لال کے گھر پناہ گزیں ہوئے۔ اس نے ہمیں دلاسہ دیا کہ کوئی فکر نہ کرو۔ اس مکان میں داخل ہونے سے پہلے دشمن کو پہلے میرے ساتھ نمٹنا ہوگا۔ بہر حال چند ہی گھنٹوں میں شہر کے سب مسلمان لوگ سمٹ سمٹا کر ایک دو مسلمان محلوں میں جمع ہوئے۔ دو تین دن مارا ماری کے بعد اعلان ہوا کہ سب مسلمان شہر کے باہر محلہ چھاؤنی میں پناہ گزیں کیمپ میں چلے جائیں۔

عجیب قیامت کا سماں تھا۔ ایک ہی دن میں سارا شہر کھلے میدان اور کھیتوں میں جمع ہو گیا۔ یہاں سے ٹرک لاریاں اور ایک دو ٹرینیں لوگوں کو اٹھا کر واہگہ کی سرحد تک پہنچا دیتی تھیں۔ اس کیمپ میں ہمارے ہندو اور سکھ دوست ہمیں ملنے آتے تھے لیکن کیمپ کردہ ہمیں ضروری اشیائے خوردنی، چائے، شکر، چاول، دالیں وغیرہ دے جاتے۔ ہمارا دوست پنچھی باتورا اور کامریڈ پرکاش آنجہانی جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، مجھے ملنے ہر روز آتے رہے۔ کامریڈ پرکاش کے بارے میں دوسرے یا تیسرے دن ہی مجھے معلوم ہوا کہ ایک گاؤں میں گھری ہوئی عورتوں کو نکال کر کیمپ میں پہنچانے کے جرم میں گولی کا نشانہ بن گیا۔ مجھے اس قدر دکھ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ وہی کامریڈ پرکاش تھا جو ساحر کی ملاقات اس کی محبوبہ ایشور کور سے کراتا تھا۔ ساحر اُن دنوں شاید دہلی میں تھا اور حمید اختر بمبئی میں۔ بہر حال

ہم لوگ زندہ اور سلامت قریباً دس دن کیمپ میں رہ کر لاہور جا پہنچے۔ جس گاڑی میں ہم واہگے کی سرحد پر پہنچے، وہ ریلوے کے کھلے ڈبوں کی ٹرین تھی۔ ہماری گاڑی دو دن میں لاہور پہنچی۔ راستے میں دو بار اس پر حملہ ہوا۔ کچھ لوگ مارے گئے لیکن کافی زندہ سلامت بچ گئے اور واہگہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔

قتل و غارت کا یہ سلسلہ سرحد کے دونوں طرف کافی عرصہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں نے عجیب انقلاب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں غریب لوگ رئیس بن بیٹھے اور اسی طرح بے شمار کھاتے پیتے امیر لوگ تقریباً بھکاری بن گئے۔ میں ان کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا اور اپنے مضمون کے متن کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔

چند دن دھکے کھانے کے بعد ہم (یعنی میں اپنے کنبے سمیت) لاہور میں بھارت بلڈنگ میو ہسپتال کے قریب ایک مکان میں گھس گئے۔ لودھیانہ میں ہم کافی بڑا مکان چھوڑ کر آئے تھے اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ عارضی طور پر پناہ لینے کے لیے کافی ہے۔ اور ہم یہ سوچے بیٹھے تھے کہ یہ نقل مکانی اور لودھیانے سے ہجرت فساد کی وجہ سے عارضی طور پر ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد واپس لودھیانے اپنے گھر چلے جائیں گے۔

سب سے پہلے تو اپنے عزیز و اقارب اور یار دوستوں کو صحیح سلامت دیکھنے اور مل پانے کا مسئلہ تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ لودھیانہ سے ہمارے یار دوست سبھی سلامتی کے ساتھ پاکستان آ پہنچے ہیں۔ لیکن بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی گوجرانوالے میں ہے، کوئی راولپنڈی اور اکثر لاہور اور لائل پور میں۔ بہر حال حمید اختر، مرتضےٰ اور ساقی (پورا نام چودھری محمد اسحاق) سب مل بیٹھے۔ ستمبر کے مہینے میں ہی ساحر بھی دہلی سے آ گیا اور سب سے پہلے اس نے اپنی والدہ کو مہاجر کیمپ سے معلوم کر کے غالباً چودھری نذیر یا برکت علی کے گھر لے گیا۔ پہلی ہی ملاقات پر میں نے اسے کہا کہ تم امی جی کو لے کر ہمارے عارضی مکان (تیسری منزل ایک کمرہ اور باورچی خانہ خالی پڑا تھا) میں آؤ۔ پھر جب کوئی بندوبست ہو گا تو وہاں چلے جانا۔ ساحر مان گیا اور یہ دونوں وہاں رتن چند روڈ آ گئے۔

اب یہ مکان سب دوستوں کے مل بیٹھنے کے لیے عارضی اڈا بن گیا۔ سب پرانے دوست، شاعر، ادیب یہیں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ فکر تونسوی پاکستان میں مستقلاً مقیم ہونے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ قریباً ایک ماہ وہ لاہور میں رہے۔ تمکین نے ایک ہندو لڑکی اغوا کر رکھی تھی اور وہ اسے دبائے کسی چک میں جا بیٹھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے ہمارے گھر کے قریب ہی ایک مکان الاٹ کرا لیا۔ اور کچھ عرصہ بعد ہاجرہ مسرور اور اس کی دونوں بہنیں خدیجہ مستور، عائشہ درانی، بھائی اور والدہ قاسمی صاحب کے مستقل مہمان بن گئے۔ قاسمی صاحب نے واقعی انہیں سگے عزیز بھائی بہنوں کی طرح رکھا۔

دوسرے سب لوگوں کی طرح ساحر بھی سخت پریشانی کے دور میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے تو فوراً راشننگ کے محکمے میں نوکری کر لی۔ ویسے اس سال میں لا کالج میں پڑھتا تھا۔ اب فل ٹائم کی بجائے پارٹ ٹائم داخلہ جاری رکھا۔ ساحر کے ذریعۂ معاش کے سلسلے میں چودھری برادران نے کافی دلجوئی کی اور "ادب لطیف" کی ایڈیٹری ساحر کو سونپ دی گئی۔ شاید تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ کچھ عرصہ ہمارے یہاں رہنے کے بعد ساحر کو ایک فلیٹ ابن انشا کی رہائش گاہ میں مل گیا۔ اور وہ اپنی والدہ کو لے کر وہاں چلا گیا۔ یہ جگہ میکلوڈ روڈ نشاط سینما کے بالکل سامنے واقع تھی۔ محل وقوع کی وجہ سے یوں بھی ساحر کے لیے مناسب جگہ تھی۔ اس لیے کہ سینما کے شیدائی اور فلم سے متعلق سب لوگ اسی علاقے میں رہتے تھے یا کافی رات گئے تک گھومتے پھرتے رہتے تھے اور ساحر کے فلیٹ میں اب ایک بار پھر وہی لودھیانے والی ریل پیل شروع ہو گئی تھی لیکن اب گھر کے اخراجات کی ساری ذمہ داری ساحر پر آن پڑی تھی اور اس کے لیے اسے کافی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔

پاکستان بننے سے پہلے لاہور میں صرف پنچولی فلم سٹوڈیو تھا جو نہ جانے کسے الاٹ ہوا۔ لیکن اس سٹوڈیو کو دوبارہ پورے عمل میں لا کر چلانے کے لیے وقت درکار تھا اور اس دور میں فلم انڈسٹری کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ لے دے کے وہی پرانے چند اردو میں چھپنے

والے روزنامے تھے جن میں سے ملاپ پرتاپ وغیرہ بھی ختم ہو چکے تھے اور انگریزی میں سول اینڈ ملٹری گزٹ اور نوزائیدہ پاکستان ٹائمز بھی ابھی مستحکم نہ ہو پایا تھا۔

ان حالات میں ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی بدحالی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ریڈیو پاکستان اور چند ایک سرکاری اداروں میں ملازمت کر کے پیٹ پال رہے تھے۔ ساحر بے چارہ کیا کرتا۔ اکثر جب ہم لوگ مل بیٹھتے تو خیالی غبارہ کرتے ہوئے سوچتے کہ میکلوڈ روڈ پر ٹھیلا لگا کر گردے کپورے بیچنے کا کام شروع کر دیں یا کوئی چھوٹا موٹا چائے خانہ کھول لیں۔ بے حد خستہ حالی، بدحواسی اور مایوسی دماغ پر سوار رہتی تھی۔ مجموعی طور پر پاکستان میں ساحر کو اپنا مستقبل سخت بھیانک نظر آ رہا تھا خصوصاً جبکہ وہ بمبئی میں فلمی حلقوں کی پُر امید اور روشن مستقبل کی جھلکیاں دیکھ آیا تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اس نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اکھنڈ ہندوستان اور اشتراکی طرز کی سوسائٹی کا قائل تھا۔ پاکستان میں ویسے ہی اس کا دم گھٹنے لگا۔ ساحر بنیادی طور پر آزاد خیال، نفاست پسند، حسن و عشق کا دلدادہ، پیدائشی فنکار اور شاعر تھا۔ اپنے خیالات کے تخلیقی اظہار کے لیے اس نے اردو زبان کو چنا۔ یہ بھی ایک حادثہ ہی ہے کہ بچپن میں اسے کوئی دوسری زبان سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

فارسی سے کافی مس تھا اور عربی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ابتدائی تعلیم خالصہ سکول میں ہوئی جہاں اردو کے فارسی باقاعدہ تعلیمی مضامین تھے اور عربی کی کلاسیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کی قومی زبان گورمکھی اور پنجابی کو حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے بحیثیت "زبان" تسلیم نہیں کیا تھا، لہٰذا اکثر سکھ طلبا اردو اور فارسی کے راستے پرائیویٹ منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے آئندہ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے راستہ نکال لیتے تھے۔

خالصہ سکول کا متعلم ہونے کی وجہ سے ساحر عربی سے بے بہرہ رہا۔ انگریزی اسے پسند نہیں تھی اور نہ ہی اس نے کبھی مصمم ارادے کے ساتھ انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس بیان سے میرا مقصد یہ ہے کہ چونکہ ساحر کا اظہارِ بیان اردو زبان کا مرہونِ منت تھا اس وجہ سے اس کے مداحوں میں کافی تعداد مسلمانوں کی تھی، ورنہ اس کی شاعری اور فن کے چاہنے والوں میں غیر مسلم لوگوں کی غالب اکثریت تھی۔ ویسے بھی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ گھل مل کر وہ بہت زیادہ خوش رہتا تھا۔ خصوصاً نوجوان طبقے میں بے حد ہردلعزیز تھا۔

پاکستان میں اس کے مختصر قیام کے دوران پہلی ہی چند ملاقاتوں میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ یہاں رہ کر خوش نہیں ہے اور جب بھی موقع ملا بھاگ جائے گا۔ یوں تو ہم بھی سب اس کے قریبی دوست کٹر قسم کے مسلمان نہ تھے نہ ہیں۔ بہر حال اپنی ولادت، نسل، معاشرت اور تمدن کے لحاظ سے مسلمان ہیں۔ ساحر بھی آخر صرف ساحر لدھیانوی نہیں تھا بلکہ عبدالحئی ولدیت چودھری فضل محمد تھا۔ وہ یقیناً ہمارا ہم مذہب، ہم مشرب، ہم پیالہ اور بہت پیارا عزیز بھائی اور دوست تھا۔

وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ وہ اس بدحالی اور قدرے مایوس کن ماحول کی وجہ سے اکثر مغموم نظر آتا تھا لیکن جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس کا کمال یہ ہے کہ ہر المیے کو ایک عظیم نظم میں منعکس کر دیتا ہے لہٰذا اس دور میں بھی اس نے چند بے حد نفیس نظمیں لکھیں، جن میں خصوصی طور پر "آج" قابلِ ذکر بلکہ قابلِ تعریف ہے:

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے چاند تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایوان سجاتا رہا
میں تمہارا مغنی، تمہارے لیے

جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا

یہ خاصی طویل نظم ہے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۷۴ء کے دن تکمیل پذیر ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یونیورسٹی ہال لاہور کے مشاعرے میں ساحر نے یہ نظم پڑھی تو تقریباً سارے ہال کے سامعین کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اسے بے پناہ داد ملی۔ اس دور میں ساحر نے اور بھی کئی بے حد حسین اور عظیم نظمیں لکھیں لیکن "آج" اُس دور کا شہکار ہے۔

ساحر اور شورش کاشمیری کی دوستی پاکستان بننے سے بہت پہلے سے تھی۔ ہم لوگ جب لاہور جاتے تو اسے ضرور ملتے۔ اکثر یہ ملاقات مجلس احرار کے دفتر واقعہ بیرون دہلی دروازہ میں ہوتی تھی۔ ہم سب دوست شورش کی بے شمار خوبیوں، سیاسی قربانیوں، بالیانز تحریر و تقریر کے علاوہ اس کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ ساحر اور شورش کی طبائع میں کئی خصوصیات مشترک تھیں لیکن کئی پہلوؤں کے اعتبار سے وہ بالکل الگ شخصیتوں کے مالک تھے۔

میں اکثر اپنے دماغ میں گہرے سوچ بچار کے بعد حیران ہو جاتا تھا کہ ان دونوں میں یگانگت کے پہلو بہت کم اور فطری اختلافات کے فاصلے اتنے وسیع ہونے کے باوجود بظاہر ان دونوں کی گہری دوستی کیسے چل رہی ہے۔ لیکن میں نے کبھی ان دونوں کے سامنے یا اکیلے پن میں اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا مبادا ان دونوں میں سے کوئی میرے ایسے ریمارکس کا بُرا مانے۔ ساحر نے ایک مرتبہ مجھے ایک بہت خوبصورت تصویر دکھائی، اس میں ساحر، شورش اور مرتضےٰ، تینوں بیٹھے ہیں، کتابیں ایک میز پر بکھری ہوئی ہیں، بیک گراونڈ میں یہ تینوں بیٹھے ہیں اور تینوں نے نہایت فلسفیانہ پوز بنا رکھا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے: "ایک دردِ مشترک آوارگی"۔ تصویر بہت پرانی ہے اور غالباً رسالوں اور اخباروں میں بھی چھپی ہوگی۔ میں نے جب پہلی بار یہ تصویر دیکھی تو بہت پسند آئی۔ سوچا کہ واقعی ان تینوں میں صرف ایک قدر ہی مشترک ہے: "آوارگی"۔ عمر کے ایک حصے میں "آوارگی" بھی بہت بڑی خوبی کہی جاتی ہے۔ میں نے خود اپنی زندگی کا قیمتی حصہ آوارگی میں گزارا ہے اور اس آوارگی سے بہت کچھ سیکھا۔ البتہ جو کچھ سیکھا وہ کسی کام نہ آسکا۔

پاکستان بننے کے بعد غیر مسلم لوگ یعنی ہندو اور سکھ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جا رہے تھے۔ ایک نوجوان ہندو جس کا نام پربودھ چندر تھا اور پنجاب کی سیاسی تحریکوں کا نامور کمیونسٹ لیڈر تھا، جانے سے پہلے اپنا ہوٹل شورش کاشمیری کی تحویل میں دے گیا۔ لہٰذا میکلوڈ روڈ پر یہ ہوٹل شورش کے ہاتھ آ گیا۔ سنا ہے کہ بعد میں پربودھ چندر مشرقی پنجاب میں اسمبلی کا ممبر چنا گیا۔ بہت امیر رئیس اور خاندانی آدمی تھا۔ دوستی اور مروت میں آکر اتنی بڑی جائیداد شورش کے حوالے کر گیا۔ شورش بہت عرصہ تک یہ ہوٹل بھی چلاتا رہا اور یہیں اس نے اپنے ہفت روزہ چٹان کا دفتر بنایا جہاں تک میں جانتا ہوں آغا شورش کاشمیری ایک منفرد شخصیت کا مالک ہی نہیں تھا بلکہ وہ کئی انواع و اقسام کی شخصیتوں کا مجموعہ تھا۔ اس نے جیلیں کاٹیں، لیڈری قائم کی بلکہ جمائی، ادیب بھی بنا، ایڈیٹر بھی بنا اور سننے میں آیا ہے کہ "داداگیری" میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں جب میں لاہور چھوڑ کر لندن آیا، اُن دنوں وہ اپنے اخبار "چٹان" کے ذریعے مولانا ظفر علی کے بعد اختر علی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

ساحر کے ساتھ شورش کی دوستی بظاہر یکجان و دو قالب بتائی جاتی تھی۔ نامعلوم اندرونِ خانہ صحیح بات کیا تھی لیکن ساحر کے پاکستان سے پُراسرار طور پر بھاگ جانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شورش نے ساحر کو پنجاب پولیس کے اذیتی پروگرام سے ڈرایا تھا۔ مگر یہ سارا قصہ محض "شنید" ہے۔ اس کی تصدیق کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے یعنی یہ بات سرے سے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ فرار ہونے سے پہلے

ساحر اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے اپنا حلیہ ہی بدل لیا تھا۔ داڑھی بڑھا لی اور کئی دن کچھ کھایا نہ پیا۔ کمرے میں، اپنے گھر نہیں بلکہ کسی نامعلوم جگہ، بند رہا اور موقعہ پاتے ہی واہگہ کی سرحد پار کر کے امرتسر جا پہنچا۔ وہاں سے دہلی چلا گیا۔ میں نے ان سب باتوں کا ذکر کبھی ساحر سے اور نہ شورش سے ذکر کیا۔ اب وہ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لیکن میری دلی خواہش ہے کہ کوئی ایماندار گواہ یا جسے بھی حقیقت کا علم ہو اس موضوع پر روشنی ڈالے

پاکستان سے پر اسرار طریقے سے فرار ہونے کی خبر مجھے کافی عرصے بعد ملی اور سننے میں آیا کہ ساحر دہلی پہنچ کر بھی کچھ عرصہ چھپا رہا۔ پہلے کسی ادبی پرچے کے ساتھ منسلک ہو گیا اور پھر بمبئی چلا گیا۔ وہاں کلا مندر سٹوڈیوز میں اسے فلمی نغمہ نگاری کے مواقع ملنے شروع ہو گئے۔ بہر حال چند سالوں میں کافی مشہور اور کامیاب نغمہ نگار قرار پایا۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں ساحر کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اور ان دنوں ورلو وار روڈ اندھیری کے علاقے میں کرشن چندر اور ساحر نے مل کر ایک کافی بڑا مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ ہمارے احباب میں سے ایک دوست آفتاب ڈار (صاحبزادہ مولوی یامین ڈار جو لودھیانے میں بجلی کے کنٹریکٹر تھے اور کانگریس تحریک کے مقامی لیڈر تھے) کسی کام کی غرض سے بمبئی گیا اور واپسی پر اس نے بتایا کہ ساحر فلمی نغمہ نگاری میں بے حد کامیاب ہے۔ اس کے مقابلے میں پرانے فرسودہ نغمہ نگار پٹ چکے ہیں اور جو اس کے ہم عصر اور ہم عمر ہیں، وہ ان سے بھی بازی لے جائے گا۔ اس کی چند ایک کامیاب فلمیں پاکستان میں بھی آئیں جن میں ایک فلم "جال" میں نے بھی دیکھی۔ ان کے گانے بہت اچھے بلکہ فلمی نغمہ نگاری کے لحاظ سے بہت اعلیٰ اور بلند تھے۔

وقت گزرتا گیا لیکن ہم سب پاکستانی دوست ساحر کی کمی محسوس کرتے تھے۔ ہر محفل میں ساحر کا ضرور ذکر ہوتا تھا اور ہم دوست اگرچہ اس کی جدائی کو بے حد محسوس کرتے تھے، لیکن خوش اور مطمئن تھے کہ بمبئی میں اس کی کامیابی اور عروج کے لیے میدان بے حد وسیع تھا۔ پاکستان میں فلم انڈسٹری کی محدود حالت کی وجہ سے اس کی ترقی، شہرت اور عروج کے امکانات بھی محدود ہوتے۔ بمبئی میں اپنی قابلیت کی بدولت اس نے جو دولت کمائی ہے وہ پاکستان میں نہیں کمائی جا سکتی تھی۔

ساحر غالباً سن ۴۸ یا ۴۹ء کے پہلے چند مہینوں میں پاکستان سے فرار ہوا۔ اور میں راشننگ کے محکمے میں ہی کام کرتا رہا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں میری شادی ہو گئی اور اس طرح میری گھریلو ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔ خیال تھا کہ جو جائیداد یا اثاثے ہم ہندوستان چھوڑ آئے تھے اس کا کوئی معقول معاوضہ ہمیں جلد مل جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ تقسیم ملک کے وقت میں لا کالج میں پڑھتا تھا۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے وہ بھی چھوٹ گیا۔ ۱۹۵۰ء کے آغاز میں ہی راشننگ والی ملازمت بھی ختم ہو گئی اور چونکہ تقسیم ملک سے پہلے ۱۹۴۵ء میں میں نے بی اے کی ڈگری لے لی تھی اس لیے مجھے لاہور کے ایک سکول میں ملازمت مل گئی۔ اخراجات بڑھتے گئے اور اس کی وجہ سے مالی پریشانیوں نے بری طرح آگھیرا۔ ان حالات میں ایک دفعہ میں سخت بیمار ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود مجھے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ صحت یابی کے بعد میں نے ملک چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دی۔ بے حد جدوجہد کے بعد جنوری ۱۹۵۴ء میں مجھے پاسپورٹ مل گیا اور میں نے انگلستان آنے کا عہد کر لیا۔ لندن یونیورسٹی میں اکیڈمک ڈپلوما آف ایجوکیشن کورس میں مجھے داخلہ مل گیا اور ستمبر میں میں نے روانگی کا پروگرام بنا لیا۔

چونکہ میں نے انگلستان میں ہی مستقل آباد ہو جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا، لہٰذا جلد واپسی کی بھی کوئی امید نہ تھی، اس لیے میں سب رشتہ داروں، دوستوں سے اس طرح ملا اور رخصت ہوا کہ شاید اس زندگی میں پھر کبھی ان سے ملاقات نہ ہو گی۔ ساحر کو میں نے خط لکھا کہ انگلستان جانے سے پہلے ملاقات بے حد ضروری ہے اور اپنے سفر کی بکنگ میں بمبئی میں مختصر قیام رکھ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ خط لکھنے کے معاملے میں وہ بے حد کاہل اور سست واقع ہوا ہے لہٰذا شاید جواب نہ ہی آئے۔ بہر حال آفتاب ڈار سے اس کا ایڈریس مجھے مل گیا تھا۔ سوچا اگر جواب نہ بھی آئے تو بھی اس سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ خوش قسمتی سے اس کا جواب بھی بروقت آ گیا۔ اس کا صرف یہی ایک خط میرے پاس محفوظ رہ گیا۔

بہر حال میں ۴ ستمبر کو لاہور سے کراچی بذریعہ ریل روانہ ہو گیا۔ چند قریبی دوست مجھے رخصت کرنے کے لیے میرے ساتھ کراچی گئے۔

یہاں سے تین چار روز قیام کرنے کے بعد مجھے بمبئی روانہ ہونا تھا۔ ساحر کو میں نے لاہور سے اپنا سارا پروگرام لکھ بھیجا تھا کہ ۲۲ ستمبر ۵۵ء بروز ہفتہ صبح ۹ بجے کی فلائٹ سے بمبئی پہنچوں گا۔ اور ایک ہفتہ قیام کے بعد لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن چونکہ اس کی طرف سے میرا خط ملنے کی کوئی اطلاع مجھے موصول نہ ہوئی تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان تھا کہ پہلی بار اکیلا بمبئی پہنچ کر میرا کیا حال ہو گا۔ بہر حال بصورتِ دیگر میں نے ہوٹل میں قیام کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ احتیاطاً جانے سے ایک دن پہلے کراچی سے کرشن چندر کے نام میں نے ٹیلی گرام روانہ کر دیا کہ ساحر کو مطلع کر دیں۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ اسے اطلاع مل جائے گی اور وہ مجھے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود ہو گا۔ کراچی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ایک پرانے دوست اکرم لودھیانوی کے اصرار پر رات کو اس کے گھر آ گیا اور علی الصبح رکشا میں اپنا سوٹ کیس رکھ کر الفنسٹن ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک بس مجھے ایئرپورٹ پر لے گئی۔ ۲۲ ستمبر کی صبح ۷ بجے جب جہاز اڑا تو میرے دل میں عجیب غریب طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا اور مستقبل کے بارے میں بھی ایک غیر یقینی کیفیت کا سامنا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے دل کو گھیرے ہوئے تھے۔ کچھ خوشی بھی تھی اور ملک چھوڑنے کا غم اور دکھ بھی تھا۔

بہر حال سفر چونکہ زیادہ لمبا نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بادلوں کے بیچ بمبئی کا ساحل اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آنے لگیں۔ آخر ہوائی جہاز نے لینڈ کیا۔ اور سیڑھی لگ گئی۔ میں اپنا بریف کیس لے کر باہر نکلا تو ابھی سیڑھیاں اتر ہی نہ پایا تھا کہ ہجوم میں سے ساحر نے مجھے بازو کے اشارے سے مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ تقریباً ۸ سال کے بعد اسے پہلی نظر دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی، یہ بیان سے باہر ہے۔ ہم گلے مل کر ملے وہی پرانا ساحر، وہی اس کی پیاری باتیں، سب احباب کی خیریت دریافت کی اور جلدی ہی کسٹم وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دونوں باہر نکلے تو ساحر کی مورس مائنر منتظر تھی۔ اس کی موٹر کار اور ڈرائیور دیکھ کر مجھے اس کا پرانا فقرہ یاد آ گیا کہ تم اپنی مدقوق بیوی کے ساتھ میرے بھیجے ہوئے اہل خانہ کے تھرڈ کلاس کے ٹکٹ پر مجھے ملنے بمبئی آؤ گے۔ ساحر خود ڈرائیو کر رہا تھا اور بمبئی کی سڑکوں کے اردگرد کے مناظر پر تبصرہ بھی کر رہا تھا۔ موسم کچھ گیلا گیلا سا تھا۔ بارش تھم چکی تھی اور لوگ اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ ایک دو جگہ عمارتوں کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ میں نے شاید زندگی میں پہلی بار عورتوں کو ٹوکریوں میں مٹی اٹھاتے دیکھا تو بے حد دکھ ہوا۔ ساحر سے پوچھا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا کہ بمبئی صحیح معنوں میں پونجی پتیوں کا شہر ہے۔ یہاں کے مارواڑی اور مزدور میں تضاد دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے گا کہ ہندوستان میں اشتراکی انقلاب کا آغاز یہیں سے ہو گا۔ ساحر کا وہی پرانا اندازِ فکر سن کر مجھے نہ صرف دلی خوشی ہوئی بلکہ فخر محسوس ہوا کہ چار سال میں اس کے پاس کار بھی ہے اور ڈرائیور بھی اور یقیناً اس کا معیارِ زندگی بھی اسی تناسب سے لودھیانہ کے مقابلے میں کہیں بہت بلند ہو گا لیکن اس کے سیاسی اور نظریاتی فلسفے میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ایک طرح سے وہ ترقی پذیر ہے۔

سانتا کروز سے اندھیری ورلووارڈ تک ہم کافی دیر میں پہنچے۔ ساحر کا فلیٹ پہلی منزل پر تھا۔ نچلی منزل میں کرشن چندر رہتا تھا۔ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو ساحر کی والدہ منتظر تھیں۔ اس نے بہت پیار سے مجھے خوش آمدید کہا۔ مجھے بھی انہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اتنے میں رام پرکاش اشک، کرشن چندر اور ان کا چھوٹا بھائی مہندر ناتھ آ گئے۔ رام پرکاش اشک تو میرا پرانا واقف اور دوست تھا۔ لیکن کرشن چندر اور مہندر ناتھ کو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ لاہور میں حمید اختر، احمد ندیم قاسمی اور ایک دوست کے ساتھ مل کر ہم نے ایک اشاعتی ادارہ کھولا تھا جس کا نام پائینیر پبلشرز تھا۔ اس ادارے نے چند ایک کتابیں چھاپیں، جن کے نام اب تک مجھے یاد ہیں۔ حمید اختر کی "کال کوٹھری"، کرشن چندر کی "پانی کا درخت" اور ایک ڈاکٹر خالد غزنوی کی "جنسی مسائل"۔ ایک اور کتاب جو انگریزی گرامر کے بارے میں تھی، پیسوں کی کمی کی وجہ سے نہ چھپ سکی اور اس کا مسودہ میں لاہور کے ایک پبلشر کو بعوض پانچ سو روپے دے آیا تھا۔ دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ کتاب کسی اور کے نام سے چھپ گئی ہے۔ لیکن پانچ سو روپے کی رقم جو میری بیوی کو ملنی چاہیے تھی، وہ بھی

نہیں ملی میں نے کرشن چندر سے معذرت چاہی کہ ان کے ساتھ بھی "پانی کے درخت" کا معاہدہ پانچ سو روپے ہی طے ہوا تھا لیکن پاکستان اور انڈیا کے درمیان پیسوں کے لین دین کی دشواریوں کی وجہ سے انہیں نہ مل سکتا۔ کرشن چندر سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے یہ لوگ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد چلے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد ساحر نے فلم "ٹیکسی ڈرائیور" کے گانے سنائے یعنی ریڈیوگرام پر ریکارڈ بجائے۔ مجھے بہت پسند آئے اور جی بھر کر داد دی۔ ذرا فرصت ملی تو میں نے نہایت سنجیدگی سے اسے پاکستان سے فرار ہونے کی اصل وجہ اور حالات دریافت کرنا چاہے تو وہ بات گول کر گیا۔ میں بھی چپ رہا۔ عام لوگوں کا خیال اسے بتایا تو بہت ہنسا۔ عام لوگ کہتے تھے کہ شورش نے تو خیر جس وجہ سے بھی ساحر کو پاکستان سے بھگایا، وہ ایک الگ بات ہے لیکن اس پر ایک مزیدار مثل صادق آتی ہے کہ ایک بدخواہ نے غصے میں آ کر ایک کبڑے (خمیدہ کمر) کی پیٹھ پر لات ماری تو اس کا "کوب" ٹھیک ہو گیا۔



رضی اختر شوق کی شاعری

رئیس احمد

کسی شاعر یا ادیب کی اچھائی یا بڑائی کو پرکھنے کے لیے جو معیار ارسطو سے آج تک قائم کیے گئے ہیں، ان کے اہم نکات یہ ہیں:-

(۱) روایت اور انفرادی صلاحیت کا توازن۔

(۲) گرد و پیش کے حالات یا عصری تقاضوں کو شاعرانہ یا ادیبانہ رمز و کنایہ میں بیان کرنے کے لیے ایسے موزوں اور مناسب الفاظ اور علامتوں کا استعمال جو کثرتِ استعمال سے اپنی افادیت اور توانائی نہ کھو بیٹھے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ایسی شاعرانہ تراکیب اور بندشیں تخلیق کرنا جو قاری اور سامع کو گراں نہ گزریں۔

(۳) طرزِ تحریر یا اسلوبِ بیان کو اس طرح ڈھالنا کہ وہ سب کی طرح بھی ہو اور اپنی انفرادیت بھی ظاہر کرے یعنی ایسا عجوبۂ روزگار اندازِ بیان نہ ہو جو کسی کو قبول نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ جو سب کے لیے کشش رکھتا ہو۔

(۴) ادب پاروں میں ایسے تجربات و حوادث کو شامل کرنا جو محض وقتی یا محدود کشش نہ رکھتے ہوں بلکہ دائمی اور آفاقی عنصر لیے ہوئے ہوں۔

(۵) ایسے ادبی فقرے یا اشعار کی تخلیق جو سہل ممتنع اور علمی اقوال بن کر ادب کا حصہ بن جائیں اور آہستہ آہستہ زبان زدِ خاص و عام ہو جائیں۔

ان نکات اور معیارِ سخن کی روشنی میں جب ہم عصرِ حاضر کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اکثریت ایسے سخنوروں کی نظر آتی ہے جو بظاہر نئے تو ہیں مگر حقیقتاً وہ نہ تو کسی نئے لہجے کے خالق ہیں اور نہ پرانی روایت کے علمبردار، ان کے ہاں نئے پن کی ایک ایسی جھوٹی لگن ہے جو وقتی طور پر ایک ایسا فیشن ہی کہی جا سکتی ہے، جو کپڑوں اور جوتوں کے اسٹائل اور کٹ سے بھی کم دیر پا ہے۔ اس غلط روش کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی زد پر کچھ ایسے لوگ بھی آ گئے ہیں جو کبھی امید افزا باتیں کیا کرتے تھے۔

ایسی صورتِ حال میں اگر کوئی شاعر یا ادیب جدید ادبی تقاضوں کو پورا کر رہا ہو تو یقیناً قابلِ داد و ستائش ہے۔ رضی اختر شوق ایسے ہی ایک شاعر ہیں جن کو ہم نہ صرف منفرد و ممتاز کہہ سکتے ہیں، بلکہ ایک ایسی آواز جو روایت اور انفرادی صلاحیت کے توازن اور حسین امتزاج کے ساتھ عصرِ حاضر کے جدید لہجوں میں خاصی معتبر ہے۔ اگرچہ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ وہ آئندہ کتنے بڑے اور کتنے اچھے شاعر ہوں گے۔ ان کے دیوان اول "میرے موسم میرے خواب" (۱۹۵۵ء سے ۱۹۸۵ء) کے مطالعہ سے جو تاثر میں لے سکا ہوں اس کی رو سے ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

شوق صاحب کی شاعری جس طرح روایت اور انفرادی صلاحیت میں ڈھل کر ہمارے سامنے آئی ہے، اس کا اندازہ

ان کے صرف ایک ہی شعر سے ہو جاتا ہے جو انھوں نے اپنے دیوان کے حرفِ آغاز پر لکھا ہے، ملاحظہ ہو:

یہ ایک کھیل ہے ہم خوش عقیدہ لوگوں کا　　　دیئے جلا کے ہوا کی امان میں رکھنا

اس شعر کا روایتی تجزیہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہوا دیوں کو امان کہاں دیتی ہے وہ تو بجھا دیتی ہے اور مثال اور سند کے طور پر میر انیس کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ　　　چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن جب ہم شوق صاحب کے شعر کو جدید حسِ شعری کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انیس روایت اور شوق انفرادی صلاحیت ہیں۔ چونکہ شوق صاحب نے چراغ اور ہوا کے روایتی تصورات (IMAGERY) کو بدل کر کوئی ایسی تصویر پیش نہیں کی ہے جو خلافِ فطرت بھی ہو اور بعید از قیاس بھی، بلکہ چراغ اور ہوا کے باہمی تعلق اور ربط میں جدید فلسفۂ حیات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شوق صاحب نے پرانی روایت میں نئی روح پھونکی ہے۔ جو اس جدیدیت کی مظہر ہے جس کے بارے میں ایک انگریز محقق و نقاد نے کہا ہے "جدیدیت نت نئے استعارے یا علامتیں تخلیق کرنے کا نام نہیں بلکہ پرانی علامتوں میں نئی روح ڈالنے کا نام ہے"۔

یہی وہ جدید شاعری کی اعلیٰ پایہ کی ٹیکنیک ہے جس کو ہماری نئی نسل تو کجا اکثر پرانے شعراء بھی سمجھنے سے قاصر رہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو انھوں نے پڑھا ہی نہیں یا اگر پڑھا ہے تو اس کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ نتیجے کے طور پر بقول منیر احمد شیخ ان لوگوں کے کلام پر یا تو کلیشوں کا غلبہ ہے یا نئے لہجے اور نئے اندازِ فکر کا فقدان۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور پروفیسر مجتبیٰ حسین نے بھی اس قسم کے گروہ شاعراں کے بارے میں یہی کچھ کہا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی بے معنویت اور بے مقصدیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کچھ مہمل عنوانات اور تراکیب گھڑ لی ہیں۔

اب آیئے دوسرے اہم نکتے پر جو شاعر کو اچھا اور بڑا بنانے کے لئے ضروری خیال کیا گیا ہے، یعنی طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان شوق صاحب نے یقیناً کوئی اتنا عظیم اسٹائیل یا اندازِ بیان نہیں دیا ہے کہ جس کی چھاپ سے آنے والے سو پچاس برس اور جو صدیوں تک لکھنے والوں پر اپنے اثرات مرتب کرتا رہے۔ انھوں نے کوئی ایسا شاندار طرزِ تحریر یا گرینڈ اسٹائیل بھی نہیں وضع کیا ہے جو خود ان پر ہی ختم ہو جائے اور کوئی دوسرا اسے اپنا ہی نہ سکے۔ مگر اس بات سے انکار مشکل ہے کہ شوق صاحب نے اپنے لئے سب سے منفرد اور الگ لہجہ ڈھالا ہے جو ان کی پہچان اسی طرح بن گیا ہے، جس طرح ہم فیض، فراق، جوش، مجاز، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور مصطفیٰ زیدی وغیرہ کو ان کے منفرد لہجوں سے شناخت کر لیتے ہیں۔

شوق صاحب نے جو منفرد لہجہ اپنے لئے وضع کیا اور جس کے ذریعہ وہ اپنے سخن کو جسے وہ اپنے نطق پر قرض سمجھتے ہیں، چکا رہے ہیں، اس کے پیچھے دو قوتوں نے میرے خیال میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے، ان میں پہلا دیوانِ میر ہے اور دوسرا کلامِ فیض۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے اشعار میں نغمگی و احساس کا پورا رچاؤ ہے وہاں وہ سوز و گداز بھی ہے جو میر کا طرۂ امتیاز ہے۔

خصوصاً میر صاحب سے شوق صاحب کا جو تعلقِ خاطر رہا ہے اس کا اشارہ ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ مثلاً ان کا تازہ ترین شعر ہے:

دلی شہر سے میرے دل تک جو کوچہ ہے ویراں ہے
میر تقی کے عہد سے ہم تک ایک ہی یادِ یاراں ہے

یا اُن کی یہ تمنا جو اُنھوں نے اپنے ابتدائی دور میں کی تھی:

اے نکہتِ میر کچھ عطا ہو ۔۔۔ میں تیرے نفس سے تازہ تر ہوں

شوق صاحب کا منفرد لہجہ ان لہجوں کی طرح نہیں کہ جس کو ہم ایک دم نظرانداز کر دیں۔ پھر ان کا لہجہ ایسا لہجہ بھی نہیں جو غیر ملکی ادبی روایت کی بُری نقالی سے جنم پاتا ہے اور وقتی طور پر اپنے نئے پن کا احساس دلا کر آخر کار رد ہونے لگتا ہے۔

مختصر یہ کہ شوق صاحب کا لہجہ فراق، فیض، ناصر کاظمی، ندیم، مصطفےٰ زیدی اور فراز وغیرہ کے منفرد لہجوں کی طرح ان کی شناخت بھی ہے اور زندہ رہنے والا بھی ہے۔ ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس نکہتِ میر کی جستجو میں شوق صاحب کی عمر، دشت میر کی سیاحی میں گزری ہے اس کے تعاقب میں فراق اور ناصر کاظمی پہلے ہی بہت آبلہ پا ہو چکے تھے۔ شوق صاحب نے میر صاحب سے براہ راست رابطہ تو قائم کیا مگر ان کے گردو پیش غالب اور انیس اور پھر بعد میں یگانہ اور فیض پر بھی نظر جمائے رکھی، جس کی وجہ سے نغمگی، سوز و گداز کے ساتھ فکرِ سخن میں انوکھا انداز اور لہجہ میں بانکپن بھی آگیا جو اطہر نفیس اور ناصر کاظمی کے وہاں بہت زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ شوق صاحب کے وہاں جب نکہتِ میر سے کچھ مختلف تازگی نظر آئی تو بعد کے آنے والوں نے ان کو ذہنی طور پر اپنے فکر و فن میں قبول کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

شوق صاحب کو اپنے لہجے میں انفرادیت کا احساس تو ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا، جیسا کہ انھوں نے اپنی مقبول خاص و عام غزل میں فرمایا ہے:

اب اس ہنر کو ترے خاص و عام کیا سمجھیں ۔۔۔ کہ میں خود اپنی طرح بھی ہوں اور سب کی طرح

شوق صاحب کا احساس یا شعورِ فن کوئی خود ستائی نہیں بلکہ ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ شوق صاحب نے فن سے آگاہی کا جو اعلان کیا ہے وہ غلط نہیں۔ ان کے وہاں "یہ اپنی طرح" اور "سب کی طرح" والی بات ایک آدھ غزل ہی میں نہیں ان کی ہر غزل میں ملے گی۔ میں نظموں کی بات اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ ان کی نظموں کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ نظم گوئی میں یقیناً شوق صاحب قدرت رکھتے ہیں مگر نظم جدید کی ٹیکنیک کے لحاظ سے ان میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے یقیناً شوق صاحب نظم میں بھی خوب ہیں۔

شوق صاحب نے اپنے منفرد لہجہ کے ساتھ ساتھ جس منفرد اندازِ فکر کا احساس دلایا ہے اس پر خاصا لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں طوالت سے بچنے کے لئے میں صرف ایک شعر کی طرف توجہ دلاؤں گا:

وہ آدمی کہ جو پتھر تھا جی رہا ہے ابھی ۔۔۔ جو آئینہ تھا وہ کب کا بکھر گیا مجھ میں

شیکسپیئر اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے حوالے سے جس "کھوکھلے انسان" یا "خالی آدمی" کا ذکر ہمارے دور میں شاعروں نے کیا ہے، وہ زیادہ تر شاعری میں نثری پیرایۂ اظہار میں نظر آتا ہے۔ مثلاً انجم اعظمی کا یہ مصرعہ:

خلا میں آدمی ہے اور آدمی میں کھوکھلا پن

یا اس سے ذرا بہتر انداز میں، اطہر صدیقی مرحوم کا یہ شعر:

خلاؤں میں الجھ کر رہ گیا ہوں ۔۔۔ زمیں میری نہ میرا آسماں ہے

شوق صاحب نے اپنے مذکورہ بالا شعر میں کھوکھلے انسان کا ذکر خالص شعری پیرایہ میں ڈھال دیا ہے جس میں دل و دماغ دونوں کے لئے یکساں کشش موجود ہے یعنی ایک طرف دعوت فکر ہے تو دوسری طرف وہ اسلوب بیان اور لہجہ ہے جو فوراً دل پر اثر

کرتا ہے۔ یعنی یہاں رومانوی اور کلاسیکی اندازِ سخن یکجا ہو کر جدید فن کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

شوق صاحب کے وہاں مجھے میر، غالب اور انیس والی بات خاصی محسوس ہوئی ہے، مثلاً ان کا یہ شعر:

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں رہتی تھی بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

یا یہ شعر:

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں مرے لہو میں مرے شجرۂ نسب کی طرح

جہاں تک شعر میں تجربات و حوادث کے سمونے کا تعلق ہے، اس کیلئے تفصیلی گفتگو مقصود نہیں، شوق صاحب نے اس ضمن میں جو طریقہ کار اپنایا ہے وہ اچھے اور بڑے شاعروں کا اندازِ سخن ہے۔ چنانچہ ان کے وہاں کسی زمانہ یا دور کے حالات پر وقتی یا حادثاتی قسم یا نوعیت کی نظمیں یا غزلیں نہیں ہیں۔ وہ کسی واقعہ یا حادثہ کو ہمیشہ گہرائی سے دیکھتے ہیں اور اس کے وقتی یا حادثاتی عنصر کو نظرانداز کر کے اس کے پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کے دائمی پہلو کو بیان کرتے ہوئے اس میں آفاقی کشش پیدا کر دیتے ہیں، اس طرح وہ جذبات انگیزی سے اجتناب کر کے مسائل پر دعوتِ فکر دیتے ہیں:

میں کل حسین کے لشکر میں تھا سو آج بھی ہوں سو ہر یزید کی زد پر ہے خیمہ گاہ مری

شاعری یا شاعرانہ فن کی خصوصیت کے بارے میں ایک انگریز محقق نے کہا ہے کہ بڑا شاعر زندگی کے تجربات کے اہم اور لازمی (ESSENTIAL) پہلو پر نظر رکھتا ہے اور چھوٹا شاعر اس کے وقتی یا حادثاتی (ACCIDENTAL) عنصر کو بیان کرتا ہے۔ گویا بڑے شاعر کا کلام آفاقی نوعیت کے تجربہ پر ہوتا ہے اور چھوٹے شاعر وقتی حیثیت کے ادب پارے پیش کرتے ہیں۔ شوق صاحب کے کلام میں وہ غزل ہو یا نظم کوئی شعر بھی ایسا نہیں ملے گا جس کو عوامی جلسہ گاہوں میں محض جذبات انگیزی یا نعرہ بازی کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ ان کے اشعار مختلف مواقع پر دعوتِ فکر دینے کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں، اور یہ ان کی شاعری کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

ادب برائے زندگی کے حوالہ سے جو معیار شاعر کی عظمت کا تعین کرنے کے لئے زیادہ مستند و معتبر خیال کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی شاعر کے کتنے اشعار ہماری عام زندگی یا عوامی زندگی میں رواں دواں ہوئے ہیں۔ کن کن مواقع پر انہیں یاد کیا گیا ہے اور ایک شعر موقع اور محل کے لحاظ سے کتنے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

رضی اختر شوق صاحب کے کلام میں کئی اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو سکہ رائج الوقت کی طرح جاری ہیں۔ مثلاً:

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو میں سوچتا ہوں میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں مرے لہو میں مرے شجرۂ نسب کی طرح

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

دشتِ وفا کی پیاسی روحیں، شوق ہوئے کہ میر ہوئے مذہبِ عشق کے سید زادے کیا کیا بے توقیر ہوئے

کوئی اس شہر میں آسیب صدا دیتا ہے جو دیا اس کے نکلتا ہوں بجھا دیتا ہے

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شوق صاحب زندگی کے صرف ان تجربات وحوادث کو موضوعِ سخن بنا کر اپنے نطق پر قرض سمجھ کر چکا دیتے ہیں جن میں آفاقی کشش ہو وقتی اپیل نہیں، پھر وہ اپنی انفرادی صلاحیت کو پورے طور پر بروئے کار لا کر اپنی اس عظیم روایت سے پورا فائدہ اٹھا لیتے ہیں جس میں ایک طرف میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ ہیں تو دوسری طرف فیضؔ اور یگانہؔ۔ جن کو زبان و ادب کی تہذیب بھی کہا گیا ہے اور سخن کے گنجہائے گرانمایہ بھی۔ نتیجہ کے طور پر شوق کے کلام میں غزل کا روایتی رچاؤ اور زبان و بیان میں ایک ایسی تازگی موجود ہے، جو ہمیں اپنے عہد کے اکثر بلکہ بیشتر شعراء میں ناپید اور مفقود محسوس ہوتی ہے۔

شوق صاحب نے اپنے دیوان "میرے موسم میرے خواب" میں شامل کسی بھی ادب پارہ کے ساتھ اس کا سن تخلیق تحریر نہیں کیا ہے، اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شوق صاحب اپنی عمر کے کسی بھی حصے میں فنی اور فکری طور پر کمزور نہیں پڑے وہ ان کی پہلی تخلیق تھی یا آخری، مجھے ہر ایک میں یکساں مضبوطی اور تازگی محسوس ہوئی۔

شوق صاحب کے کلام کی اس خوبی کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تعلق شعراء کے اس عظیم قبیلے سے ہے جن میں تخلیق کا عمل آخر عمر تک جاری رہا ہے اور جو فنی اور فکری اعتبار سے مسلسل ترقی کرتے رہے ہیں۔ اور یہ بڑی اہم بات ہے۔

رضی اختر شوق ملازمت کے اعتبار سے اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچا چاہتے ہیں۔ مگر شاعری میں اور زیادہ توانا اور مضبوط نظر آ رہے ہیں۔ ان کا آنے والا مجموعہ "شہر آئندہ" جس کے چیدہ چیدہ اشعار میں نے ان سے نجی محفلوں میں سنے ہیں۔ نہ صرف تازہ بلکہ تازہ تر اور توانا تر محسوس ہوئے ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو مجھے ان میں "کیٹس" کے اس نظریۂ فن کی پوری عکاسی دکھائی دی ہے جس کی رو سے ایک ادب پارہ دائمی مسرت یا کیف کا حامل ہوتا ہے اور اپنا حسن دوبالا کرتا رہتا ہے۔ ان پر کیٹس کی طرح شاعری کا نزول ایسا ہی نظر آ رہا ہے جس طرح قانونِ فطرت کے تحت درخت پہ پتے اُگتے رہتے ہیں۔ اب جہاں تک ادب برائے ادب کے حوالہ سے یہ کہا جائے کہ ہر لفظ اپنی جگہ اٹل ہو تو خصوصاً اس دور میں جہاں بڑے بڑے عروض داں اور سکہ بند شاعر فاش غلطیوں کے مرتکب ہیں اور قومی سطح کے سخنور اندھا دھند گولیاں چلا رہے ہیں شوق صاحب اپنے ہم عصر شعراء میں احمد ندیم قاسمی اور عزیز حامد مدنی کی طرح بڑے مضبوط اور توانا دکھائی دیتے ہیں الف سے یے تک میں نے ان کو پڑھا تو بے ساختہ کسی استاد کا یہ شعر یاد آ گیا:

داند آں کس کہ فصاحت بکلامی دارد
ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامی دارد

لاہور کی یادیں

نصیر شادانی

یہ میری یادیں نہیں ہیں، زندگی کے اُس عہد کی مرثیہ خوانی ہے جو ماضی کے گورستان میں دفن ہو چکا ہے۔ جن بزرگوں اور رفقاء کا ذکر کیا چاہتا ہوں، اُن میں اکثر عالمِ جاودانی کا سفر کر چکے ہیں۔ اور میں اُن کا ماتم کرنے کے لیے زندہ ہوں۔ وہ صحبتیں جو برہم ہو چکی ہیں اور جن کے نقوش حافظہ کی لوح پر مرتسم رہ گئے ہیں، اُن کی یاد سے دل پر جو عالم گزر جاتا ہے، اُس کے اظہار کے لیے ذہن وضعِ الفاظ سے قاصر ہے۔ جب میں اپنی بیاضِ حیات کی ورق گردانی کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اُن میں کچھ رفقاء کے احوال کچھ مشاہیر کی عظمتیں اور کچھ اہلِ علم کے تذکرے محفوظ ہیں۔

اس وقت میں اس شش و پنج میں ہوں کہ اس داستان کو کہاں سے شروع کروں ——— میں ۲۶ر اگست ۱۹۲۸ء کو وارد لاہور ہوا تھا۔ اُس وقت کا لاہور آج کے لاہور سے بالکل مختلف تھا۔ فصیلِ قدیم کے باہر صرف تین علاقے آباد یا نیم آباد تھے، ایک تو انارکلی اور پرانی انارکلی۔ دوسرے قلعہ گوجر سنگھ، تیسرے گوالمنڈی۔ مال روڈ کا وہ مقام، جہاں اب اسمبلی ہال ہے، ایسا ویرانہ تھا کہ دن کو ڈر لگتا تھا۔

۳ر ستمبر کو اورینٹل کالج کھلا۔ میرے والد نے حضرت شاداں بلگرامی کے نام ایک خط دیا تھا۔ میرے والد طبیب تھے مجھے اب تک بھی معلوم نہیں کہ وہ حضرت شاداں بلگرامی سے کس طرح متعارف تھے۔ میں نے کالج میں وہ خط شاداں صاحب کو دیا۔ انھوں نے خط دیکھ کر فرمایا کہ خط لانے کی کیا ضرورت تھی، یونہی کہہ دیتے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔

خواجہ دل محمد روڈ پر جہاں آج کل گھنی آبادی ہے، سردار سوہن سنگھ کی کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی کی زمین طول میں حضرت شاہ ابوالمعالی کے مکان تک چلی جاتی تھی۔ کوٹھی کی پشت پر قبرستان تھا جو میکلوڈ روڈ تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہ جہاں پور کے رہنے والے ایک صاحب ڈاکٹر فخرالدین محمود نے یہ کوٹھی ٹھیکے پر لی ہوئی تھی۔ ہم تین طالب علموں نے اس میں ایک کمرہ ۶ روپے ماہوار پر لیا ہوا تھا۔ یہ تین طالب علم ابوالحسن سیف تھے، مطیع الحسن تھے اور میں۔

ابوالحسن سیف کو اورینٹل کالج سے تعلق تو برائے نام ہی تھا۔ انھیں ملک کی سیاست اور سیاسی آدمیوں سے ملنے کا شوق، بلکہ شغف تھا۔ چنانچہ اس عہد کی تمام سیاسی شخصیتوں سے اُن کے مراسم تھے۔ مثلاً ڈاکٹر ستیہ پال صدر پنجاب کانگریس، کیدارناتھ سہگل جنرل سکریٹری وغیرہم۔ ابوالحسن سیف مرحوم نہایت مخلص، ہمدرد اور مرزانش انسان تھے۔ فتحپور ہسوہ کے رہنے والے تھے۔ میں ان کے احسانات کا شکر گزار ہوں۔ مطیع الحسن صاحب ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور ضرورتِ معاش کے ہاتھوں مولوی ہو گئے ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں استادِ محترم حضرت مولانا اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی اعلی اللہ مقامہٗ کے علمی مقام اور ان کی سیرت

کا تذکرہ کرتا ہوں۔ شاداں صاحب کی ولادت تو بلگرام میں ہوئی تھی۔ مگر تربیت اور تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی زبان میں مرزا محمد ہادی رسوا کے شاگرد تھے۔ مفتی محمد باقر صاحب سے بھی پڑھا تھا۔ شاداں صاحب اپنے عہد میں فارسی زبان کے فاضل اجل تسلیم کیے جاتے تھے۔ بالخصوص علم لغت پر ایسے حاوی تھے کہ اورینٹل کالج کے تمام اساتذہ انھیں علم لغت کا امام کہا کرتے تھے۔ ان کے گھر کے دروازے جویندگانِ علم کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ طلبا کے علاوہ علمی ذوق کے اور لوگ بھی آتے تھے اور اپنی مشکلات حل کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بعض کتابوں کو سات سات مرتبہ پڑھا تھا۔ جب کسی کتاب کا مطالعہ شروع فرماتے تھے تو سرِورق پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو شروع کی اور ورق کی پشت پر تاریخ اختتام لکھتے تھے۔ نہایت روشن خیال اور اجتہاد دوست انسان تھے۔ انھیں ہر معاملہ میں تقلید سے سخت نفرت تھی۔ مذہب کے معاملہ میں بھی وہ تقلید اور معتقداتِ عوام سے گریزاں تھے۔ اُن کی خدمت میں ہر مذہب و ملت کے طلبا حاضر ہوتے تھے۔ اُن کی محبت اور وسعتِ خُلق سے سب بہ توفیقِ تحصیل مستفید ہوتے تھے۔ اُن کے شاگردوں میں سے ایک صاحب تیج بہادر گول تھے۔ معمولی حاضری کے علاوہ اُن کا دستور یہ تھا کہ عید الفطر کے روز صبح کی اذان کے وقت ہی جاکر استاد کے دروازہ پر دستک دیتے اور کچھ کھانے کو مانگتے۔ استادِ محترم تیج بہادر سے مذاق کیا کرتے تھے "تیج! میری اور تمہاری ذات ایک ہی ہے۔ میرے آبا و اجداد مکہ کے پجاری تھے اور تمہارے مندر کے"۔

شاداں صاحب کی صحبت درحقیقت علم کی بارش تھی۔ میں اپنے قصبہ نوگانوں کے مدرسہ باب العلم سے پڑھ کر لاہور آیا تھا وہاں میں نے فارسی میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے کامل کا امتحان دیا تھا۔ پھر عربی پڑھ کر مولوی پاس کیا اور مولوی عالم میں پڑھتا تھا۔ وہاں سارا ماحول قدامت پرست مقلدین کا تھا جو ہر وقت فکر کا گلا گھونٹتے رہتے تھے جہاں علم نام تھا صرف "خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست" کا۔ بزرگوں کے قول کو بے چون و چرا تسلیم کرنے ہی کو سعادت سمجھا جاتا تھا۔ اب جو شاداں صاحب کی قربت نصیب ہوئی تو دماغ کے دریچے کھل گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک بدبودار، غلیظ اور متعفن فضا سے نکل کر گلشن پر بہار میں آگیا ہوں۔ استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ علم کا نہ کوئی مذہب ہے نہ اُس میں کوئی میراث چلتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو اگلے کہہ گئے ہیں وہی صداقتِ مطلق ہے۔ اگر افلاطون اور ارسطو سوچ سکتے تھے تو کیا خدا نے تمہاری عقل کے دروازوں کو بند کردیا ہے۔ شاداں صاحب کے فیضِ صحبت کا سب سے بڑا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ نسل، قوم، مذہب اور عقیدہ کسی قسم کا تعصب باقی نہ رہا۔

ڈاکٹر فخر الدین محمود کی کوٹھی اِن دونوں علما کے اجتماع کا مرکز تھی۔ کوٹھی کے صحن میں ہر روز چھڑکاؤ کیا جاتا۔ کرسیاں اور مونڈھے رکھ دیے جاتے اور ایک نہایت پرتکلف حقہ بھر کے بیچ میں رکھا جاتا۔ ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ اُس عہد کے جملہ اہل علم بجز سر عبدالقادر کے سب اُسی قرب و جوار میں رہتے تھے۔ اب اربابِ کمال کی آمد شروع ہوتی تھی۔ شاداں بلگرامی، حافظ محمود شیرانی، مولانا احسن اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، عبدالمجید سالک ایڈیٹر "انقلاب"، پروفیسر عبدالقادر ——— یہ حضرات تو روزانہ آنے والوں میں سے تھے۔ کبھی کبھی نشتر جالندھری بھی آتے تھے۔ میں ایک حقیر طالب علم تھا۔ میری کیا جرأت تھی کہ ان اساتذہ اور علما کے ہم صحبت بننے کا خیال بھی کرتا۔ ذرا دور ایک چارپائی بچھا لیتا تھا اور ان بزرگوں کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کیا عرض کروں کہ جب وہ منظر یاد آتا ہے تو دل پر کیا عالم گزر جاتا ہے ؎

ہر کس کہ رفت رخ بسوئے خاکداں نہ کرد   وضع زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست

ان میں سے ہر شخصیت کا حال لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ حافظ محمود شیرانی محقق آدمی تھے۔ زبان کے محاوروں اور روزمرہ سے اُس کے بولنے والوں کے اخلاق اور سیرت کی تحقیق کے بڑے شائق تھے۔ اس امر پر بھی زور دیتے تھے کہ کسی قوم

پر جب تاریخی انقلابات وارد ہوتے ہیں تو اُن کی زبان پر کیا اثر پڑتا ہے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی دیال سنگھ کالج میں اردو کے استاد تھے۔ شاعر تھے اور شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ ادبی رسالے نکالنے کا انھیں شوق تھا۔ ادبی دنیا جو بعد میں مولانا صلاح الدین احمد کی ملکیت بنا انھیں نے جاری کیا تھا جب میں اُسی شہر لاہور میں اُستاد ہوگیا تو مجھے بھی اُن کی خدمت میں بارہا باریابی کا موقع ملا کسی زمانے میں، میں اسکول میں بھی کام کیا کرتا تھا۔ ایک روز میں صبح ہی صبح سکول کو جارہا تھا۔ مولانا دیال سنگھ کالج کے دروازے پر کھڑے تھے اور بہت ناراض نظر آتے تھے مجھے دیکھتے ہی میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ "نصیر صاحب یہاں آئیے۔" میں قریب گیا تو کہا "میں آپ کے شرافت نسبی کے اصول کا اب قائل ہوگیا ہوں" — میں سمجھ گیا کہ کسی شخص نے مولانا کی دل آزاری کی ہے۔

جب مولانا کو شمس العلما کا خطاب ملا تو سالک صاحب نے "انقلاب" میں اس خبر کو شائع کرکے یہ شعر لکھ دیا ؎

شکر صد شکر ہر آں چیز کہ ملا می خواست　　　آخر آمد ز پس پردۂ سرکار پدید

میں مبارکباد دینے گیا تو سالک کے مذاق پر مسکرا کر فرمایا "دیکھو اس شخص نے میرے متعلق کیا لکھ دیا ہے۔"

لاہور میں ایک صاحب کاظم حسین تھے۔ وہ انجینیرنگ کالج میں ڈیمانسٹریٹر تھے مگر ہم انھیں پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا ذہین آدمی کم دیکھا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ وہ سردی کی ایک رات کو میرے پاس بیٹھے تھے۔ انگیٹھی سلگ رہی تھی اور اُس میں سے پتنگے اُڑ رہے تھے۔ کاظم حسین کہنے لگے "دیکھو ایک دن سائنس داں ان ذرات کی قوت کو دریافت کرلیں گے اور دنیا کو تباہ کردیں گے۔" قدرت نے انھیں گلا بہت اچھا دیا تھا میرے پاس اکثر آتے تھے۔ جب آتے تو خوب گاتے اور باقی وقت لطائف میں صرف کرتے تھے۔

کاظم حسین صاحب مرحوم کا تعارف میں نے اس نے کرایا کہ جب مولانا تاجور صاحب کو شمس العلما کا خطاب ملا اور سالک صاحب نے شعر میں پھبتی لکھی تو میرے پاس چند احباب بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی نے کہا۔

"مولانا کا علم اتنا تو نہیں کہ انھیں شمس العلما کہا جائے۔"

کاظم حسین نے برجستہ کہا کہ خطاب کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ واقعی عالم ہیں۔ اس کا مطلب تو فقط یہ ہے کہ حکومت اُن پر اعتبار کرتی ہے۔

اب مجھے اس زمانے کی ایک رومانی شخصیت کا نام یاد آیا۔ جب میں ۱۹۲۸ء میں لاہور وارد ہوا تو ابوالحسن سیف صاحب نے سب سے پہلے میری ملاقات اختر شیرانی سے کرائی۔ اس زمانے میں اختر اپنی رومانی نظموں کی وجہ سے نوجوانوں کے آئیڈیل تھے۔ محمود شیرانی صاحب فلیمنگ روڈ پر جس مکان میں رہتے تھے اس کی نچلی منزل میں ایک کمرہ اختر صاحب کا تھا۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ متعدد احباب جمع ہوکر شرب مدام میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کے والد حافظ محمود شیرانی متقی آدمی تھے۔ انھوں نے بیٹے کی ناہمواری کو بہت برداشت کیا۔ حافظ صاحب کا انتقال ٹونک میں ہوا۔ مگر اختر تقسیم ہند کے بعد پھر لاہور آگئے تھے اور حکیم نیر واسطی کے پاس رہتے تھے۔ دائم الخمر تھے۔ یا تو میں نے اُن کا وہ زمانہ دیکھا تھا کہ احباب کے پیر دھتے یا وہ وقت بھی دیکھا کہ میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل کے سامنے میلے کپڑے پہنے ننگے پاؤں پھر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور رونے لگے۔ اور کہا کہ — "نصیر صاحب! آپ کہتے تو ہوں گے کہ اختر ننگے پیر پھر رہا ہے۔"

عبدالمجید سالک مرحوم نہایت باغ و بہار اور اپنی ذات سے خود انجمن تھے۔ اس مرحوم کی خوبی یہ تھی کہ انتہا درجہ ہمدرد انسان

تھے، اپنا یا پرایا جو شخص بھی ان کے پاس کسی کام کو چلا جاتا اُسے اپنا کام سمجھ کے کرتے، اُن کی ڈائری میں اہل حاجت کے پتے، اُن کے کام اور جن صاحب سے سفارش کرنی ہوتی اُن کے عہدے لکھے ہوتے تھے۔ چونکہ وہ ایک موقر روزنامہ کے مالک و مدیر تھے اس لئے ان کے تعلقات بڑے بڑے صاحبِ اختیار لوگوں سے تھے، اسی لئے وہ اپنی رسائی سے کسی کو فائدہ پہنچانے میں گریز تو کیا تساہل بھی نہ کرتے تھے۔

انہیں کے ساتھی غلام رسول مہر بھی تھے۔ وہ تنہائی پسند ہی نہیں، مردم گریز آدمی تھے، مگر تھے بڑے بااصول۔ ایوب خاں صاحب کے عہد میں جب نواب صاحب کالا باغ گورنر تھے تو انھوں نے مہر صاحب کو بلایا اور کوئی سیاسی قسم کی خدمت کے عوض انھیں ایک معقول رقم دینی چاہی مگر ـــــ مہر صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ـــــ "میں تو تقسیم ہند ہی کا مخالف رہا ہوں لہذا یہ خدمت انجام دینے سے قاصر ہوں۔"

تلازم خیال کے تحت مجھے اس وقت لاہور کے ایک غیر معروف بزرگ پنڈت کشن پرشاد یاد آ گئے، پنڈت جی موصوف لاہور میں سنہری مسجد کے دہنی طرف ایک کوچے میں رہا کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج سے فارغ التحصیل اور مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے تحصیلدار ریٹائرڈ تھے۔ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ جب گھر سے باہر نکلتے تو سفید پگڑی اور سفید جبہ پہنے ہوتے تھے۔ اُن سے میری ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ وہ میرے پاس ابوالفضل کی ایک عبارت ترجمہ کرانے لائے۔ پھر کبھی کبھی میرے پاس از راہِ کرم تشریف لاتے تھے۔ اور جب آتے اپنا کوئی تازہ کلام ضرور سناتے تھے۔ زبان میں ایسا شعر کہتے تھے کہ روح شعر وجد کرتی تھی۔ مجھے اس وقت اُن کا ایک شعر یاد آیا ؎

سادگی میں بھی بری زاد بلا ہوتے ہیں
بت تراشے نہیں جاتے کہ خدا ہوتے ہیں

لاہور کی علم پرور شخصیتوں میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ حمید احمد خاں صاحب وہی ہیں جنھوں نے مرزا غالب پر تحقیق کے سلسلے میں دہلی جا کر اُن کی بہو بگا بیگم سے ملاقات کی تھی۔ حمید احمد خاں صاحب جب لاہور کے سول لائن کالج میں پرنسپل تھے تو انھوں نے ایک تحریک شروع کی کہ لاہور کے تمام مشہور بازاروں میں جا کر دوکانداروں سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ اپنی دوکانوں کے بورڈ اردو زبان میں لکھیں میں نے انھیں خط لکھا کہ اس سلسلے میں اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کر دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ فلاں روز اور فلاں وقت پر ہمیں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ملیے۔

تب سول لائن کے چند پروفیسر اور میں بازاروں پر دوکانداروں سے درخواست کرنے گئے کہ اپنے بورڈ اردو زبان میں لکھیں یا کم از کم انگریزی کے ساتھ اردو بھی ضرور لکھیں۔ اس کوشش کا مثبت نتیجہ تو بہت کم ہوا مگر حمید احمد خاں صاحب سے مجھے کچھ بے تکلفی ضرور ہو گئی۔ اس کے بعد حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر ہو گئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حمید احمد خاں صاحب مولوی ظفر علی خاں کے سوتیلے بھائی تھے۔

ایک روز میں ایم اے او کالج کے سبزہ زار میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص تلاش کرتا ہوا آیا۔ اُس نے مجھے ایک خط دیا، معلوم ہوا کہ وائس چانسلر صاحب نے یاد فرمایا ہے اور ملنے کا وقت بھی مقرر کیا ہے۔ میں نے حاضری دی تو فرمایا کہ ہم نے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو سائنس اور فلسفہ کی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرے گی۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اُس مسودہ کو خوش خط صاف کرتے جائیں۔ اب ذرا اس کمیٹی کی روداد سنیے، سائنس اور فلسفہ کی اصطلاحات کا ترجمہ جن صاحبان کے سپرد تھا اُن میں سے ان علوم کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس کے چیرمین جناب وقار عظیم صاحب تھے۔ میں اس کمیٹی کے دو جلسوں میں شریک ہوا۔ وقار عظیم صاحب کے سامنے مصر کی مطبوعہ ایک لغت کئی جلدوں میں اور ایک فہرست اصطلاحات مطبوعہ حیدرآباد دکن رکھی رہتی تھی۔ کمیٹی میں اورینٹل کالج کے دو پروفیسر اور ایک صاحب، جو حیدرآباد دکن میں دار الترجمہ سے متعلق رہے تھے، شریک ہوتے تھے۔ میری حیثیت

صرف تماشائی کی تھی۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ میں سے ایک صاحب جو ہنوز جوان تھے سنہری عینک لگا کے اور کاغذات رکھنے کا ایک قیمتی بیگ لے کر آتے تھے اصطلاح کے ترجمے کے حسن و قبح کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ جو ترجمہ منظور ہوتا اُسے کاغذ پر لکھ لیتے تھے بس اُن کا سرمایۂ علم کاغذ ہی پر تھا دماغ میں کچھ نہ تھا۔ ان اجلاسوں میں، میں نے دیکھا کہ سب حضرات اُن دکنی ممبر کی بات کو فیصلہ کن سمجھتے تھے۔ آخر حمید احمد خاں وائس چانسلری سے علیحدگی کے ساتھ ہی یہ کمیٹی بھی ختم ہو گئی۔

لاہور کے اہلِ علم کی آخری صف میں اسلامیہ کالج کے استاد مولانا علم الدین سالک تھے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے۔ شبلی کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ انھیں تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ اُن سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ جب ملتے یوں کہتے۔ کہ آپ نصیر صاحب مل کر کچھ کریں ـــــ ملے تو ہم بہت دفعہ مگر ہم سے کیا کسی نے کچھ نہیں ـــــ آدمی جذباتی تھے۔ قدیم اقدار کے پابند مسلمانوں کی گزشتہ عظمت اور عہدِ ماضی کے علمائے اسلام کی ثنا خوانی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ "وہ یہ ہے کہ" ان کا تکیہ کلام تھا۔ پاکستان کے عالمِ شہود میں آنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے ایک ایجوکیشن بورڈ بنایا تھا۔ اُس کے جلسے سینٹ ہال میں ہوا کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے مولانا کی اور میری نشست پاس پاس ہی ہوتی تھی۔ ایک نشست میں مولانا چند منٹ تاخیر سے آئے بیٹھتے ہی بڑے جوش کے لہجے میں کہنے لگے ـــــ "دیکھا آپ نے اسے؟" ـــــ میں نے عرض کیا "کون؟" فرمایا "عبدالقادر" میں نے عرض کیا "پھر کیا ہوا" کہنے لگے "اسے شیعوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔" بات یہ تھی کہ پروفیسر عبدالقادر اسلامیہ کالج میں تاریخ کے استاد تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے انھیں شیعہ قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ اس بات پر مولانا ناخوش تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور میں کسی ایسے ادبی حلقہ کی تشکیل کا خیال جس میں اشعار پر تنقید ہوا کرے، سر عبدالقادر کے فرزند منظور قادر صاحب کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ میں اس زمانے میں سکول ٹیچر تھا۔ ایک روز میرے ایک ہم نام شاگرد نصیر الدین (جو تقسیمِ ہند کے بعد ادبی حلقوں میں نصیر انور بن گئے تھے) میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ کو منظور قادر صاحب بلاتے ہیں۔ مجھے احساسِ کمتری تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی! میں ایک ادنیٰ آدمی ہوں منظور قادر صاحب اور میرا کیا جوڑ ہے۔ مجھے معاف رکھو مگر نصیر صاحب کا اصرار اتنا بڑھا کہ آخر میں ایک شام کو منظور قادر صاحب کے دولت کدہ پر گیا۔ وہاں ایک صاحب اور بھی آئے۔ اب مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ اس مختصر سی میٹنگ میں منظور قادر صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسی مجلس قائم کی جائے جس میں شعرا اپنا کلام پڑھیں اور ان پر تنقید ہوا کرے۔ چنانچہ ان کے دولت کدہ ہی پر ان مجالس کی نشست کا فیصلہ ہوا۔ ابتدائی جلسوں میں تو تنقید ہوتی رہی پھر یہ جلسے مختصر پیمانوں پر مشاعرہ کی صورت اختیار کر گئے۔ اس لئے بند کر دینا پڑے۔ منظور قادر صاحب نہایت علم دوست آدمی تھے۔ اُن کا کتب خانہ بڑا علمی خزانہ تھا۔ انھیں آرٹ سے بھی نہایت لطیف ذوق تھا۔ یورپ کے ممتاز مصوروں کے آثارِ قلم کے البم ان کے پاس تھے۔ وہ کبھی کبھی جب لطافت پسند موڈ میں ہوتے تو مجھے وہ البم نکال کے دکھاتے اور ساتھ ہی ساتھ ان باکمال مصوروں نے اپنے موقلم کے جو نقوش چھوڑے ہیں اُن کے نکات سمجھایا کرتے تھے۔ بڑے وضعدار آدمی تھے۔ ایوب خاں کے عہد میں جب وہ وزیرِ قانون ہو گئے تھے تو ایک روز مجھے میکلوڈ روڈ پر ایک سینما کے سامنے مل گئے۔ پہچانا اور بڑے اخلاق سے میرا حال پوچھا۔

سنہ ۲۸، ۲۵، ۳۰ء لاہور میں بڑے ہنگامے کا عہد تھا۔ شاعروں کے تین گروہ تھے ـــــ ایک گروہ مولانا تاجور کا۔ دوسرا حفیظ جالندھری کا اور تیسرا اختر شیرانی کا۔ "ایس پی ایس کے" ہال میں مشاعرے ہوتے تھے اور یہ تینوں حضرات اپنے اپنے شاگردوں اور مداحوں کی افواج کو لے کر مقابلے کے لئے پہنچتے تھے۔ وہ مشاعرے کیا تھے حقیقت میں شاعروں کے دنگل ہوتے تھے۔

میں نے حفیظ صاحب کی جوانی دیکھی ہے مگر اُن سے ملا کبھی نہیں تھا۔ اُن کی زندگی کا ایک لطیفہ بھی سناتا چلوں۔ ایک مرتبہ

انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا اور آغا حشر صدارت کر رہے تھے۔ حفیظ صاحب ان دنوں جوان تھے۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ ایک شعر کو انھوں نے تخصیص کے ساتھ گلے کی پوری پھرت کے ساتھ پڑھا اور توقع یہ کی کہ آغا حشر داد دیں گے۔ مگر آغا صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ حفیظ صاحب نے وہ شعر دوبارہ پڑھا مگر آغا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تیسری بار حفیظ صاحب نے صاحب صدر کو متوجہ کر کے اور پوری موسیقیت صرف کر کے شعر پڑھا تو آغا صاحب نے ان لفظوں میں داد دی "ہاں ہاں آپ خوب گاتے ہیں!"

اُن کی اور میری ایک ڈرامائی ملاقات ہوئی۔ یوم آزادی کی تقریب میں یونیورسٹی سینٹ ہال میں ایک جلسہ تھا۔ حفیظ صاحب آئے اور میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرے بائیں طرف پروفیسر ناظر حسن بیٹھے تھے۔ اُن سے گفتگو فارسی ادب کی بعض خصوصیات پر ہو رہی تھی۔ حفیظ صاحب چند منٹ تو ہماری باتیں سنتے رہے۔ پھر بڑے اشتیاق آمیز لہجہ میں مجھ سے پوچھا: "آپ کی تعریف؟" میں نے مختصر لفظوں میں اپنا تعارف کرایا۔ پھر کیا تھا، کھڑے ہو گئے۔ معانقہ کیا اور بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کہ آپ کا نام تو اکثر سنا کرتا تھا خوش قسمتی سے آج ملاقات بھی ہو گئی۔ بس اُن سے وہی پہلی اور وہی آخری ملاقات تھی۔

اب میں دوستداران علم میں سے اپنے ایک رفیقِ سفر مصطفےٰ علی ہمدانی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات میں سے جو صاحبان ریڈیو اعلانات سنتے رہے ہیں انھوں نے مصطفےٰ علی ہمدانی کا نام سنا ہوگا۔ وہ ریڈیو اناؤنسر تھے۔ مصطفےٰ علی اورینٹل کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ کلاس میں ہمیشہ ہم دونوں شانہ بشانہ بیٹھتے تھے۔ مصطفےٰ علی کی مادری زبان فارسی تھی اور میری پدری زبان فارسی تھی۔ فارسی لکھنے میں ہم دونوں کا مقابلہ بھی رہتا تھا۔ مصطفےٰ علی ایک عالی ظرف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جد اعلیٰ ہمدان سے آکر پہلے کشمیر اور پھر لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کے گھر کی تہذیب ایرانی تھی، اُن کی وضعداری کا یہ حال تھا کہ طالب علمی کے زمانہ میں جیسے پُر جوش تعلقات تھے، مرتے دم تک ویسے ہی رہے۔ وہ میری اقامت گاہ سے بہت دور وسن پورہ میں رہتے تھے۔ اگر مجھے اُن کے پاس جانے میں تاخیر ہو جاتی تو اپنے کسی فرزند کو خیریت معلوم کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔ مصطفےٰ علی شعر بھی کہتے تھے، اور بہت خوب کہتے تھے۔ اُن کی شاعرانہ زندگی میں ایک واقعہ سے انقلاب آگیا تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز عصر کے بعد میں استاد محترم حضرت شاداں بلگرامی کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ مصطفےٰ علی آگئے۔ انھوں نے آکر بڑے ادب سے سلام کیا اور پنجاب کی رسم کے مطابق پیروں کو مس کیا۔ بیٹھ گئے۔ جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر استاد کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی غزل اصلاح کے لئے لائے ہیں۔ اُستاد اس کاغذ کو بغور دیکھتے رہے پھر فرمایا "مصطفےٰ اتم میر نہیں ہو سکتے، غالب نہیں ہو سکتے، تو پھر اس خرافات سے فائدہ!" اب مصطفےٰ علی کی سعادت مندی دیکھئے کہ اُستاد کی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا۔ غزل کہنے سے توبہ کر لی اور مدح اہل بیت میں سلام اور رباعی لکھنے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں جب شاداں صاحب لاہور سے چلے گئے تو مصطفےٰ علی اپنا کلام نشتر جالندھری کو دکھانے لگے۔

اورینٹل کالج کے نام کے ساتھ تلازم خیالات کے تحت مجھے ڈاکٹر وولنر یاد آگئے۔ ڈاکٹر وولنر جرمن تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو کبھی کبھی کلاسوں کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کے یہ سوال کرتے تھے؟ WHICH CLASS IS THIS یہ کہہ کر ایک دو منٹ کھڑے رہتے اور چلے جاتے۔ ایک بار ایک شخص نے وولنر صاحب کو اپنی بی اے کی ڈگری واپس کی اور لکھا کہ چونکہ میں نے یہ سند ناجائز ذرائع استعمال کر کے حاصل کی تھی اس لئے میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ ڈاکٹر وولنر نے وہ ڈگری اسی شخص کو واپس کر دی اور لکھا کہ "تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ وہ انسان کے ضمیر کو بیدار کرے۔ اب چونکہ تمہارا ضمیر بیدار ہو گیا ہے اس لئے تم اس کے مستحق ہو۔"

میرے زمانے میں اورینٹل کالج میں ایم اے پاس صرف دو ہی آدمی تھے۔ ایک مولانا شفیع صاحب، دوسرے اقبال صاحب، باقی سب استاد وہ تھے جنھوں نے درس نظامی کے طور پر دیسی مدرسوں میں فارسی عربی پڑھی تھی۔ ہماری کلاس کو مولانا نور الحق عربی پڑھایا کرتے تھے۔ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ جب ۱۹۴۸ء میں استادِ محترم حضرت شاداں کا انتقال ہوا تو مجھے وہ اتفاقاً فلیمنگ روڈ پر مل گئے۔ میں نے انھیں استاد کی خبر رحلت سنائی۔ اُن کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "آج علم مر گیا!"

میرے کرم فرماؤں میں دیال سنگھ کالج میں ایک پروفیسر نرمل چند تھے تقسیم ہند کے بعد وہ جالندھر چلے گئے تھے اور وہیں سورگ باش ہو گئے۔ پروفیسر موصوف نہایت سنجیدہ طبع اور روشن فکر اور عقلیت دوست آدمی تھے۔ میں ان کے مکان پر کبھی کبھی جاتا تھا۔ وہ خود تو برہمو سماج مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن دوسرے عقاید کے معاملے میں نہایت روادار، حقیقت پسند اور قدر شناس انسان تھے۔ جب مدراس سے راما کرشنا لاہور آئے اور کلب روڈ پر اُس کوٹھی میں لکچر دیتے تھے جہاں آج کل مجلس ترقی ادب کا دفتر ہے تو پروفیسر مذکور اُن لکچروں میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اُن کی حقیقت پسندی کا یہ عالم تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کرتے تھے "آپ نے کو اصلاح میں کتنی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی جسے اپنی قوم کو یہ تک بتانا پڑے کہ اگر دروازہ بند ہو تو کھٹکھٹا لیا کرو"۔ جذباتی طور پر وہ رجائیت پسند تھے۔ چنانچہ ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "جینے کی خوشی"۔

خالصہ کالج لاہور کے ایک اور پروفیسر راجندر سنگھ تھے۔ نہایت خوش خصال، کریم النفس اور دوست پرور آدمی تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب لاہور میں انسانی خون کی ارزانی تھی انھیں قتل کر دیا گیا۔ ایک صحبت میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ذبیحہ بہتر ہے یا جھٹکا۔ پروفیسر موصوف کہنے لگے کہ یہ تو بکری سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

اب آخر میں مَیں علم و ادب کی اس شمع فروزاں کا ذکر کروں گا جو حوادث کے جھونکوں سے نہایت بے کسی کے عالم میں بجھ گئی۔ وہ مجسمۂ دانش جس کی زندگی میں لایعلمون کے مشارٌالیہ اس لیے حسد کرتے تھے کہ وہ معشرِ یعلمون کا ایک فرد تھا۔ اُس کی حیات میں اُس کے مقام علم اور فضیلت تبحر کو سمجھنے والے لوگ نہ تھے، اور مرنے والے کے بعد اب کوئی یاد کرنے والا نہیں۔ وہ تھے ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر صاحب موصوف تہران یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ اُن کا محبوب مشغلہ علم لسانیات PHILOLOGY تھا۔ اس علم میں ان کا شمار دنیا کے باکمالوں میں ہوتا تھا۔ فارسی ادب پر ان کا عبور قابلِ رشک تھا۔ انتہائی ذہین اور طباع انسان تھے۔ علوم ادبیہ انھیں مُتحضر تھے۔ اُن سے میری پہلی ملاقات اورینٹل کالج میں غالباً ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ چند ہی ملاقاتوں میں ہماری روحوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور ہم ایک دوسرے کے رازدار ہو گئے۔ انھوں نے متعدد علمی کام یادگار چھوڑے ہیں۔ دیوان عرفی کی تصحیح کی جسے پنجاب یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔ دیوان غالب فارسی کو از سر نو مدوّن کیا۔ امیر خسرو پر بھی کام کیا ہے۔ میں نے بڑے بڑے علما کو دیکھا اور اُن سے پڑھا ہے مگر میں وثوق سے کہتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی جیسا وسیع العلم انسان شاذ ہی پیدا ہوتا ہے۔ میں نے جب عابدی صاحب کے انتقال کی خبر "نوائے وقت" میں پڑھی تو اُن کے فرزند کو تعزیت نامہ میں، میں نے صرف ایک ہی جملہ لکھا تھا کہ "جو ہم نہیں جانتے اب کس سے پوچھیں گے"۔ مولانا حالی کا وہ شعر یاد آیا جو انھوں نے مرزا غالب کے مرثیہ میں لکھا ہے ؎

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں | اہلِ ماتم جنازہ ٹھہرائیں

جن دوستوں اور بزرگوں کا میں نے ذکر کیا ان کے علاوہ بھی قابل ذکر شخصیتیں تھیں، مثلاً مولانا صلاح الدین احمد، آغا باقر، آغا طاہر، ڈاکٹر دلاور حسین پرنسپل ایم اے او کالج یہ تو تھے مرحومین اور زندہ لوگوں میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ہیں۔ یہ سب لوگ اس قابل تھے کہ ان کا ذکر کیا جاتا مگر میں نے یہ صفحات ایک ہی نشست میں لکھے ہیں، اور لکھتے لکھتے تھک گیا تھا۔

صاحبو! میں نے آپ کی خدمت میں اُن ہستیوں کا ذکر کیا جو فنا فی العلم تھے جنھوں نے صرف حصول معاش کے لیے تحصیل نہیں کی تھی بلکہ اس لیے پڑھا تھا کہ جاننا ہی ان کا مقصد تھا۔ مگر اب وہ معاشرتی حالات ناپید ہیں۔ تاریخ نے اپنا پہلو بدل لیا ہے۔ اس زمانہ کی ضرورتیں اُس زمانہ کی احتیاجات سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ لوگ صرف حرف شناس نہ تھے بلکہ گنوان پنڈت تھے علم ان کی ذات میں رچا ہوا تھا اور اب کاغذی قابلیت (PAPER QUALIFICATION) کا زمانہ ہے۔ اب تحصیل علم کے اقتضا سے نہیں، پیسہ کے زور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کا علم لفظوں سے شروع ہوتا ہے اور لفظوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ کتاب میں پڑھتے ہیں نفوس پر اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مسافرِ خیال

محمد اشفاق چغتائی

مرزا غالب نے تقریر کی نمایاں خوبی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ سننے والا یوں محسوس کرے گویا کہی جانے والی بات اس کے دل میں موجود ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ، میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح بسا اوقات کوئی خوبصورت شعر اپنے حُسنِ معنی کے ساتھ سماعت کے پردوں سے ہوتا ہوا جب ذہن کے کینوس پر مرتسم ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے شعر کا مفہوم پہلے سے ذہن میں موجود ہے۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ ہماری نگہِ شعور اس خیال کو کسی دوسرے لباس میں دیکھ چکی ہوتی ہے اور مختلف قالبِ شعر میں پہچان لیتی ہے۔

عظیم خیال وہی ہوتا ہے جو گردِ ایام کی دستبرد سے محفوظ رہتا ہے اور عہد بہ عہد سفر کرتا ہے۔ ہم اسے بجا طور پر مسافرِ خیال کہہ سکتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے توارد کا نام دیتے ہیں اور کچھ لوگوں نے اسے سرقہ کا الزام بھی دیا ہے لیکن توارد اور سرقہ میں بڑا فرق ہے۔ سرقہ یہ ہے کہ کوئی شاعر اپنے کسی پیشرو یا ہمعصر کے مصرعے یا شعر یا پوری کی پوری نظم کو اپنے نام کر لے، جبکہ توارد ایک ہی مضمون، مفہوم یا خیال کا مختلف عہد، علاقہ یا زبان کے شعراء کے کلام میں مشترک ہونا ہے۔ ایسا مشترک خیال محوِ سفر رہتا ہے اور ہر عہد میں اپنی عظمت کی دلیل بن کر سامنے آتا ہے۔

میرا ذوقِ تجسس مجھے بہت سے مسافر خیالات تک لے گیا اور مجھے بہت سے اجنبی مسافروں میں آشناؤں کی سی شباہتیں نظر آئیں۔ قارئین کے ذوقِ مطالعہ اور حسِ تحقیق کی تسکین کے لیے ان اجنبی شناسا مسافروں میں سے چند کا مختصر تعارف ان سے کراتا ہوں۔

نعت گوئی ایک ایسی صنف ہے جس میں ممدوحِ اعظم و اقدس ؐ کے مشترک ہونے کے سبب مضامین و خیالات میں توارد بے حد و بے حساب ہے۔ مسافر خیالات کی اس مختصر سی فہرست میں مطلع و عنوان بنانے کے لیے نعتیہ مسافر خیال سے بڑھ کر عظمت مآب خیال کوئی نہیں ہو سکتا۔

معروف عربی شاعر ابو نواس نے مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

وفی الایام عشت فقبکا لم یراک ، وما الاختام من باصر ونک من العہود

(یا رسول اللہ! میں ایسے دور میں پیدا ہوا جس نے آپؐ کو نہیں دیکھا بلکہ آپؐ کو دیکھنے والوں پہ بھی کئی عہد بیت چکے ہیں، میں ان کی تعریف کے لائق بھی نہیں ہوں، کجا آپ کی تعریف کروں)

اسی خیال نے کچھ عرصہ بعد مولانا جلال الدین رومیؒ کے قلب و دماغ میں انگڑائی لی:

حسرتے بر چشم ما، بر چشم عہد دردِ ما — نے ترا بینندہ، نے بیندگاں را دیدہ ایم

(خود اپنی آنکھوں اور اپنے پُر درد عہد کی آنکھوں پر افسوس ہے کہ نہ تجھے دیکھا، اور نہ تجھے دیکھنے والوں کو دیکھا)

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں یہی خیال شیخ ابراہیم ذوق کی زبان سے اس طرح ادا ہوا:

گُل نے تو دیدۂ بلبل ہی کے نالے دیکھے — تجھ کو دیکھا نہ تجھے چاہنے والے دیکھے

ذوق سے تقریباً ۶۵ برس بعد اسی خیال نے محسن کاکوروی کو تڑپایا:

میرے آقا تری توصیف کہاں ہو ممکن — میں نے دیکھے ہی نہیں دیکھنے والے تیرے

نعت کی گل پوش رہگزر کے ایک اور مسافر خیال سے ملئے جسے اپنے اپنے عہد کے نامور صوفی بزرگوں، کامل ولیوں کے مجذوبانہ قلموں نے اپنے اپنے انداز میں رقم کیا:

غم مخور یا وہ نگردد او ز تو — بلکہ عالم یاوہ گردد اندر او

(مولانا رومؒ)

حضورؐ بچپن میں شقِ صدر کے دوران جب حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو وہ غم اور بے قراری کے عالم میں آپؐ کو ہر طرف تلاش کرتی ہیں۔ اس وقت جبرئیلِ امین جس طرح ان کی تسلی کراتے ہیں، مولانا رومؒ نے اسے اپنے الفاظ میں نظم کیا ہے کہ "اے حلیمہؓ غم نہ کھا اور پریشان نہ ہو وہؐ تجھ سے گم نہیں ہوں گے بلکہ پورا عالم انؐ میں گم ہو جائے گا۔"

سرمدؒ فرماتے ہیں:

مُلا گوید کہ احمدؐ بہ فلک بر شد — سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

(مُلا نے کہا کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر ہیں، سرمد نے کہا کہ آسمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں)

اسی خیال کو نوجوان منصور آفاقی نے اس طرح اردو لباس پہنایا ہے:

شیخ کہتا ہے کہ افلاک نشیں ہیں احمدؐ — عشق فرمائے جہاں ذات وہیں ہیں احمدؐ

رہِ نعت کے مسافر چند نمائندہ خیالوں سے آشنائی کے بعد اب آیئے آپ کو شہرِ سخن کی چند اور رہگزاروں کے مسافر خیالات سے ملواتے ہیں۔ ایک عظیم خیال جس نے سب سے پہلے ابو نواس کے سازِ سخن کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے اپنی نمود کی راہیں تلاش کی تھیں ؎

أنا والريحانة الورد والقلب في الدرد
والتقاية المفرد تقيم بالحزن والحسرة الملامي

(میں، پھول کی خوشبو، قلب پُر درد کی صدا اور بجھتی شمع کا دھواں، تجھے چھوڑ کر رنج اور اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے حسرت لے کر اٹھے)

یہی خیال جس میں اس قدر جان تھی، مرزا بیدل کے موئے قلم سے فارسی قالب پا کر اپنی عظمتوں کا خراج وصول کرتا نظر آیا ے

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل! ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

اور ایک صدی گزرنے پر مرزا غالب کے ہاں اپنی عظمت کا لوہا منواتا دکھائی دیا:

بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل! جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوفِ طوالت سے اب میں صرف شعراء کا نام اور متوارد خیالات کے حامل اشعار پیش کرتا ہوں۔

چھٹی صدی ہجری کے عارف و صوفی احمد جامی رح کا قطعہ ہے:۔

غرّہ مشو کہ مرکبِ مردانِ مرد را در سنگلاخ بادیہ پاہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ جرعہ نوش ناگہ بہ یک ترانہ بہ منزل رسیدہ اند

اقبال رح نے اپنے انداز میں کہا:

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

ہمارے عہد کے ایک شاعر عبدالحمید عدم نے انتہائے محبت کی بات انتہائی حسنِ اختصار کے ساتھ یوں بیان کی ہے:

انتہا ہے تری محبت کی آپ اپنا رقیب ہو جانا

اس عظیم خیال کا آغازِ سفر حضرت شرف الدین بو علی قلندر رح کے ہاں ہوتا نظر آتا ہے:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدم ندہم گوش را نیز حدیثے تو شنیدم ندہم

مرزا غالب کے ہاں اسی خیال نے یوں اظہار پایا:

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اور اقبال کے ہاں ایک نئے رنگ سے جلوہ گر:

بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش
از نگہ بافم بہ رخسارے تو روبندے دگر

محبوبِ حقیقی کی تعریف ہی کے باب میں ایک اور متوارد خیال دیکھئے:

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

یعنی:

زندگیاں ختم ہوئیں اور قلم ٹوٹ گئے تری تعریف کا اک باب بھی پورا نہ ہوا

ایک اور خیال جسے مرشد رومیؒ اور مرید ہندیؒ نے اپنے اپنے انداز میں باندھا:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر (رومی)

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ (اقبال)

می تواں جبریل را گنجشک دست آموز کرد شہپرش با موئے آتش دیدہ بستن می تواں

اور حفظِ خودی کے موضوع پر:

گر بخود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست مثلِ گوہر در دلِ دریا نشستن می تواں

اقبالؒ کے الفاظ میں:

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں!

ایک اور خیال یہ ہے جو عہد بہ عہد بہت سے شعراء کے ہاں جلوہ نما ہوا۔۔۔ الحسین لا یحتاج المعین!

سعدیؒ ع حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

غنی کاشمیری ع آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

آتش:

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے!

اقبالؒ ع چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

ملکۂ نور جہاں کا ایک خوبصورت شعر ہے:

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

اسی خیال کو اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا:

نظارے کو تو جنبشِ مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

خیالِ سعدیؒ شیراز:

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم شراب با تو حلال است آب بے تو حرام

حافظؒ کے ہاں یہی خیال اس رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے:

در مذہبِ ما بادہ حلال است ولیکن بے روئے تو اے سروِ گل اندام حرام است

غالبؒ نے بے خوابی کا علاج تجویز کرتے ہوئے کہا تھا:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں!

تری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہو گئیں!

عدم نے اسی خیال کو اپنے انداز میں پیش کیا :

کہاں سے لائیں وہ گیسو جو گرم راتوں میں — ہجومِ ہوش کو ترغیبِ خواب دیتے ہیں

غالب نے مردم گزیدگی کا شکوہ کیا :

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد — ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

شکیبؔ جلالی کے ہاں اسی خیال کا اظہار ملاحظہ ہو :

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندام ہو جائے

انفرادیت پسندی کا اظہار شکیبؔ کے ہاں :

شکیبؔ اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

منفرد راستوں پہ چلتے ہیں ——— ہم ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

اور شہزاد احمد کہتے ہیں :

میرا وہ جادہ ہے جس پر نہ چلا تھا کوئی — تم ہر اک راہ پہ نقشِ کفِ پا مانگتے ہو

اقبال نے کہا تھا :

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر — ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

شکیبؔ کا اندازِ بیاں :

آنکھوں کو بند کر کے بڑی روشنی ملی — مدھم تھا جو بھی نقش اجاگر لگا مجھے!

مرا از شکستن چناں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی (سعدیؔ)

من فقیرے بے نیازم مشربم این است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن می تواں! (اقبالؔ)

اور یہی خیال :

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

نظیریؔ کا ایک خیال :

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگری — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ایک اردو شاعر کے ہاں :

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے
آتا ہے یہی جی میں کہ یہیں عمر بسر ہو

مولانا روم اپنے مرشد کے بارے میں کہتے ہیں :-

کعبۂ من کنشتِ من دوزخِ من بہشتِ من — مونسِ روزگارِ من شمسِ من و خدائے من

اقبال کا خیال ؎

در دہر نیازِ من در کعبہ نمازِ من — زنّار بدوشم من تسبیح بدستم من

قربِ الٰہی کے بارے میں صوفی شاعر محمود شبستری کا مسافر خیال ؎

اے زاہدِ ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی — او در من و من در وے چوں بو بگلاب اندر

اقبال کے الفاظ میں ؎

میانۂ من و او ربطِ دیدہ و نظر است — کہ در نہایتِ دوری ہمیشہ با اویم

اقبال کا خیال :

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست — تجلّیٔ دگرے در خورِ تقاضا نیست

شہزاد احمد کے ہاں بھی خیال اس رنگ میں جھلکتا نظر آتا ہے :

دھوپ نکلی ہے تو بادل کی ردا مانگتے ہو — اپنے سایے میں رہو غیر سے کیا مانگتے ہو

مرشد رومیؒ نے کہا تھا :

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

غالبؔ نے اس خیال کو یوں ادا کیا :

رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارم ! — محرم آنست کہ رہ جز بہ اشارت نبرد

مرید ہندی نے اسی خیال کو یوں باندھا :

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است — حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

چھٹی صدی ہجری کے مشہور صوفی شاعر یونس ایمرے نے ترکی زبان میں ایک خیال کو نظم کیا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے :

" اب تو ہر لحظہ نیا طُور میرے قدموں کے نیچے ہے اور برقِ انوار نئے انداز سے چمکتی ہے۔ کاش !
یہ ساعتیں ابد آشنا ہو جائیں "۔

اقبال نے اسے اردو قالب عطا کرتے ہوئے کہا ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

حضرت رابعہ بصریؒ ایک مرتبہ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے جا رہی تھیں۔ استفسار پر فرمایا کہ اس آگ سے جنت کو جلانے اور پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے جا رہی ہوں تاکہ لوگ جنت اور دوزخ کی امید اور خوف سے نیک عمل نہ کریں بلکہ اعمال کا دارومدار محض اللہ کی محبت پر ہو۔

غالبؔ نے اسی خیال کو یوں باندھا :

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی خیال کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

ابوالعلا معرّی کا ایک شعر ہے ؎

دعوت ربّی للمطر دامطرھا
انا وربی لا یدرم المولا

(میں نے اپنے خدا سے موسلا دھار بارش کے لیے دعا مانگی، اس نے دعا قبول کر کے بارش برسا دی، میں اور میرا خدا ہم دونوں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ اس دنیا میں کچے مکانوں والے بھی رہتے ہیں)

اسی احساس کی ترجمانی ہمیں دورِ حاضر کے ایک نوجوان شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ قائم نقوی کہتے ہیں:

بارشوں کی زد میں آ کر ڈھے گئے کچے مکاں
اور تھوڑی دیر کو موسم سہانا ہو گیا

دِل کے دوہے

خواجہ دل محمد

دورِ حاضر کی اردو شاعری میں دوہے کی صنف خاصی مقبول رہی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران بعض بہت یادگار دوہے کہے گئے ہیں مشکل صرف یہ ہے کہ بیشتر دوہے جس بحر میں لکھے جاتے ہیں وہ قدیم دوہے کی مسلمہ بحر نہیں ہے۔ یہ بحر "فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع" کی ہے حالانکہ دوہے کا وزن "فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع" ہونا چاہیئے۔ دوہے میں یہ جو ایک دلآویز نوعیت کی لچک کا مرحلہ ہے، یہی دوہے کو دوہا بناتا ہے

اردو میں خواجہ دل محمد نے اسی بحر میں دوہے لکھے تھے۔ ان کے پانچ سو دوہوں کا مجموعہ "پیت کی ریت" کے نام سے، شاید ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اس کے تعارف اور پیش لفظ لکھے تھے۔ آج کی محفل میں خواجہ دل محمد مرحوم و مغفور کے انہی دوہوں کا ایک انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے دوہے کی اس معروف بحر میں اتنے بچے تلے دوہے پڑھ کر شعرا اس صنفِ شعر کی طرف پہلے سے بھی زیادہ توجہ دینے لگیں ——— ادارہ

اب کی اب کے ساتھ ہے، جب کی جب کے ساتھ
جس کی رب کے ساتھ ہے، اس کی سب کے ساتھ

سرپٹ، دلکی، پوئیا، سو سو چال چلائے
آنکھیں بندھی کمیت کی، مالک نظر نہ آئے

میں مالک کی آنکھ ہوں، میں مالک کا ہاتھ
میں مالک کے ساتھ ہوں، مالک میرے ساتھ

سوئی سر کے بل چلے، بھاگوں سے کیا زور
مڑ مڑ پیچھے دیکھتی، ہاتھ پیا کے ڈور

منوا تنگ شریر میں، خودی خودی چلائے
بکری باندھی کھونٹے سے، میں میں کرتی جائے

من مندر کی سیڑھیاں، کعبہ، دیر، کنشت
دھوپ اور چھایا روح کی، دوزخ اور بہشت

گوندھی گوندھن ہارنے، سب دنیا اک تار
ذرہ بھی گم جائے تو، گم جائے سنسار

سورج نکلا، دن چڑھا، ہوئے ستارے ماند
بن میں پھروں اداس میں، جیسے دن میں چاند

دیا پسارے رات بھر، وال سنہری ہاتھ
میاں پتنگے! آچلیں، ہم تم مل کر ساتھ

بیرے انکھیں سینکتے، چلیں پیا کے ساتھ
سوکھا پتہ راہ میں، پڑا پسارے ہاتھ

مستی کی رت آگئی، ناچیں پھول اور پات
شاخیں مجھے بلا رہیں، کر کر لمبے ہات

چڑیا! تیرے چہچہے، میرا جیا لبھائیں
مطلب کچھ کچھ پا لیا، بول نہ بوجھے جائیں

جگمگ جگمگ کر رہی، تاروں بھری برات
کس دولہا کی آس میں، جاگیں ساری رات

دن سارے سنسار کو، اکو دیا دکھائے
رات بچاری کیا کرے، گھر گھر دیپ جلائے

رائی اوٹ پہاڑ ہے، قطرے میں طوفان
دیکھو پتلی آنکھ کی، تل میں چھپا جہان

ناز دکھائے نازنیں، عاشق ناز اٹھائے
خوشبو پھیلے باغ میں، جگنو دیا دکھائے

ننھی ننھی اوس کو کیوں، بھوکم زور؟
سورج دوارے چڑھ گئی بن سیڑھی بن ڈور

گھونگٹ کھولے کامنی، پھولوں کو غش آئے
شبنم چھینٹے مارتی، تتلی پنکھ ہلائے

گوری تیرا روپنا، فطرت کی چمکار
جیسے برسے چاندنی، جیسے آئے پیار

تل ننھا سا بیج ہے، تل کے اندر تیل
تیل کے اندر نور ہے، دل کو تل سے میل

قابو کرے بجلیاں، آگ، ہوا اور بھاپ
میں جانوں جب تو کرے، قابو اپنا آپ

اک مشعل انسان کو سیدھی راہ دکھائے
اک مشعل، انسان کے گھر میں آگ لگائے

لٹ پٹ[۱] لٹا[۲] نہ دھار تو، پھر مت چندیا مونڈ
اس دنیا دکھیا رکے، دکھ کا دارو ڈھونڈ

علم بڑے تو کم نہ ہو، اس کا یہی سبھاؤ
جوت گھٹے کب دیپ کی سو سو دیپ جلاؤ

۱؎ آڑی ترچھی

۲؎ گیس

جو تو پکّا گیان کا، منہ سے بول نہ بول
نین ترازو کھول کر، دھرتی امبر تول

چھانٹیں سو باریکیاں، عقل بھید کب پائے؟
اس سوئی کی نوک سے کنواں نہ کھودا جائے

سیوا جن کا کام ہے، دراس نہ رکھیں پاس
سوئی ننگی خود رہے، سب کا سیے لباس

جل میں رہ کر بھیگ مت، کنول روپ سے جی!
بات جو چاہے آپنی، پانی مانگ نہ پی!

پچھلا کل دفنا چکے، اگلا کل کل ہو
اس کل کل کو چھوڑ دے، آج نہ بے کل ہو

من پھولوں کی ٹوکری، چوہے پانچ حواس
کتر کتر کم ہو رہی، سب پھولوں کا ناس

آندھی اونچے پیڑ کو جڑ سے کھینچ گرائے
سبزہ جو کمزور ہے، جھک جھک کر بچ جائے

جیون بیتا، آگئی پچھتاوے کی شام
ہاٹ تمہاری لُٹ چکی، اب تالا کس کام

ہلکی پھلکی تیتری، اُڑے پاس اور دور
مور پروں کو کیا کرے، بوجھ لدا مزدور

پیٹ بھرے کب لوبھ کا، اگنی اس کو جان
جوں جوں ایندھن ڈالیے، نکلے اور زبان

ہم مہرے شطرنج کے، چوپٹ بچھی زمین
میں تیرا گھر چھین لوں، تو میرا گھر چھین

نیکی ان کی ریت ہے، جن کے نیک اصول
کانٹے پر بھی دھوپ میں، چھتری کھولے پھول

بپتا لپٹے اس طرح ناداروں کے ساتھ
جیسے لپٹے چھپکلی دیواروں کے ساتھ

راج محل کے آنگنا، برکھا امرت دھار
ٹپکے جن کی جھونپڑی، بوندا انھیں تلوار

بھوکا پیٹ کسان کا جو محنت سے چُور
دانے اس کے کھیت میں، روٹی اس سے دور

چٹے، گورے رنگ پر، کیوں متوالا ہو
کالی کالی گائے کا، دودھ نہ کالا ہو

ایسے خود مختار کی، آزادی کس کام
جس کا تن آزاد ہو، جس کی روح غلام

جگ ڈھونڈے انسان کو، ڈھونڈے اور نہ پائے
بھوسے کے کھلیان میں سوئی ہاتھ نہ آئے

پتہ ٹوٹے ڈال سے، ڈال بڑھائے ہاتھ
کانپے، لرزے، سر دھنے، بات نہ آئے ہاتھ

باقی میری آتما، فانی میرا نام
ذات مری انسان ہے، بات مری الہام

امیر خسرو ترجمہ صبا اکبر آبادی

رباعیات

رعدی نہ دو حل کہ جائے من بر گردو نست
گردوں داند صدائے آں رعد کہ چو نست
بے پردہ زمن بروں نیامد آواز
ہر چند کہ آواز من از پردہ برونست

بجلی کا نہ کڑکا ہوں نہ میں نغمۂ ساز
کیا میری صدا کی ہو فلک تک پرواز
آواز کو پردے میں چھپاتا ہوں مگر
بے پردہ ہی رہتی ہے ہمیشہ آواز

آں شمع کہ شمع روشنی را دودہ است
خود رانخ او کہ باد چشمت سودہ است
در دیدۂ تو جائے گرفتست آرے
بسیار بدنبالۂ چشمت بودہ است

وہ شمع کہ خود جس کا دھواں ہالہ ہے
تاریکی میں اک شعلۂ جوالہ ہے
چاہا تھا تری آنکھ میں کاجل بن جائے
اب اس پہ ہے مسرور کہ دنبالہ ہے

از شعلۂ عشق ہر کہ افروختہ نیست
با او سر سوزنی دلم دوختہ نیست
گر سوختہ دل نہ اے زما دور کہ ما
آتش بدلی زنیم کان سوختہ نیست

جو آتشِ عشق سے پگھلتا ہی نہیں
وہ جادۂ دوستی پہ چلتا ہی نہیں
بے سوزِ محبت مرے نزدیک نہ آ
اُس دل کو لگے آگ جو جلتا ہی نہیں

چوں کز غمت از دیدہ بروں میگزرد
چوں درد بدیدہ اے کہ خوں میگزرد
از مردمکِ دیدہ بر آمد فریاد
کامروز در ایں خانہ چہ چوں میگزرد

جب غم ترا اِن آنکھوں سے باہر گزرا
پھر درد جو تھا وہ خون بن کر گزرا
کرتی ہے مری آنکھ کی پُتلی فریاد
اس گھر سے مصیبتوں کا لشکر گزرا

والیری برسی یوسف
مترجم: عبدالعزیز خالد

بادِ شمال

شاعر سے!

تم کو پرچم کی طرح مغرور ہونا چاہیے ـــــ تلوار کی مانند تیز و صیقل و براں ـــــ تمھارے گال دانتے کی طرح زیرِ زمیں شعلے سے ہونے چاہئیں جھلسے ہُوئے ـــــ ہر ایک شے کے غیر جذباتی تماشائی بنو ـــــ ہر چیز پر ڈالو نظر ـــــ آمادگی جلتی چتا میں کود جانے کی، تمھارا جوہرِ کردار ہونا چاہیے ـــــ دنیا میں ہر شے روشن و وجد آفریں اشعار کا ہے رزقِ طیّب ـــــ سو تم اپنے لااُبالی دورِ طفلی سے تلاشِ لفظِ پُر معنی کرو ـــــ سیکھو در و بستِ سخن ـــــ حرفوں کو گویائی عطا کرنے کا فن ـــــ چوری چھپے کی پُر محبت ہمکناری کی گھڑی میں بھی، بچو مدہوش ہونے سے ـــــ کرے مصلوب جس لمحے بہیمانہ عقوبت تم کو، گاؤ اپنے پاگل درد کی عظمت کے آتشناک گیت ـــــ اُجلی، سہانی صبح کے رنگوں میں، خوشبوئے سکوتِ شام میں، تقدیر کی سرگوشیانہ وحی کے ادراک کی کوشش کرو ـــــ اور اس کو مت بھولو کبھی:

شروع روز سے شاعر کو تاج کانٹوں کا
ہے دل پسند تر اکلیلِ گوہر آگیں سے!

رابرٹ فراسٹ

ترجمہ: محمد افنس ساجد

رہگذر جو چھوڑ دی

دو طویل سے رستے، ہو گئے بہم یکجا، ایک زرد جنگل میں
میں رہا پشیماں سا، چل سکا نہ دونوں پر
بن سکا نہ اک راہی، اور کھڑا رہا برسوں
دیکھتا رہا اس کو (اک رواں تسلسل سے)
مڑ گیا تھا جو رستہ اک دبیز سبزے میں

چل پڑا میں دوجے پر، اتنا ہی لگا خوش رنگ
حق بھی اس کا تھا مجھ پر
گھاس اس پہ پھیلی تھی، چاپ کا وہ طالب تھا
گرچہ دونوں رستوں پر
لوگ چلتے رہتے تھے

دونوں راستے اس صبح
اَٹ گئے تھے پتوں سے
میں نے پہلے رستے کو کل پہ ملتوی رکھا
راستہ تو چلتا ہے آگے آگے بڑھتا ہے
مجھ کو شک تھا شاید میں لوٹ کر نہ آپاؤں

آ تجھے بتاؤں میں، اپنے غم کا یہ قصّہ
اک زمانہ بیتا جب
دو طویل سے رستے، ہو گئے بہم یکجا ایک زرد جنگل میں
اور میں چلا اس پر، جس پہ سب چلے کم کم
فرق پڑ گیا کتنا !!

ادا جعفری

وصال و ہجر کے موسم

طلسمِ خود پذیرائی کے موسم میں
وصال و ہجر آساں تھے
اُسی نادان دانائی کے موسم میں
ہوا کے ہاتھ سے
بادل کے ٹکڑے جوڑ کر میں نے
کبھی اک گھر بنایا تھا
وہیں پر نیل ساگر کے کنارے
تم کو پہلی بار دیکھا تھا
پھر اس کے بعد صدیوں تک
تمھاری راہ دیکھی تھی
پھر اس کے بعد کتنے مہرباں لمحے
صبا کے ہم سفر ہم نے گزارے ہیں

اور اکثر بے وفا دن بھی بہ حکمِ زندگانی
آندھیوں کے ساتھ کاٹے ہیں
تمھارے ساتھ اندھیروں نے بھی تنویریں تراشی ہیں
چٹانوں سے دُعا چہروں کی تصویریں تراشی ہیں
تمھارا ہاتھ تھامے
آج اچانک دھیان آیا ہے
کہ تم سے پُوچھ ہی لیتی
مری آنکھیں تو ہیں گردی
مگر ان دلرُبا اُجلے دھندلکوں میں
کبھی تم نے مجھے دیکھا ؟
مجھے تم نے کبھی دیکھا ؟ !

قتیل شفائی

رباعیات

دل پر اثرِ شام وہی ہے کہ جو تھا
جذبات میں کہرام وہی ہے کہ جو تھا
بے رنگئ حالات پہ رل کر مرے ساتھ
روتا ہوا اک جام وہی ہے کہ جو تھا

تُو آئے تو جنت مرا گھر ہو جائے
یہ عمر سہولت سے بسر ہو جائے
ہم میں تو دلوں کا ہے وہ رشتہ جاناں!
تو روئے تو دامن مرا تر ہو جائے

اِک رند کو ناراض نہ کر اے ساقی
پھر ظلم کا آغاز نہ کر اے ساقی
بولیں گے مرے حق میں ترے جام و سبو
مجھ کو نظر انداز نہ کر اے ساقی

محفوظ پسِ نقاب تُو بھی تو نہیں
کانٹے ہیں جو ہم، گلاب تُو بھی تو نہیں
واعظ ترے اعمال پہ سب کی ہے نظر
ناواقفِ احتساب تو بھی تو نہیں

تُو صاحبِ اعجاز نہیں ہو سکتا
تجھ پر تو ہمیں ناز نہیں ہو سکتا
کرتا رہے کائیں کائیں کوّا کتنا
کوئل کا ہم آواز نہیں ہو سکتا

قتیل شفائی

دوہے

چلی جو نار ہزار بار، دھنک پہ رکھ کر پاؤں
اب کے پیرا اُس نار کے، دیکھے بناں کھڑاؤں

مت آئیو تُم شہر میں، بَن بَن ناچتے مور
نرت کے دشمن سب یہاں، کیا حاکم کیا چور

تجھ بِن ہوگئی ساجنا، میں کتنی کنگال
چاندی بن کے رہ گئے، سونے جیسے بال

جانے کیونکر سہہ گئی، میں برہا کی آنچ
جلتی آگ کے سامنے، ثابت رہے نہ کانچ

پلکوں پیچھے جھُومتے، اِک گوری کے نین
آپ رہیں نِت موج میں، ہمیں کریں بے چین

بھر بھر آہیں دُور سے، گوری کو مت چھیڑ
چلیں نہ جب تک آندھیاں، نہیں اکھڑتے پیڑ

دل کو دل سے تول لے، جو کرتے ہیں پریت
قوم قبیلہ دیکھنا، نہیں ہے اُن کی ریت

قتیل شفائی

گیت

بول سمندر بول کہ تجھ میں کتنا پانی!
جتنا تجھ میں اُتریں اتنی بڑھ جائے حیرانی
بول سمندر بول کہ تجھ میں کتنا پانی!

اُوپر اُوپر چُپ چُپ رہنا
اندر اندر چُھپ چُھپ بہنا
لیکن پُونم رات جب آئے تب کرنا من مانی
بول سمندر بول کہ تجھ میں کتنا پانی!

کوئی تیری تھاہ نہ پائے
سیڑھی تجھ میں کون لگائے
ہر اک راہ کٹھن ہے تیری ہر منزل انجانی
بول سمندر بول کہ تجھ میں کتنا پانی!

جھانک ذرا تُو میرے اندر
میرا دل بھی ایک سمندر
فرق ہے اتنا، تجھ میں پانی مجھ میں ہے ویرانی
بول سمندر بول کہ تجھ میں کتنا پانی!

ضیا جالندھری

سبکدوش

آج اُتری تری گردن سے وہ زنجیرِ گراں
جس میں اک عمر قدم چاٹتے ہیں آقاؤں کے
ان کے ہر حکم، ہر آواز پہ لبیک کہا

مسئلہ رزق کی آسانی کا
نرم کر دیتا تھا آہن کی گرفت
اور ہر صبح رکابی میں وہ باقاعدہ راتب کا حصول
سرِ تسلیم کو کچھ اور جھکا دیتا تھا
ان کے قبضے سے نکلنے کا خیال
کبھی آتا بھی تو اک ابرِ گریزاں کی طرح

اپنے آقاؤں کی چمکار تری نظروں میں
عرش و افلاک کی موسیقی تھی
پھر بھی دیکھا ہے کہ تو
گھورتا رہتا تھا نمناک نگاہوں سے اُفق کی جانب
تیرے دل میں کبھی پندار کی لَو لرزی تو ہوگی لیکن
تیری آواز میں طیش آیا تو
صرف آقاؤں کے دشمن کے لیے

آج ہر عہد سے آزاد ہوا
آج تو چاہے تو
چیخ سکتا ہے بآوازِ بلند
لیکن اک عمر کی عادت کے طفیل
تو ہے افسردہ کسی شاخِ شکستہ کی طرح
ہاتھ میں رفتہ مہ و سال کا البم تھامے
سر کو خاشاک پہ رکھے ہوئے، حیراں، خاموش

ضیا جالندھری

عرضداشت

اک بھیانک گرج اور اچانک
دھوئیں کے شجر
خاک سے اوجِ افلاک تک چھا گئے
اک دھماکا ہُوا
اور زمیں کے پرخچے اُڑے
بحر و بر، کوہ و دشت
آگ کے دیو ہیکل پرندوں کی صورت
خلاؤں میں گرتے بھٹکتے ہوئے بُجھ گئے
اور آدم کی اولاد کا آخری کارنامہ مکمل ہُوا

عین اُس وقت ابلیس نے عرش پر حاضری دی
نگاہوں میں شوخی کا موہوم پرتو
لبوں پر تبسم کی ہلکی جھلک تھی
بڑے عجز سے سر جھکائے ہوئے عرض کی
یاد تو ہوگا انکار کے اوّلیں روز ہی
قدسیوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا
کہ نوعِ بشر فتنہ جُو، فتنہ پرداز ہوگی
سو دیکھا کہ وہ خاک زاد آج تک
کیسے کیسے بہانوں سے
اپنی بہیمانہ خصلت کو تسکین دیتا رہا
میں تو بدنامِ ترغیب تھا ہی مگر
اس کی ہر طرزِ ایجاد میرے لیے درسِ اُستاد تھی
خیر کے نام پر
قتلِ انصاف و خونِ عبث
زور و زر کی ہوس
دل کی پُرفن سیاہی
جنگ، وحشت، تباہی

تو اب میری درخواست ہے
پھر کوئی ایسی تخلیق اگر ہو
تو اس جنسِ نو کو
کوئی ایسا جوہر ملے
جو مجھے بھی فنا کر سکے

سیّد ضمیر جعفری

اک اُونچی سبز حویلی میں

گاؤں سے باہر!
گدرائی اور بھوبھل، پچھلی صدی کی چھوٹی اینٹوں کے —
اسکول سے ہٹ کر
اِک نیلی، باریک سی، خوابیدہ پگ ڈنڈی کے، پگ اُوپر
ایک لکیر جو کھیتوں میں بل کھاتی ہے
بھاگ نگر یا جھوک سیال کو جاتی ہے
کچھ دُور جہاں اک "اتھرا" چشمہ بہتا ہے
اس چشمے پر
اک اُونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

وہ پہلی — بڑی لڑائی — میں
لفٹین ہوا — کپتان ہوا
رُسمت سے رُستم خان ہُوا
قصبے کی اُٹھتی — "کچ عمری" گلنار کا دل جان ہُوا
کیا ترچھی ٹوپی رکھتا تھا
جو سیدھی دل میں جا اُترے
کیا لش لش کرتی، چار سنہرے بکلس والی
بیچ سے تھوڑی تھوڑی کالی، پیٹی تھی
اور چوڑے گورے ماتھے پر خود ماں کے پیار فروزاں تھے
ممتا کے خالص سونے کے یہ چندن ہار فروزاں تھے

ماں کے قدموں کو چھو کر وہ گھر سے نکلا
برما پہنچا — جاپان گیا
اسوان گیا — میلان گیا
تریپولی — شط العمارا
ہر منظر آنکھوں کو پیارا
صحرا چھانے — ساحل گھومے
موسم جھیلے — چہرے چومے
آنکھوں نے محبت جھلکائی
زُلفوں نے جوانی چھلکائی
اسمارا سے ایران گیا
وہ جس پلٹن میدان گیا
دشمن بھی لوہا مان گیا
زخمی بھی ہُوا — قیدی بھی ہُوا
جنرل ہو کر آخر وہ فوج سے گھر آیا
آسودہ پنشن پر آیا

اب کھیتی باڑی کرتا ہے
مٹی کی کھدائی کرتا ہے
فصلوں کی نلائی کرتا ہے
تھانے میں، کچہری میں جا کر
لوگوں کی بھلائی کرتا ہے
ہر شخص سے ملتا جُلتا ہے
چوپال میں آتا جاتا ہے
"گھر پال ٹماٹر" کھاتا ہے
اور اپنی "دوندی بھینس" کی گاڑھی ۔ ۔
سوندھی سوندھی لسی پی کر

اپنے دیس کی ماں بولی میں گاتا ہے
اور پہروں تک چشمے کی چنچل لہروں تک
گجرات اور جھنگ کی نہروں تک
تسکین کا دریا بہتا ہے
اُس اُونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

کچھ پیٹ کا خط اُبھرا اُبھرا
کچھ ٹھوڑی ڈھلکی ڈھلکی سی
کچھ سر کے بال بھی چھدرے سے
جینے کا مگر دستور وہی
آواز وہی — انداز وہی، اوقات وہی، منشور وہی،
ہر روز گجردم جاگتا ہے
چائے بستر پر مانگتا ہے
گوبھی کی باڑ پھلانگتا ہے
اخبار کا ناغہ ناممکن
ہر چیز ٹھکانے پر دیکھو
پائپ بھی سرہانے پر دیکھو

دو بیٹے فوج میں افسر ہیں
اک میجر پیدل پلٹن کا
اک کرنل کسی رسالے میں
(چک لائے ہیں)
خط آتے ہیں، خط جاتے ہیں
(یوں مجھے ساز بجاتے ہیں)
اک ستھرا "شیلف" کتابوں کا
(جھرمٹ انسان کے خوابوں کا)

طاقوں میں جو تصویریں ہیں
یہ خوابوں کی تعبیریں ہیں
تصویریں ہیں صف کے جی داروں جیالوں کی
میدان میں مرنے والوں کی
جن سے تو تیز خیالوں کی

چھوٹے سے "مویشی خانے" میں
دو چوکس کتے بیٹھے ہیں
اِک باز ہے پر پھیلائے ہوئے
خود مار کے چڑیا کھائے ہوئے
اک سانڈل گائے تھان بندھی
اِک دُبلا مشکی گھوڑا بھی
چائے کے ساتھ پکوڑا بھی
وہ گرم پکوڑا کھاتا ہے
اور اپنے دیس کی ماں بولی میں گاتا ہے
اور سادہ سادہ لفظوں میں
یادوں کی راس رچاتا ہے
خوابوں کے چراغ جلاتا ہے
چہروں کے چاند جگاتا ہے
خوش رہتا ہے
ہر آتے جاتے راہی سے
جو گزری ہے وہ کہتا ہے
اُس اُونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

(انگریزی کی ایک نظم سے ماخوذ)

اختر حسین جعفری

لہو لہو خلعتوں کے زرتار

لہو لہو خلعتوں کے زرتار
شامِ مقتل میں میری خاطر نہ کھینچ، رہنے دے
تیرا سہرا
اب ایسی عمروں میں میرے ماتھے پہ کیا سجے گا —!

بریدہ انگشت کی گواہی
بہت سپیدی، بہت سیاہی
مکرنے والے! عمل میں مہتاب عدل گستر ہے اور
ترازو کا ایک پلڑا
تمہارے رُخ تک پہنچ گیا ہے —!

میں ایسا قیدی نہیں جسے بادِ صبحگاہی رہائی دے گی
نہ ایسا آزاد
جس کا، چھت سے لٹکتے جالوں سے
دھوپ کی دھجیوں سے، پورا کفن سلے گا
سو، طے ہوا ہے کہ
مہرِ نصف النہار تک جو نہیں پہنچتے

پرانے محور سے اب ہٹیں گے
جزا، سزا پر
گداگروں، بندگانِ خدمت میں، قیدیوں میں
سلے سلائے کفن ہوں یا پیرہن ادھورے
نہیں بٹیں گے —!

یہ درہم و داغ
تیر، دستار، زین، رہوار
واقعہ ہو کہ نظم تفصیل مال و احوال درج کرنے
شمار کرنے میں عذر کیسا
لکھو، کہ رہوار تھک گئے ہیں
لکھو، کہ اس واقعے کے اندر جو تھی کہانی، بدل گئی ہے
گنو، ہیں قبروں پہ پھول کتنے
شمار کرنا کہ ترکشوں میں بچے ہوئے ہیں اصول کتنے!

ساقی فاروقی

مُدافِعَت

اس نگر کے حبس کا
شاید سبب کچھ اور ہے
یہ کہ لوگوں سے ہوا ناراض ہے
ناراض ہے، مجرم نہیں ہے

وہ ابھی کچّی سڑک پر
دُھول کے ننھے بگولے
دُھن کے کوٹی ہے
جہاں اِملی کے پیڑوں پر
پرندے اُکڑوں بیٹھے ہیں
وہاں پنکھے چلاتی ہے
اُنھیں اُونچی اُڑانوں پر بھی اُکساتی ہے
اور اُن کا پسینہ بھی سُکھاتی ہے

یہ ناخواندہ اگر آرام کرتے ہیں
تو اُن کی اِستراحت میں خلل انداز ہوتی ہے
اُلٹ دیتی ہے پتّوں کے ورق
شاخوں کی تحریریں دکھاتی ہے
پَروں میں سرسرا کے
اِن گراں گوشوں کو
موسیقی کے شائستہ سبق
دیتی ہے، جھانجھن بھی بجاتی ہے

ہوا اک پاک سیرت
نرم دل محبوب جو فیّاض ہے
فیّاض ہے، ظالم نہیں ہے

احمد ظفر

وہ لمحہ جو میرا نہیں ہے

مرے پاس کیا ہے؟
ترے پاس کیا کچھ نہیں ہے
میں صحرا ہوں جس میں کبھی پھول کھلتے نہیں
تو سمندر افق پر ترے ساتھ سورج کھڑا ہے
یہاں ایک نیزے کی صورت وہی موسمِ ہجر دل میں اُترنے لگا ہے
مگر تو اندھیرے میں لکھی ہوئی روشنی کی عبارت
مرے ہاتھ سینے پہ رکھے ہوئے ہیں، مرا شغل اختر شماری
مجھے حرف نے قید رکھا
تجھے خوشبوؤں نے نگارِ مہ و مہر رکھا

تقابل کی یہ آنچ آتی نہ میری صدا سے
مگر تو، امجو، بے نشاں ایک لمحہ
وہ لمحہ جو میرا نہیں ہے
میں ہارا ہوا اس شجر کے کسی زرد پتے کی مانند ہوں جو لرزنے لگا ہے
مری آگہی کے سفر میں وہی ایک نقطے کی مانند ہر شے
جو میری ہے، میری نہیں ہے
وہی ایک لمحہ جو میرا نہیں ہے
وہ ایک لمحہ جو مجھ کو وجود و عدم کی پراسرار وادی میں ہر زاویے سے بلاتا رہے گا

وہ لمحہ جسے میں نے دل سے لگایا، لبوں پر سجایا
مجھے کیا خبر تھی، وہ حرفِ خزاں تھا
مری آتی جاتی ہوئی سانس کے زیر و بم کا دھواں تھا
پرندہ جو رنگین تصویر میں پرفشاں تھا
وہ آغاز کیا تھا؟ یہ انجام کیا ہے؟
یہ مشرق میں اک نقطۂ منجمد — اور
یہ مغرب کے چاروں طرف ایک وحشت زدہ شام کیا ہے؟
مری سوچ میں بارشِ برگ کے دائرے پھیلتے جا رہے ہیں
ابھی آنکھ کھولی تھی شبنم کے قطرے نے
سورج کی پہلی کرن ایک نیزے کی مانند —
پیوست ہوتی ہوئی، اس کے سینے میں کیا ہے؟

وہ رشتے جو بنتے ہیں کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟
تم آئینے میں دکھائی تو دیتی ہو لیکن کوئی اور تصویر آنکھوں کے
پردے پہ ٹھہری ہوئی ہے
وہ لمحہ جو میرا نہیں ہے وہ میرا ہُوا بھی تو سنگِ گراں کی طرح
دل پہ رکھا ہُوا ہے
کہ میرے ہی جیسے کئی اور لمحے
کسی شعبدہ گر کے ہاتھوں میں آ کر تڑپتے رہیں گے

یہ میرا مقدر ہے، میں خواب دیکھوں
یہ تیرا تصور کہ تو کہکشاں کے کسی گوشۂ عنبریں میں
چمکتے پرندوں کی مانند نقشِ دل و جاں بنے گی
مہکتے ہُوئے پھول سارے ہیں تیرے
کہ تو تتلیوں کی عبارت کا عنواں بنے گی
مگر پھر بھی ناخوش ہے تو اور میں خوش کہ میں کچھ نہیں ہوں
مجھے آفتوں کے بھنور میں اسی ایک لمحے کا چہرہ دکھائی دیا ہے جو میرا نہیں ہے
وہی ایک چہرہ جو تیرا ہے شاید، مگر تو نہیں ہے
تذبذب کے گہرے گھنے جنگلوں میں بکھرتے ہُوئے سوچتا جا رہا ہوں
کہ دنیا کے سب سلسلے ایک کارِ عبث کے سوا کچھ نہیں ہیں

رتجگا

چپ کے اُجلے دریا میں
تیر رہا ہے ہنس کوئی،
دریا کے اس پار چلیں
رات کے میلے جنگل میں
جھیل کوئی آ جائے گی
ایک سفید کنول جس میں
اپنے پاس بلائے گا

ٹھہرو، دیکھو، کون ہے وہ
چاند زمیں پر اُترا ہے
پریوں کا اک غول بھی ہے۔
لیکن اب تو کچھ بھی نہیں!
خواب سا ہم نے دیکھا ہے!

خواب کہاں سچ ہوتا ہے
پوچھیں کیا تعبیر اس کی
چپ رہنا ہی اچھا ہے!

جمیل ملک

منصورِ حلاج

مجھے قتل کردو
مری روح کو نرم رُت کے گالوں کی صورت دھنک دو
مری موت ہی میری وہ زندگی ہے
کہ جو آنے والے زمانوں کی تابندگی ہے
میرے ہاتھ پاؤں اگر کٹ گئے
میرا سر بھی قلم ہو گیا
جسم کی خاک بھی پانیوں میں اگر بہہ گئی
تو بھی لہریں مری یادیں
ساحلوں پر سر اپنا پٹکتی رہیں گی
میرے پاؤں پھر بھی شہادت گہہِ عشق کے راستوں پر
سوئے منزلِ آگہی یونہی بڑھتے رہیں گے
مرے ہاتھ سچ کی گواہی میں اٹھتے رہیں گے
مرا سر قلم ہو کے بھی ظلم کے سامنے سرکشیدہ رہے گا
"اناالحق" کی للکاریں
میری جاں، ہر زماں جابروں کے مقابل بھی
وہ کلمۂ حق کہے گی
کہ جو میری پہچان ہے اور میرے خدا کی زباں ہے
کہ جو خود شناسی، خدا آشنائی کا وہ معجزہ ہے
جو ہر دور میں دردمندوں کے دل کی دوا ہے
جو میری صدا ہے
جو انسانیت کی بقا ہے

انعام الحق جاوید

رزم نامہ

بندۂ معتبر!
کون تھا جس کی ہیبت بہت دیر تک شوخیِ چشمِ شبنم پہ طاری رہی
بے سماعت صداؤں پہ بھاری رہی
کون تھا جس کی ہر چال کاری رہی
جس کے ہر وار سے پستیوں کے اندھیرے بکھرتے رہے
اہلِ دل کیسۂ درد بھرتے رہے
غیر سہمے رہے، دوست ڈرتے رہے

ہو گئیں سب کی سب کوششیں بے ثمر
سو گئے جاگنے والے تھک ہار کر
کھو گئے راہ میں سینکڑوں ہم سفر
اس کے باوصف بھی ذہن میں عمر میں امن کے نام پر جنگ جاری رہی

کس کا منفی عمل ایک مثبت قدم کو جنم دے گیا
کام تھا کچھ زیادہ مگر وقت کم دے گیا
دل مچلتے رہے دُور ہوتی ہوئی منزلوں کے لئے
لب ترستے رہے صوت و آہنگ کی لذتوں کے لئے
دیکھ پائے نہ ہم
روشنی کی کرن
یہ الگ بات ہے
تیرگی سے مگر شام سے تا سحر رازداری رہی
جیت اس بار بھی اس کی قسمت بنی
ہار اس مرتبہ بھی ہماری رہی

ادیب سہیل

بند زمیں اور کھُلی زمیں

کھُلی زمیں اور بند زمیں کے پیارے لوگو
کھُلی زمیں کے باہر، اندر
ایک سمندر یکساں شور میں رہتا ہے
کھُلی زمیں اک کھُلی حقیقت
اس پر سارے رہنے دا
بند زمیں پر اُس کے سب دروازے بند

گیان کا دامن چھوٹ گیا تو
ذہنوں میں بحران اُٹھے گا
نزع کا اک طوفان اُٹھے گا
کھُلی زمین کا کیا ہے، وہ تو کھُلی زمیں ہے
بند زمیں خود ایک گھٹن ہے
اِس صورت میں اور گھٹن بڑھ جائے گی

یہ آنگن ہے کھُلی زمیں اور بند زمیں کا
تازہ ہوا، تازہ آسائش کھُلی زمیں کی بخشش ہے
کھُلی زمیں اور بند زمیں کے رشتے کی پہچان،
بقا ہے
لازم اور ملزوم رُتوں کا گیان
بقا ہے

اِن بدصورت لمحوں کا احساس کرو تم
گھر میں ٹانڈو کھیل نہ کھیلو
گھر میں رہ کر کیوں خود کو بن باس کرو تم
اِک دُوجے کا پاس کرو تم
کھُلی زمیں اور بند زمیں کے پیارے لوگو

سیّد مُنیر

لندن میں سالگرہ

وقت گِنتا ہے مجھے
وقت کو میں گِنتا ہوں ،
میری
اور
وقت کی
دیرینہ شناسائی ہے ،
مدّتوں سے
یہی اِک رسم چلی آئی ہے
وقت گنتا ہے مجھے ، وقت کو میں گنتا ہوں!

آج کے دن
تو مگر
بات کچھ انجانی ہے
آج کے دن
تو مگر
وقت کی سلطانی ہے
تنگ ماحول میں اُڑتے ہوئے پتّوں کی پریشانی ہے
اور میں سوچ رہا ہوں ___
کیسے
وقت کے ہاتھ
مری زیست کے دامن سے اُلجھتے ہوئے
پہنچے ہیں گریباں کے قریب
اور میں سوچ رہا ہوں ، کیسے ؟

کہیں، بچپن کے حسیں پھول سجاتے ہیں ہوا کا رُخسار
کہیں، اُٹھتی ہوئی لہریں
کسی ساحل سے گریزاں نظر آتی ہیں مجھے
کہیں، اک سایۂ دیوار میں سستانے کو [illegible] ہے —

وقت کی ریگِ مسلسل میں روانی، مری جان میری ہے
شفقِ شام کے جلنے میں جوانی، مری جان میری ہے
شبِ گلرنگ کے ڈھلنے میں کہانی، مری جان میری ہے

اور
میں سوچ رہا ہوں پھر بھی
وقت کے ہاتھ میں ڈھل جاتے ہیں کیوں سارے ہاتھ،
وقت راہی نہیں
میں راہی ہوں
وقت اندھیرا ہے تو میں نورِ سحر گاہی ہوں !
راستہ ہے
مرے ہمراہ سفر آیا ہے
میں جدھر جاتا ہوں
یہ مرے پاؤں میں اُلجھا ہُوا اک سایہ ہے

وقت مفروضہ ہے حالات کا، بیتابی کا
وقت مفروضہ ہے ماضی کا اور اُمید کی نایابی کا

وقت صحرا بھی نہیں
وقت ہے صحرا کا سراب
جو
مجھے اور تجھے
خود سے بیگانہ کیے جاتا ہے
خود جو دھوکا ہے تو دھوکا ہی دیے جاتا ہے
کبھی بہتا بھی نہیں اور کبھی تھمتا بھی نہیں
ذہن کے بند شگافوں سے نکلتا بھی نہیں

وقت
ساکت ہے
رواں عہدِ جوانی، شبِ وصلِ محبوب
وقت خاموش
مگر نوحہ کناں صبحِ فراق
وقت کی کوئی حقیقت نہیں، دل جانتا ہے
مگر
اب عمرِ رواں مجھ سے سنبھلتی ہی نہیں
میں کہ اس راز سے واقف ہوں، نہ جانے پھر بھی
وقت سے پوچھ رہا ہوں
کیسے
دن گزر جاتا ہے اور شام گزرتی ہی نہیں !

محمود علی محمود

مامن

میں کمرے کے واحد شیلف میں، بے اوسان پڑے پرچوں میں
ایک کتاب، کہ رکھ کر بھول گیا تھا، ڈھونڈ رہا تھا
شاید اس کا عنوان "مامن" تھا یا اس جیسا تھا
.... میری لاڈلی ننھی "جوہی" صحن سے چلائی تھی
----- پھر پاؤں کی ہکلاہٹ کیساتھ، ڈری، سہمی سی
گردن نیچے اُوپر کرتی، سسکیوں میں بولی تھی
"بابا! میرا پاؤں گڑھے نے بھینچ دیا ہے
زور سے بھینچ دیا ہے"
میں نے پلٹ کے دیکھا .... تو
بیٹی کے اشک اور اپنی لاپروائی دونوں ساتھ کھڑے تھے
میری اُٹھی ہوئی پلکوں میں گرہیں پڑیں اور میں نے کہا:
"بیٹے! اپنی اِک لاپروائی
ایک ذرا سی لاپروائی، سینوں میں کس کے لیے کانٹے بھر دیتی ہے
تُو جب گود میں تھی، سیمنٹ کے استحکام میں ایک دراڑ پڑی تھی
پھر اِک اینٹ نے اپنا "مامن" چھوڑ دیا ــ اور
اینٹ اکھڑ جائے تو سارا فرش اکھڑ جاتا ہے
.... ننھے ننھے پاؤں بھنچ جاتے ہیں
پچھتاووں کا وقت گزر جاتا ہے"

بیری

اب تو ابو پر بھی، خالہ کا پرچھانواں پڑنے لگا ہے
میں جب بھی ان سے کہتی ہوں
"ابو! یہ بازو کے گھر والی خالہ تو سنک گئی ہیں
ناشتے کی چائے سے، شام کو "باتوں باتوں میں" آنے تک
خالو سے بس ایک ہی بات کہے جاتی ہیں
"میں کہتی ہوں ــ بیری کا آنگن میں رہنا ٹھیک نہیں ہے
لڑکے بالے دیواروں پر چڑھ کے جھانکتے ہیں، پتھر آتے ہیں
ہم بھی ــ کسی دن گھائل ہو جائیں گے
کسی روز، فرصت ہے، چار محلے والوں کو بلوا کر
اس کو آنگن سے ہٹواؤ، سر سے بوجھ اُتارو"
میری ان باتوں کو سن کے ابو مجھ کو نیچے سے اُوپر تک دیکھتے ہیں
ــ اور ــ
اور ــ اک ٹھنڈی سانس کھینچ کے رہ جاتے ہیں!

امجد اسلام امجد

درد کے رشتے عجب ہیں

درد کے رشتے عجب ہیں
کوئی ان کی حد نہیں
کوئی ان کی تھاہ نہیں ہے
اور کوئی سرحد نہیں

"یہ زماں اور یہ مکاں
یہ قربتیں، یہ دوریاں
دور تک بچھتی زمیں
اور اس پہ پھیلا آسماں"
درد کے رشتوں کے آگے ان کی ساری وسعتیں
ریت کے اک بے ٹھکانا ذرے سے زیادہ نہیں

اس گھڑی چاروں طرف اک ہجر کا آشوب ہے
میرے تیرے درمیاں اک خواب سینہ کوب ہے

پھر بھی اے جانِ سخن!
جس طرح اہلِ سخن کی گفتگو
کتنی صدیوں کی مسافت ایک پل میں کاٹتی ہے
تیری میری خواہشوں میں اپنے دکھ سکھ بانٹتی ہے
اور جیسے
اجنبی سی کہکشاں سے ڈولتے تارے کی ضَو
روشنی رفتار سے چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے
اور جیسے، کچھ پرندے
موسموں کے ساتھ اڑتے
اپنی اپنی منزلوں کے راستوں پر مستقل پرواز کرتے ہیں
کبھی کی منتظر اور مضطرب شاخوں
کی سیجوں پر اترتے ہیں

ہمارے خواب بھی (ان کی طرح)
اک دن ہمارے "ہست" کی شاخوں پہ اتریں گے
دھنک کے رنگ ان بھیگی ہوئی آنکھوں پہ اتریں گے
کہ رشتے درد کے منزل بھی ہیں، قطبی ستارا بھی!
ہمارے خواب کی تجسیم بھی ہیں
استعارا بھی!

تیرے دھیان کی تیز ہوا

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا!

یوسف حسن

سائے

دن دُھواں دُھواں اپنے
راتیں کولتار ایسی
گم ہیں ساری پہچانیں
کچھ پتا نہیں چلتا
کون ہیں، کہاں ہیں ہم
کس طرف رواں ہیں ہم
سائے ہیں وجود اپنے
اور سائے کیا جانیں،
آگہی کا غم کیا ہے
زندگی کا رَم کیا ہے

رب نواز مائل

تہی دامن

اس برس کتنے تہی دامن رہے
لفظ کب یہ دُکھ، ہمارا کہہ سکیں
زندگی آساں سی گزرے یوں بھی ایسا کب ہُوا
ہم عجب لفظوں کے سوداگر ہُوئے
ہجر کو مانندِ وصلِ خوش کہیں
اِس برس کتنے تہی دامن رہے
یہ خیال آتا ہے خوابوں کے سبب
جن میں، یا شب سے کلام
یا کبھی اُن سے پیام
اس برس کتنے تہی دامن رہے

رخسانہ لودھی

حوصلہ

مجھے تاروں کی ہمراہی
میں کرنا ہے سفر
لیکن
ستاروں کو کھلی آنکھوں سے تکنے کا
نہیں ہے حوصلہ مجھ میں
ازل سے میں رہی ہوں تیرگی میں
اور اچانک روشنی حاصل اگر ہو جائے
تو بینائی اکثر کھو ہی جاتی ہے

تسلیم الٰہی زُلفی

خموشی بیان تک پہنچی

جسم تک آئی
جان تک پہنچی
یہ زمیں — آسمان تک پہنچی
سب در و بام نعرہ زن ہیں آج
ہر گلی کوچہ و دیار میں شور
بول اُٹھے تمام مُہر بہ لب
پاؤں کی بیڑیاں چھنک اُٹھیں
آج ہر درد جاگ اُٹھا ہے
آج ہر چوٹ ہو گئی تازہ
زخم در زخم ہے خطاب و کلام
لو! خموشی بیان تک پہنچی

سوختہ جانی میری

تیری دیوار کے سائے بھی
میسر ہیں مجھے
اور اک ابرِ کرم
سر پہ مرے سایہ فگن
کچھ گھنے پیڑ تمازت سے بچاتے ہیں مجھ کو
پر یہاں سب سے الگ ہے یہ کہانی میری
سائباں چھوڑ کے
پھر دُھوپ میں چلنا چاہوں
پھر تپش چاہتی ہے سوختہ جانی میری

سات سمندر پار

دھوپ کے پہرے دار
پیڑ یہ سایہ دار
گھر کے در و دیوار
آئینہ خانے ہیں
آئینہ بردار
تمھاری باتیں کرتے ہیں

دُوری کی مجبوری ہے
پر رشتہ قائم ہے
پیٹ کی مزدوری پر
چاہت اب بھی حاکم ہے
سات سمندر پار
تمھاری باتیں کرتے ہیں

سنّاٹے شور مچاتے ہیں

میرے گھر کی ویرانی میں
خوف نہیں ہوتا
میرے آنگن کے سایوں سے
لوگ نہیں ڈرتے
میرے گھر کی خاموشی بھی گونجتی رہتی ہے
میرے گھر کے سنّاٹے بھی شور مچاتے ہیں

(جدّہ)

تسلیم الٰہی زُلفی

خود سے خفا

کوئی موسم نہ مجھ کو راس آیا
کوئی بھی رُت نہ لائی فصلِ بہار
مجھ کو ہر دَور نے عذاب دیئے
میری رنگینیٔ حیات گئی
اور میں خود سے دُور ہوتا گیا
آج یہ گردشِ حیات مجھے
پھر اُسی زندگی میں لائی ہے
بعد مدت کے خود میں لوٹا ہوں
ہو رہا ہے دھواں دھواں چہرہ
اُڑ گیا رنگ
مِٹ رہے ہیں نقوش
آئینہ دیکھ کر ہوا احساس
خود سے کتنا خفا رہا ہوں میں!

ایک تم بھی سہی

یہ داستاں بھی عجیب ہے نہ اَن کہی نہ کہی
ہر ایک شام کے منظر بچھڑ گئے ہم سے
وہ گہری نیند بھی کھوئی
وہ رتجگے بھی گئے
اُداس آنکھوں سے رخصت ہوئے ہیں سارے خواب
خود اپنے آپ میں گم ہو گئے ہیں سب احباب
بس ایک تم تھے
جسے زندگی سمجھتے تھے
بس ایک تم تھے
مگر تم بھی ساتھ چھوڑ گئے
جُدا ہوئے ہیں جہان اور
ایک تم بھی سہی

(جدّہ)

نجیب احمد

سحر جھوٹی نہیں ہوتی

دکانوں میں سبھی اشیا خریداروں کی طالب ہیں
سرِبازار اک یوسف کی بولی اُٹھنے والی ہے
زلیخا قصر سے باہر نہیں نکلی
اکہرے سوت کی انٹی لیے بڑھیا نہیں پہنچی
ابھی نیلام گھر تک جانے والے راستے خالی پڑے ہیں، سوت کی انٹی ابھی اپنی بنت کے مرحلے میں ہے، زلیخا نیند کی آغوش میں خوابوں سے ہم بستر ہے — نوبت پیٹنے والے کی مزدوری عزیزِ شہر کی گردن کی رسی ہے
کوئی زنجیر کھینچے — ریل کی پٹڑی کہیں اُس رات کے پل سے پرے اکھڑی نہ ہو — سارے مسافر اپنے گھٹنوں کو شکم کے ساتھ جوڑے بوگیوں میں سو رہے ہیں — نیند کی آغوش میں سمٹے ہوئے اور قبر میں لیٹے ہوئے افراد بالکل ایک جیسے ہیں
ہوا کا ہاتھ در در ایک دستک دے رہا ہے — "شہر کے بازار میں یوسف کی بولی اُٹھنے والی ہے — اُٹھو، جلدی کرو، یوسف کی بولی اُٹھنے والی ہے — چلو نیلام گھر تک جانے والے راستے خالی پڑے اچھے نہیں لگتے — چلو یوسف کی بولی اُٹھنے والی ہے — زلیخا کو جگاؤ — سوت کی انٹی لیے بڑھیا کہیں بازی نہ لے جائے — زلیخا کو جگاؤ، نیند کی آغوش میں سمٹے ہوئے اور قبر میں لیٹے ہوئے افراد بالکل ایک جیسے لگ رہے ہیں — کوئی اُٹھے صورِ اسرافیل ہونٹوں سے لگائے — فاختہ کے جسم سے گرتے لہو کی لَو کہیں مدھم نہ پڑ جائے
دکانوں میں سبھی اشیا خریداروں کی طالب ہیں
پسِ دیوارِ معبد ایک داسی ایک کاہن کے قدم چھو کر اُسے اُس کے تقدس اور اپنی بے بسی کا واسطہ دے کر سرِ دیوارِ معبد نصب سنگیں بُت کے سنگیں قہر سے کب تک ڈرائے گی — کہ صحنِ صبح میں کاہن نہا دھو کر قدم رکھنے کے عادی ہیں — سحر کا خوف ہر کاہن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتا ہے — سحر جھوٹی نہیں ہوتی — سحر کاہن نہیں ہوتی
کوئی زنجیر کھینچے — ایک نوبت پیٹنے والے کی مزدوری عزیزِ شہر کی گردن کی رسی ہے
دکانوں میں سبھی اشیا خریداروں کی طالب ہیں

منجیب احمد

بہت مصروف ہوں، پھر بھی

"مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے"
"بہت مصروف ہو" — پھر بھی کوئی لمحہ بچا کر شام ڈھلتے ہی چلے آنا — تہِ اشجار کتنے سبز وعدوں
کی مہک بکھری ہوئی ہے — ایک غم کا حرف — دل کی رمز — نامحرم سے کہنا
رائیگاں ہوگا"
مجھے یہ خط گزرتے دن کے پہلے پہر میں گھر پر ملا ہے اور ماضی کے دریچے سلسلہ در سلسلہ اسرار در
اسرار کھُلتے جا رہے ہیں — گفتگو تھم تھم کے چلتی ہے
وہ کیا دن تھے، وہ کیسی گفتگو تھی اور کیسے پھُول ہونٹوں کی ہری بیلوں پہ بِن موسم بھی کھِلتے تھے
وہ کیا دن تھے، وہ کیسے آئینے تھے خواب سی تتلی سا جھلمل عکس محرابِ نظر میں چاند تارے ٹانک دیتا تھا
سروں پر ابر کی چادر کے تنتے ہی دیارِ ذات میں بھیگی ہوا تک کُو بہ کُو تھم تھم کے چلتی تھی
یہ کیسی شام ہے، اِک روشنی سی پیڑ کے نیچے کھڑی ہے — میں اندھیروں سے نکل کر سات رنگوں
کی گلی میں مُڑ چکا ہوں — اک عجب خواہش مچلتی ہے، "کہو کیا حال ہے — کیسے ہو —
دن کیونکر گزرتے ہیں"
یہ کیسے کھُل کھِلے سے قہقہوں کی گھنٹیاں سی گونج اُٹھی ہیں
"ذرا بھی تو نہیں بدلے۔ نہایت لااُبالی، غیر سنجیدہ"
"مجھے تو — خیر جانے دو — کہو کیا بات کہنا ہے"
ہمہ تن گوش ہوں لیکن وہ لعلیں ہونٹ پتھر ہیں
"اجازت دو مجھے بھی ہجر کی اس رات کا پُل پار کرنا ہے"
"کسی دن مجھ کو ٹیلی فون کر لینا، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے"
تہِ اشجارِ غم اک سبز وعدے کی مہک اب تک مرے کانوں میں گرداں ہے
بہت مصروف ہوں، پھر بھی کئی لمحے بچا کر شام کے ڈھلتے ہی گھر کو لوٹ جاتا ہوں، اُسے مجھ
سے ضروری بات کرنا ہے، کوئی خط میرے کمرے میں — مرا رستہ نہ تکتا ہو —
مجھے اُس سے ضروری بات کرنا ہے!

نجیب احمد

جزیروں میں پڑاؤ کرنے والی بارشیں

پرندوں کی طرح موسم بھی خالی ہاتھ آئے ہیں
نہ تیرے لمس کی خوشبو
نہ کوئی وصل کا وعدہ، ہوا کی زرد ٹہنی پر کھلا ہے۔ تُو نے جو مکتوب بھیجے
ہیں، عبارت سے تہی ہیں۔ ہاں مگر کچھ اشک کاغذ کی ہتھیلی پر لکیروں
کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور میں علمِ جفر سے نابلد ہوں
مَیں نے اک لمحے کی سرگوشی ترے آنچل کے پلو میں انہی ہاتھوں سے
باندھی تھی
جزیروں میں پڑاؤ کرنے والی بارشوں کی راگنی کانوں میں اُتری تھی
تری آنکھوں میں کچّی خواہشوں کے سُرخ ڈورے تھے
لبوں کی بانسری تمثیلِ دل دُہرا رہی تھی اور جو سُر اس میں رچے تھے
وہ کھرے سُر تھے، مہِ اقرار کے دُر تھے
سبھی کچُھ تھا
مگر تُو نے فقط یہ اشک بھیجے ہیں
اگر کچُھ بھیجنا ہی تھا تو اُس لمحے کی سرگوشی کہ جو عمروں کا حاصل تھی جزیروں
میں پڑاؤ کرنے والی بارشوں کی راگنی اور خواہشوں کے سُرخ ڈورے
موسموں کے ہاتھ کر دیتے
مجھے اشکوں میں لپٹی ان لکیروں کی تپش جھلسائے گی کب تک؟
مرے اطراف میں یہ راکھ سی لہرائے گی کب تک؟

ایوب خاور

مداوا ہو نہیں سکتا

مداوا ہو نہیں سکتا

دلِ سادہ!
اب اس آتش نما کے سامنے عجزِ محبت کا
اعادہ ہو نہیں سکتا

یہ کیا کم ہے
کہ اپنے آپ تک کو بھول کر اُس حُسنِ خود آگاہ کی
خاطر نہ جانے کتنے روز و شب تھے جو
ہم نے گنوائے ہیں
بہت سارے دنوں کی گٹھڑیاں تھیں
جن کو کھولا تک نہ تھا ہم نے
بس اک تہ خانۂ عمرِ شکستہ میں ہم ان سب
گٹھڑیوں کو ڈھیر کرتے جا رہے تھے
ان گھنی پلکوں کی ٹھنڈی چھاؤں کو
محسوس کرنے کی تمنا میں ہمیں یہ
دھیان کب تھا، کون سی گٹھڑی میں
کتنا خوبصورت دن بندھا ہے
اور اُس بے دام دن کی صبحِ ساحر
کس ہوا کے تخت سے اُتری ہے
کن پھولوں کی خوشبو زیبِ تن کر کے
سوادِ شب سے جھانکی ہے
لب و رخسار کو قوسِ قزح کے رنگ دینے کی
عبث خواہش میں ہم کو دھیان
کب تھا، کون سی گٹھڑی میں
کس دن کی دوپہر اپنے طلسم آثار رازوں
کو سنہری دھوپ کے نقل میں جگاتی ہے
چھتوں پر سوکھتی مرچوں

گلی میں گونجتی، اسرار میں ڈوبی ہوئی سی خامشی
میں کون سے لمحے "سُلگتے" ہیں
ہمیں یہ دھیان کب تھا
اُس تمنا ساز کے پیراہنِ صد رنگ کے
اندر مہکتی گرم خوشبو کے حنا اِمِ تازہ
میں کھوئے ہوؤں کو دھیان کب تھا
کون سے دن کی سہانی شام، کن
اُفقوں کو روتی ہے
بہت سارے دُکھوں کے درمیاں
جو ایک شمعِ آرزو تھی، اس کی لَو کے
سامنے جُھک کر ہم اُس بے مہر
چشمِ منحرف میں بس ذرا سی دیر
کو اِک حرف کی تعبیر پڑھنا چاہتے
تھے اور خمیرِ عشق میں گوندھے ہوئے اِک
خواب کا اظہار کرنا چاہتے تھے
اور اس ساری کہانی میں ہمیں یہ دھیان
کب تھا، کون سی گٹھڑی میں کس دن کا
جنازہ ہے
ابھی تہ خانۂ عمرِ شکستہ کا یہ دروازہ کھلا
تو دھیان آیا ہے کہ اتنی ڈھیر ساری
عُمر مٹی میں ملا کر جو خسارہ ہاتھ آیا ہے
دوبارہ ہو نہیں سکتا

مداوا ہو نہیں سکتا

دلِ سادہ!
اب اُس آتش نما کے سامنے عجزِ محبت کا اعادہ ہو نہیں سکتا

ایوب خاور

ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنے ہیں

کسی نے میری پلکیں نوچ کر رسّی بنائی
اور اُس رسّی میں میرے خواب باندھے
اور پھر میرے ہی سینے کی اندھیری کوٹھڑی میں
قید کر ڈالے
اندھیرے میں سجھائی کچھ نہیں دیتا
بس اک لَو ہے لہو کی بوند کی مانند جس کی ٹمٹماہٹ میں
یہ سارے خواب سایوں کی طرح سینے کے محرابوں سے لپٹے
منتظر ہیں جیسے کوئی آکے اُن کے ہاتھ پاؤں
کھول کر آزاد کر دے گا
مگر مجھ کو بہت سے کام ہیں
خود اپنی بے پلکوں کی آنکھیں دیکھنے کی بھی
مجھے فرصت نہیں ملتی

مرے چاروں طرف دُنیا ہے
دُنیا کے ہزاروں کام ہیں اور میں اکیلا ہوں
اک ایسا جیرتی ہوں جس کی مٹھی سے
گزرتی ساعتیں بس ریت کے ذرّوں کی صُورت
دانہ دانہ کر کے نکلی جا رہی ہیں، ہاتھ خالی ہو رہا ہے
اور ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنے ہیں
ابھی اس شام کے ریوڑ کو صبحِ زرد کی کھیتی تک
اک بوڑھے گڈریئے کی طرح سے ہانک کر لانا ہے،
یہ بھی دیکھنا ہے، میرے ریوڑ سے کوئی ننھا ستارہ
ٹوٹ کر آفاق تک پھیلے ہوئے اندھے سفر کی دھول
میں غائب نہ ہو جائے

ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنے ہیں
کسی کے پاؤں کو مٹی کے جوتوں سے چھڑانا ہے
کسی کے حلق میں بوئی گئی پچھلی رُتوں کی پیاس فصلیں کاٹنی ہیں
اور کسی خاکستری تن پر کوئی پیراہنِ گل کھینچنا ہے
اے اسیرانِ قفس مجھ کو بہت سے کام کرنے ہیں!

ناہید قاسمی

میرے شہر مری باتیں سُن

بیگانے

تیری چھتوں سے تھوڑی ہی سی دُھوپ چُنی ہے
تیرے پیڑوں کی چھاؤں سے چھنتے سائے
لمحہ بھر ہی اوڑھے ہیں
تیرے آنگن میں بارش کی چند لڑیاں ہی پروئی ہیں
تیرے باغوں میں اُڑتے پتّوں سے
ایک ہی نَم آلود دُعا حاصل کی ہے
تیری گلیوں میں دُکھ سُکھ کی رُت میں بھی
سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھے ہیں
تیری بخشی نیندوں میں کچھ ایسے سپنے بھی دیکھے ہیں
جن کی تعبیروں سے کسی کا کوئی بھی نقصان نہیں ہے

پھر کیوں میرے پیارے شہر !
تیرے اندر رچنے بسنے والے مالامال انسان
مجھ سے اتنے روٹھ گئے ہیں !
خفا خفا ہیں !!

تاریخ کے ورق

سوچتی ہوں
وہ دن بھی کیسا دن ہوگا
جب کسی نے میرے شہر کی پہلی اینٹ رکھی ہوگی
کسی نے اس کے سر پر تاج سجایا ہوگا ! (اُس دن میرا شہر
چمکتا ہوگا)
اس کا کوئی باسی قتل ہوا ہوگا !! (تو شہر مرا رویا بھی ہوگا)

سوچتی ہوں
کہ آنے والے سینکڑوں سینکڑوں برسوں بعد بھی
میرے شہر کی سج دھج کیسی ہوگی !

کاش یہ سب کچھ تکنے کو ایسا بھی ممکن ہوتا
بیت چکے ماضی میں بھی میں جی سکتی !
اور آنے والے مستقبل میں بھی سانسیں لے سکتی !

مجھے میزبان تو کر

ایک سِرا اُس میں دل سے باندھے
آرزوؤں کی چھَن چھَن چھَن کرتی اِک زنجیر میں جکڑی
بھٹک رہی ہوں
آج تُو میرے شہر میں ہے
اور پھُول ہی پھُول برستے ہیں
ساری فضا میں تیری خوشبو نرمیلا سا گیت جگاتی پھرتی ہے،
تیرے ہی منظر کی رنگیں تتلیاں ہر سو رقصاں رقصاں ہیں
لیکن میں تو
ایسے ایک بھی پھُول سے
ایسے ایک بھی گیت سے
ایسی ایک بھی تتلی سے
ہاتھ ملا نہیں سکتی
تجھ کو تکنے آ نہیں سکتی

تُجھے خبر ہے ؟

میرے بارونق اور میرے اپنے شہر!
جب سے یہاں وہ آن بسا ہے
تیری ساری گلیاں، سارے رستے
اُسی کے گھر کو اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
واپسی کا مفہوم ہی بھولتے جاتے ہیں
تجھے خبر ہے ــ !
میں پھر سے تنہا ہوں!!

دھیان میں گُم سُم

ہم پر بھی اسی شہر کا سحر ہے
دن کے نکلتے ہی میں تیری راہ پہ چل پڑتی ہوں
اور تُو میری کھوج میں میری راہوں کی جانب بڑھتا ہے
لیکن دونوں پاس پہنچ کر بھی جانے کس دُھن میں
اپنے اپنے رستے پر آگے ہی آگے چلتے جاتے ہیں
اِک دُوجے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام ڈھلے
تنہا ہی پار اُتر جاتے ہیں!

بدلے میں

تُو کتنا چالاک ہے، شہر!
تُو نے مجھ سے میرا گاؤں چھین لیا ہے
اس کے بدلے
بس تھوڑا سا ــــ بھولپنا لوٹا دے!

پتّھر کا زمانہ

میرے شہر سے ہاتھ پکڑ کر سڑکیں پار کرانے والے
غائب ہوتے جاتے ہیں
ہیرے موتی جیسے آنسو پونچھنے والے جوہری
تیزی سے معدوم ہوئے جاتے ہیں
غنچہ غنچہ مسکانوں کے تحفے بانٹنے والے
کیوں نایاب ہوتے ہیں!
دل میں لہر جگانے والے نرمل نغمے
کیسے خواب ہوئے ہیں!

بس اک رسمی سی پہچان
بس اک زخمی سی مسکان
لمحہ بھر کو اپنی جھلک دکھا کر چھپ جاتے ہیں
تُو ـــــ اے میرے شہر!
آنکھوں میں حیرت کے دیئے جلائے
خالی ہاتھ کھڑا رہ جاتا ہے!!

رکھوالا

جانے کس جنگل سے آکر
بھیڑیوں، گیدڑوں، لومڑیوں نے
تیری حدود میں اپنے ٹھکانے ڈھونڈ لیے ہیں
لیکن تیرے گھر میں
کلی کلی کو چومتا
تتلی تتلی آنکھ مچولی کھیلتا
میمنوں اور خرگوشوں کو ہمراہ لیے
اک ننھا سا بچّہ
تجھ کو اب بھی شہر بنائے ہوئے ہے

جرأت مند

میرے شہر جرأت مند!
تُو نے اتنے بہت سے اندھیروں کی یلغار کے بعد بھی
اپنے دریچوں اور باموں پر
دیے جلا کر رکھنے کی عادت نہیں چھوڑی!

ثمینہ راجہ

سفر

میں سیہ رات کے سفر پر ہوں
ایک قندیل یادِ جاناں کی
ہات میں ہے مگر ہوا ہے تیز
میں تو اک بات کے سفر پر ہوں
جو کسی کنجِ لب سے پھوٹی تھی
اور میری تمام عمر کو اک
دشتِ پُرخار میں دھکیل گئی
ساری صبحیں اُسی کے نام ہوئیں
ساری فتحیں اُسی کے نام ہوئیں

میں فقط مات کے سفر پر ہوں
میں تو اک بات کے سفر پر ہوں

عجیب رنگِ چشم ہے

عجیب وقت ہے کہ زندگی کو ایک زندگی کی پیاس ہے
ہزیمتوں کے دورِ بے حجاب میں
پرانی فتح یابیوں کی آس ہے
فراق ایک بحر ہے
یہ بحرِ کرب جس میں اک سفینۂ قرار کا سوال ہے
مگر سفینۂ قرار تو فقط وصال ہے
ہمیں بغیرِ زادِ راہ
اجنبی دیار کی طرف سفر عزیز ہے
وہ چشمِ مہرباں جو خفا ہوئی
سو اب سفر کا عزم ہے
یہ فیصلہ کہ اپنی اپنی زندگی کو جھیل لیں
بہت محال تو نہیں
مگر عجیب طور اپنے دل کے ہیں
عجیب رنگِ چشم ہے

شاہین مفتی

توڑا یہ کس نے آئینہ تمثال دار ہے

پھر یوں ہُوا
کہ اُس نے مرے نیند پاؤں پر
اک اجنبی سے خواب کا پتھر سا رکھ دیا
آنکھوں میں رت جگوں کی سنانیں سی گاڑ دیں
پلکوں کی شاخ شاخ پہ آنسو اُگا دیے
اور آسماں کی رحل پہ مہتاب رکھ دیا
پھر اک شبِ سیاہ کی زنجیر گوندھ کر
ہر اک خوشی کو دار پہ اُس نے چڑھا دیا
رنگوں کو تتلیوں کے پروں سے اکھیڑ کر
خوشبو کے سارے لمس تہِ تیغ کر دیے
ہونٹوں سے چاہتوں کے سبھی گیت چن لیے
اور اِک خزاں کا پھول نظر میں کھلا دیا
اس بسترِ اَلم سے کوئی کس طرح اُٹھے
خواہش کی کھڑکیوں سے پرے کچھ نہیں رہا
شاید دُکھوں کی رات کے پچھلے پہر یونہی
خلقِ خدا بھی ایسے ہی خوابوں کی زد میں ہے
جس سمت بھی میں کان لگاؤں یہی سنوں
"اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو"
توڑا یہ کس نے آئینہ تمثال دار ہے

اپنے بغیر ایک دِن

شام ڈھلے
جب لوٹ کے آئے
آنکھ سفر سے بوجھل تھی
اور خواب کے پاؤں زخمی تھے
جانے رات کے کس حصّے میں
کس نے کس کو مار دیا
صبح ہوئی تو بستر پر
اک سلوٹ تھی
گلی گلی میں دھوم مچی تھی
ایسے مکاں کی
جس کے اندر آتا جاتا کوئی نہ تھا
بے دستک دروازوں پر
ہاتھ تھے ایسے لوگوں کے
جن سے مرنے والے کا
رشتہ ناتا کوئی نہ تھا

مقبول عامر

مختصر نظمیں

فردِ جرم

فقیہہِ شہر بولا بادشہ سے
بڑا سنگین مجرم ہے یہ آقا
اسے مصلوب کر دیں بے تردّد
کہ اس کی سوچ ہم سے مختلف ہے

خوابیدہ بچّے

بے خبری میں ایسے ایسے
سانحے ہم پر گزرے ہیں
جیسے خوابیدہ بچّوں پر
کمرے کی چھت آن گرے!

جھیل میں چاند

تری آنکھیں
بڑی گہری — بہت ہی خوبصورت ہیں
اجازت ہو تو میں کچھ دیر ان میں جھانک کر دیکھوں
کہ مجھ کو چاند کی مانند
جھیلوں میں اُترنا
لُطف دیتا ہے

منصورہ احمد

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں
جن کے بچّے پیدا ہونے کی پاداش میں
پیدائش کے ساتھ ہی سُولی پر آویزاں ہو جاتے ہیں
اور ہر لمحہ رسّہ کھنچنے کی دہشت میں
ہونٹوں کی سُوکھی پپڑی سے
موت کی سیلن چاٹتے چاٹتے، اِک دن نیچے گر جاتے ہیں!

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں
جن کے بستر کی شکنوں میں
رشتوں کے مُردہ خانے ہیں
جن پر ہونے والی رات کے پچھلے پہروں کی سرگوشی
دن کی روشنی آتے ہی
مفہوم سے مُنکر ہو جاتی ہے —!

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں
جن کی دیواروں پر پھیلے "منی پلانٹ" کے
نکھرے اور تازہ پتّوں پر
دیمک زادوں کا پہرہ ہے!
جن کے دُھسے باورچی خانوں کے کھانے
جسم میں جاتے ہی سمجھوتا بن جاتے ہیں!

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں
جن کے اندر رہنے والے ہر لمحہ مجھ سے کہتے ہیں:-
'شام ڈھلے کی تنہائی سے بچنا ہو تو گھر آجاؤ!'
اُن کو یہ معلوم نہیں ہے، گھر سے باہر
شام ڈھلے تک کا سُورج تو میرا ہو گا!
شام آنے سے پہلے سُورج کیوں دفناؤں؟

منصورہ احمد

صرف ایک لمحہ

کتنی صدیوں پہلے میں نے
بستے کی میلی شکنوں میں اُلجھے وقت سے
اِک لمحے کی منّت کی تھی ___
میں نے بس اِتنا چاہا تھا
لمحے کی دہلیز پہ رُک کر میں بھی خود سے ہاتھ ملاؤں
ساون کی رم جھم میں آنکھیں مُوند کے
اُن لوگوں کا سوچوں
جن کے ساتھ کو دل دھڑکا تھا!
کہرے کی آغوش میں
اس لڑکی کو ڈھونڈوں
جس کا بچپن اس کی پیدائش سے پہلے
بچھڑ گیا تھا ___!

لیکن
بستے کی میلی شکنوں سے
دفتر کی بکھری میزوں تک
سارے کام ضروری تھے
اپنے سارے پیاروں کی مجبوری تھے

سرپٹ بھاگتا وقت بہت تھوڑا تھا
لیکن فرض کی کالی رات کا کوئی انت نہیں تھا

آخر اک دن لمحے کا ناقوس بجا
اور میں بازو پھیلائے، لپکی
لیکن بے چھت کمروں، بے دروازہ دالانوں میں صرف ہوا تھی!
بے دیوار آنگن میں اک سہمی سی بڑھیا
کھاٹ پہ بیٹھی کھانس رہی تھی!
خوف کے آہنی خول میں جکڑی
آنکھوں کے گہرے حلقوں میں
صرف تھکن تھی ___!
پنگھٹ سے گھر آتے آتے
بے بچپن کی لڑکی، جانے کتنی عمریں بھوگ آئی تھی ___!

اور میں اب تک
ہُوکتے آنگن کی مٹی پر ٹھٹکی بیٹھی
اپنے آپ سے پوچھ رہی ہوں
میں نے وقت سے ایسا لمحہ کیوں مانگا تھا؟

جاوید انور

بولتا کیوں نہیں

تو نے کیوں اپنے گالوں پہ سرسوں ملی
تو نے کیوں اپنی آنکھوں میں چُونا بھرا
تیری گویائی کس دشت کے بھیڑیے لے گئے
بولتا کیوں نہیں ؟

بولتا کیوں نہیں، طفلِ معصوم ! تو کب سے بیمار ہے
کیسا آزار ہے، جس نے تیری شبوں سے تری نیند،
تیرے دنوں سے کھلونے چرائے،
تُو سویا نہیں ہے مگر جاگتا کیوں نہیں؟
دیکھتا کیوں نہیں، تیرے بابا کے بالوں میں کھچلی ہے اور
اُنگلیاں جھڑ چکی ہیں !
حسابِ شب و روز کرتے ہوئے
تیری اَماں کے رعشہ زدہ ہاتھ خوشحالیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اَن دُھلے برتنوں میں پڑے رہ گئے
صبحِ تعبیر نے شاخ پر سبز ہونے کی حسرت لکھی
آنکھ کو موتیا دے دیا !
دیکھتا کیوں نہیں، آج بازار میں جشنِ افلاس ہے
شہر کی بھوک چوری ہوئی
اور خبروں نے اخبار گم کر دیا !

لوگ روتے رہے !
لوگ ہنستے رہے
تیرے بستر پہ اشکوں کی چمپا کھلی
اور تو چپ رہا !
تیرے ماتھے پہ مسکان کا عطر چھڑکا گیا
اور تو چپ رہا !
میری ہنڈیا جلی
میرا چُولھا بجھا
میری جھولی سے حرفِ دُعا گر گیا
میرے بچے ! تو لب کھولتا کیوں نہیں !
بولتا کیوں نہیں !

جاوید انور

کُھلے پانیوں کے نواح میں — جہاں ریت ہے

کسی سیلِ نُور میں بہہ گئے
وہ جہاز راں بھی، جہاز بھی
شبِ تار کا جو حصار توڑ کے آئے تھے
کُھلے پانیوں کے نواح میں
مری دھوپ میں
وہ طیور بھی جو کھلے گلاب کے روپ میں
کسی شاخ پر
تو وہ شاخ آتشِ سُرخ تھی
کسی سیلِ نور میں بہہ گئی مری نظم بھی
مرے خواب بھی
وہ گناہ بھی، وہ ثواب بھی
کہ جو لوحِ خاک پہ رات بھر
کسی ماہتاب کی انگلیوں نے رقم کیے
کئی بُرجِ صبحِ نجات کے
کسی سیلِ نور میں بہہ گئے، تو مری خبر
ہوئی نشر تیرے مدار میں
تری ذات کے کسی منطقے میں ہوا چلی
کُھلے بادباں
مگر اب یہاں کسی وصل کی کسی ہجر کی کوئی یادگار نہیں بچی
کُھلے پانیوں کے نواح میں

نہ گلاب ہیں
نہ جہاز ہیں، نہ جہاز راں
نہ گلاس ٹوٹا ہوا کوئی
نہ شراب کا کوئی داغ ہے
یہاں صرف ریت ہے موج موج دُھلی ہوئی
یہاں صرف ریت ہے
ریت پر کہیں قبر ہے کسی چاند کی
جو کہ تھا کبھی
کہیں آفتاب کے استخوان کی ریت ہے
کفِ ریگ پر کئی رنگ محوِ ترنگ ہیں
کئی نور سال ہیں رقص میں
کسی عکس میں کوئی میں نہیں
کوئی تُو نہیں
یہی ریت ہے
یہی ریت جو کہ ازل ابد کا وصال ہے
یہ قیامتوں کا جمال ہے
تو دھنک بنی تو کرن کی اوٹ میں جا چُھپی
میں فلک بنا تو زمیں کی گود میں آ گرا
کُھلے پانیوں کے نواح میں
جہاں ریت ہے!

جاوید انور

رات کی بات

کہیں کہیں زمیں نہیں ہے اور کہیں پہ آسماں نہیں
دراڑ در دراڑ کیا عجیب رات ہے

مہیب رات ہے
کہیں کسی مچان سے لہو لہو گلاب جھڑ رہے ہیں اور کہیں پہ
گرگِ شب کی ہچکیوں میں موت ہے

—— کواڑ بج رہے ہیں ساتھ والے بے مکیں مکان کے
—— کلاک پر اڑھائی بج چکے ہیں
رات کے

کتاب در کتاب صبح کا سفر طویل بھی ہے اور سخت بھی!
مگر سوال اور جواب کا وہ سلسلہ جو ممتحن کی میز کے دراز
میں رکھا ہوا ہے وہ چُرا بھی لیں تو
پرچۂ سوال بے سوال ہو گا کیا؟

جواب کون دے؟
جواب کون دے کہ یہ سرنگ ہم جو اپنی نیند اپنے خواب
ہی میں کھودتے ہیں رات دن
رہائی کس سے ہے؟

وہ کیسا لمحۂ وصال تھا کہ پُل صراط پر ٹھہر گیا؟
میں جاگتا رہا!

حسین عابد

کافی

پینگ چڑھے سُکھ پیار کی
ٹہنی ہری بہار کی
ندی کنارے اُتری کُونجیں
چٹھی آئی یار کی
پینگ چڑھے سُکھ پیار کی
اندر باہر جاتی سانسیں
چال چلیں جب نار کی
پینگ چڑھے سُکھ پیار کی
باندھ اپنے پگ میرے گھنگرو
لَے جوڑیں اقرار کی
پینگ چڑھے سُکھ پیار کی
کچی، پکی، اُونچی، نیچی
ہار جیت بیکار کی
پینگ چڑھے سُکھ پیار کی

راشد مراد

بات شناسائی کی

(۱)

اچھے دریا!
علم ہے مجھ کو
یہ کاغذ کی ناؤ
اسے جہاں میں بھیج رہا ہوں وہاں نہیں پہنچے گی
پھر بھی اس کو — اچھے دریا —!
سطحِ آب پہ رہنے دینا
جب تک، جن لہروں میں چاہے
بہنے دینا!

(۲)

دلِ ناداں!
اُسے وعدہ شکن کہنا ابھی اچھا نہیں لگتا
ابھی اُس کا چلے آنا حدِ امکاں میں ہے
سرِ بامِ شبِ وعدہ ابھی تک چاند روشن ہے
ابھی اچھا نہیں لگتا — اُسے وعدہ شکن کہنا

(۳)

اِک شخص کو بھلا کر
اب زندگی ہماری
پہلے سے بھی زیادہ
دُشوار بن گئی ہے
ہم در بنا رہے تھے
دیوار بن گئی ہے

(۴)

وصل کے زمانے کی
خوشگوار باتوں کو
یاد کرتے رہنے سے
آہیں بھرتے رہنے سے
درد کم کہاں ہو گا
جی کا ہی زیادہ ہو گا

اشرف جاوید

کوئی زندگی کا جواز دے

ترے شہر میں
سرِ شام ہی
مرے جسم و جاں کی منڈیر سے
کوئی خوابِ تازہ کے ٹوٹنے کی صدا اُٹھے
کسی یادِ سبز کی کرچیاں
مری پتلیوں میں کھلے گلاب کو نوچ لیں
کئی بے جہت سی مسافتیں
مجھے لمحہ لمحہ بکھیر دیں
کہ ہواؤں کی سبھی تہمتیں، سبھی فیصلے مرا رزق ہیں
کھُلے پانیوں پہ لکھے ہوئے سبھی حرف میرا نصیب ہیں
یہ تمام حرف سمیٹ لوں تو بھی تیرے عکس کے زائچے
کسی یاد کے بھلے موسموں کا سراغ کیسے لگائیں گے
کوئی شکلِ تازہ کا خواب کیسے کھلائیں گے
پسِ حرفِ دستِ دُعا بھی تُو
سرِ شاخِ چشمِ وفا بھی تُو
ترے ہجر کے سبھی ذائقے

سبھی کلفتیں
سبھی واہمے
مری لوحِ لمس پہ نقش ہیں
کبھی شورشِ مہ و سال میں
کہیں یورشِ خد و خال میں
ترے قرب میں پَلی ساعتوں کی دھنک
نگاہ سے محو ہو
تو خیال کے کھلے ناخنوں سے کرید لیتا ہوں یاد کو
مرا درد ہے مرا ساتباں
مرے زخم ہیں مری کہکشاں
یہی خواب تھے
جو عذاب ہیں
یہ فشارِ زہر مراد ہے
یہ حصارِ ہجر نژاد ہے
ترا شہر چھوڑوں تو کس لیے

تجھے بھول جاؤں تو کس طرح !
یہی سوچ کر
ترے شہر میں
میں نے ہجرتوں کی تمام راتیں گزار دیں
گئے موسموں کے فشار لمحے سمیٹ کر
ترے رتجگوں میں گلاب نوم کھلا دیا
ترے نام کی سبھی تلخیاں
میں نے اپنی جاں میں اُتار لیں
ترے اسم کی سبھی ظلمتیں
میں نے اپنی آنکھوں پہ تان لیں
تری راہ کے سبھی آبلے
میں نے اپنے پاؤں میں رکھ لیے
تجھے کیا خبر، مرے بے خبر !

مرے بے خبر!
کبھی اپنے گنبدِ خوف سے نکل آ
کہ کاسۂ جاں لیے
سرِ رہگزر
ترا منتظر
کوئی کب سے ہے
گلِ لمس میں وہ مہک چھڑک
جو ترے بدن کی اساس ہو
جو مری وجود شناس ہو

مرے بے خبر!
کبھی بھول کر
سرِ رہگزر
مجھے آہٹوں کا گداز دے
کوئی زندگی کا جواز دے

قائم نقوی

خواہش اور کوشش کا برزخ

افق پہ پھیلی ہوئی شفق میں
ابھی تو سورج کا ڈوبنا ہی بھلے لگے گا
بھلا لگے گا حریمِ شب سے جمالِ مہتاب کا ابھرنا
کسی کا آنا کسی کا جانا
ہمارے کب اختیار میں ہے
ہمیں تو اپنا یہ رونا ہنسنا
بچھا رتوں سے نکالتا ہے
پہیلیوں میں اُتارتا ہے

ہم اپنے ہونے کی اور نہ ہونے کی جستجو میں
ازل ابد کی تمازتوں میں
ردائے افلاک تن پہ اوڑھے ہوئے خلا میں بھٹک رہے ہیں
یہ کیسی کوشش
یہ کیسی خواہش
جو ہم کو جینا سکھا رہی ہے
جو ہم کو مرنے سے روکتی ہے

تین مختصر نظمیں

(۱)

ہر ایک حد سے گزر کے دیکھا
ہَوا سے آگے ہوا ہی ٹھہری
کبھی جو اک بار مڑ کے دیکھا

(۲)

مکاں مکینوں سے رُوٹھ جائیں
کھلے دریچوں میں بند آنکھیں
جو خواب بننا ہی بھول جائیں

(۳)

آگ پانی ملیں گے کیسے
ہجر موسم کی ٹہنیوں پر
نور سپنے کھلیں گے کیسے

اعجاز رضوی

بساط

چاروں جانب گہری دُھند ہے کوئی ہمیں بتلائے
کس خانے میں پاؤں دھریں ہم
کس خانے میں ٹھہریں
کس مہرے سے نظر بچائیں
کس رستے سے بھاگیں
کس چوپال پہ رات گزاریں
کس کو اپنا جانیں
کس سیٹی کی دُھن پہ ناچیں
کس کو اپنا مانیں
چاروں جانب ایک سے خانے
ان گہرے خانوں کی گہری دھند کا رَن
ہم تم کیسے کاٹیں
گہری دھند کی اس دیوار کی مٹی کب تک چاٹیں

خواب

ایک آنسو گرا خاک پر، آنکھیں اُگنے لگیں
سارے منظر نظر میں سمٹنے لگے
میں نے ہاتھوں سے ساری زمیں کھود دی
میری جھولی میں جو خواب تھے
میں نے ان کو زمیں کے حوالے کیا
پھر زمیں پر دعاؤں کی چادر بچھا
آپ بھی سو گیا
جب ذرا نیند ٹوٹی تو میں نے زمیں چوم لی
کیونکہ اس میں مرے خواب سوئے ہوئے تھے
مرے خواب شیشہ نہ پتھر نہ مٹی
مرے خواب تو بس مرے خواب تھے!

عباس تابش

شجر سے اُترتی ہوئی ایک نظم

مجھے اک نظم لکھنی ہے
طلوعِ شام سے پہلے
نگر سے دُور جنگل کی اُداسی پر
ہوا کی بے لباسی پر
بھٹکتے مور کے قدموں میں بکھرے آنسوؤں پر
نظم لکھنی ہے

کوئی بدلی سجل الفاظ کی کشمش گرائے گی
مرا خامہ کوئی نوزائیدہ بچہ ہے چڑیا کا
عجب بے رزق موسم ہے
اُسے چوگا نہیں ملتا

مجھے مصرعہ بنانا ہے
کہ جیسے ڈار کونجوں کی فلک کے خالی کاغذ پر
کہ جیسے اشک بستہ ساعتیں
آنکھوں سے صف باندھے نکلتی ہیں
طلوعِ شام سے پہلے

مرے الفاظ بے موسم پرندوں کی طرح شاخوں پہ بیٹھے ہیں
نہ وہ منقار زیرِ پَر
نہ گیتوں سے بھری چونچیں مرے دل میں چبھوتے ہیں
سوادِ شب بھی حسرت ہے
مرے اظہار کی حسرت
سرِ مہتاب بدلی میں مرا مصرع چمکتا ہے
مگر میری حدِ تحریر سے باہر

بدن دیمک زدہ لاٹھی
سماعت ملتجی آواز کے در پر
کہاں مہتاب کی زردی نیا کینوس بناتی ہے
سرشکِ خوں کا خامہ بھی تہی خط ہے
کہاں سے زاویہ کھینچوں
کہاں زنجیرِ بست و در میں مصرع قید ہوتا ہے
کوئی حلقہ نہیں ملتا

نہ جانے کون نادیدہ فرشتوں کے پَروں پر نظم لکھتا ہے
سُن اے آوازِ بے مسکن
مجھے الفاظ سے بھر دے
مجھے اک نظم لکھنی ہے
سجل لفظوں کی کشمش سے
سوادِ شب کی کڑواہٹ پہ بیٹھی نظم لکھنی ہے
طلوعِ خواب سے پہلے

تماشا سطرِ خستہ کا لہو میں گونج اُٹھا ہے
سُن اے آوازِ بے مسکن
طلوعِ خواب سے پہلے
مجھے اک نظم لکھنی ہے

چلو بیٹا
شجر کے پاس جا کر تالیاں پیٹیں
پرندے جب اُڑیں گے تو زمیں پر نظم اُترے گی

رؤف امیر

گھر آنگن

یہی وہ صحن ہے جس میں
ہمارا بچپنا مٹی کے گھر تعمیر کرتے
کھیلتے اور دوڑتے گزرا
کھلا آنگن درِ شفقت ہمیشہ ہم پہ وا رکھتا
ہمارے ننھے ننھے پاؤں تھک جاتے
مگر آنگن کی وسعت کم نہ ہوتی تھی

یہی وہ صحن ہے جس میں
سبھی دن عید کی صورت گزرتے تھے
مسرت رقص کرتی تھی

یہی وہ صحن ہے
جس کے مکیں اک دوسرے کو دیکھتے تھے
اور جیتے تھے
یہی وہ صحن ہے
جو پیار کی، مہر و محبت کی علامت تھا

یہی وہ صحن ہے جس میں
مرا بچہ کھلے قدموں پہ چلنے سے بھی قاصر ہے
کہ اونچی اونچی دیواریں
ہر اک جانب سے اس کا راستہ روکے کھڑی ہیں

یہی وہ صحن ہے جس میں
اداسی بال کھولے بین کرتی ہے
ہمیں بے چین کرتی ہے

یہی وہ صحن ہے
جس کے مکیں اب اپنے اپنے حال میں گم ہیں
کسی کو دوسرے سے کوئی بھی مطلب نہیں ہے

یہ آنگن تم نے مرضی کے مطابق بانٹ ڈالا ہے
مگر میرے چچا زادو
مجھے تم سے گلہ کوئی نہیں

زمیں ماں ہے
مگر جب اس کے بیٹے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں
تو اپنے بھائیوں کے خون کی قیمت لگاتے ہیں

خدا کا شکر ہے
اجداد کی اتنی زمینیں ہی نہیں تھیں
اور ہمارے سر سلامت ہیں
یہ آنگن چھوٹے چھوٹے ہی سہی پر گھر سلامت ہیں

رؤف امیر

خاں صاحب کی تقریر

وہ جب اُس گاؤں میں پہنچا
تو دن بھر کا تھکا سورج اُفق کی گود میں سونے ہی والا تھا
پرندے اپنی روزی چگ کے جنگل کے گھنے پیڑوں کی جانب اُڑ رہے تھے

سحر دم پنچھیوں کے ساتھ کے جاگے ہُوئے لوگوں نے
اُس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں
پھول برسائے

یہ دور افتادہ گاؤں
یوں تو اُس کے باپ دادا کی وراثت ہے
مگر، سرکار سے منصب ملے عرصہ ہُوا وہ آج پہلی بار آیا ہے

جب استقبال کی ہر رسم پوری ہو چکی
تو تالیوں کی گونج میں اُس نے
بڑے پرسوز لہجے، درد کی آواز میں ڈوبی ہوئی تقریر کی

وہ کہتا تھا
کہ اس دورِ حکومت میں ہمارے ملک نے جتنی ترقی کی
وہ پاکستان کی تاریخ میں پہلے نہیں ملتی

وہ کہتا تھا
کہ ہم نے ہر طرف سڑکیں بچھا دی ہیں
مگر، مجمعے سے تھوڑی دور اس کی گرد میں لپٹی ہُوئی گاڑی کھڑی تھی
جس کو نوکر اپنی اپنی چادروں سے صاف کرتے تھے

وہ کہتا تھا
کہ ہم نے ملک کو سیراب کر ڈالا
مگر، کچھ دُور پگڈنڈی پہ پنہاریں گھڑے سر پہ اُٹھائے
دُور کے جوہڑ سے واپس آ رہی تھیں
جو انسانوں، درندوں، بکریوں، بھیڑوں، پرندوں
ڈھور ڈنگر کا وہاں واحد سہارا ہے

وہ کہتا تھا
کہ ہم نے ملک کو بجلی مہیا کی
مگر اس شام تو مسجد کے حجرے میں پڑا
مٹی کا ٹوٹا دیپ بھی روشن نہیں تھا

فضا میں تالیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا
خلق بہری ہو گئی تھی
تھکا سورج اُفق کی گود میں سر رکھ کے کب کا سو چکا تھا
شام گہری ہو گئی تھی

اسماء راجا

مجھے ان سے محبّت ہے

مجھے ان سے محبّت ہے
جو ننگے پاؤں چلتے ہیں
جو بچّے اپنے کاندھوں پر اُٹھاتے ہیں
جو ہم سب کی طرح اُبلے ہوئے انڈے نہیں کھاتے!

مجھے ان سے محبّت ہے
کہ جن کا لہجہ بھرّایا سا ہوتا ہے
اور ان کے دل بھی
ان کی انگلیوں کی سُرخ پوروں میں دھڑکتے ہیں

مجھے اُن سے محبّت ہے
کتابوں کے ورق جو موڑ کر رکھتے ہیں
سگرٹ اپنی چائے کی پیالی میں بجھاتے ہیں
بہت سی پیاری پیاری باتیں کرتے ہیں

مجھے اُن سے محبّت ہے
جو گھر سے دُور جاتے ہیں
تو خط لکھتے ہیں بہنوں کو
دُعائیں ماؤں کی، مقبول ہوتے دیکھتے ہیں

مجھے ان سے محبّت ہے
لکھی جاتی ہیں جن پر نظمیں
ہنس سکتے ہیں جو
اور جن کی آنکھیں بولتی ہیں

مجھے ان سے محبّت ہے
کہ جن کے بچّے اُن کو یاد رکھتے ہیں
وہ جن کی عینکیں میزوں پہ رکھی ہوتی ہیں
اور جن کے دروازے کھُلے رہتے ہیں

مجھے ان سے محبّت ہے
جو بے پایاں محبّت سے بھرے اشعار کہتے ہیں
فقط کہتے نہیں ہیں
وہ محبّت کر بھی سکتے ہیں!

اسماء راجا

خوشیاں

بھری دوپہر میں چڑیا نے کیا گیت سُنایا
آج پہاڑ سے پانی بھر کر لانے جیسا دن بھی
جلدی گزرا !
کھُلے دریچے سے درآنے والی تیز ہوائیں
کیسے بال اُڑاتی ہیں !
آئینے کو دیکھ کے خود ہی ہنس پڑنا
معصوم شرارت ہے اور کتنی اچھّی ہے !
جگنوؤں کو ہاتھوں پر اُڑتے دیکھنا !
اک دو پل کو شام، ہوا اور بادل کے ہمراہ ٹہلنا !
جنگل کے رستے پر بوندوں کی چادر میں مچلے جانا !
جس نے ہمارا نام لیا تھا، اس کو ڈگر ڈگر پہ پانا !
یہ احساس کہ لمحوں کی بھی طنابیں ڈھیلی پڑ سکتی تھیں !
تجھ کو تو معلوم تھا، مالک !
یہ خوشیاں بھی ہم کو زندہ رکھ سکتی تھیں !!

طلب

زندگی بھر بھاگتے گزری
تعاقب میں بسر کی
اِک طلب تھی
زندگی کو ہاتھ سے محسوس کرنے کی طلب — !
اس طلب میں آسماں کی سمت جا نکلی، مگر دیکھا
کہ جتنے بھی ستارے تھے
وہ سب چٹخے ہوئے تھے
کہکشاں بھی راکھ کی مانند بُجھتی جا رہی تھی
زندگی اور مجھ میں تھا اک ہاتھ بھر کا فاصلہ
— جب زندگی تھک کر گری
— اور پھر نہ اُٹھی !

احمد ندیم قاسمی

عدم تجربہ

مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہُوا
مجھے ماوراء کے جمال سے کوئی کد نہیں
مگر اس زمیں پہ جو آدمی ہیں
میں ان کے چہروں کو، ان کے ذہنوں کو
اپنے دل میں اُتار لُوں تو اُدھر چلوں
میں سمندروں کو سمیٹ لُوں تو اُدھر چلوں
یہ جو ریگزار ہیں، کوہسار ہیں، سبزہ زار ہیں
ان کے حُسن کو اپنے گرد لپیٹ لُوں تو اُدھر چلوں
مری کائنات طلوع بھی ہے، غروب بھی
مری سلطنت میں شمال بھی ہے، جنوب بھی
یہ مری زمیں کا جو فرش ہے
مرا عرش ہے
میں بلند ہو کے بھی اپنے کرّۂ ارض سے ہوں بندھا ہُوا
کہ مرے وجود کی جڑ تو میری زمیں میں ہے
یہ زمیں جو کعبۂ زندگی ہے
جو سجدہ گاہِ فنون ہے
یہ زمیں ہی میرا شعور ہے
یہ زمیں ہی میرا جنون ہے
مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہُوا!

رفاقتیں

کون کہتا ہے کہ تنہائی مرا مقسوم ہے
میں نے مانا
میری ساری زندگی
ایک ناپیدا کراں صحرا میں گزری ہے
جہاں طوفان در طوفان یوں چلتے ہیں
جیسے شہر میں انسان چلتے ہیں — !
میں نے لیکن بارہا دیکھا کہ ہر طوفاں میں میرے ساتھ ساتھ
ریت کے ٹیلے سفر کرتے رہے!

پھلواری

رضیہ فصیح احمد

تائی اماں! آپ نے سنا، یہاں کی چڑیاں بھی تو انگریزی بولتی ہیں۔ غور سے سنیئے ایک کہہ رہی ہے سوئیٹ، سوئیٹ دوسری کہہ رہی ہے، برڈی، برڈی ـــ اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں کہہ رہی ہیں گٹ پٹ، گٹ پٹ ـــ" یوسف نے باربی کیو کرتے گھرانے کے پس منظر میں صفائی سے تائی اماں کی تصویر کھینچی۔ اُن کو پتہ بھی نہ چلا۔

"اے ہاں یہ تو وہی بات ہوئی" انھوں نے اطمینان سے ایک ٹانگ اٹھا کر بنچ پر رکھتے ہوئے کہا ـــ "کسی نے کہا چاند کی شکل روپے جیسی ہے تو بھوکے نے۔ بھیا مجھے تو روٹی دکھائی دے ہے"۔ اپنے ہاں کہا کرے ہیں ٹیٹری پکارے ہے ٹیٹری ہوں، پیاسی ہوں۔ دوسری زبان والے خدا جانے کیا کہتے ہوں گے، تمہاری امریکن زبان کیا کہوے ہے؟"

"معلوم نہیں تائی اماں ـــ مگر کبھی کبھی تو آپ بڑی عقلمندی کی باتیں کرتی ہیں!"

"اور کبھی کبھی پاگل پنے کی، کہہ دے نا، چپ کیوں ہو گیا!"

"میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں" یوسف نے آگے بڑھ کر جھیل کے اندر کشتی میں گذرتے ایک جوڑے کی تصویر لی۔ پھر پانی میں گڑی لکڑیوں کو فوکس کرتے ہوئے بولا ـــ "اب آپ نے خود ہی کہہ دیا۔"

"ارے ہم نے زمانے بھر کا علم پڑھا نہ کبھی گھر سے باہر نکلے۔ تم لوگوں سے کچھ پوچھو تو تم ایسے ہنسو ہو جیسے پہلے بڑے بچوں کی باتوں پر ہنسا کریں تھے۔ ـــ"

یوسف نے کیمرے کا بٹن دبایا اور آن کر تائی اماں کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا "تائی اماں بات تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں مگر جب آپ ایسے سوال پوچھتی ہیں کہ سعودی عرب اور امریکہ کے درمیان ریل چلے ہے تو آپ ہی ہنسی آئے گی سچ آپ نے کرلیا، امریکہ تک آپ آگئیں مگر کبھی دنیا کا نقشہ اٹھا کر نہ دیکھا کہ پاکستان کدھر ہے، سعودی عرب کہاں ہے اور امریکہ کس طرف کو ہے۔"

لاؤ کیمرہ مجھے دو" منیر نے کہا اور جھیل کے دوسری طرف سرخ، زرد، گلابی، بھورے اور عنابی ہوتے پتوں کی تصویریں اتارنے لگا۔

تائی اماں کچھ کھسیانی سی ہو گئیں گھٹنے کے نیچے سے پاندان گھسیٹ پان لگاتے ہوئے بولیں "ارے جس دن نقشہ دیکھنے لگوں گی اس دن بھی تم ہنسو گے کہ لو بوڑھی اماں کو جغرافیہ پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ اے ہے جب میں نئی نئی امریکہ آئی تو، ایک دن منیر کہنے لگا، اماں یہاں مغرب کی طرف نہیں مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں میں سمجھی مذاق کر رہا ہے۔ اس نے جھٹ دینی مسجد کے ملاجی کو فون کر دیا۔ وہ پاکستانی تھے۔ کہنے لگے ہاں یہاں سے کعبہ مشرق کی طرف سے نزدیک ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں

آئی۔" تائی اماں نے پان منہ میں رکھ کر اشتیاق سے جھاڑیوں کے سرخ خوشوں پر نظر ڈالی جو لاکھوں کی تعداد میں انگور کے خوشوں کی طرح لدے تھے اور سورج کے عکس میں یوں چمک رہے تھے جیسے ان میں کوئی مشروب بھرا ہو۔

"تائی اماں گھر جا کر آپ کو نقشے میں دکھاؤں گا کہ کعبہ کس طرح مشرق کی طرف ہے۔ ابھی تو آپ یہ منظر دیکھیے، ایمان سے کہیے کبھی ایسی خوبصورت خزاں دیکھی تھی آپ نے؟"

"نہیں بھیا ــــ واقعی بڑی خوبصورت خزاں ہے، بہار سے بھی بڑھ کر ــــ بھلا بتاؤ کون رنگ ہے جو ان پتوں میں نہیں ہے۔"

منیر نے اس طرف آتے ہوئے یہ بات سن لی، "اماں، اس مرتبہ اتنی خوبصورت خزاں بھی آپ کے اعزاز میں آئی ہے میں چھ سال سے یہاں ہوں مگر ایسی حسین خزاں نہیں دیکھی۔"

"یار یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو ــــ" یوسف بولا ــــ "اس سال یونیورسٹی کے درخت بہت خوبصورت لگے۔ میں نے یونیورسٹی کے مالی سے پوچھا تو بولا کہ اس دفعہ بارشیں بہت ہوئی ہیں۔ درختوں نے نمی جذب کر لی ہے اسی وجہ سے خزاں دیر میں آئی ہے مگر خوبصورت آئی ہے۔"

"اماں یہ تو چھوٹا سا اسٹیٹ پارک ہے۔ یہاں کے نیشنل پارک دیکھیے، جن کے قدرتی جنگلوں کو ویسا ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں جنگلی جانور، پرندے اور جنگلی پھولوں کی افراط ہے۔ یلو اسٹون پارک جہاں گرم پانی کے ہزاروں چشمے پھوٹ رہے ہیں، کولوریڈو نیشنل پارک جہاں چودہ ہزار فٹ اونچی پہاڑیاں ہیں۔ پاکستان میں ایسے پارک کہاں ہیں؟"

"پاکستان بھر کا تو مجھے پتہ نہیں مگر کراچی کے باغوں کا تو وہی حال ہے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔"

"تائی اماں، آپ تو بات کرتی ہیں پہیلیوں میں، اب اس پہیلی کو بوجھے کون؟"

"ارے پرانے زمانے میں ایک ایک مرد کی چار چار بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ جس پر وہ اپنا پیار نچھاور کرے تھلدہ سہاگنوں کی طرح سج بنا رہا کرے تھی، باقی بے چاریاں اجڑی بجڑی جیسے بیوائیں ــــ جب پاکستان بنا تو گاندھی گارڈن اچھا خاصا ہرا بھرا تھا۔ دوسرے پارک بنے تو وہ اجڑا۔ جب سے عزیز بھٹی پارک بنا ہے، ہل پارک میں دھول اڑنے لگی ہے۔"

"اب کی گرمیوں میں تائی اماں کو فلوریڈا لے جاؤ۔ وہاں کے ایورگلیڈز پارک میں ایک جگہ ہے فلیمنگو، بھئی کیا خوبصورت جگہ ہے۔ بیٹھنے کی جگہ اونچی بنائی ہے جہاں سے دور دور کا منظر نظر آتا ہے۔ سمندر کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن کے درختوں پر چڑیاں بیٹھی رہتی ہیں۔ مرغابیاں اور سارس سینکڑوں کی تعداد میں۔ کی ویسٹ، امریکہ کا آخری مغربی کنارا ہے۔ اس طرف جانے والی سڑک بھی یہاں سے صاف نظر آتی ہے۔ تائی اماں وہ پورا باغ دیکھ کر بڑی خوش ہوں گی ــــ"

"نہ بھیا ــــ اب میں زیادہ دن نہ ٹھہروں گی، مجھے ٹکٹ لا دینا۔"

"ارے اماں، یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی آپ کو؟ ــــ"

"ہاں ــــ" وہ کسمسائیں۔ جواب دینے کے لئے دماغ پر زور ڈالا، پھر ایسے لہجے میں کہ بلا سے کوئی برا مانے یا بھلا، بولیں ــــ "میرے پودے جل جلا گئے ہوں گے ــــ ہاں نہیں تو ــــ"

"پودے تو اب جل ہی گئے ہوں گے، ایک سال ہو گیا آپ کو آئے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں ــــ"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اچانک آپ کو پودے کیسے یاد آگئے، وہ تو کب کے جل گئے ہوں گے ــــــ"

"اَرے تمہیں کیا پتہ، کب سے انھیں دل ہی دل میں یاد کر رہی ہوں، سوچتی ہوں بہو کو ذرا بھی شوق نہیں بیل بوٹوں کا۔ اس نے پانی وانی بھی نہ دیا ہوگا ــــــ خیر ایک دفعے اور نئے سرے سے لگا لوں گی۔ ایک ہی دفعے لگانے پڑیں گے۔ یہاں کے گملے کے پودے تو ایک سال میں دس دفعے جلے ــــــ"

"تو جلتے ہی ــــــ" منیر نے کہا، "آپ نے بھی تو مارچ میں اٹھا کر باہر رکھ دیئے جبکہ اپریل تک یہاں فروسٹ ہوتا ہے۔ باقاعدہ اخبار میں آتا ہے کہ اس دن فروسٹ کا آخری دن ہوگا۔ اس کے بعد پودے باہر رکھے جاتے ہیں ــــــ"

"اے ہے، تو مجھے کیا پتا۔ ایسی اچھی دھوپ نکلی۔ ایسا اچھا گرم دن ــ میں نے اٹھا کر باہر رکھ دیئے۔ رات کو پالا مار گیا ــــــ ایسے جلے کہ لاکھ اندر رکھا، کھاد ڈالی، مگر اونہوں ــــــ" انھوں نے سر ہلایا ــــــ "بالکل مردہ، جڑ تک کو پالا مار گیا ــــــ"

"تو اور کیا ــــــ" یوسف بولا ــــــ "یہاں کا فروسٹ ایسا ویسا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں فخر تھا جیسے کہہ رہا ہو یہاں کی تو ہر چیز بڑے پیمانے پر ہوتی ہے چاہے برفباری ہو، فروسٹ ہو یا فراڈ!

"یہ بھی کوئی بات ہوئی، دو ہفتے کے لئے باہر جاؤ تو کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہیں، پانی بنا پودے جل گئے، کچھ میں احتیاطاً زیادہ پانی ڈال گئی وہ گل کر رہ گئے باقی سارے خشک، بے دم، مہینوں ان کو زندہ کرنے میں لگے۔ نہ بھائی تمہاری کھیتی باڑی سمجھ میں نہیں آتی ــــــ وہاں کا تو ہمیں پتہ ہے، بیلے میں کب پانی ڈالنا ہے، گلاب کی قلمیں کب لگانی ہیں اور اللہ تمہارا بھلا کرے چنبیلی کے جھاڑ کو کیا کرنا ہے ــــــ یہ تمہارے گھروں کے اندر کے پودے ہم سے نہ سنبھلتے ــــــ"

"تائی اماں! آپ کو کب سے شوق ہوا ان پھولوں دولوں کا؟" یوسف نے پوچھا۔

"اے ہے بچپن سے۔ تمہارے ابا کی پھولوں کی دکان تھی ــــــ حیدرآباد سے پھول آیا کرتے تھے۔ بابا تین ہنڈی سے پھول لاتے ہم سب گھر کی عورتیں لڑکیاں مل کر ہار گوندھتے ــــــ سارا گھر مہکا کرتا۔ تب ہی شوق تھا کہ اللہ نے دیا تو کبھی گھر کے آنگن میں پھول لگاؤں گی۔ اللہ رکھے میرے منیر کو۔ اس نے بھر بھر مٹھیاں روپے بھیجے۔ میں نے آنگن چھوڑ پورا باغیچہ لگا لیا۔"

"آپ نے شادی بھی پھول بیچنے والے سے کی؟" منیر کی زبان سے نکل گیا۔ بعد میں وہ خود شرمسار ہو گیا۔

ماں گُلگُوں سی ہو گئیں۔ دبی زبان سے بولیں "اور کیا ــــــ" پھر پاندان گھسیٹ کر پان بنانے لگیں جب کوئی افتاد پڑے ذہنی یا جسمانی، پاندان ہی مدد کو آتا تھا ــــــ اب بہت دنوں سے جیسے خاندان میں بے کہا معاہدہ سا تھا کہ ان دنوں کی بات کوئی نہ کرتا تھا جب ان کا باپ اور وہ خود سڑک پر کاروں میں بیٹھنے والیوں کے ہاتھ پھول اور کلیاں بیچتے تھے۔ کبھی پیسے ہاتھ لگتے تھے کبھی گالیاں۔

وہ دن منیر کو خوب یاد تھے۔ اب بھی اکثر وہ ان دنوں کی یاد میں کھو جاتا تھا اور کبھی کبھار خود کو ڈنڈے میں بیلے کی کلیوں کے ہار اور کنگن لٹکائے کار کار پھرتا خواب میں دیکھتا تھا۔

اماں بھیگے نگین نادل میں چھپا کر پان لگا رہی تھیں کہ منیر نے تاڑ لیا۔ چھالیہ کھانے کے بہانے اٹھا اور اماں کے ہاتھ سے سلاد کا پتہ جھپٹ لیا۔ "اماں آپ باز نہیں آئیں گی اپنی حرکتوں سے ــــــ پھر سلاد کا پتہ کھا رہی ہیں پان کی جگہ ــــــ"

"کہہ تو دیا، بہت دفعہ کھایا ہے ــــــ کراچی میں جب کبھی پان کا قحط پڑا یہی بے چارہ کام آیا، عادت پڑ جائے ہے ــــــ"

"یہاں تو قحط نہیں ہے۔ جتنا کہیے لادوں ــــــ" منیر بولا۔

"تو تم ڈھیروں بھر پان ایک مرتبہ لا کر کیوں نہیں دے دیتے۔"

یوسف بگڑ کر بولا "اماں نے خود منع کیا تھا۔"

منیر نے معذرت کی ——— "کہتی تھیں جب ختم ہو جائیں گے بتا دیا کروں گی ———"

"ارے میں نہیں کھاتی تمہارے پان ———" اماں نے ہاتھ نچایا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ انسان ہرے نوٹ پر چونا کتھا لگا کر چاٹ لیا کرے، ہاں نہیں تو۔ بھلا بتاؤ اتنے مہنگے پان! ———"

"اماں مہنگے نہیں ہیں امریکہ کے حساب سے ——— کتنی دفعہ آپ کو بتایا۔ یہ جو ٹھنڈی بوتل آپ پیتی ہیں، ڈبل روٹی آپ کھاتی ہیں یہ سب اسی حساب سے آتی ہیں، تو کیا آپ کھانا پینا چھوڑ دیں گی؟"

"میرا بس چلتا تو چھوڑ دیتی ———"

"کتنی دفعہ تو آپ کو بتایا کہ ڈالر میں کماتے ہیں تو ڈالر میں خرچ کرتے ہیں۔"

"میں تو یہ سوچوں ہوں کہ دن بھر میں جو پان میں کھاؤں ہوں، اس میں شیرے کی بیوہ کا ایک جوڑا بن جاتا یا اس کے بچے کے جوتے آ جاتے۔"

"وہاں جو پان آپ کھاتی ہیں اس کی بچت کریں تو وہاں بھی شیرے کی بیوہ کا جوڑا بن جائے۔ ———"

"ارے نہیں، وہاں اب پان بہت سستے ہو گئے ہیں۔ کھیت کے کھیت لگ گئے ہیں ——— میں نے خود پھلواری لگا لی ہے۔ ضرورت ہی نہیں بازار سے منگوانے کی ———"

"اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ آپ کے پان، آپ کی چمپا چنبیلی سب یہاں منگوا کے لگا دیتے ہیں، پھر تو آپ نہیں جائیں گی؟"

یوسف بولا ——— یوسف منہ بولا بھتیجا تھا اور بقول منیر "اماں سے خوب لبرٹی لیتا تھا۔"

"ارے وہ یہاں لگ ہی نہ سکیں ———" اماں نے ناطق فیصلہ دے دیا۔ "تمہیں کیا پتا ——— بھونے جو پرس دیا تھا نا یہاں لانے کو ——— اس میں پلاسٹک کی تھیلی میں چھپا کر ایک پان کا پودا رکھ لائی تھی۔ یہاں آتے ہی گملے میں لگایا مگر وہ نہ ہوا۔"

"اچھا تو آپ اسی غم میں واپس جا رہی ہیں کہ آپ کا پان نہ پنپا۔" یوسف نے شرارت سے کہا۔

"تو کراچی میں کون سے ایک دن میں لگ گئے" منیر بولا۔ "وہاں بھی مشرقی پاکستان یا بنگلا دیش سے لا کر لگائے گئے تھے، برسوں بعد آج سن رہا ہوں کہ سندھ میں کھیت کے کھیت لگ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی کبھی نہ کبھی لگ جائیں۔"

"اے ہے تو میں اس انتظار میں یہاں سوکھتی رہوں ——— نہ بھیا یوں کرو اگلے ہفتے ٹکٹ دلوا دو ——— اسی مہینے تمہارے خالہ زاد بھائی کی شادی ہو رہی ہے اس میں بھی شریک ہو جاؤں گی ———"

"ارے ارے تائی اماں کوئی بات بھی ہو ———" یوسف جلدی سے بولا۔ "آپ امیگریشن پر آئی ہیں کوئی مذاق ہے۔ پکڑ لیں گے، یہاں کی پولیس بڑی سخت ہے ———"

"کیوں پکڑ لیں گے، کیا ان کی چوری کر کے بھاگ رہی ہوں۔ اپنے ملک جا رہی ہوں ———"

"ان کا گرین کارڈ کیوں لیا تھا پھر؟"

"تو ان کی صورت پہ مار جاؤں گی ———" اماں نے تیزی پکڑی۔ "میں نے تو اس سفارت خانے والے امریکن سے بھی کہہ دیا تھا جو اردو میں بات کرے تھا کہ بھیّے یہ نہ سمجھنا کہ میں تیرے ملک میں رہ پڑوں گی۔ اللہ رکھے یہاں بھی میرے بیٹے

پوتے ہیں، میں آتی جاتی رہوں گی ــــــ"

یوسف بے اختیار اتنے زور سے ہنسا کہ جھیل کے کنارے کھیلتی دو لانبی چوٹیوں والی چھوٹی بچیوں نے مڑکر دیکھا اور خود بھی ہنس دیں "غضب خدا کا ــــ یہ کہہ دیا آپ نے!" یوسف مزید لطف لیتے ہوئے ہنسے چلا گیا۔

"پھر کیا بولا وہ امریکن؟"

"بس ہنس دیا اور بولا، اچھا اماں ایک ہفتے بعد آکر ویزہ لے جانا۔ اے اتنا اچھا لگتا تھا گورا گورا بھولا بھالا سا اردو بولتا ہوا ــــ"

"لو بھائی ہم کالے کلوٹے اردو بولتے بھی بُرے لگتے ہیں تائی اماں کو ــــ"

"یہ میں کب کہوں ہوں۔ میں تو یہ بتا رہی ہوں کہ عجیب سی بات لگتی تھی اس کا اردو بولنا۔ آکر کھڑی ہوئی تو اردو میں بولا کہ ٹیلی فون اٹھا لیجیے ــــ میں نے فون اٹھایا تو بالکل صاف لہجے میں بولا کہ السلام علیکم اماں ــــ اے ہے مجھے ایسا اس پر پیار آیا جیسے میرا عرفی بول رہا ہو۔ عرفی بھی بڑا ہو کر ایسا ہی نکلے گا ــــ"

"آپ نے تو غلط بات کہہ دی پھر بھی اس نے ویزا دے دیا۔ مگر اب آپ کو واپس ہرگز نہیں جانے دیں گے۔"

"کیوں نہ جانے دیں گے، کتنے ہی واپس چلے گئے ــــ اللہ رکھے ہمارے پاکستان نے کہہ رکھا ہے "جو ایک دفعہ پاکستانی ہوا، وہ سدا پاکستانی رہا ــــ"

"اوہو ــــ آپ کو تو بڑی معلومات ہیں" یوسف نے ظاہر کیا جیسے وہ سخت متاثر ہو رہا ہو۔

"مگر پھر یہاں نہیں آسکیں گی آپ دوبارہ امیگریشن پر" منیر نے کہا۔

"کیوں نہیں، وزیٹنگ ویزا لے کر آجاؤں گی جب دل چاہے گا ــــ رہنے کو نہ میں اب آئی، نہ آئندہ آؤں گی ــــ لو بھلا سردیوں جاڑے کے پودوں کی طرح اندر بیٹھے رہو۔ ایک ذرا موسم اچھا ہوا تو مار بجلیاں چمک رہی ہیں، گرج چمک کے طوفان دم نہ لینے دیوے ہیں ــــ یہاں سیلاب آگیا، وہاں زلزلہ آگیا ــــ روز کے قتل، روز کے حادثے ــــ کوئی دن نہ جانے ہے کہ دو ایک گھر جل کے راکھ نہ ہو جائیں ــــ لکڑی کے موئے مکان جیسے گڑیا گھر ــــ"

"بیٹھے بیٹھائے سارے عیب نکل آئے بے چارے امریکہ میں ــــ" منیر نے دہائی دی۔

"اے ہے تو کیا میں نے نکالے ہیں؟ کوئی غلط بات کہی ہیں؟"

"تو کیوں ہزاروں لوگ آ رہے ہیں امریکہ۔ اپنے ملک میں گزارا ہوتا تو یہاں کیوں آتے؟" منیر باقاعدہ بُرا ماننے لگا۔

"ارے یہاں بھی لشتم پشتم گزارا کرے ہیں۔ کوئی رات کی نوکری کرے ہے۔ کسی کی بیوی بچے سب جتے ہیں۔ بس شان یہ ہے کہ بڑے ملک میں رہ رہے ہیں جیسے پرانے زمانے میں قلعے کے دھوبیوں اور بھنگیوں کی شان تھی کہ بادشاہوں کے کپڑے دھوتے اور شہزادیوں کا میلا اٹھاتے تھے ــــ"

"یہ تو نہ کہیئے اماں ــــ" منیر نے اور منہ تھوتا لیا۔ "بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگوں کے، سرکاری افسروں کے بچے یہاں رہ رہے ہیں۔"

"ہاں تو اسی لئے رہتے ہوں گے کہ وہاں ان کی وہ شان نہ رہی ہوگی ــــ یہاں تو خدا قرضوں کا بھلا کرے سب کی شان بنی ہوئی ہے۔ قرضے کے کپڑے پہن کر شادی ہوگئی، قرضوں سے دعوت ہوگئی ــــ ہمارے ہاں جب نوابی ڈوبی تھی تو لوگ

ایسے ہی قرضوں سے جشن منایا کریں تھے۔ مجھے تو ایسے قرضوں کے نام سے ہی ہول آئے ہے ——"۔
"تائی اماں آج کل تو ملک قرضوں پر چلتے ہیں۔ گھروں کی کیا بات ہے۔"
"خیر —— میں تمہاری طرح پڑھی لکھی تو نہ ہوں پر اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ مالدار ملک قرضہ دے گا اور غریب ملک قرضہ لے گا۔ کبھی یہ تو نہ سنا کہ مہاجن قرضہ لے اور کسان قرضہ دے ——"۔
"اب بولو ——" منیر نے یوسف کو چیلنج کیا۔
"تائی اماں، نواب لوگ مہاجنوں سے قرضہ لیتے تھے۔ اُن کو معلوم تھا ان کے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ حویلیاں، باغات، زمینیں قرق کرالیں گے۔ یہاں کے قرضے ویسے تھوڑا ہی ہیں ——"۔
"کیوں نہیں؟ یہاں تو تم لوگوں کی زندگیاں گروی ہیں۔ نہ قرضہ اُترے گا نہ تم یہاں سے نکلو گے ——"۔
"اماں، سچی بات تو یہ ہے کہ قرضے کا بہانہ ہے۔ قرضوں میں گرفتار ہو کر ہم خوش ہوتے ہیں کہ اپنے ماں باپ سے کہہ سکیں گے کہ ہم قرضوں کے جال میں بندھے ہوئے ہیں۔ آپ یہ باتیں نہ سمجھیں گی اماں، آپ تو گھر میں بیٹھی رہتی ہیں وہاں آدمی کی عزت نفس باقی نہیں رہتی۔ میں نے پولیس والوں کو اپنے آنکھ سے رکشا اور ٹھیلے والوں کو ٹھوکریں مارتے دیکھا ہے۔ ہر دفتر میں ہر شخص آنکھیں دکھاتا ہے، بے عزت کرتا ہے، خوشامد کرواتا ہے —— یہ باتیں ہم سے برداشت نہیں ہوتیں۔ یہاں آپ کتنے دفتروں میں گھومیں، کسی نے کہا یہ ہمارا کام نہیں دوسرے کمرے میں جائیے؟ اوپر جائیے یا نیچے جائیے ——؟ دکانوں میں اور بینکوں میں لوگ آپ کا کام ایسے ہنس ہنس کر کرتے ہیں جیسے آپ کے بغیر ان کی دکان یا بینک دیوالیہ ہوا جا رہا ہو۔
فراڈ یہاں بھی ہوتے ہیں ——" اب کے یوسف بولا۔ "مگر عام لوگوں کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے رشوت نہیں مانگتے۔ یقین مانیے تائی اماں ہر وہ لڑکا یا لڑکی جو اپنے ملک سے صرف پڑھنے آتے ہیں وہاں سے رخصت کے وقت ایسے خراب تجربوں سے گزرتے ہیں کہ کبھی واپسی کا خیال بھی دل میں لائے تو وہ باتیں یاد کر کے دل اور ضمیر کو تھپک دیتے ہیں۔"
"اور یہاں کے آرام دیکھئے ——" منیر نے گرہ لگائی —— "کیسے کیسے گرج چمک کے طوفان آئے کسی دن بجلی گئی؟ —— فون خراب ہوا؟ پانی کی کمی ہوئی؟ آندھی آئی تو ریت کا ذرہ نظر آیا؟"
"ارے ایسے آرام کو لے کر کوئی چاٹے۔ سارا دن کوئی بات کرنے کو نہیں —— فون ٹھیک ہو تو بات کس سے کریں۔ ٹی وی کھولو تو کم بختیں ناف دکھاتی، ننگی ناچتی کودتی پھرے ہیں ——"۔
"تو آپ وی سی آر پہ ہندوستانی فلمیں دیکھیئے، پاکستانی ڈرامے دیکھیئے۔"
"کب تک دیکھوں —— میں اپنے گھر کے ڈرامے بھی تو جا کر دیکھوں —— بہو نے گھر کا گھروا کر دیا ہوگا —— جانے میرے پودے کس حال میں ہوں گے؟"
"اچھا دیکھ لیجئے گا، پہلے یہ باغ تو دیکھ لیں۔" منیر نے کہا۔
دونوں نے اماں کو کشتی میں بٹھایا۔ لائف بیلٹ باندھ، چپو کھیتے پوری جھیل کی سیر کرائی۔ پھر درختوں سے ڈھکی ایک چھوٹی سی ٹرین کی سیر کو بھی گئیں مگر ان کا دل اکھڑا اکھڑا سا تھا —— بگڈنڈی کی سیر سے لوٹتے ہی بولیں "لو بھئی امریکہ کی بہار بھی دیکھ لی، خزاں بھی دیکھ لی، سب سے اونچی عمارت بھی دیکھ لی، سب سے اونچا مینار، سب سے بڑا پل الابلا سب دیکھ ڈالا۔"
"مگر ابھی آپ نے آدھے امریکہ کی سیر بھی نہیں کی ——" منیر بولا۔

"بہت کی، امریکہ تو پوری دنیا ہے، اس کی سیر کرتے کرتے ختم ہو گئی تو کیا ہوگا؟ ——"

"ہو گا کیا! —— آپ کو یہاں کے کسی خوبصورت ہرے بھرے قبرستان میں جگہ مل جائے گی۔ ہر اتوار کو پھول آپ کے سرہانے دھرے ہوں گے —— اس بات کا ذمہ میرا ——" یوسف یہ بات کہتے کہتے دھیرے دھیرے تائی اماں سے دور سرکا۔

"توبہ توبہ —— ایسے پھول، نہ خوشبو، نہ کچھ —— اس سے تو اچھا ہو کہ پاکستان میں میری قبر پر ہرا دھنیہ لگا دو —— مجھے تو ہرے دھنیے کی خوشبو تمہارے ان جاپانی پھولوں سے اچھی لگے ہے۔"

"جاپانی، یا امریکی؟"

"پہلے زمانے میں ہر گھٹیا مال کو جاپانی کہا کریں تھے ——"

"اب نہ کہیئے گا —— کسی جاپانی نے سن لیا تو سخت برا مانے گا۔"

"بات یہ ہے اماں کہ آپ کے ٹکٹ کے پیسے تو ہیں نہیں میرے پاس۔" منیر نے یوسف کو آنکھ ماری۔ "ساری کی ساری تنخواہ تو قرضے میں چلی جاتی ہے۔"

"پیسے نہیں ہیں تو یہ لو ——" اماں نے جھٹ سونے کی چوڑیاں اتار منیر کی طرف بڑھائیں۔

منیر گھبرا گیا —— یوسف اس کی مدد کو آیا۔ "تائی اماں —— یہ یہاں نہیں چلتیں ——" یوسف نے بینچ پر نیم دراز ہو کر لال جالی دار ٹوپی آنکھوں پر رکھ لی۔

"کیوں؟ ——" اماں بگڑیں —— "چوبیس کیرٹ کا سونا ہے، کھرا بالکل۔"

"امریکہ میں تو چودھا کیرٹ کا سونا چلتا ہے ——"

"ہاں کھری چیزیں یہاں کیسے چلیں گی ——" اماں نے طنز کا کوڑا گھمایا۔ "جب بال نقلی، ناخون نقلی، پلکیں نقلی —— اور تو اور آنکھیں نقلی، وہ ٹی وی والی لونڈیا روز اپنی آنکھوں کے رنگ بدل بدل کر دکھائے ہے، ابھی بھوری، ابھی کرنجی، ابھی نیلی جیسے آسمان —— ان کے دل بھی نقلی ہوں تو کیا تعجب ——!"

"اماں —— بناوٹی ہوں یا اصلی، ہم لوگوں سے تو صاف ہی ہوں گے ——"

"مشین سے صاف کر لیتے ہوں گے ——" اماں نے پھرتی سے کہا۔ "جیسے وہ قالین صاف کرنے کی مشین ہے۔ ایسی ہی کوئی مشین ہو گی۔ برتن مشین سے دھلیں، شیو مشین سے ہوں، کاریں مشین سے دھلیں تو دل بھی صاف ہو جاتے ہوں گے کسی مشین سے —— لو یہ رکھو ——" اماں نے پھر چوڑیاں بڑھائیں۔ دھوپ سینکتی لڑکیاں یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

"ارے اماں، کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ اگر آپ اتنی ہی سنجیدہ ہیں تو چلی جایئے، ٹکٹ آ جائے گا ——" پھر وہ رونی شکل بنا کر بین کرنے کے انداز میں بولا۔ "کیسی کیسی خوبصورت جگہیں اماں کو دکھائیں، ہم تو سمجھتے تھے اماں کہیں گی بس یہیں ایک گھر بنوا دے، بیں نہ جانے کی —— اب ذرا اسی منظر کو دیکھئے، کبھی دیکھا تھا ایسا سماں ——!" منیر نے نہر میں ڈوبے رنگ برنگے درختوں کے عکس اور پہاڑوں پر پینٹنگ کی طرح خوبصورت درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں جگہیں تو بڑی اچھی ہیں، مگر اپنا گھر اپنا گھر ہے۔"

"تائی اماں کو شاید امریکہ پسند نہیں آیا ——" یوسف بولا۔

"اے لو کیوں پسند نہ آتا، فرعون کے زمانے کے اللہ مارے درخت ابھی تک ہرے بھرے کھڑے ہیں اور ان درختوں

کے بیچ میں سے کاریں نکلی جا رہی ہیں۔"

"ارے تائی اماں صرف ایک درخت ایسا ہے پورے امریکہ میں جس کے بیچ میں سے کار نکل جاتی ہے ـــــ"

"چلو ایک ہی سہی، مگر ہرے بھرے درخت کے تنے سے کار نکل جائے ہے تو بھی جادو نگری۔ مگر دیکھنے بھر کی ـــــ"

"کیوں رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"ارے کوئی سرکس میں جا کر رہا کرے ہے۔ جا کر دیکھا، دل خوش کیا اور آ گئے ـــــ"

"ہائے، آج تائی اماں نے میرا دل توڑ دیا ـــــ" یوسف نے دھڑ سے گردن ایک طرف ڈھلکا دی۔ "اب تو میں تائی اماں کو اپنے خرچ پر واپس بھیجوں گا اور اپنی شادی میں بھی نہیں بلواؤں گا ـــــ"

"تیری شادی تو میں وہیں کروں گی تجھے بلوا کر اور تیرا پہلا بیٹا ہوگا تو آؤں گی، دیکھوں گی تو کیسے روک لے گا ـــــ"

"اب اماں پر جانے کی دھن سوار ہو گئی ہے تو دیکھ لینا اب ٹھہریں گی نہیں ـــــ آئی تھیں تو وزن سو پونڈ سے کم تھا، بیٹوں کے ہاں رہیں یا بیٹیوں کے، سب کو کھلا کر بچا کھچا کھاتی ہیں مگر رہیں گی وہیں ـــــ"

"تو کیا ہوا ـــــ زمین میں جو کچھ ہووے ہے وہ اپنی پھلواری کو دے دیوے ہے ـــــ خود بنجر ہو جائے پر اس کی چھاتی پر پھول کھلے رہیں ـــــ میں یہاں دنیا بھر کی سیریں کروں ـــــ آئس کریم اور چاکلیٹ کھاؤں پر دل تو میرا دیں ہے ـــــ" گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "اب چلو، میری نماز کا وقت ہو گیا ـــــ یہاں تو ایک سال میں کان اذان کو ترس گئے، وہاں تو بھیا دس اذانیں ایک ساتھ کانوں میں آیا کریں تھیں ـــــ"

"دس اذانوں کا ثواب آپ کو ملتا ہوگا۔"

"ہاں اور کیا! ـــــ"

"نماز اب یہیں پڑھ لیں اماں، پھر چلیں گے ـــــ" منیر نے کہا۔

اماں نے ساتھ لائے پانی سے وضو کیا اور ایک طرف جھنڈ کے پیچھے جا نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگیں۔

"اماں نے تو فیصلہ کر لیا مگر ہمارا کیا ہو گا یار ـــــ ہم تو نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے ـــــ" منیر نے غم سے بھرے لہجے میں کہا۔

"ہر دور کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ ہمارے دادا پردادا کی نسل کے لوگ ہندوستان میں نوکری کے لئے مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کی بیویاں سسرال میں بیٹھی ساون میں ساجن کے آنے کی دعائیں مانگتی رہ جاتی تھیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم رہیں پردیس میں اور دل رہے دیس میں ـــــ"

اماں نماز پڑھ کے آئیں تو دیکھا کہ دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ منیر کسی خیال میں گم دریا کی اور تکے جا رہا ہے۔ ابھی اس کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا ـــــ انھوں نے سوچا اور دوبارہ بینچ پر ٹک گئیں ـــــ چڑیاں مسلسل انگریزی میں مختلف راگ الاپ رہی ہیں۔

"اماں! ـــــ" منیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "آپ اس پتے کو ایک دفعہ اور ڈھونڈ کر دیکھئے ـــــ ابا مرحوم کے گھر یا بینک کے کاغذات کو سنبھالئے ـــــ میں نے اُن سے بہت سنبھال کر رکھنے کو کہا تھا ـــــ"

"ہ بھیا جانے کس کا پتا ہے جس کے پیچھے تو پڑا ہوا ہے۔ میں نے ہزار ڈھونڈا، مجھے کہیں نہ ملا۔ تو بھی چلتے وقت لے کر آیا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"اماں ـــــ وہ میں نے بچپن میں اس وقت اتارا تھا جب مجھے پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اپنے خیال میں تو ٹھیک ہی

اتارا تھا مگر یہاں آ کے پتا چلا کہ غلط ہے۔ جتنے خط لکھے اسی ریمارک کے ساتھ واپس آ گئے کہ پتا صحیح نہیں ہے ——"

"تو کس لیلیٰ نار کا پتا ہے جسے بچپن سے سنبھال سنبھال کے رکھ رہے ہو؟ ——" یوسف نے چھیڑا۔

"لیلیٰ نار کا نہیں —— ایک فرشتہ خاتون کا پتا ہے ——"

"ارے آج تک اس نے مجھے نہیں بتایا۔ بس ایک پتے کے پیچھے پڑا رہتا تھا بچپن میں کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر چھپاتا پھرتا تھا ——"

"اتنی جگہ لکھا پھر بھی ان کا پتا نہ چلا ——" منیر نے دکھ سے کہا "ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ابا کو دے دیا تھا وہ بھی نہ ملا ——

"کچھ تو بتاؤ قصہ کیا ہے، اب ہم سے کیا پردہ!" یوسف نے کہا۔

"بتا دوں اماں؟" منیر نے اماں کی طرف دیکھا۔

"اب لو —— مجھے تو خود معلوم نہیں اُلٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔"

"ابھی اماں نے بتایا تھا کہ ہمارے ہاں حیدر آباد سے پھول آتے تھے اور گھر میں گوندھے جاتے تھے۔ میں چھوٹا سا تھا تو کاروں میں بیٹھنے والیوں کے ہاتھوں گجرے اور کنگن بیچا کرتا تھا۔ ایک دن ایک دبلی پتلی بیگم صاحبہ نے بڑے پیار سے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو کہنے لگیں۔ عدنان نام تو بہت اچھا ہے، پھر بڑی ہمدردی سے بولیں۔ اسکول جاتے ہو؟ —— میں نے بڑے اعتماد سے کہا "نہیں"، تو مسکرائیں اور بڑی اپنائیت سے کار کی کھڑکی پر جھک کر کہنے لگیں —— "تو کیا ساری عمر اسی طرح سڑکوں پر خوار ہو گے بیوی بچے ہوں گے تو انھیں کہاں سے کھلاؤ گے، ان پیسوں میں تو گزارہ نہیں ہو گا، اسکول میں پڑھو، لائق بنو ——" "پیسے نہیں ہیں" میں نے پڑھا پڑھایا، رٹا رٹایا فقرہ دہرا دیا۔ "پیسے کسی کے پاس نہیں ہوتے ——" وہ بولیں —— "پیسے تو پیدا کرنے پڑتے ہیں —— بات سنو، تمہیں ذرا جم کر لڑنا ہو گا —— ماں باپ سے آج ہی جا کر کہنا کہ میں تو ہر حالت میں پڑھوں گا —— —— آئس کریم اور چاٹ نہ کھانا، پیسے جمع کرنا۔ پڑھائی تو مفت ہے، قلم دوات اور صاف ستھرے کپڑوں کے لئے شام کو پھول بھی بیچنا مگر ایک بات یاد رکھنا بھیک نہ مانگنا —— پھول لئے بغیر کوئی پیسے دے تو نہ لینا —— اور پڑھائی نہ چھوڑنا —— میٹرک تک پڑھ لو تو مجھے خط لکھنا میں تمہیں امریکہ بلوا لوں گی —— مگر میٹرک تک تمہیں خود پڑھنا ہو گا —— یہ لو میرا پتا —— انھوں نے ایک کاغذ پر پتا لکھ کر دیا —— سنبھال کے رکھنا —— اماں ابا کو بھی دے دینا اور دو چار جگہ نقل کر کے رکھ لینا ——"

"اچھا تو یوں ایک دم تجھے پڑھنے کی چاٹ لگی۔ پھر تو میٹرک پر تو نہ رکا بس پڑھتا ہی چلا گیا ——"

"ہاں اماں —— شاید یہی وہ چاہتی تھیں۔ پیسے تو ہزاروں نے دیئے تھے، حوصلہ صرف انھوں نے دیا تھا —— میں سوچتا ہوں میں اس گمنام ہستی کا قرضدار ہوں، وہ اب تک ملی نہیں ہیں مگر ہر کامیابی پر دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شاید کسی دن ان کا پتا مل جائے تو ان کے گھر جاؤں گا اور زبانی شکریہ ادا کروں گا۔"

"اچھا گھر جا کر ایک دفعہ اور ڈھونڈوں گی۔ انھوں نے تو ہم سب پر احسان کیا —— نہ تو پڑھتا، نہ مٹھی بھر بھر روپے بھیجتا، نہ چھوٹے بہن بھائی پڑھتے، نہ گھر بنتا —— اللہ اس نیک بخت کو خوش رکھے —— مگر اب ان کی بیوی بچوں والی بات پر بھی تو دھیان دے ——"

"ارے نہیں اماں، اب عمر نہیں، چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں، کتنے بھتیجے بھانجے ہو گئے۔ اماں آپ چلی جائیں گی تو یہاں کے پودوں کا کیا ہو گا، یہ جو آپ نے میرے سینکڑوں ڈالر کھپا دیئے ——" منیر نے موضوع بدلا۔

"تم دیکھنا بھالنا ___ ان پودوں کی اٹھا دھری بھی میرے بس کی نہ ہے ___"

"نہیں بھئی مجھے کچھ معلوم نہیں، اور میرے پاس وقت کہاں ہے؟ سب جل جائیں گے ___"

"جل جانے دو ___ پلاسٹک کے لاکر لگا لینا ___ یہاں تو اتنے اچھے ملے ہیں، پتہ بھی نہ چلے کہ اصلی ہیں یا نقلی ہیں۔ آؤ اب چلیں ___"

پندرہ دن بعد اماں کے ہاتھ پر ٹکٹ رکھا تو وہ اپنا سامان ایک ایک کر کے پہلے ہی باندھ چکی تھیں۔ بہو بیٹیوں کے لئے مصنوعی زیورات، بیٹوں کے لئے شوخ رنگ کی ٹائیاں، پوتے نواسوں کے بیٹری سے چلنے والے طرح بہ طرح کھلونے۔ اس دن وہ ایک ایک کا نام لے کر سوغاتیں گنواتی رہیں "منا اب اسکول جانے لگا ہوگا۔ ندی پاؤں پاؤں چلنے لگا ہوگا، شازی دانت نکال رہی ہوگی ___"

"تو ___ یوں کہیئے نا، آپ ان کی خاطر جا رہی ہیں، اتنے دن سے اپنے پودوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ آم پپیتے، گلاب چمپا، چنبیلی ___" منیر ہنسا۔

"اور ہرا دھنیہ ___" یوسف نے گرہ لگائی۔

"ارے بے وقوفو ___ وہ چمپا چنبیلی ہو یا پوتے نواسے ہوں، یہ بھی تو میری پھلواری ہی ہے ___" اماں نے زور دے کر کہا "مگر تم کہاں سمجھو گے ان باتوں کو ___"

"نہیں اماں میں سمجھتا ہوں، بلکہ میں خود پھلواری لگا رہا ہوں آپ کی طرح کی ___"

"ارے ہٹ، شادی کرتا نہیں تو کیا لگائے گا پھلواری ___"

"میں ایک بچہ گود لے رہا ہوں ___"

"ہیں! سچ مچ! ___" مارے حیرت کے اماں کی آنکھیں پھٹ گئیں، "کہاں ہے وہ بچہ؟ ___"

"دنیا میں کسی نہ کسی جگہ ہے، آپ ٹیلی ویژن میں اشتہار دیکھتی ہیں نا۔ بس ایسا ہی بچہ گود لوں گا ___ ہر ماہ کچھ پیسے دینے ہوں گے وہ بچہ لکھے گا، پڑھے گا ___ میرے پاس اس کی تصویریں آئیں گی۔ رپورٹ کارڈ آیا کرے گا، میں اسے اپنی تصویریں اور خط بھیجوں گا۔ اگر خدا نے توفیق دی تو کبھی اسے اپنے پاس بلوا لوں گا، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"نیک خیال ہے بھیا اور کیا کہوں ___ اپنے ملک کا کوئی بچہ پال لو ___"

"انگریزی کی مثل ہے تائی اماں کہ خیرات اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے ___"

"اماں، بات یہ ہے اور شکر کی بات ہے کہ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں اپنے ملک کا نام نہیں ہے۔ میں نے بنگلہ دیش کا ایک بچہ گود لیا ہے۔ میں نے اپنی درخواست میں ایک نوٹ لکھ دیا تھا کہ اس بچے کا تعلق پھولوں سے ہو تو بہتر ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس بچے کا باپ مالی تھا، سرکٹ ہاؤس کے پودوں کی دیکھ ریکھ میں مٹی ہو گیا، دیکھیئے یہ اس کی تصویر ہے ___"

اماں نے ہاتھ میں تصویر لے کر غور سے دیکھی "ہاں ذہین معلوم دے ہے ___"

"اماں، جس طرح دیا سے دیا جلتا ہے اسی طرح پھلواری سے پھلواری بڑھتی ہے۔ میں نے بہت پہلے یہ سوچ لیا تھا کہ میری محسن مجھے ملیں نہ ملیں کسی ایک بچے کو حوصلہ دینا یا کامیابی کا راستہ بتانا مجھ پر فرض ہے۔"

"ہاں، کیوں نہیں ___ خدا کرے تیری لگائی ہوئی پھلواری بھی خوب پھلے پھولے" ___ کہتے کہتے اماں کی آواز رندھ گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

متبادل

رام لال

روی گپتا صبح جاگا تو اس کی یادداشت میں اپنی گلی کا وہ منظر پوری طرح موجود تھا جو اُس نے اس جگہ تیس سال باہر گزار کر لوٹنے کے بعد دیکھا تھا۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے یاد کیا ـــــ مہاتما بدھ مارگ اور امین آباد روڈ کے درمیانی محلے کے بیچوں بیچ بنی ہوئی چھوٹی سی سڑک پر دونوں اور لکڑی کے بے شمار اسٹال کھڑے کیے جا چکے ہیں، جن میں کتابوں، کپڑے دھونے والا صابن، ویلڈنگ، درزی، بسکٹ ڈبل روٹی، پان سگریٹ، حلوائی، گھڑی ساز، بیٹری کا ڈسپوزل کا سامان، کمبل، تھیلے، پانی کی بوتلیں وغیرہ بیچنے والوں اور کرائے پر گھٹیا قسم کے ناول چلانے والوں کی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ اُن کے مکان کی باؤنڈری وال کے آگے بھی پانچ دکانیں ہیں۔ یہی غنیمت ہے کہ اُن کا چھوٹا سا گیٹ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اُن کے گیٹ کے دائیں طرف ایک چائے کا اسٹال بھی لگا ہوا ہے۔

چائے کے اسٹال کی یاد آتے ہی اُسے مارننگ ٹی کی طلب محسوس ہوئی اور یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے کل شام کو اسی اسٹال سے چائے منگائی تھی۔

اس نے سر گھما کر ساتھ لگے ہوئے پلنگ کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے ہی اُٹھ کر نہانے دھونے اور پوجا پاٹھ میں مصروف ہو گئی ہو۔ اُس نے کان لگا کر باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز تو سننے کی کوشش کی لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور اس نے وندنا کو بھی یاد کیا جو اُن کے ساتھ اورنگ آباد سے آئی تھی۔ اُسے کل رات کو سونے کے لیے ساتھ کا دوسرا چھوٹا کمرہ دے دیا گیا تھا بلکہ اس نے خود ہی اپنے لیے وہی کمرہ پسند کیا تھا۔ وہ بھی صبح بہت جلدی اُٹھ جانے کی عادی تھی۔ وہ اپنا تھیسس مکمل کر کے ان دنوں اُسے ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے وندنا کو ایک خوبصورت ٹائپ رائٹر لے دیا تھا، لیکن اُسے یاد آیا، ابھی تو ٹائپ رائٹر بکسے میں بند تھا۔ اسے کھولا ہی کب گیا تھا۔ سارا سامان نئے سرے سے ترتیب دے دیا جائے تب زندگی اپنے معمول پر آئے گی، یا نئے معمول کے مطابق شروع ہو گی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وندنا پیٹھ پر تازہ دُھلے ہوئے بال بکھیرے اور دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

”گڈ مارننگ انکل!“

اورنگ آباد میں اُن کا صبح کا یہی معمول تھا۔ وندنا ہی آ کر اُسے نئی صبح کی نیک خواہشات پیش کرتی تھی اور خود ہی چائے بنا کر لے آتی تھی ـــــ البتہ ناشتہ بنانے کی ذمہ داری رامیشوری نے اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ سالہا سال سے، جب سے وہ دو سے تین ہو گئے تھے، ایک ہی ٹیبل پر ٹھیک آٹھ بجے مل کر ناشتہ کرتے تھے۔

”آج گیس سیلنڈر مل جائے گا۔ اوپر والے صاحب نے وعدہ کیا ہے اور ان کی بیوی نے کام چلانے کے لیے اسٹو اور مٹی کا

تیل بھی دے دیا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد رامیشوری بھی آ گئی۔ پچپن سال کی ڈھلی ہوئی عورت۔ اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے۔ سو سو کے۔ آتے ہی پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ بولی ـــــ "مسز علی نے تین ماہ کا کرایہ دے دیا ہے کہتی تھی چیک سے اس لیے نہیں بھجوایا تھا کہ ہمارے آنے کی خبر تھی۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر روی گپتا نے اپنے مکان کی سڑک کا ایک چکر لگایا۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ وہ کتنی دیر تک فتح گنج کراسنگ پر کھڑا رہا۔ تجارتی مرکز کی طرف جانے والی آدمیوں سے لدی ہوئی بے شمار رکشائیں تھیں۔ اِدھر سے آنے والوں کی بھی۔ ہر طرف آبادی ہی آبادی تھی۔ صبح ہوتے ہی دفتروں میں پہنچنے والے بھی جلدی میں تھے۔ سائیکل سوار اور اسکوٹر سوار۔ اسی سڑک پر ایک سبزی کی اور ایک اناج کی منڈی بھی تھی۔ درمیان میں کوئی ٹھیلا پھنس گیا تھا۔ رکشے والے چیخ رہے تھے۔ پیدل جانے والے بیچ بیچ میں سے راستہ پا کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دکاندار نے اپنی دکان کا شٹر کھول کر اسے اوپر سرکاتے ہوئے بتایا ـــــ "یہاں برسوں سے ٹریفک کا یہی رونا ہے۔ دن میں پچاس بار ٹریفک جام ہوتا ہے۔"

کتنے برسوں سے! روی گپتا نے اندازہ لگایا۔ وہ یہاں تیس برس کے بعد لوٹا ہے۔ تب تو ایسی بھیڑ نہیں رہتی تھی۔ اُسے وہ زمانہ یاد تھا جب اُس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ وہ کئی روز تک یہاں مقیم رہا تھا۔ پھر والدہ کو ساتھ لے کر لوٹ گیا تھا۔ مکان کے دونوں حصے کرائے داروں کے حوالے کر کے۔ درمیان میں دو دو تین تین سال کے بعد ایک آدھ روز کے لیے اس لیے آیا تھا کہ مکان کی مرمت وغیرہ کرانی پڑ گئی تھی اور دو بار کرائے دار بدل گئے تھے۔

اس نے اسی دکان سے ٹوتھ پیسٹ، شیونگ، بسکٹوں کے دو پیکیٹ، انڈے اور اسکوائش کی دو بوتلیں خریدیں اور اسے اپنا تعارف دیا اور یہ بھی پوچھا کہ اس کے مکان کے آگے لگے ہوئے لکڑی کے اسٹال کیسے ہٹائے جا سکیں گے۔

دکاندار جو مغربی پنجاب کا باشندہ تھا، آزادی کے بعد وہاں آ کر بس گیا تھا۔ بولا "بہت مشکل ہے جناب عالی۔ کئی سال تک مقدمے بازی کرنی پڑے گی۔ پھر بھی جگہ خالی نہیں کرا پاؤ گے۔ قانون سے زیادہ قانون کے خلاف لڑنے والوں کے ہاتھ لمبے ہو گئے ہیں اب تو! میرے تھڑے پر بیٹھے ہوئے پان بیڑی والے کو دیکھ رہے ہو! یہ چار فٹ کی جگہ خالی کرانے کے لیے مجھے چار سال تک خوار ہونا پڑا۔ چار ہزار روپے بھی وکیلوں کی جیبوں میں پہنچ گئے۔ پر وہ بندہ وہیں کا وہیں موجود ہے۔"

"اگر میں اپنی باؤنڈری کے اندر اندر پانچ چھ نئی پکی دکانیں بنا لوں تب تو اسٹال والے آگے بیٹھنے کا حق کھو بیٹھیں گے۔"

"کیسی بات کرتے ہو جناب عالی۔ تب تو اُن کے وارے نیارے نہیں ہو جائیں گے؟ اگر جگہ چھوڑ بھی دیں گے تو خاصی لمبی پگڑی لے کر۔ بہت سے ناجائز قبضہ کرنے والوں نے تو یہی دھندہ اپنا رکھا ہے۔"

وہ دل ہی دل میں جز بز سا ہوتا ہوا اپنے مکان پر واپس آیا۔ ایک طویل مدت سرکاری سروس کرتے کرتے گزار دی تھی۔ لوگوں کے بزنس کے گر بالکل نہیں جانتا تھا۔ کچھ روز کے بعد اس نے ایک دن وندنا سے ایک لیٹر ٹائپ کر دینے کو کہا ـــــ جو اس نے ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے نام لکھا تھا۔ لیٹر پوسٹ کر کے وہ روزانہ اس کے چھپنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن صبح سویرے اخبار میں چھپا ہوا اپنا نام دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ وندنا سے بڑے پُرجوش لہجے میں بولا ـــــ "اب دیکھتا ہوں یہ لوگ یہاں سے کیسے نہیں ہٹیں گے۔ میرے لیٹر کا تراشا اوپر کے افسروں تک پہنچے گا تو وہ فوراً حرکت میں آ جائیں گے۔ کوئی معمولی بات تھوڑی ہے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لینا!"

وندنا بولی ـــــ "لیکن وہ لوگ تو کارپوریشن کی زمین پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، وہ کارپوریشن کی زمین بھی ـــــ پر کارپوریشن کس کی ہے؟ وہ بھی شہریوں کی ملکیت ہے۔ اس طرح تو ہر شخص کو حق ملنا چاہیے وہ جہاں

چاہے قبضہ کر کے بیٹھ جائے۔"

وندنا بولی "کارپوریشن کو بھی قانون کا سہارا لینا پڑے گا اور آپ ہی کہتے ہیں، قانون بہت ڈھیلا ہے۔ لڑتے لڑتے کئی برس لگ جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے! کوئی کارروائی تو شروع ہو، یہاں تو کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا۔"

"کیسے کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کارپوریشن والے سڑک کے کنارے کنارے بیٹھے ہوئے سارے دکانداروں سے اپنا ماہانہ وصول کر کے لے جاتے ہیں یعنی جن کو آپ قانون شکنی کے لیے متوجہ کر رہے ہیں وہ خود دھاندلی کے حصے دار بنے ہوئے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے وندنا اس مسئلے کے سارے پہلوؤں سے واقف ہو چکی تھی۔ یوں بھی وہ بے حد ذہین تھی۔ اس کے ساتھ کئی موضوعات پر بحث کرنے میں روی گپتا کو خاصا لطف حاصل ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ خود ہی کوئی بحث چھیڑ بیٹھتی تھی۔ اُسے بھی اس گھر میں روی گپتا ہی کی وجہ سے بڑی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔

کئی سال پہلے اورنگ آباد میں جب مراٹھواڑہ یونیورسٹی کا نام بدل کر اُسے بی۔ آر۔ امبیڈکر سے موسوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہاں ہریجنوں اور شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کے خلاف بڑے خونریز فسادات برپا ہو گئے تھے۔ اُن کی کئی بستیاں جلا دی گئیں تھیں اور کتنے لوگوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ وندنا اسی زمانے میں اُن کی پناہ میں آگئی تھی۔ اس کے ماں باپ دونوں مار ڈالے گئے تھے۔ اس کا باپ روی گپتا کے دفتر میں چپراسی تھا جو اُسے ایک ہائی اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ گپتا نے نہ صرف اس کی تعلیم جاری رکھی بلکہ اس کی تربیت میں بھی خاصی دلچسپی لی۔ وہ اپنی کلاس میں سب سے ذہین لڑکی تھی۔ ہر امتحان میں فرسٹ آتی تھی اور یہ بات ان لوگوں کے اس نظریے کو غلط ثابت کر رہی تھی جو کہتے تھے کہ شیڈولڈ کاسٹ والے بڑے کند ذہن ہوتے ہیں۔ وندنا پی ایچ۔ ڈی کرے گی تو پورے ملک میں وہ ایسا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی شیڈولڈ کاسٹ لڑکی ہوگی لیکن اُن کے ساتھ رہتے رہتے اُس کی ذات پر ایک پردہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ ان ہی کے خاندان کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ لوگ بھی یہی سمجھتے تھے۔ وندنا بھی خود کو ذہنی طور پر اسی گھر کا ایک فرد سمجھنے لگی تھی۔

کئی ہفتوں تک جب کارپوریشن کے حکام نے روی گپتا کے مکان کے سامنے سے ناجائز قبضہ داروں کو ہٹانے کے سلسلے میں کچھ نہ کیا تو ایک روز وندنا اور وہ کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر سے جا کر ملے۔ اس نے اخبار میں چھپے ہوئے اس خط کے بارے میں بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے بتایا کہ اس وقت اس کی فائل پر پورے شہر میں دس ہزار سے زائد ناجائز قبضوں کے بارے میں، علامات موجود ہیں۔ قانون کے مطابق کارروائی ہوتی ہی رہتی ہے لیکن اس میں بڑا وقت لگتا ہے۔ شہریوں کو خود ذمہ دار ثابت ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس شہر میں شہری سطح پر اس کی یہ پہلی شکست تھی۔ اُس کی افسردگی میں وندنا بھی شریک تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرے!

وہ اگر اپنے مکان کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ پانچ دکانیں بنا لیتا تو ان کے اوپر بھی ایک شاندار فلیٹ بنایا جا سکتا تھا اور اس کے باوجود ان کے لیے خاصی بڑی زمین بچ رہتی تھی۔ ان دکانوں اور فلیٹوں سے ملنے والے کرائے سے اُن کی زندگی بڑے مزے سے گزر سکتی تھی۔ اگرچہ اُس کی پنشن اور دو تین فکسڈ ڈپازٹس کی رقمیں کم نہیں تھیں لیکن سروس سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد جیسے اس کے اندر زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی حرص بڑھ گئی تھی۔ ایک مدت تک وہ دفتری فائلوں میں کھویا رہا تھا۔ اُن سے نجات پا کر اس کے ہاتھ یہ نیا مشغلہ لگ گیا تھا۔

اس کے علاوہ بھی اس کے کچھ مشاغل تھے جو اُسے بیکار نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ دن میں ایک دو گھنٹے کے لیے وہ وندنا کے ٹائپ شدہ مسودوں پر نظرِ ثانی تو کر ہی لیتا تھا صبح سویرے وندنا کو ساتھ لے کر مارننگ واک کے لیے بھی نکل جاتا تھا۔ اگرچہ گنجان آبادیوں سے نکل کر کھلی سڑکوں پر پہنچنے کے لیے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ ایک دن اسی طرح ٹہلتے ٹہلتے اُسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس نے اپنے

محلے کے پورے علاقے کا کئی روز کی محنت کے بعد نقشہ تیار کیا۔ چھوٹی اور بڑی بڑی گلیاں اور سڑکیں اور مکانوں کے سلسلے دکھائے۔ اس طرح اُس کے سامنے پورا کا پورا محلہ پھر سے آموجود ہوا۔ لوگوں سمیت وہ انہیں اسی طرح چلتا ہوا، رینگتا ہوا اور ایک دوسرے سے جھگڑتا ہوا محسوس کرنے لگا اور وندنا کو بلا کر بتانے لگا —— "ہماری سوسائٹی اپنی ساری برائیوں سمیت اس شیٹ پر اُتر آئی ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس بیماری کی جڑ کہاں ہے؟ آبادی کی کثرت اور غلط منصوبوں نے ہمیں ذہنی طور پر کیوں مفلوج کر رکھا ہے —— اس کے لیے ہم ہی تو ذمہ دار ہیں۔ اپنے مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر انھیں دور بھی کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" وندنا نے نقشے پر جھکتے جھکتے پوچھا۔

"اس طرح" یہ کہہ کر اُس نے ایک سرخ پنسل سے اس نقشے کی از سرِ نو ترتیب دی۔ کچھ گلیوں اور سڑکوں کو چوڑا کر دیا اور کہا —— "یہاں یہاں یہ سارے مکان گرا دیئے جائیں گے اور یہاں جتنے اسٹور یڈ مکان ہیں انھیں بھی گرا کر کئی کئی اسٹوری کی بلڈنگ بنا دیا جائے گا اور اس سبزی منڈی اور اناج منڈی کو شہر کے باہر کسی دوسری جگہ پر شفٹ کر دیا جائے گا تاکہ یہاں خریداری کرنے کے لیے آنے والے ہزاروں لوگ ان سڑکوں پر آئیں ہی نہیں۔ اس طرح سڑکوں پر جو اکثر ٹریفک جام ہو جاتا ہے، پھر کبھی نہیں ہوگا۔"

وندنا اپنی ہنسی روک کر بولی "پھر؟"

"پھر کیا! —— اس محلے کو صرف ایک بار گرا دینے کی دیر ہے۔ سارے پرابلم حل ہو جائیں گے۔ تم نے دیکھا ہے ناکہ ہمارے محلے میں ایک بھی پارک نہیں ہے۔ بچے بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں پر اور گلیوں میں کھیلتے ہیں اور آئے دن ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ سب کیا آپ کر سکتے ہیں؟" وندنا نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہیں! میں اتھارٹیز کو لیٹر بھیجوں گا۔ اپنا پورا پلان بھیجوں گا۔ ان سے جا کر ملوں گا۔ تم بھی میرے ساتھ رہنا۔ ہم دونوں مل کر انھیں سمجھائیں گے۔"

روی گپتا کئی روز تک ایک اور نقشہ بھی تیار کرنے میں لگا رہا جس میں کھلی کھلی سڑکیں تھیں، پارک تھے، کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا ایک ویران اور سنسان جگہ پر ہی ایک بالکل نیا شہر تعمیر کیا جانے والا ہے جس کی تمام تر ذمہ داری صرف اسی کو سونپ دی گئی ہے۔

ایک روز وہ صبح سویرے اپنی بیوی کو خوشی خوشی اپنے پلان کے بارے میں تفصیل سے سمجھا رہا تھا اور اُسے یہ باور کرا رہا تھا کہ ہماری بہت سی مشکلات اسی ذریعے سے حل ہو جائیں گی کہ اچانک وندنا باہر سے تازہ اخبار اٹھا کر لے آئی اور ایک صفحے پر چھپی ہوئی خبر سناتی ہوئی بولی —— "دیکھئے انکل! ابھی آپ نے اپنا پلان بھیجا بھی نہیں کہ کارپوریشن نے خود ہی ایک ایسا پلان بنا لیا ہے۔ ہمارے ہی محلے کی شکل وصورت بدل دینے کا۔"

روی جلدی جلدی وہ خبر پڑھنے لگا جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی چھپا ہوا تھا۔ اس نقشے میں کچھ مکانوں کو اپنے قبضے میں لے کر کارپوریشن نے ایک بڑا پارک بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ بھی اعلان کیا تھا کہ جن کے مکان قبضے میں لیے جائیں گے انھیں شہر کے باہر ان کے معاوضے میں آدھا دس دس کے مکان دے دیئے جائیں گے —— اسی نقشے میں روی گپتا کا بھی مکان آگیا تھا۔

وہ سناٹے میں آگیا۔ کئی لمحوں تک بالکل بول ہی نہ سکا۔ وندنا اور راجیشوری حیرت سے اس کی طرف تک رہی تھیں —— روی گپتا نے اپنی خاموشی سے نکلتے ہوئے کہا —— "صرف چند مکانوں کو گرا دینے سے کیا ہوگا۔ میرا پلان تو سارے محلے کو گرا کر نئے سرے سے بنانے کا تھا۔ میں بھی اپنا نقشہ لے کر ایڈمنسٹریٹر کے پاس جاتا ہوں۔ نہیں مانے گا تو پھر ہمیں نئی جگہ جانا ہی پڑے گا اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔"

اعتراف

ام عمارہ

سردیاں ختم ہو رہی تھیں، بہار کی آمد آمد تھی۔ گھر سے لے کر باہر تک سبزہ رنگ بدل رہا تھا۔ فضا میں نغمگی بکھر رہی تھی۔ زندگی کا حسن نکھر رہا تھا اور موت کو شکست ہو رہی تھی۔ موت کی بھی موت آجائے گی، جاوید نے ہمک کے سوچا اور قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ کیا نظام قدرت ہے! خزاں کی کوکھ سے بہار جنم لیتی ہے۔ موت نہ ہوتی تو زندگی اپنا حسن کھو دیتی۔ غم نہ ہو تو خوشیاں بے جان ہو کر رہ جائیں۔ جاوید نے مسکرا کے قلم ہاتھ میں پکڑ لیا۔

وہ پچھلی گرمیوں میں اپنے ہی ملک کا دورہ کرتا رہا تھا اور یہ سوچتا رہا تھا کہ اپنے ملک میں کیا کچھ ہے اور ہم میں سے کتنے لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس چند پیسے ہوں تو ہم ممالک غیر کی طرف بھاگتے ہیں مگر کیوں ۔۔۔؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ صرف اس لیے کہ لوگوں پر رعب ڈالا جا سکے کہ ہم لندن اور امریکہ گئے تھے۔ ہم نے سارا یورپ دیکھا ہے۔ ورنہ یہاں ہماری اپنی دنیا میں کیا نہیں ہے، زندگی کا حسن، اس کی لطافتیں، رنگینی، برف پوش پہاڑیاں اور بیابان جیسی وادیاں جیسے لالہ زار جیسے شوگراں ۔۔۔ جیسے ۔۔۔ جیسے ۔۔۔!

جاوید آہستہ آہستہ اپنا احتساب کر رہا تھا۔ اس کی عجیب طبیعت تھی۔ قدرت کی بخشی ہوئی رنگینی اور زندگی کی لطافتیں اسے خوشی بخشتی تھیں لیکن جب زیادہ خوشی ملتی تھی تو وہ اداس ہو جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں اور بڑی سے بڑی بات اس کے لیے اپنی اہمیت کھو دیتی تھی۔

جاوید اپنے آپ کو سنبھال سنبھال کے رکھتا تھا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں تھا جو تیزی سے آگے بڑھتے ہیں اور سمندر کی موج بن کے شکست و ریخت کا سبب بنتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ایک ایک لمحے کا حساب رکھتے ہیں۔ گفتگو کرتے وقت اپنے لب و لہجے کی نرمی اور کرختگی کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ الفاظ سے کھیلتے ہیں بلکہ الفاظ کے حسن اور اس کے اثر کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں اور لمحات کو الفاظ میں باندھ کے رکھ دیتے ہیں۔

جاوید دو دن ہوئے شمالی علاقے سے لوٹا تھا۔ سرخ و سفید چہرے پر برف کی جلتی ہوئی ہواؤں اپنے داغ چھوڑ گئی تھیں اور ہونٹ اس قدر خشک ہو رہے تھے جیسے لکڑی کا برادہ ان پر چھڑک دیا گیا ہو۔

اپنے گرم و آرام دہ بستر میں بیٹھا وہ کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن الفاظ قابو میں نہیں آ رہے تھے اور وہ حیران و پریشان ہوا جا رہا تھا۔

بات یہ تھی کہ جب بھی کچھ لکھنے کی کوشش کرتا دو خوبصورت چمکیلے پاؤں اس کے حواس پر چھا جاتے۔ چمکتے ہوئے پاؤں، برفیلی زمین پر کھردرے کیوں نہیں ہوئے۔ اس نے اپنے پیروں پر ہاتھ پھیرا، مگر وہاں یہ بڑی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔

اس نے گھبرا کے اپنی آنکھیں ملیں جو برفیلے علاقے میں رہنے کی وجہ سے سوج رہی تھیں۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ وہ تو میدانی علاقے کا رہنے والا ہے۔ ہوائیں وہاں نہیں کاٹتی ہیں۔ پانی برف نہیں بنتا ہے۔ زمین گیلی نہیں ہوتی۔ پہاڑ برف پوش نہیں ہوتے۔ پھر بھی اس کے اپنے پاؤں میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں ـــــ مگر اسے اس کا کہاں پتہ تھا کہ جن کے پاؤں میں دراڑیں نہ ہوں ان کی قسمت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔

اور ناران کی برف پوش وادیوں میں گھومتے ہوئے اس نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس علاقے میں اخروٹ کی تلخی کونین کی تلخی بن جاتی ہے اور گندم کی روٹی کا مزہ شکر کی مٹھاس سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ اور وہ منا سا بچہ جو ملائشیا کا سوٹ پہنے، کاندھے پر بستہ ڈالے، ننگے پاؤں بھیگی زمین پر کھڑا تھا، اس کے ساتھی لڑکے آہستہ آہستہ وادی میں اتر رہے تھے کیونکہ ان کا اسکول اس وادی میں تھا جہاں مولوی پتوں کی بنی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھا بچوں کو علم سکھانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ مولوی بے چارہ صرف مولوی نہیں بلکہ پیش امام بھی تھا، اور پیش امام ہی نہیں بلکہ سارے گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں جو مسجدیں تھیں ان کا امام بھی تھا۔

وہ لوگوں سے ہمیشہ کہا کرتا ـــــ "اے لوگو کسی کا دل نہ دکھاؤ کہ ہر دل خدا کا گھر ہے۔"

جاوید نے نیچے جھک کر وادی میں دیکھا۔ مولوی کا مدرسہ ـــــــــ ایک کھلے میدان کی شکل میں تھا۔ ایک طرف ایک کمرہ تھا جہاں مولوی رہا کرتا تھا۔ اس سے جڑا دوسرا کمرہ تھا جس کی حیثیت مسجد کی تھی۔ سامنے مکی کے کھیت تھے۔ آلو بخارے اور بیٹنگ کے پودے تھے۔ سیب کے سبز اور سرخ چہرے پتوں سے جھانک رہے تھے۔ بچے ایک ایک کر کے وادی میں اترتے چلے جا رہے تھے لیکن وہ منا سا لڑکا دونوں ہاتھوں میں اپنا بستہ سنبھالے کھڑا تھا اور اس کی کانچ جیسی چمکیلی ایڑیاں اس کے دل میں کھبی جا رہی تھیں ـــــ شفاف، خوبصورت اور گلابی گلابی ہیرے ـــــ!

جاوید نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا۔ چمکیلی آنکھوں سے ذہانت جھانک رہی تھی۔ "تم گئے نہیں اسکول؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے نیچے اترتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں ڈر لگتا ہے؟"

"بس لگتا ہے ڈر۔"

"مگر کیوں؟ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ۔۔؟"

"ہوں جی۔"

"تم روز پڑھنے نہیں جاتے؟"

"بالکل نہیں جاتا میں پڑھنے کے لیے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ منشی کو پڑھانا نہیں آتا۔ اور پھر نیچے وادی میں جادوگرنیاں رہتی ہیں جو بچوں کے کلیجے نکال کے کھا جاتی

ہیں۔ اس لیے میں بالکل نہیں جاؤں گا وہاں۔" منا اپنا بستہ زمین پر رکھ کے اس پر بیٹھ گیا۔ اس کے ننھے منے شفاف پیر سردی کی شدت سے ایسے سرخ ہو رہے تھے کہ خون اب ٹپکا کہ تب ٹپکا۔

"پھر تم یہاں کیا کر رہے تھے۔ جاؤ اپنے گھر۔"

"میں اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ماں مارے گی۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے پڑھ لکھ کے کم از کم منشی تو ہونا ہی چاہیئے۔"

"اچھا!"

"ہاں جی میری ماں کو بڑا ارمان ہے کہ میں پڑھ لکھ کے منشی بن جاؤں۔"

"پھر بن کیوں نہیں جاتے منشی؟ دو چار کتابیں پڑھ لو۔ قرآن تم کو آتا ہی ہوگا۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"میں اگلی سردیوں میں نو سال کا ہو جاؤں گا۔ اور ــــ اور قرآن تو میری ماں نے کب کا مجھے پڑھا دیا ہے۔"

"واہ" جاوید نے حیرت سے منے کو دیکھا۔

"ہاں جی اور مجھے بہت ساری سورتیں بھی یاد ہیں۔ مجھے آیت الکرسی بھی یاد ہے۔ سناؤں آپ کو؟" اس نے جاوید کا دامن پکڑ کے کھینچا۔

"اچھا تو تمہیں آیت الکرسی بھی آتی ہے؟"

"ہاں جی۔"

"تو پڑھو۔"

منا آیت الکرسی پڑھنے لگا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" وہ آیت الکرسی پڑھتے پڑھتے رک گیا۔

"نیچے وادی میں منشی کے مدرسے، وہاں تمہیں وہ کتابیں پڑھنی ہیں جن میں علم ہے۔"

"پر مجھے ڈر لگتا ہے نیچے وادی میں جادوگرنیاں رہتی ہیں۔ اوپر جھیل سیف الملوک اور بابو سر پاس ہے اور وہاں سے جو پانی آتا ہے اس میں دیو جھنکھاڑتے ہوتے ہیں اور وہ سارا پانی نیچے وادی میں کنہار کے نام سے بہتا ہے اور جادوگرنیاں اس میں غسل کرتی ہیں ــــ اس لیے ــــ۔"

"مگر یہ سب تم سے کون کہتا ہے؟" جاوید نے بچے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔

"مجھے جی۔ مجھے یہ ساری باتیں میری دادی بتاتی ہے، اور اسی لیے میری ماں میری دادی سے بہت لڑتی ہے۔ وہ کہتی ہے دادی خود سب سے بڑی جادوگرنی ہے اور مجھے ہر وقت اپنی باتوں کے جادو میں گھیرے رکھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نکما، جان چور اور سارے زمانے کا کاہل ہو گیا ہوں اور کسی ــــ۔"

"کیا کسی؟" جاوید نے غور سے بچے کے بھولے بھولے چہرے کو دیکھا ــــ سرخ چہرہ جس سے خون اب ٹپکا اور تب ٹپکا۔

"کچھ نہیں جی، وہ میری ماں کہتی ہے کہ میں کسی کام جوگا نہیں رہا۔"

"پھر بھی یہ تو بڑی بری بات ہے۔ تیری ماں تجھے منشی بنانا چاہتی ہے، اور تو پڑھنے نہیں جاتا۔ چل میں تجھے چھوڑ آتا ہوں۔" جاوید نے منے کو پیار سے تھپکا اور بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔

"نہیں جی میں نہیں جاؤں گا۔ میں کبھی بھی منشی کے پاس نہیں جاتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ بس۔ ابھی لڑکے واپس آجاتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ لوٹ جاؤں گا۔" لڑکے نے اپنا بستہ کاندھے پر رکھ لیا۔

"دیکھو بھئی منے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے یا کیا کہنے لگا ہے۔ بس یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تیری ماں تجھے پڑھانا چاہتی ہے۔" جاوید نے منے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میری ماں تو مجھے منشی بنانا چاہتی ہے۔"

"اس مدرسے کے منشی جیسا منشی۔" جاوید نے کہا۔

"نہیں جی یہ تو مسکین غریب منشی ہے ——— میری ماں تو سچ مچ مجھے بہت بڑا عالم بنانے کا خواب دیکھتی ہے۔ اور وہ خود بھی۔"

"وہ کون؟" اس نے بچے کو دیکھا جو اگلی سردی میں نو سال کا ہونے والا تھا۔

"وہ جی میری ماں ہے۔ میری ماں بہت پڑھی لکھی عورت ہے اور میری دادی اسے جادوگرنی کہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس نے اپنے جادو کے زور سے ہر شے کو قابو میں کر رکھا ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں اور کیا۔ مجھے اپنی دادی پر بڑا ترس آتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب میری ماں اسے مارتی ہے اور وہ کلیجہ کوٹ کوٹ کے روتی ہے ——— اور ——— میری ماں اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ دراصل یہ دونوں ہی جادوگرنیاں ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں جی۔ میری ماں دادی کو جادوگرنی کہتی ہے اور میری دادی میری ماں کو کہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میری ماں کو کالا جادو آتا ہے۔ بنگال کا کالا جادو ——— اور اسی کے زور سے اس نے میرے باپ کو قابو میں کیا تھا ———"

اس تمام عرصے میں لڑکے نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کا ذکر کیا۔ "کہاں ہے تمہارا باپ؟"

"میرا باپ، پتہ نہیں جی وہ کہاں ہے۔ میں نے تو آج تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح کبھی کبھی تھوڑے سے پیسے کہیں سے آجاتے ہیں دادی کے پاس اور اس دن دادی بڑی خوش ہوتی ہے۔ وہ میرے لیے تلوں کے لڈو بناتی ہے میری ماں کے لیے چھینٹ کا سوٹ سلوا دیتی ہے اور میری ماں ان دنوں میں میری دادی سے ذرا کم لڑتی ہے اور مجھے پڑھوانے اور عالم فاضل بنانے کے چکر میں لگ جاتی ہے۔"

"دیکھو بھئی منے میں نیچے جا رہا ہوں تیرے اسکول۔ چل تو بھی۔ منشی میرا یار ہے۔ وہ تجھے جی لگا کے پڑھا دے گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔"

جاوید نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور نیچے جانے کے راستے پر مڑ گیا۔ لڑکا بولا "بات یہ ہے جی کہ میں آپ کو جانتا بھی نہیں۔ آپ میرے لیے اجنبی ہیں اور اجنبی بڑے ذلیل اور کمینے ہوتے ہیں۔" لڑکے نے بڑے آرام سے اسے ذلیل اور کمینہ بنا دیا۔

"دیکھو بھئی لڑکے تجھے نہیں جانا ہے تو مت جا مجھے تیری اتنی سی بھی پروا نہیں ہے۔ تو میرا کیا لگتا ہے کہ مجھے ذلیل اور کمینہ بنا دیا تو نے۔" جاوید نے غصے سے اسے دیکھا۔

"آپ کا ہے کو بُرا مانتے ہیں جی۔ یہ میں تو نہیں کہہ رہا۔ یہ تو میری ماں کہتی ہے کہ کبھی اجنبی پر اعتبار نہیں کرنا۔ یہ بڑے ذلیل اور کمینے ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ لے میں چلا۔ نہ تجھے میرا اعتبار اور نہ مجھے تیرا اعتبار۔"

"او جناب، آپ کیوں بُرا مانتے ہیں دیکھیں نا آپ اور میں دونوں اجنبی ہیں ایک دوسرے کے لیے۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے ۔۔۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جاوید نے حیرت سے اس لڑکے کو دیکھا جو اگلی سردیوں میں نو سال کا ہونے والا تھا اور جس کی باتیں بڑی پکی پکی سن رسیدہ لوگوں جیسی تھیں۔

"چھوڑ میرے یار، نام میں کیا رکھا ہے۔" جاوید نے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا "ویسے میرا نام جاوید ہے۔"

"اور میں آفتاب ہوں ۔۔۔ آفتاب سورج کو کہتے ہیں نا۔ میری ماں کا خیال ہے کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو میرا نام سورج کی طرح روشن ہوگا۔ اس کی کرنیں اس وادی سے جہالت کے اندھیرے کو دور کر دیں گی ۔۔۔"

"پر تو پڑھتا تو ہے نہیں۔ تجھے تو پڑھنے سے ڈر آتا ہے۔"

"آپ بڑے بھولے ہیں جی۔ منشی کے مدرسے میں نام تو اس لیے لکھوایا ہے کہ یہاں سے پرائمری کروں گا تو ۔۔۔"

"کیسے پاس کرے گا بھائی؟"

"ایسے پاس کروں گا کہ میں اپنی ماں سے پڑھتا ہوں۔ منشی کے اسکول میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے۔ سرکاری اسکول ہے۔ سارے وقت بچوں سے پاؤں دبواتا ہے۔ تم آپ ہی دیکھ لو۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کے نیچے اترتے ہوئے لڑکے نے میدان نما اسکول کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں لڑکے اب آرام سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور دو تین، دھوپ میں لیٹے ہوئے منشی کی مٹھیاں بھر رہے تھے۔" لو خود ہی دیکھ لو۔ میری ماں تو اس کے اسکول میں مجھے صرف اس لیے بھیجتی ہے کہ میں پرائمری پاس کر لوں اور پھر نیچے جا کے کسی اچھے سے اسکول میں پڑھ سکوں۔ ورنہ یہاں تو ۔۔۔ یہاں تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ خود ہی دیکھ لو دریا کیسا شور مچا رہا ہے جیسے دیو چنگھاڑ رہے ہیں۔"

"بات یہ ہے منے کہ دریا کا پانی پتھر سے ٹکرا رہا ہے اس لیے یہ شور ہے ورنہ دریا بھلا کیسے دیو بن سکتا ہے یار۔ یہ تو پانی کا شور ہے۔"

"مگر جناب پانی کے اس شور کو میری دادی کہتی ہے کہ ۔۔۔"

"بھئی آفتاب تم دنیا کو اپنی دادی کی نظر سے مت دیکھو۔"

"پھر کس کی نظر سے دیکھوں جی، یہیں تو یہاں سے وہاں تک وہی کچھ نظر آتا ہے جو دادی دیکھتی ہے۔"

"صاحبزادے اسے تم اپنی ماں کی نظر سے دیکھو۔"

"ماں کی نظر سے؟ بھلا اس سے کیا فرق پڑ جائے گا ۔۔۔ کیا یہ پتھر۔ یہ چیڑھ۔ یہ بٹنگ کچھ اور ہو جائیں گے ۔۔۔"

لڑکے نے حیرت سے جاوید کو دیکھا اور بڑی پھرتی سے دو قدم اور نیچے اتر آیا۔

"او آفتاب میاں۔ تمہاری دادی، تمہاری دادی ہے اور اس کی آنکھیں بوڑھی ہیں اور اس کی نگاہوں میں خزاں کا رنگ ہے۔ شکست و ریخت کی کہانی ہے۔ زوال کی دھمک ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔"

"بس کر یار۔ میری دادی تو بڑی زندہ دل ہے، تجھے کیا پتہ اس کی گدلی نگاہیں پتنگ کے شگوفوں میں پریاں ناچتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ آلو کے بینگنی پھول میں اسے دھنک پھوٹتی نظر آتی ہے ــــ اور ــــ اور یہ دیو اور جادوگرنیاں تو ــــ"

"چل اب چپ کر جا منے یار ــــ دیو اور جادوگرنیوں کی رٹ میں نہیں سنتا۔ کوئی اور بات کر ــــ" جاوید نے منے کا بستہ اس کے کاندھے پر ٹھیک کیا جو بات کرنے کے جوش میں اس کے ہاتھ پر لٹک آیا تھا۔ پھر وہ منشی کے مدرسے میں پہنچ گئے۔

"منشی جی آفتاب آیا ہے" لڑکے ایک ساتھ بول اٹھے۔

"اوئے، تو پھر آگیا!" منشی نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔

"منشی جی میں خود نہیں آیا میں تو لایا گیا ہوں" آفتاب نے سیانوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کے پاؤں پھیلا دیئے۔

"اوئے حرام کے، میں نے تجھے کہا تھا کہ ــــ"

"منشی ذرا اپنی زبان سنبھال کے بات کر ورنہ تجھے پتہ ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں" آفتاب کا خون ٹپکاتا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اور جاوید نے چونک کے اس ننھے آدمی کو دیکھا جو اگلی سردیوں میں نو سال کا ہونے والا تھا اور جو کسی بلوان سورما کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے منشی کو للکار رہا تھا۔

"ارے بھئی آفتاب یار تو تو بڑا بلوان ہے۔ تجھ میں تو بڑی جان ہے۔ تو بڑی ترقی کرے گا۔ پر بھائی اپنے سے بڑوں سے ایسے گفتگو نہیں کرتے۔"

"اپنے سے بڑوں سے نہیں کرتے ہیں نا جی۔ پر منشی کو اپنے چھوٹوں سے باتیں کرنی کہاں آتی ہیں ــــ ذرا اسے دیکھو تو اس نے مجھے گالی دی ہے۔"

"اوئے میں نے تجھے کہاں گالی دی ہے۔ سارا گاؤں کہتا ہے۔"

"سارا گاؤں تو جاہل ہے۔ تو، تو منشی کہلاتا ہے۔ پھر تو گاؤں والوں کی ریس کیوں کرتا ہے" آفتاب کا چہرہ دہک اٹھا تھا

"او یار آفتاب، تو کس چکر میں پڑ گیا۔ تجھے تو سورج کی طرح روشن ہونا ہے۔ تیری کرنیں تو دور دور پھیلنی ہیں" جاوید نے آفتاب کو پیار سے تھپکا۔

"جاوید صاحب تسی مت بولو جی۔ یہ منڈا ہے گا ہی پاگل" منشی نے اپنے سر کے پٹوں پر ہاتھ پھیرا۔

"تو آپ ہو گا پاگل" آفتاب نے اچک کے منشی کے پٹے پکڑ لیے۔

"ارے کیا کرتے ہو ــــ بدتمیز" جاوید نے آفتاب کا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا تو منشی کے پٹوں سے چند بال اس کے ہاتھ میں آگئے۔

"تم اچھے بچے نہیں ہو" جاوید نے اسے جھنجھوڑا۔

"میں اچھا بچہ ہوں" وہ جاوید کے سامنے ڈٹ گیا۔

"تم بالکل اچھے بچے نہیں ہو"

"میں بالکل اچھا بچہ ہوں۔ میری ماں کہتی ہے ہم رسولؐ کی امت ہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔"

"ارے یار میرے، تیری ماں تو پڑھی لکھی ہے پر آفتاب نرمی بھی کوئی چیز ہے۔"

"ہاں جی اس کی ماں واقعتاً پڑھی لکھی ہے۔ اس سارے علاقے میں اس جیسا پڑھا لکھا اور حسین کوئی نہیں ہے" منشی نے بڑی دیانت داری سے کہا۔

"اچھا! مگر یہاں تو یہ ——" اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا جو لیشیا کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے، پھٹے ہوئے بستے میں کتابیں اٹھائے ننگے پیر کھڑا تھا جس کی ایڑیاں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں۔

"او جی جاوید صاحب، یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ اور تم اس آفتاب کی غربت پر نہ جاؤ۔ یہ بڑا کرموں والا ہے۔ اس کی ماں بڑے علم والی ہے۔ چودہ جماعتیں پاس ہے۔"

"ہائیں! اور اس وادی میں کیا کر رہی ہے وہ؟"

"اس وادی میں اس کا اپنا گھر ہے جی۔"

"لیکن اتنی پڑھی لکھی اور اتنی غربت ——؟"

"علم کا دولت سے کیا واسطہ! اہل علم اور اہل دل ہمیشہ ہی غریب ہوتے ہیں" منشی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"اوئے منشی تو پڑھا لکھا ہے؟" ننھا سا لڑکا منشی کی طرف لپکا۔

"ہاں میں پڑھا لکھا ہوں میرے سینے میں اتنا بہت سا علم ہے۔ اور پھر تیس پارے بھی ہیں اور جی اس کی ماں بڑی ہی اچھی ہے لیکن لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

"لوگ باتیں بالکل نہیں کرتے، اس جیسے شیطان کہتے ہیں" آفتاب بولا۔

"ہائیں، تو اتنا سا ہے اور اتنا بدتمیز۔ منشی بزرگ ہے۔ اس سے الجھتا ہے!"

"بات تو سمجھو نا جی۔ میں نے اپنی طرف سے تو اسے کچھ نہیں کہا۔ یہ سب کچھ تو اسے میری ماں کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے یہ ولی کے روپ میں شیطان ہے۔"

منشی کا سرخ و سفید چہرہ دہک اٹھا "ٹھہر جا اوئے سور دے ——"

"دیکھو دیکھو بھاجی، اس نے مجھے پھر گالی دی" لڑکا خوف سے آنکھیں میچ کے جاوید سے لپٹ گیا۔ "اسی لیے میں اس کے اسکول میں نہیں آتا۔ پر ماں مانتی ہی نہیں۔"

"یار آفتاب تو بھی اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے نا۔ یہ تو تیری ماں کی تعریفیں کرتا ہے اور تو اسے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔"

"میں اسے جان سے مار دوں گا ایک دن" آفتاب اچانک بلبلا کے رونے لگا "کس نے کہا ہے اسے میری ماں کی تعریفیں کرنے کو" وہ بستہ اٹھا کے اوپر کی طرف دوڑا۔ دس فٹ اوپر چٹان پر ایک پھوس عورت اسے آواز دے رہی تھی۔ وہ پلٹ کر بولا "تم جی میرے گھر ضرور آنا۔ وہ، اس بٹنگ کے درخت کے پیچھے ہمارے گھر کا دروازہ ہے۔" وہ قمیض کے دامن سے آنسو پونچھتا بڑی تیزی سے اوپر کی طرف دوڑا۔

اور جاوید اس بچے کے پاؤں دیکھ کے سوچنے لگا کہ کہیں کوئی کنکر چبھ گیا تو کیا ہوگا۔

"جاوید صاحب کیا سوچ رہے ہو جی؟" منشی نے جاوید کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے کوئی کنکر چبھ گیا تو ——"

"یہاں اس علاقے میں کنکر ونکر کا کون خیال کرتا ہے جی۔ ابھی پرسوں ہی اس کی ماں کی ایڑی میں ایک شیشہ اتر گیا تھا تو

اس پاس کی ساری زمین واں ہو گئی تھی۔

"تم نے منشی صاحب دیکھا ہے اس کی ماں کو؟"

"ہاں جی ہاں، دیکھا ہے۔"

"اچھا!" اس کا دل چاہا پوچھے "وہ کیسی ہے؟"۔۔۔ لیکن وہ چپ رہ گیا۔ وہ اس عورت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

"جاوید صاحب آؤ بیٹھ جاؤ ادھر دھوپ میں۔ کس سوچ میں گم ہو گئے۔ دیکھو کیسی اچھی دھوپ ہے۔ بس دو گھڑی میں۔۔۔"

منشی نے اپنی کوٹھری سے کرسی نکال کے رکھی اور خود چٹائی کو دھوپ میں کھینچ کے بیٹھ گیا۔۔۔ لڑکے ادھر ادھر کھیل رہے تھے اور ایک بڑا لڑکا نیچے دریا سے پانی اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ "جاؤ تم لوگوں کی چھٹی۔ اوے یعقوب پتر آج تیرے گھر سے روٹی آنی ہے پتر میرے۔ دو آدمی کی روٹی لے آنا یہ صاحب جی میرے مہمان ہیں۔"

"نہیں منشی صاحب میں نے روٹی نہیں کھانی۔ میں تو سید علی قاسم کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں، ادھر" اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ اب اس وقت نہیں جا سکتے جی۔ چھ میل فاصلہ ہے اور ادھر نہ بس آتی ہے اور نہ گاڑی۔۔۔ راستہ ہی ایسا خراب ہے۔ میں آپ کو ہر دو چار دن بعد ادھر دیکھتا ہوں۔۔۔"

"بات یہ ہے کہ۔۔۔ میں اس لڑکے کو۔۔۔ یعنی کہ اس کی باتیں، اس کا انداز مجھے یہاں آنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون ہے اور اس کا باپ۔۔۔ آپ جانتے ہیں اسے؟"

"ہاں جاوید صاحب میں اسے جانتا ہوں۔۔۔ پھر جی یہ ایک لمبی کہانی ہے اور کہانیاں دن کے اجالے میں نہیں کہی جاتیں۔ لوگ راستہ بھول جاتے ہیں۔" منشی ہنسا تو اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔ جاوید نے اسے غور سے دیکھا۔

"یار منشی تو بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر تو اپ ٹو ڈیٹ ہو جائے تو بڑا خوبصورت آدمی بن جائے۔"

"میری یہ صورت میرا بھرم ہے جاوید بھائی، میری پاکبازی میری سچائی کا بھرم۔"

"صرف بھرم؟"

"ہاں اور کیا۔ یہاں ہماری دنیا میں میرے جیسی صورت والا ہر شخص صوفی ہے اور۔" منشی اداس سا ہو گیا اور تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔

لڑکے اپنی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کے ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ کوئی اوپر اور کوئی نیچے۔ دریائے کنہار بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ دھوپ پہاڑوں پر چمک رہی تھی۔ نیچے وادی میں اندھیرا اتر رہا تھا۔ سردی کی ایک لہر جاوید کے جسم میں تیر گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ منشی لکڑی کی طرح ساکت و جامد تھا۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے؟" جاوید کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ "میں چلتا ہوں۔" اس نے منشی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جانا چاہتے ہو؟ رات پڑ جائے گی۔ چھ میل بہت ہوتے ہیں اس علاقے میں۔ اور اندھیرا اجنبیوں کو نگل لیتا ہے۔ انجانے راستے انہیں گم کر دیتے ہیں۔"

منشی اس وقت پرائمری اسکول کا ماسٹر نہیں کچھ اور لگ رہا تھا ـــــ وہ تو گویا بہت بڑا فلسفی تھا اور اپنے اوپر چڑھا ہوا خول آہستہ آہستہ اتار رہا تھا۔

"منشی یار ـــــ" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"جاوید صاحب میرا نام شمس الدین ہے۔ میرے عزیز اور دوست مجھے شمس کہتے ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ تم مجھے منشی کہہ لو کہ پرانے زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کو منشی ہی کہہ کر پکارتے تھے جیسے منشی پریم چند' اور ـــــ"

"یار منشی ـــــ اوہ! شمس الدین۔ تو، تو خاصا پڑھا لکھا لگتا ہے۔"

منشی مسکرایا۔ "آؤ جی جاوید صاحب دیکھو ٹھنڈ بڑھ رہی ہے اور دھوپ اوپر جا رہی ہے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔ آج آپ ہمارے مہمان ہیں۔ دیکھیں اس علاقے میں سردی کیسی پڑتی ہے ـــــ"

"شمس صاحب آپ یہاں کے نہیں ہیں ـــــ ہے نا ـــــ؟"

"ہاں میں یہاں کا نہیں ہوں۔ میں تو ـــــ میں تو ـــــ"

منشی شمس الدین اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کسی نے اس کی زبان کو بریک لگا دی ہے ـــــ وہ چپ چاپ چٹائی اٹھا کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جاوید وہیں کھڑا رہا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ منشی کے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں جو اس گاؤں کی مسجد تھی دو چار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ منشی پلاسٹک کے لوٹے سے ایک طرف بیٹھ کے وضو کرنے لگا ـــــ اور پھر مغرب کی اذان نے جاوید کو چونکایا۔

موذن کہہ رہا تھا "حی علی الفلاح"۔

ہاں یہی فلاح کا راستہ ہے ـــــ جاوید کے قدم کمرہ نما مسجد کی طرف اٹھے وہ نمازیوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

منشی سورۂ فاتحہ کی تلاوت بلند آواز میں کر رہا تھا۔

"اس کی آواز میں سوز ہے۔ اس نے مار کھائی ہے"، جاوید خدا سے لو لگانے کی بجائے منشی کی آواز میں گم ہوا جا رہا تھا ـــــ پھر نماز ختم ہو گئی۔ آواز کا سحر بھی ختم ہو گیا۔ منشی شمس الدین اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ یعقوب کے گھر سے روٹی آئی رکھی تھی۔ منشی نے مٹی کے تیل کی چمنی روشن کی اور جاوید کو ساتھ لے کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ آلو اور مکئی کی روٹی تھی۔ آلو سے ازلی بیر ہونے کے باوجود اس نے آلو کے ساتھ مکئی کی روٹی مزے لے لے کے کھائی۔ اس کا ذہن سید علی قاسم کی طرف لگا ہوا تھا جس کا یہ مہمان تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچتا ہو گا۔ پچھلے دو ہفتے سے وہ اس کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ سارے دن کی آوارہ گردی کے بعد سورج ڈوبنے سے پہلے وہ اس کے ہاں ضرور پہنچ جاتا تھا لیکن آج وہ آلو کی سبزی اور مکئی کی روٹی کھا کے شب بسری کی سوچ رہا تھا۔

"پتہ نہیں وہ کیا سوچیں گے۔" بے خیالی میں اس کے منہ سے نکل گیا۔

"وہ کچھ بھی نہیں سوچتے ہوں گے۔ ان کے پاس تمہارے جیسے بھولے بھٹکے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔" منشی شمس الدین نے آہستہ سے کہا۔

اچھا!"

"ہاں اور کیا۔ یہ سید علی قاسم بڑی شئے ہے۔ تم اسے نہیں جانتے۔"

"تم جانتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں رہتے ہوئے تقریباً آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ میں اس علاقے کے ڈیرے ڈیرے گھوما ہوں۔ خزانوں کی خونی داستانیں سنی ہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھی بھی ہیں۔ اس علاقے کی کھلی وادی میں جہاں ہم اور تم کھلے بندوں گھومتے ہیں اور آزادانہ رہتے ہیں، کئی مجرم بھی پلتے ہیں اور کئی قیدی بھی رہتے ہیں جو ہماری ہی طرح کھلے خزانے گھومتے ہیں۔ مجرم اپنے ضمیر کی سیاہی کے ساتھ روز نئے نئے جرم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور قیدی بغیر ہتھکڑی اور آہنی دیواروں کے قید با مشقت کاٹتے رہتے ہیں کہ وہ اس علاقے سے نکل نہیں سکتے۔ یہاں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی شخص جو سید علی قاسم کا قیدی یا مجرم ہے یہاں سے نکل نہیں سکتا کہ یہ بے جان، درخت، اونچی نیچی پہاڑیاں سب آنکھیں رکھتی ہیں اور جن کی پہرہ داری ضروری ہے سید علی قاسم کے گرگے انھیں اپنی آنکھوں کے سائے میں رکھتے ہیں، کیا سمجھے آپ جاوید صاحب؟"

"سمجھ گیا۔"

"ہاں اور اس کو اب بھی یہ خبر ہو گی کہ اس وقت آپ میرے پاس ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں جی اگر اس نے اس کی ضرورت سمجھی کہ آپ کی خبر رکھی جائے ــــ ورنہ ــــ"

"ورنہ ــــ؟"

"ورنہ کچھ بھی نہیں آپ اس چڑھائی پر چڑھتے ہیں تو آپ نے دیکھا ہوگا، راستے کے موڑ پر سب سے اونچی پہاڑی پر ایک بڑا سا کوٹھا ہے اور کوٹھے کی دیواروں میں گول گول سوراخ ہیں۔"

"ہاں دیکھا ہے۔"

"ان گول گول سوراخوں سے پوری پہرہ داری ہوتی ہے اور بوقتِ ضرورت سوراخ شعلے بھی اگلتے ہیں جو بڑے جان لیوا ہوتے ہیں ــــ آئی سمجھ میں بات؟"

"مگر شمس الدین صاحب آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں۔ میں تو سید علی قاسم کا مہمان ہوں اور اس کے بچے ہمارے اسکول میں پڑھتے ہیں ــــ"

"ہاں جی مجھے پتہ ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ آپ قیدی نہیں ہیں لیکن آپ ــــ آپ نہیں سمجھتے اس علاقے میں بڑے خزانے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کن چٹانوں کے نیچے ہیں۔ اسی طرح یہاں بہت سے راز بھی ہیں ــــ"

"یار تو کہنا کیا چاہتا ہے، میں اب تک سمجھ نہیں سکا۔"

"آپ جاوید صاحب واقعتاً نہیں سمجھ سکے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ آپ ایسے بے وقوف یا سیدھے تو نہیں نظر آتے۔ کیا آپ اس لڑکے آفتاب اور اس کی ماں کے بارے میں نہیں سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ ان کے بارے میں نہیں جاننا چاہتے؟"

"کیا؟" جاوید نے حیرت سے منشی شمس الدین کو دیکھا جو اپنے پلنگ سے اتر کے اس کی چارپائی پر آ بیٹھا تھا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی جتنی سانس لینے کی آواز۔

"سوچ تو رہا ہوں پر تو میرے سر پر کیوں چڑھا آ رہا ہے ——" جاوید نے منشی کو پرے دھکیلا۔

"آہستہ بولیے جاوید بابو، میں آپ کو انہیں ماں بیٹے کے بارے بتانے لگا تھا۔"

"تو ان کے بارے میں کیا جانتا ہے۔ وہ بچہ تو تجھ سے نفرت کرتا ہے۔"

"مجھ سے نفرت کرتا ہے؟ نہیں بھائی۔ جب وہ لڑکا بولتا ہے تو وہ نہیں بولتا، اس کی ماں بولتی ہے۔ بڑی دکھی ہے نا بے چاری۔"

"کیوں؟"

"وہ اس لیے جناب کہ وہ چودہ جماعتیں پاس ہے۔ اس کے پاس علم و دانش ہے۔ وہ غالب کو سمجھتی ہے۔ اقبال کی نظمیں اسے ازبر ہیں۔ شیکسپیئر اور شا سے لے کر جیکولین سوزین تک کو پڑھا ہے اس نے" منشی شمس الدین کی آواز بھرا رہی تھی۔

"بھر اتنا پڑھ لکھ کر پہاڑ کی ان چٹانوں سے سر ٹکرانے کی اسے کیا ضرورت ہے؟"

چمنی کی روشنی میں شمس الدین اسے چراغ کا جن نظر آ رہا تھا۔ باہر دریائے کنہار دیوؤں کی طرح چنگھاڑتا ہوا بہہ رہا تھا اور دیار، صنوبر اور چیڑھ کے درختوں کے درمیان سیٹی بجاتی ہوا کی آواز —— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ کی جادوگرنیاں دراتی پھر رہی ہیں۔

"ٹھیک ہی کہتا تھا وہ۔" جاوید کو جھرجھری سی آئی۔

"کون ٹھیک کہتا ہے؟"

"وہ آفتاب جو اگلی سردیوں میں پورے نو سال کا ہو جائے گا۔"

"کیا کہتا تھا؟" منشی نے اپنی آنکھیں جو نم سی ہو رہی تھیں اوپر اٹھائیں۔

"وہ کہتا تھا نیچے وادی میں جادوگرنیاں رہتی ہیں اور دریا میں جن چنگھاڑتے ہیں۔"

"وہ بیوقوف بچہ ہے۔" شمس الدین کی آواز بوجھل تھی۔

"وہ تم سے نفرت کرتا ہے اور تم بھی اسے گالیاں دیتے ہو ——"

"میں گالیاں نہیں دیتا بھائی۔ میں اسے کیا گالیاں دوں گا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ منافقت کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"وہ ایسے کہ میں اسے یعنی اس کی ماں کو ایسے جانتا ہوں جیسے اپنے آپ کو —— اور —— اور اس وادی میں وہ اس لیے ہے کہ یہ اس کا نہیں میرا کارنامہ ہے۔"

"کیا؟" جاوید اتنے زور سے چیخا کہ رات کا سناٹا گونج گیا۔

شمس الدین نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا —— "جاوید صاحب اس طرح تو مت چلائیں کہیں اوپر کوٹھی کے سوراخ میں سے کوئی شعلہ نکل کے مجھے چاٹ نہ جائے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں وہ نہیں ہوں جو تمہیں نظر آرہا ہوں ـــــ میں تو ـــــ شمس ہوں۔"
"وہ تو مجھے پتہ ہے لیکن یہ سب کچھ تم مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو ـــــ"
"تم اس چودہ جماعت پاس عورت کے بارے میں جاننا چاہتے ہو نا۔"
"ہاں چاہتا تو ہوں ـــــ مگر ـــــ مگر تم کو اس سے کیا۔ وہ تو آفتاب کی ماں ہے"
"ہاں وہ آفتاب کی ماں ہے اور یہی سارا دکھ ہے۔"
"تو پھر کیا وہ تمہاری ماں ہوتی؟" اس نے ناگواری سے کہا۔
"میری ماں؟ نہیں مجھے اس کا بیٹا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" شمس الدین نے لمبی سانس کھینچی۔ پھر بولا "میں اس وقت یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔"
"ہائیں منشی! تو ـــــ؟"
"دیکھو بھئی جاوید آپ بیچ میں نہیں بولیں گے۔" شمس الدین نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
"بہت بہتر۔"
"ہاں تو ان دنوں یونیورسٹی میں ایک بے حد خوبصورت لمبے تڑنگے لڑکے نے قدم رکھا۔ اس آنکھیں نیلی، بال سنہرے اور رنگت سچ مچ سیب جیسی تھی ـــــ وہ اتنی بڑی سی سفید مرسیڈیز پر آتا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی ہوتے تھے۔ ایک اس کا ڈرائیور اور دو اس کے گن مین ـــــ اور وہ شہزادوں جیسی تمکنت سے قدم اٹھاتا ہوا کلاس میں آتا تھا۔ ہم سارے اس سے مرعوب تھے۔ اس کا جغرافیہ تلاش کیا۔ پتہ چلا سرحد کے کسی دور دراز علاقے کا رہنے والا ہے۔ ہم نے سوچا ـــــ ہو گا کسی اسمگلر کا بیٹا اور مطمئن ہو گئے۔
"اور اس کی شہزادوں جیسی صورت اور مرسڈیز کار کے باوجود ہمارے دل میں اس کے لیے حقارت تھی اور اس نوجوان کو بھی ہم سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ کتابوں میں الجھا رہتا۔ ملٹن سے لے کر کیٹس کی شاعری اور دانتے سے لے کر ورجل کا کلام سب سے اسے دلچسپی تھی، ادب کا تو وہ دیوانہ تھا۔ بلکہ یوں سمجھیے، اگر میں یہ کہوں کہ ہماری یونیورسٹی میں وہ ادب کا سب سے ذہین، سب سے لائق طالب علم تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ اسے اردو، فارسی اور انگریزی تین زبانوں کے ادب کا ماہر سمجھا جانے لگا۔ اور جاوید صاحب دوسری خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے پیچھے نہیں بھاگتا تھا جبکہ ذرا سے قبول صورت لڑکے اپنے پاکٹ میں دو چار معشوقائیں ضرور رکھتے ہیں۔ اس کی یہی ادا ہمیں اچھی لگی۔ ہم اس کے قریب ہونے لگے۔ کبھی کچھ پوچھنے کے بہانے، کبھی لفٹ لینے کے بہانے۔ وہ فراخ دلی سے ہر دو خدمات انجام دیتا تھا۔
"ہماری دوستی آگے بڑھتی گئی۔ ہمارے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ ترشے ہوئے بال، مضبوط ہاتھ پیر اور یہ بڑے تازہ بتازہ چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ ساتھ مضبوط دل اور خوبصورت ذہن کی مالک تھی وہ۔ مجھے لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگیں۔ اور اسفند یار بھی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کمبخت لڑکی کچھ اس طرح ہمارے قریب آگئی کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلا۔ میں ہوسٹل میں رہتا تھا اسفند یار کے باپ نے اس کے لیے مکان خریدا تھا جہاں وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گیا اور نہ ہی اس نے کبھی بلایا۔"
"اچھی یاری تھی تمہاری۔"

"ہاں بس کچھ ایسا ہی تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ جب کبھی وہ لڑکی نہیں آتی تو میں کچھ گم سم سا ہو جاتا ہوں ــــ ایسا کیوں ہے ــــ میں نے بارہا سوچنے کی کوشش کی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک بات اور میں نے محسوس کی کہ وہ لڑکی ــــ وہ لڑکی اور اسفندیار جب باتیں کرتے ہیں تو اس لڑکی کا چہرہ رنگین ہو جاتا ہے اور اس لمحے میں نے اپنے دل میں ایک پھانس سی اٹکتی محسوس کی ــــ میں نے سوچا یہ لڑکی میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کچھ دن اور گذر گئے۔ امتحانات قریب آ گئے ہم پڑھنے میں جٹ گئے ــــ انھیں دنوں اسفندیار نے بتایا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس کے باباجانی بہ نفسِ نفیس اس کی شادی کرانے آئے تھے۔ میں نے کہا "یار تو نے مجھے نہیں بلایا شادی میں۔" وہ بولا "ضروری نہیں سمجھا۔" آپ حیران نہ ہوں جاوید صاحب، اسفندیار اسی طرح گفتگو کرتا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا "چل تم بھی مت بلانا مجھے ــــ مگر میں سوچتا ہوں تو شادی کرے گا کیسے تجھ میں اس کی ہمت کہاں ہے۔" اسفندیار کھلکھلا کے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "دیکھ لینا میں کیسے دھوم دھڑکے سے شادی کرتا ہوں۔" میرے ذہن میں وہ تازہ و توانا لڑکی گھوم گئی۔ جو پچھلی چھٹیوں کے بعد سے نہیں آئی تھی میں نے اسفندیار سے پوچھا "کیا وہ اب نہیں آئے گی؟

اس نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟ مجھے تو اس کا ٹھکانہ بھی نہیں معلوم۔" میں نے بڑے دکھ سے کہا ــــ اور ایم اے کے پریویس کے امتحان میں جٹ گیا۔

اسفندیار ذہین تھا مجھ سے نمبر لے گیا مجھے برا نہیں لگا دوست جو تھا۔

وقت گذرتا رہا اس لڑکی کا سایہ ہمیشہ ذہن پہ منڈلاتا رہا ــــ سوچتا تھا ــــ مگر میں پوچھوں کس سے ــــ یونیورسٹی کے رجسٹر میں اس کا پتہ ہوگا۔" دل نے کہا۔

فائینل کی تیاری کرتے ہوئے اس کی یاد کچھ زیادہ آنے لگی تھی۔ منزل جو قریب آتی جا رہی تھی۔

اس دن ہمارا آخری پرچہ تھا۔ اسفندیار بہت خوش تھا۔ اسے امید تھی وہ ٹاپ کر جائے گا۔ میں بھی خوش تھا کہ مجھے کبھی اسفندیار پر رشک نہیں آیا وہ میرا یار تھا۔ اس کے دل کی ان کہی باتیں بھی جیسے میرے دل میں در آتی تھیں۔

وہ ہوسٹل میں میرا آخری دن تھا۔ میں ایک ایک چیز سمیٹ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ــــ اسفندیار کا ہشاش بشاش چہرہ میرے سامنے تھا۔ "میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

"میں بھی جا رہا ہوں۔ سبھی جا رہے ہیں۔"

"ہاں سبھی جا رہے ہیں مگر میں ــــ میرے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ بہت ہی اچھے ہوئے ہیں اور میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے باہر جاؤں گا۔ کیمبرج یا آکسفورڈ۔"

"پیسے ــــ" میں نے منہ اٹھا کے کہا۔

میں اس وقت یہ بھول گیا کہ اس کے پاس پیسوں کی کیا کمی ــــ وہ تو اسمگلر کا بیٹا ہے۔

"یار مجھے اسکالرشپ مل جائے گی ــــ اور اگر نہیں ملی تو بھی ــــ باباجانی ہیں ہی ــــ اور میں جناب ان کی اکیلی اولاد ہوں۔" اسفندیار کے موتی جیسے دانت چمکے ــــ پھر بولا "آؤ چلیں ــــ" میں نے پوچھا "کہاں؟" وہ بولا ــــ "آؤ میں تمہیں اپنا بیٹا دکھاؤں ــــ"

"بیٹا؟" میرا منہ کھلا رہ گیا ــــ یار اسفندیار تیرا بیٹا!"

"ہاں۔ ہاں، بھئی میرا بیٹا ــــ"

"اچھا" میں واقعتاً حیرت زدہ تھا۔

"ہاں بھئی تجھے یاد نہیں ــــ میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میری شادی ہو گئی ہے ــــ اور ہاں یہ اُس وقت کی بات ہے جب ــــ" اور میرے دل میں کسک سی ہوئی۔

اگر وہ کمبخت اچانک۔ پڑھائی نہ چھوڑ دیتی تو شاید آج میں بھی ــــ میرا بھی! اسفندیار کی مرسڈیز میں بیٹھتے بیٹھتے مجھے اپنی محرومی پر رونا آ گیا۔ ایسا رونا جس میں آنسو اندر ہی اندر گرتے ہیں پلکوں تک نہیں آتے ــــ کار ایک شاندار مکان کے پھاٹک پر رک گئی۔ باوردی دربان نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"کون آیا ہے؟" اسفندریار نے کیڈی لک کی طرف انگلی اٹھائی۔

"سرکار!" دربان نے دونوں باندھ دیے۔

"بابا جانی۔"

"ہاں جی!"

"آؤ یہاں بیٹھو ــــ" اسفندیار میرا ہاتھ پکڑ کے اندر لے آیا۔ شاہانہ ڈرائنگ روم دیکھ کے میں ہکا بکا رہ گیا ــــ "بولو کیا پیو گے شیمپین؟ برانڈی؟ وسکی؟"

"کیا بکتے ہو میں ٹھنڈا پانی پیوں گا۔"

ایک کرخت آواز اندر کسی کمرے میں گونجی ــــ "دیکھو ایک بار میں نے کہہ دیا کہ اُس محلے کے لوگ ہمارے محلوں میں نہیں رہ سکتے۔ تم میرے بیٹے کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ تم اپنے کوٹھے پر لوٹ جاؤ میں اپنے بیٹے کو لیے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کوٹھی کا بھی سودا کر لیا ہے۔"

"اوہ بابا جانی!" اسفندیار دھاڑتا ہوا اندر کی طرف بھاگا۔

"میں اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتا ــــ اسفندیار تم کو پتہ ہے نا!" ایک کلے ٹھلے والا بوڑھا اندر سے باہر آیا ــــ اسفندیار اس کے ساتھ تھا۔

"بابا جانی ہمارا ایک بیٹا بھی ہے۔"

"اسفندیار تم بھی ہمارے ایک ہی بیٹے ہو۔ تم ہوٹل آ جاؤ میں ہلٹن میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" نئی نویلی کیڈلک گرد اڑاتی آگے بڑھ گئی۔

اسفندیار کا چہرہ میں نے پہلی بار بے رنگ دیکھا۔ وہ بولا "میں اپنے باپ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا ــــ مگر اس وقت وہ یہ کیسا حکم دے گیا ہے ــــ خیر آؤ ــــ آؤ اندر چلو ــــ تمہیں اپنی بیوی سے ملواؤں ــــ میں نے کہا تھا نا، ہمارا ایک بیٹا بھی ہے۔"

میں بڑے شوق سے آگے بڑھا۔ اور کمرے کا پردہ ہٹا کے اندر آیا تو مجھے سانپ نے ڈس لیا ــــ سامنے وہ کھڑی تھی۔ تازہ اور توانا قندھاری انار جیسا چہرہ نظر کے سامنے تھا۔

"یہ ہمارا بچہ ہے ــــــ" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ جھولے میں سرخ و سفید بچہ کلکاریاں مار رہا تھا۔

"اسفندیار، تمہارے بابا کہتے ہیں کہ میں اپنی ماں ــــــ"

"ہاں میں نے سن لیا ہے، پر عارفہ جانی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"دیکھو ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں تمہارے ــــــ اب تم ہی بتاؤ کہ میں تمہارے بغیر ــــــ یعنی کہ اب ــــــ اب میں کیسے اس راستے پر چل سکتی ہوں، تمہاری رفاقت کے بعد، بھلا کیسے؟ کیسے؟" موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"لیکن عارفہ! میری جان میں نے اپنے باپ کی حکم عدولی کبھی نہیں کی۔" اسفندیار کا چہرہ زندگی سے عاری تھا مگر آواز مضبوط تھی۔

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم وہی کرو جو بابا جانی کہتے ہیں۔"

"اسفندیار!" وہ دھاڑی۔ اس نے لپک کے میز پر پڑا ہوا پستول اٹھا لیا۔

"اس راستے پر چلنے سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں ــــــ" وہ زور سے چلائی۔

میرا سر گھومنے لگا۔ میں اس سے لپٹ گیا۔

اور اسفندیار ڈھیٹ بنا سگریٹ سلگا رہا تھا ــــــ جیسے یہ سب کچھ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ "اسے مر جانا چاہیئے" میں نے لمحے کے چوتھائی حصے میں سوچا۔ یہ خود غرض ہے اسے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر گولی چلی اور اسفندیار خاک و خون میں لتھڑ گیا۔

پستول نیچے گر گیا۔ میں خوفزدہ تھا۔ اس نے زمین پر سے پستول اٹھا لیا اور بولی "تم سے کس نے کہا تھا کہ میرے معاملے میں ٹانگ اڑاؤ ــــــ دفع ہو جاؤ یہاں سے بزدل کہیں کے ــــــ کتے کمینے ــــــ تو نے مجھے ــــــ تو نے ــــــ تو نے" وہ اسفندیار کے خون میں لتھڑے جسم سے لپٹ گئی ــــــ میں بزدل تھا دفع ہو گیا۔

سید علی قائم اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی میت کے ساتھ ساتھ اسے اس کے بچے سمیت اپنے علاقے میں لے کر چلا گیا اور وہ ننھا سا بچہ جو اگلی سردیوں میں نو سال کا ہو جائے گا عارفہ کا بیٹا ہے۔ وہ عورت جو عارفہ کے ساتھ رہتی ہے اس لڑکے کی دادی نہیں ــــــ سید علی قاسم کی رکھیل ہے۔ وہ اس کو ذلیل کر رہا ہے ــــــ کیونکہ ــــــ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ اس کے بیٹے کی قاتل ہے ــــــ حالانکہ میں ــــــ میں ــــــ" منشی شمس الدین سارے جسم سے کانپ گیا۔ اور برف برساتے موسم میں اس کی پیشانی پر پسینے کے موتی چمکنے لگے تھے

اور میں ــــــ اور میں ــــــ پچھلے آٹھ سال سے اس علاقے میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اسفندیار کی موت پرانی بات ہو چکی ہے۔ اور عارفہ جو دہ جماعتیں پڑھنے کے باوجود اس علاقے میں قید ہے کہ سید علی قاسم کے قیدی ہتھکڑی اور آہنی دیوار کے بغیر بھی عمر قید کاٹتے ہیں ــــــ" اب منشی شمس الدین دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

اور اسے قطعی طور پر کوئی ڈر نہیں تھا کہ اوپر پہاڑی کے موڑ پر بنے ہوئے قلعے کی دیواروں کے کسی سوراخ سے کوئی شعلہ نکل کر اسے چاٹ لے گا۔

انسان کا دیش

حسن منظر

موبنر روحمن ان لوگوں میں سے تھا جو نیک ہوتے ہیں لیکن دوسرے ان سے کتراتے ہیں۔

وہ یا تو جہاز میں برج[1] پر اپنی ڈیوٹی پر نظر آتا تھا یا اکیلا بندر فالکے[2] کے تختے پر بیٹھا رسی بنا کرتا تھا۔ کسی نے اُسے گاتے نہیں سُنا تھا، روتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اُس کے منہ سے شراب کا بھپکا سونگھا تھا۔ یوں بھی جو دوسرے ملاح اس کے علاقے کے تھے کم ہی شراب پیتے تھے، بلکہ شاید نہیں ہی پیتے تھے۔

اسے ہم ان کی کنجوسی سمجھتے تھے۔ نہ خود پینا نہ دوسرے کو پلانا نہ یہ کہ چھٹی ملتے ہی بندرگاہ میں شہر کی طرف دوڑ پڑنا جہاں دنیا زمانے کی عورتیں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی ہوتی تھیں۔

لیکن موبنر روحمن یا جسے اس کے ساتھی محض مُوبنر کہتے تھے اُن سیلرز میں سے نہیں تھا جن کے لئے کہا گیا ہے

ملاح ہی کو سجے بدھائی نیا پورٹ نئی لُگائی

ہم لوگ فراخ دل تھے۔ کھل کر پیتے تھے اور ساتھ بیٹھ کر پیتے تھے۔ سب کا پرسر[3] سے اپنا اپنا حساب چلتا تھا۔ پھر بھی اگر کسی کے پاس نامہ نہیں ہوتا تھا تو دوسرا اس کی دست گیری کرتا تھا اور بعد میں اُدلا بدلا ہو جاتا تھا۔ یہی نہیں، کبھی کبھی پورٹ میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم میں سے دو چار کسی بار میں بیٹھے پی رہے ہیں، کوئی لڑکی بھی ساتھ بیٹھی ہے اور جیب میں ہاتھ ڈالو تو پیسہ نہیں۔ ایسے میں اگر اپنے جہاز کے ساتھیوں کا کوئی گروہ باہر گھومتا نظر آ گیا تو ہاتھ ہلانے پر وہ اندر آ جاتا تھا اور موقع کی سنگینی کو سونگھ کر ایک طرف کو لے جا کر کہتا تھا "یہ لو پیسے آخری پیگ کے اور بھاگ لو۔ میں باہر کھڑا ہوں۔" ہمیں اپنے اُس باہوش ساتھی کی بات ماننی ہی پڑتی تھی۔ ورنہ اُس کے چلے جانے کے بعد نہ بار والے اِدھر پھٹکتا نہ لڑکی پاس بیٹھی رہتی اور پھر جہاز تک پہنچنے کا بھی سوال ہوتا ٹیکسی کا کرایہ، پورٹ تک پہنچنا، ہلتی ہوئی کشتی میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے بیٹھنا اور پھر جہاز کے ہلتے ہوئے گینگ وے پر سے ہوتے ہوئے اپنے کیبن تک پہنچنا جس کے بعد آدمی گھنٹوں یہی نہیں جانتا کہ دنیا ہے کس جگہ کا نام اور وہ ہے کہاں۔

لیکن یہ لوگ؟ یہ لوگ مجھے یاد نہیں پڑتا کبھی اس طرح جہاز تک لائے گئے ہوں۔ ان میں سے ہر ایک، ہم مذاق میں آپس میں کہتے تھے، کنارے پر جانے سے پہلے خوب پیٹ بھر کر پانی پیتا ہے جس طرح بچے سحری کے وقت پیتے ہیں تاکہ شہر میں پیاس نہ لگے اور مجبوراً مین وین نہ پینی پڑ جائے۔ میرا اپنا خیال ہے۔ یہ لوگ اسی طرح خوب ڈٹ کر کھا کے بھی نکلتے تھے کہ دو چار گھنٹے جو پورٹ میں گذریں گے ان میں بھوک نہ لگ جائے۔

ہم لوگ جہاز کے پورٹ پکڑنے سے پہلے یہ بندوبست کر رکھتے تھے کہ شراب کہاں چھپی ہوئی ہونی چاہیئے جہاں سے کسٹم آفیسر

---

[1] کپتان کے کھڑے ہونے کا دیدبان [2] تہہ خانہ [3] خزانچی

کے جانے کے بعد اُسے برآمد کیا جاسکے اور اپنا حصہ پی کر باقی کو چھپا کر باہر لے جائیں تاکہ بیچی جاسکے۔ کچھ گیٹ پر کھڑے سنتری کو بھی دینا پڑتا تھا، مثلاً سگرٹ کا پیکٹ یا بیئر یا اسٹاؤٹ کی ایک بوتل جو جہاز پر کوڑیوں کے مول ملتی تھی۔ کبھی پورٹ پکڑنے سے پہلے ہم میں سے جو ڈیوٹی پر نہیں بھی ہوتا تھا وہ ایک دن پہلے ہی سے پینی بند کر دیتا تھا کیونکہ آنے والے پورٹ میں ہمیں معلوم ہوتا تھا شراب جہاز کے مقابلے میں پانی کے مول ملتی ہے۔ بڑھیا سے بڑھیا رم اور کونگ سے کونگ۔ برانڈی جس کے دو ہی گھونٹ کے بعد سامنے بیٹھی ہوئی بدشکل سے بدشکل عورت بھی نازک سی خوبصورت لڑکی لگنے لگے۔ ہم جب ایسے پورٹوں سے جہاز پر واپس آتے تھے تو ہر ایک پئے ہوئے ہوتا تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک، دو دو بوتلیں رم یا وسکی کی ہوتی تھیں جنھیں ہم ہاتھوں میں جھلاتے ہوئے آتے تھے۔

لیکن موہنر کے ساتھ ایسے بے رونق پورٹوں پر جہاں عورت اور شراب کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں تھا، ڈیوٹی اوف ہونے پر یا تو اِدھر اُدھر عرشے پر پڑے سوتے رہتے تھے یا اگر کبھی سمندر میں بچا کھچا کھانا اچھال دینے پر جہاز کے اردگرد مچھلیاں جمع ہو جاتی تھیں تو ان کا شکار کرنے لگتے تھے۔ اس کام میں وہ واقعی ماہر تھے۔

"موہنیو" ایسے میں، میں اکثر اس کے پاس سے گذرتا ہوا کہتا تھا، "کیا پکڑتا ہے؟ اِدھر ہلسا نہیں ملے گا!"

وہ ہنس دیتا تھا۔ اور اگر زیادہ اچھے موڈ میں ہوتا تو کہتا "مگر اِدھر اُس کا بھائی ملے گا، ہم اُس کا انتظار کر رہا ہے۔"

اس کا مطلب ہوتا تھا گھر سے کوئی بُرا سمٹی (چٹھی) نہیں آیا ہے اور اُس کی ماں بھی ٹھیک ہے، باپ بھی ٹھیک ہے بہن بھی، چھوٹے تین بھائی بھی، بیوی بچے سب حتیٰ کہ بڑی بہن اور اس کا شوہر اور بچے بھی جو کسی منشی گنج یا نارائن گنج، گوپال گنج قسم کے شہر میں تھے۔ موہنیر کے گھر تین چار ندیوں پار، چار پچاس میل دور۔

اُس کا بہنوئی بھی اُسی کی طرح سیلر تھا لیکن اُس وقت کسی اور شپنگ لائن میں۔ میرا اُس کا ساتھ کبھی نہیں ہوا، نہ ان دنوں میں جب موہن اور میں ایک جہاز پر تھے نہ بعد میں۔ البتہ اُن دنوں اُن جہازوں کو میں نے اکثر سمندر پہ دور جاتے دیکھا جن کے فنلز کو پہچان کر اس کے چہرے پر رونق آجاتی تھی اور وہ مجھ سے کہتا تھا "او امار بھائی کا لائن کا جہاز ہے!"

ایک دفعہ ہمارا جہاز جبن اُس موقع پر جہازیوں کی زبان میں لان سیٹ[1] ہوا جب دھکے پر دو تین جہاز چھوڑ کر اس کی دوسری کمپنی کا کوئی جہاز پہلے ہی سے لگا ہوا تھا۔ اُس جہاز کو دیکھ کر موہنیر اتاؤلی اور خوشی دونوں کی بیٹ میں ایک ہی وقت میں آگیا۔ اتاؤلی اس وجہ سے تھی کہ پورٹ اچھا تھا اور اچھے پورٹوں کا مطلب ہوتا ہے زیادہ کرینیں، زیادہ شور پر کام کرنے والے، جھٹ پٹ کام اور فی گھنٹہ جہاز کے عین پورٹ پر ٹھہرنے کے زیادہ چارجز۔ ایسے پورٹوں پر جہاز چند ہی گھنٹے ٹھہرتا تھا اور ہمیں چھٹی مشکل ہی سے ملتی تھی۔ اور اگر ملتی بھی تو بہت تھوڑی دیر کی۔ موہنیر کو کھٹکا تھا وہ دوسرا جہاز اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نہ چل پڑے۔ اور ایک جہاز سے دوسرے تک پہنچنے میں ہزار کھڑاک ہوتے ہیں، چاہے دونوں آگے پیچھے ہی دھکے پر کیوں نہ کھڑے ہوں۔

موہنیر کی خوشی میں مجھے ان لوگوں کی کنجوسی کی جھلک نظر آئی۔ جہاز اگر لان سیٹ نہ ہوتا، یعنی لنگر پر دور سمندر میں ہوتا تو وہاں سے کنارے تک آنے اور جانے میں، ہو سکتا ہے اُسے کسی کشتی والے کو دو چار شلنگ دینے پڑتے۔ اگر ایسا تھا تو کیا ہوا۔ جب بہنوئی سے ملنا ہی تھا یا اس کی کھوج لینے جانا تھا تو دو چار شلنگ کی کونسی بڑی بات تھی۔ ہم لوگ ان چھوٹے چھوٹے خرچوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔

---

[1] ALONGSIDE [2] دھکوارے

موبیئر چم چیچڑ آدمی تھا۔ نالکوں سے مال نکلواتا ہوا گورا سیکنڈ آفیسر اُس سے پیچھا چھڑانے کے لیے بار بار کہہ رہا تھا۔ "نو، نو یو کانت۔ گو ورک۔ ڈیوٹی، ڈیوٹی۔ گو ورک" اور ساتھ ہی کرین میں سے آریا، ابس بھی کرتا جا رہا تھا کہ کرین اوپر کرنی ہے یا نیچے۔

موبیئر نے اپنی انگریزی الفاظ کی جمع جتھا اٹاتے ہوئے سیکنڈ آفیسر سے کئی بار کہا "ہم ابھی لوٹ آئے گا۔ اس سیپ (SHIP) پر ہونے سکتا ہمارا بہن کا آدمی ہو یا اس کا رشتی۔ اودس لائن پر اودھار طرف کا بہت کورو (CREW) لوگ ہے۔ کوئی ادھار بھی جاننے والا ہونے سکتا!"

لیکن سیکنڈ آفیسر جس نے گرمی کی وجہ سے اپنی قمیص کے بٹن کھول رکھے تھے اور ٹھنڈی جرمن بیئر کے کین کے کین خالی کیے جا رہا تھا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ لوگ، یعنی ہم سب، گھر سے ڈاک آنے کے اتنے بے چینی سے کیوں منتظر رہتے ہیں کہ وہاں کون کس حال میں ہے۔

اس طرح تو یہ گورے لوگ دو گھڑی کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ کسی کی ایک بہن آسٹریلیا میں تھی تو دوسری کینیڈا میں۔ ماں ہالینڈ میں بھی تو باپ کونگو میں۔ یہ باتیں ہمیں مختلف جہازوں پر چیف اسٹیورڈوں سے معلوم ہوتی رہتی تھیں جو عام طور سے ہمارے ہی علاقوں کا آدمی ہوتا تھا، دوسرے درجے کا آفیسر، جو انگریزی بھی بول سکتا تھا اور ہماری زبانیں بھی۔ در جوگول مال میں ہمارا بھی ساتھی ہوتا تھا اور کسی گورے کا بھی، یعنی جب سونا تھوڑی مقدار میں اِدھر اُدھر لے جانا ہو۔ جہاز کا جہاز بھر کے نہیں۔ ایسا کام ہم لوگ نہیں کرتے تھے۔

چیف اسٹیورڈ نے دبے دبے الفاظ میں سیکنڈ آفیسر کو سمجھانا چاہا کہ ماسٹر اور چیف انجینئر پورٹ جا چکے ہیں ... لیکن وہ بیچ ہی میں بول اٹھا "اوخ۔ پورٹ میں وہ کر کیا سکتے ہیں سوائے ــــــ"

اور اپنی بات اُدھر میں چھوڑتے ہوئے اُس نے بھرے ڈبے سے بیئر اپنے حلق میں انڈیلی۔ اس سب کے ساتھ ساتھ وہ برابر انگلی سے کرین مین کو "آریا، آریا، آریا" کیے جا رہا تھا۔

پھر چیف اسٹیورڈ کی سفارش پر اُس نے ایک گالی بکی اور موبیئر سے کہا "مائی سسٹر[1] آلسو ہوم، شی نو رائٹ، آئی نو دائی، اندر اسٹینڈ؟"

موبیئر کی گہری سانولی رنگت میں سرخی ابھر آئی اور اُس نے غصے سے پوچھا "یو[2] گوی گالی؟"

"نو گالی ٹو یو[3] موبیئر"، سکنڈ آفیسر ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "آئی گو گالی ٹو مائی سیلف۔ سی۔ دی ورک گوئنگ اَون اینڈ، اینڈ می ....."

موبیئر کو چیف اسٹیورڈ نے سمجھایا "پٹے ہوئے ہے، آریا ابس کرتے کرتے اس کی مت کٹ گئی ہے خود کو گالی دے رہا ہے۔ ہم نہیں جب کام زیادہ پڑ جاتا ہے کہتے ہیں ہم ہی بیٹی ــــــ اس کام کے لیے رہ گئے تھے۔"

پھر موبیئر نے چیف اسٹیورڈ اور سکنڈ آفیسر دونوں کے چہروں کو باری باری سے بار بار دیکھتے ہوئے کہا "دیئر[4] وسائیکلون دیں مونسون بیجن ڈائی۔ تھاؤزنڈ مین تھاؤزنڈ چلڈرن (چلڈرن)، بُو من (ووِمن)، اولڈ مین، نو ہوم سار (سر) دیئر آل ینگ مین

---

[1] میری بہن بھی گھر پہ ہے، اس نے خط نہیں لکھا تو میں مر تو نہیں گیا۔ سمجھے؟ [2] تم نے مجھے گالی دی؟
[3] تمہیں گالی نہیں دی میں نے خود کو گالی دی۔ بھئی کام کو دیکھ رہے ہو، اور میں ــ میں ــ
[4] وہاں سائیکلون آیا ہے۔ یہ مونسون کا زمانہ ہے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہیں، بچے، عورتیں، بوڑھے۔ گھر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے تمام نوجوان کام پر دور دور گئے ہوئے ہوتے ہیں سمندر پہ۔ گھر کون بنائے گا۔ مجھے بڑی فکر لگی ہے۔

گوورک۔ نی سنگ (نتھنگ)، اُون سب، بیری پھار (دیری فار) اون دریا، ہومیک ہاؤس۔ آئی بری بیری بیچ"
سیکنڈ آفیسر نے دہی گالی پھر بکتے ہوئے کہا "آخ موبیٹر یور کنٹری آلویز بین واٹنگ۔ وے نو وانٹ ٹو یو۔ آلویز سائیکلون، آلویز فیمن، فلڈ۔ ڈیم اِٹ!"
چیف اسٹیورڈ نے سیکنڈ آفیسر کے کہے کا ترجمہ کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ موبیٹر وہیں اُس سے بھڑ جاتا اور یہ معاملہ پورٹ کا تھا سمندر کا نہیں۔ جھگڑے کا فیصلہ خشکی پر ہوتا اور کوئی اور کرتا جہاز کا ماسٹر نہیں۔ سمندر پر وہ میری ٹائم لاز دیکھ کر موبیٹر کو جو سزا چاہے دے لیتا، اس کی نلی خراب کر دیتا یعنی ملاح والے پاسپورٹ میں لکھ دیتا کہ اُسے اپنے غصے پر قابو نہیں ہے، بے حکما ہے، لیکن یہاں پورٹ میں وہ بے بس تھا اور موبیٹر اس سے لڑنے کو تیار۔ یوں بھی یہ سیکنڈ آفیسر دل کا بُرا نہیں تھا۔ کورو (CREW) میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تو دس بار اُسے پوچھنے جاتا تھا اور اگر کیس خراب ہو تو اگلے پورٹ میں اُسے ہسپتال میں داخل کرانے کے معاملے میں بھی وہ کمپنی سے زیادہ اپنے عملے کا وفادار رہتا تھا۔ ورنہ ہر کمپنی والے چاہے وہ دیسی ہو چاہے یورپین تمام کے تمام کنجوسی میں بیاج پر پیسہ چلانے والوں کو مات کرتے ہیں۔
مال اب سب سے نیچے کے فالکے سے نکالا جا رہا تھا اور کسی وجہ سے کرین مین نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ دو چھوٹے گینگ وے پر سے جانوروں کو اسٹیوے ڈورز (STEVE DORES) جہاز پر کھدیڑ کر چڑھا رہے تھے۔
سیکنڈ آفیسر نے خالی ڈبہ سمندر میں پھینکا اور سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا "آخ ایز فار ایز آئی کیر ہی کین گو ٹو ہز کنٹری اف ہی لائیکس اینڈ سواٹ فروم سائیکلون۔ وات از ہی ڈوئنگ ہیر؟ واٹ از ہز گورمنٹ ڈوئنگ؟"
"صاحب کیا بولتا؟" موبیٹر نے تشویش سے کہا "گورمنٹ نے کوئی آرڈر نکالا ہے۔"
"کچھ نہیں،" چیف اسٹیورڈ نے کہا۔ "کہہ رہا ہے جاؤ جا کے معلوم کرو کوئی سائیکلون تو نہیں آیا۔"
"تھینک یو سار" موبیٹر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُسے چیف اسٹیورڈ کے ترجمے پر شک تھا۔
"اُدھر پھر سائیکلون آیا ہے؟ گو۔ گو" سیکنڈ آفیسر نے موبیٹر کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا "اینڈ ٹیل ہم ——"
اُس نے چیف اسٹیورڈ سے کہا "تو ورنگ پڑے، پیتا نہیں ہے تب ہی اُسے ہر وقت لگتا ہے وہاں کوئی سائیکلون آیا ہے، کوئی فیری ڈوب گئی، اتنے لوگ مر گئے۔"
رات کو میرا ملنا موبیٹر سے نہیں ہو سکا، اور اگلی صبح جب ہم کام پر ڈیک دھونے کے لیے آئے تو وہ جہاز اور پورٹ نجانے کہاں رہ گئے تھے۔ اس وقت تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ اس طرف کا دریا جیسا کہ ہم سمندر کو بولتے ہیں ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ نہ کھانے کو جی چاہتا ہے نہ پینے کو۔ سگرٹ اور بولنے کو بھی نہیں۔
ہم ربڑ کے فل بوٹ پہنے ہوئے تھے اور ڈیک کی گھمائی موپس سے کر رہے تھے۔ موبیٹر ہوز سے سمندر کا پانی ڈال رہا تھا۔ میں نے اُسے "بھالو؟" کہا۔
خیریت معلوم کرنے سے زیادہ یہ لفظ میں ہیلو کی طرح اس سے ملنے پر کہتا تھا۔ وہ صرف سر ہلا کے رہ گیا۔

۱؎ ارے موبیٹر تمہارے ملک میں تو آدمی سدا مرتے رہتے ہیں۔ وہ جینا نہیں چاہتے۔ ہمیشہ طوفان، ہمیشہ قحط، سیلاب۔ دھتکار ہے۔
۲؎ کپتان ۳؎ سمندر پر لاگو ملاحوں کے لیے قانون ۴؎ ملاح ۵؎ مال چڑھانے اتارنے والے
۶؎ جہاں تک میری مرضی کا سوال ہے وہ چاہے تو اپنے ملک بھی جا سکتا ہے اور جا کر اسے طوفان سے بچائے۔ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس کی گورنمنٹ کیا کر رہی ہے؟

دوپہر کے کھانے کے بعد سیکنڈ آفیسر سے دو اسپرین کی گولیاں لے کر میں اپنے کیبن میں سونے چلا گیا۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا اور گولیاں دیتے ہوئے سیکنڈ آفیسر نے مجھ سے کہا تھا "ری میمبر[1] عبدل۔ یو آر اے موزلیم۔ یو آر نوٹ سپوزڈ تو ڈرنک اینڈیو ڈرنک تو مچ"۔ جس پر میں نے کہا تھا "سر یو[2] تو آر سوری میمبر لائیک کرسچین مسلم آلسو ٹو کائنڈز۔ گڈ مسلم ___"

"اینڈ[3] بیڈ موزلیم" اس نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

اس وائیج میں ہمارے اپنی طرف کے ساتھی خوش تھے۔ شیر افضل نے جس دکاندار سے بنوکیولر لانے کا وعدہ کیا تھا وہ اُسے ہوشیاری سے پہنچا آیا تھا اور اس پر اس نے چار پانچ پاؤنڈ کما لیے تھے۔ اسی طرح جیرے نے کیمرے پر۔

تھرڈ انجینیر ٹراپسٹرا، چیف اسٹیورڈ اور فضلے نے مل کر سونا بیچا تھا جسے پچھلے ڈیوٹی فری پورٹ میں فضلہ خریدنے گیا اور اس ہوشیاری سے لارہا تھا کہ اس کی اطلاع اگلے پورٹ تک نہیں پہنچ سکی۔ ٹراپسٹرا گورا تھا اس نے خود کو اس دھندے سے الگ تھلگ بنائے رکھا تھا۔ مرتا چیف اسٹیورڈ یا فضلا۔ ٹراپسٹرا صاف نکل جاتا۔ لیکن یہ کام بھی ہو گیا۔ باقیوں میں سے کسی نے سگرٹ کے کارٹن بیچے، کسی نے اسکاچ کی بوتلیں۔ میں بھی بُرا نہیں رہا تھا۔ لیکن ہم میں سے زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے جو کمایا تھا وہیں لٹا دیا اور وہی بات ہوئی۔

سی مین فنی لائف   نیو پورٹ نیو وائف

عیاشی کرنے والے پورٹ چھوڑنے کے بعد ہم لوگ جو اُس طرف کے نہیں تھے جدھر سے موہیئنز آیا تھا، ہر جہاز پر ان لوگوں کو چھیڑتے آتے تھے کہ "اچھا ہوا تم اُدھر نہیں گیا۔ جاتا تو اول تو تم لڑکی کو نظر آتا نہیں کیونکہ تم اُس کے کندھے برابر ہوتا دوسرے اُدھر کا لڑکی لوگ کالے رنگ سے ڈرتا ہے!!"

کوئی زیادہ وہ چھیڑنے پر آجاتا تو کہتا "تمہارے طرف کی گائے بکری برابر، بکری کتے برابر اور تم خود پتہ ہے کس کے برابر ہے ___؟"

لیکن اس قسم کی چھیڑ خانی پر جھگڑا ہو جاتا تھا کیونکہ ان لوگوں میں سے بھی کچھ کو اس قسم کی گالیوں کا جواب آتا تھا اور کوئی گوئی ہماری طرف کے کسی سیلر سے جو رنگ میں کالا ہو اور پھر بھی چھیڑ خانی کر رہا ہو پوچھ بھی بیٹھتا تھا "کہیں تمہارا باپ تو اد ماردیش سے نہیں آیا تھا؟"

تیسرے پہر میں اپنے کیبن سے اٹھ کر باہر آیا۔ سر میں درد ختم ہو چکا تھا صرف اس کی دھمک باقی رہ گئی تھی۔ بھنڈاری سے چائے لے کر میں ایک بند فالکے پر بیٹھ گیا جہاں دھوپ نہیں پڑ رہی تھی۔ جہاز میں ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف سمندر کا شور تھا اور لہروں کے وقفے وقفے سے دھماکے۔ کام کرنے والے یا انجن روم میں تھے یا برج پر ہوں گے۔ باقی سب اپنے اپنے کیبنوں میں پڑے سو رہے ہوں گے۔ ایسے میں کوئی ریڈیو بھی نہیں سُنا کرتا جو ہم سب ہی نے گھر لے جانے کے لیے خرید رکھے تھے۔ ہم میں سے بعض بعض کے پاس تین تین چار چار گھڑیاں تھیں، چھوٹے ٹیپ ریکارڈر، شادی بیاہ میں کام آنے والے اَن سِلے کپڑے، موٹی بھدی سونے کی انگوٹھیاں جو گھر سونا لے جانے کا ایک عام طریقہ تھا۔

موہیئنز کے ساتھی اور وہ خود جو تھوڑا بہت روپیہ جہاز پر خرچے کے لیے ملتا تھا اُس سے جرمن لالٹینیں، اسٹوو، چینی چھاتے، اور اسی قسم کی روز کام آنے والی چیزیں خرید اکرتے تھے اور موقع ملتا تھا تو کسی آتے جاتے کے ساتھ ایسے

---

[1] عبدل یاد رکھو تم مسلم ہو اور تمہیں پینے کی اجازت نہیں ہے اور تم ہو کہ بہت پیتے ہو،

[2] سر تم بھی یاد رکھو عیسائیوں کی طرح مسلمان بھی دو قسم کے ہوتے ہیں اچھے مسلمان ___، [3] اور بُرے مسلمان

پورٹ سے جہاں روپیہ۔ نا ہو شلنگ بیچ کر پیسہ بھی گھر بھیج دیتے تھے۔ یہی کام جہاز سے سائین اوف کرتے وقت بھی کرتے تھے کہ زیادہ سے روپیہ گھر لے جائیں۔ ان کا اس طرح دانت سے پیسہ پکڑنا ہمیں کھلتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہماری طرف والوں میں سے اکثر خود پیسہ نہیں بچا سکتے تھے۔

ہم سب کی تنخواہ کراچی میں کٹتی تھی ہمارے گھر والوں کو بھیجنے کے لیے کیونکہ شپنگ آفس والوں کو یقین تھا کہ اگر پوری کی پوری ہمیں جہاز پر ملتی رہی تو شراب اور عورتوں پر اڑا کر آئیں گے اور ہمارے گھر والے بھوکے مریں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں انھیں ہمارے کنبے اور ٹبر کا کتنا خیال ہے۔ کمپنی انھیں تنخواہیں پاؤنڈ اور ڈالر میں دیتی تھی جو دنیا جانتی ہے ہر پیسے سے بڑے ہوتے ہیں اور ہمارے گھر والوں کو کیا ملتا تھا؟ روپے۔ مزے میں کون رہا؟ وہ جسے کوئی کام نہیں کرنا پڑا۔ گھر بیٹھے پیسے کی جگہ کاروبار میں کیا لگایا؟ آدمی۔ اور ڈالر اور پاؤنڈ کما لیے۔ ہم ایسی اصل رقم تھے جو محفوظ رہتی ہے۔ ہم کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ کہاوت ہے جس نے جہاز کی ٹنکی کا پانی ایک بار پیا ہے وہ اُسے سو بار پینے آتا ہے۔

لیکن ہم بھی ایک ــ می تھے۔ جو پینے پلانے والے تھے اور جن کی پرسر (خزانچی) سے دوستی ہو جاتی تھی اتنا زیادہ خرچ کر لیتے تھے کہ ہوم پورٹ پہنچ کر انھیں مشکل ہی سے کچھ ملتا تھا اور گھر والوں کو بھی، ہمیں بتایا جاتا تھا، اتنے ماہ سے کچھ نہیں بھیجا گیا ہے۔ اس پر ہم جھوٹا تعجب دکھاتے تھے جو ہمارا گورا ــ می پن ہوتا تھا۔

شپنگ آفس ہمارا مائی باپ تھا۔ سیلر دو ہی چیزوں سے ڈرتا ہے۔ ایک جہاز نہ دیئے جانے سے، دوسرا نلی کے خراب کیئے جانے سے۔ سمندر کے خراب ہونے کا اُس پہ اثر نہیں پڑتا۔ جہاز دینا نہ دینا شپنگ ماسٹر کے اختیار میں ہوتا ہے یعنی شپنگ آفس والوں کے ہاتھ میں۔

وہ دنیا ہی الگ ہے۔ جاؤ تو لگتا ہے میلے میں آ گئے۔ کیسے کیسے پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوتی ہے جن میں سے کچھ کے نام بھی بھول گئے ہوتے ہیں۔ یہ اپنا فلاں جہاز کا ساتھی ہے وہ فلاں کا۔ اس کے ساتھ ساؤتھ امریکہ گئے تھے۔ اُس کے ساتھ پرتگال۔ یہ اپنی طرف کا ہے، یہ اپنی طرف کا نہیں ہے۔ کوئی سائن اوف کر رہا ہے کوئی پھر سے نیا جہاز پکڑنے کے لیئے لائن میں لگا ہے۔

ہم لوگ سائن آف کرتے وقت شپنگ آفس میں جو جس کے لیئے لائے ہوتے تھے سگرٹ کا کارٹن، اسکاچ کی بوتل یا کوئی چھوٹی موٹی چیز جیسے پرفیوم وہ اس کے حوالے کر دیتے اور اگلی دفعہ اس سے بہتر تحفہ لانے کا وعدہ ضرور کرتے تھے ورنہ وہ چھٹیاں گذارنے کے بعد دوسرا جہاز دینے میں اڑنگے لگاتا۔

موبنر قسم کے سیلر گھگھیاتے ہوئے سائن اوف کرنے آتے تھے۔ شپنگ آفس میں یوں بھی سب ہی ان لوگوں سے زیادہ کھائے پئے ہوتے تھے، لمبے تڑنگے امریکی ایکٹروں جیسے نہ سہی نگراتنے ٹھٹھرے ہوئے بھی نہ ہوتے تھے جتنے یہ لوگ۔ اور انھوں نے ہی شپنگ آفس والوں کو بگاڑا تھا۔ اگر جہاز دیتے وقت کسی نے کہہ دیا ہے کہ میرے لیئے چائے کا سیٹ جرمنی کا لے کر آنا تو وہ وہی لے کر آتا تھا۔ یہ نہیں کہ کسی چھوٹی سی چیز سے ٹرخا دے۔ بس ڈر کے مارے مرے جاتے تھے کہ صاحب اگر ناراض ہو گیا تو جہاز کے لئے ہفتوں کراچی میں پڑے رہنا پڑے گا کیونکہ سائن اوف کر کے ان لوگوں کو چٹا گانگ اور نوکھالی کا رخ کرنا پڑتا تھا، اپنے خرچے پر۔ کمپنی سب کو صرف ہوم پورٹ تک اپنے خرچے پر واپس بھیجتی تھی۔ یوں پورٹ کے حساب

لہ زحمتی

سے ان کا ہوم کراچی بنتا تھا اور رہنے کا ہوم وہ تھا جہاں مسافر بن کر انہیں کسی دوسرے جہاز پر جانا ہوتا تھا۔ کولمبو ہوتے ہوئے چٹاگانگ اور پھر چٹاگانگ سے معلوم نہیں کدھر کدھر رلتے ہوئے فیری اور کشتیوں میں اپنے گھروں تک۔

ہمیں غصہ اس بات پر آتا تھا ہم گھر جاتے تھے تو دو تین مہینے آرام کی کھا کے آتے تھے اور یہ لوگ ادھر سائن اوف کیا نہیں کہ دوبارہ نیا جہاز سائن کرنے کے لئے کھڑے ہیں جیسے پیسہ ہی ان کے سب کچھ تھا۔ اُسے خرچ کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ ہم کریون اے اور پانچ سو پچپن پیتے تھے، یہ لوگ تمباکو اور وہ بھی گھر سے لایا ہوا۔ اُسی کی کاغذ کی بیڑی بنا کر پیتے تھے۔ خیر یہ تو الگ بات ہوئی۔ ہماری اپنی طرف کے ساتھی وہ جن کے گھر کراچی میں نہیں تھے ٹرین پکڑ کر اپنے اپنے شہروں کی راہ لیتے تھے۔ رلتے ان میں سے بھی اکثر تھے کیونکہ سب ہی کے گھر ریلوے مین لائن پر نہیں تھے اور انہیں باقی سفر لاریوں اور تانگوں سے طے کرنا پڑتا تھا مگر اس میں ڈوبنا ڈابنا نہیں ہوتا تھا اور وہاں پہنچنے پر گھر بھی اپنی جگہ ملتا تھا، یہ نہیں کہ سائیکلون اسے اُڑا کر لے گیا۔

میں فالکے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اچانک میری نظر اسی تختے کے دوسرے کونے کی طرف گئی جدھر زیادہ اندھیرا تھا۔

"یہ موہیئر تو نہیں ہے؟" میں نے دل میں سوچا۔ اور پھر بوجھل لہجے میں کہا "موہن۔ موہینور" میں اُسے اسی طرح پکارتا تھا۔

وہ بیٹھا شاید مونجھ کی رسی کا چھینکا بنا رہا تھا پتیلیاں رکھنے کے لئے، یا گھڑا رکھنے کا اینڈوا ہوگا۔ ایسے اُسے بہت سے کام آتے تھے۔ ایک گھوڑے کی دُم جیسی چیز وہ بنا کر مجھے بھی دے چکا تھا جسے کیل سے لٹکایا جا سکتا تھا اور جس کے کھلے ہوئے بالوں میں کنگھی اور کنگھے اوپر تلے اُڑسے جا سکتے تھے۔

موہن خاموش رہا۔

اپنا چائے کا مگ لے کر میں اس کے پاس جا بیٹھا "بھالو؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ سوٹ (چوٹ) ملا؟" میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

اس کی عادت تھی کارگو اتارتے چڑھاتے میں اگر ذرا سی بھی خراش آجاتی تھی تو بڑا واویلا کرتا تھا "ہم کو سوٹ ملا۔ اب نہیں بچنے سکتا، بڑا سوٹ ملا" اور حجم جیجڑ ہونے کی طرح یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جہاز پر ہر شخص اُس سے کتراتا تھا، حتیٰ کہ اس کے ساتھی بھی۔ وہ بولتا نہیں تھا اور اگر بولتا تھا تو پھر اس سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی تھی۔

اُس نے پیچھا چھڑانے والے لہجے میں کہا "ہمارا گھر کا کھوبورا اچھا نہیں ہے۔"

میں نے مگ کو منہ سے لگانا چاہا کہ اس سے زیادہ نہ پوچھوں کیونکہ سیکنڈ آفیسر والی بات صحیح تھی۔ کب اس کے گھر کی کھوبورا اچھی ہوتی تھی۔ اُدھر یا تو سائیکلون آتے رہتے تھے یا فیریاں ڈوبتی رہتی تھیں۔ اور ان لوگوں کی بھوک تو مشہور تھی ہی۔ خود میری ماں مجھے بچپن میں کھانے پہ ٹوٹ پڑنے پر بھوکا بنگالی کہا کرتی تھیں۔

پھر یہ لوگ گھر کھیتی باڑی کیوں نہیں کرتے تھے۔ سائیکلون سے بچنے کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے تھے۔ کم سے کم گھر ہی مضبوط بنوا سکتے تھے ایسے کہ ہوا سے اُڑ نہ جائیں۔ کشتیاں کیوں ڈوب جاتی ہیں؟ وہ زیادہ گہری، بڑی اور مضبوط نہیں بن سکتی تھیں؟ کیوں کوئی موسم کا حال بتانے والا یا ٹاور پر سے لائٹ کا سگنل دینے والا گاؤں میں نہیں رہ جاتا تھا کہ لوگوں سے کہے، اس وقت فیری میں مت چڑھو، سائیکلون آنے والا ہے۔ بس سب کو کمانے ہی کی فکر تھی۔ ایسا لگتا تھا وہاں جو تھے سب مچھیرے تھے یا ملاح اور باقی ادھر ہماری طرف نوکری کی تلاش میں ٹوٹ پڑے تھے

خود میرا گھر کراچی میں ہے، ایسی جگہ جو امیروں کا ایریا نہیں ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اور بہت سے علاقوں میں جہاں کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے۔ کراچی میں بھی اور دوسرے شہروں میں بھی موہیئر کی قوم کے کتنے ہی لوگ باورچی تھے یا ڈرائیور اور سدا اپنی تقدیر کو روتے رہتے تھے۔

لیکن مگے کو ٹھیک سے منہ سے لگا نہ سکا اور اسے تختے پر رکھتے ہوئے میں نے پوچھا "زیادہ بُری خبر ہے؟"

اُس نے اشارے سے ہاں کی۔

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ میں سمندر کو دیکھ رہا تھا جس میں ہوا بھرے ہوئے بادبانوں جیسے میلوں لمبے ابھار اٹھ کر ہماری طرف آ رہے تھے۔

پھر موہیئر رسی رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور وہیں تختے پر نماز پڑھنے لگا۔ مجھے لگا وہ نماز نہیں پڑھ رہا، رو رہا ہے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا اور سمندر کی خرابی کی وجہ سے پیٹ میں کچھ ہو رہا تھا۔ اُٹھ کر میں نے چائے سمندر میں انڈیل دی۔ اور کچھ اور کرنے کے لئے نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ موہیئر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کی خود سے بولنے کی آواز آئی۔

میں نے پوچھا "کیا کہا؟ مجھ سے کہہ رہے ہو؟"

"خیر خدا کی مرضی، جو ہونے سکتا۔"

پھر جیسے اُس سے نہیں رہا گیا اور میں، جو اس وقت رات کے نشے کے اتار کے بعد پتھر کی طرح بے حس تھا اس کے لہجے سے سہم سا گیا۔

"ہم بولا جو خدا کا مرضی۔ غریب آدمی کیا کرنا سکتا۔ ہم کو ایسا معلوم پڑتا اُن لوگ نے ہمارا بہن کا آدمی کو سوٹ (شوٹ) کر دیا اور ابھی بہت بہت آدمی مرا ہے۔ کچھ پہلے سائیکلون سے مرا اور باقی ابھی اپنا گھور (گھر) بھی نہیں ٹھیک سے بنا پایا تھا کہ اُس کو آدمی لوگ نے سوٹ کر دیا۔"

میں نے چونک کر کہا "کس آدمی لوگ نے؟"

"تمہاری طرف کا آدمی لوگ نے۔" اُس نے مجھ پر ایسی نظر ڈالی جیسے میں ہی تین سمندر پار اس کے ملک میں اس کی بہن کے آدمی اور دوسرے لوگوں کو شوٹ کر کے یہاں آن چھپا ہوں۔

لیکن اتنی دیر میں موہیئر جیسے خود سے باتیں کرنے لگ گیا تھا۔ "اب جنگ ہوگا۔ اس آدمی نے جو جرمن لائن کے جہاز پر تھا ہمارے کو سوب بتایا۔ بہت بُرا حال ہے اُدھر کا۔ غریب آدمی کیا کرنے سکتا، اپنا بی بی بچے کا جان بچانے کھاطر لڑے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ اب جنگ کو کوئی نہیں روک سکتا۔"

میرا دماغ ابھی تک پوری طرح سے کھلا نہیں تھا اور یوں بھی میں اپنی طرف کے اُن سیلرز میں سے نہیں تھا جو ذرا سیریس ٹائپ کے ہیں، شراب وراب نہیں پیتے، پیسہ جوڑ کر رکھتے ہیں اور جن کی اس بات سے مجھے چڑ سی ہوتی ہے کہ جب دیکھو ملک کے ٹوٹنے کا خطرہ لئے بیٹھے ہیں ــــ یہ قوم غدار ہے ــــ فلاں قوم میں یہ عیب ہے۔ فلاں قوم میں وہ عیب ہے۔

مجھے معلوم ہے پچھلے دنوں موہیئر کی طرف سائیکلون آیا تھا اور شاید اس کی وجہ سے یہ لوگ ہر وقت ریڈیو پر کان لگائے رکھتے تھے، چاہے پروگرام بنگالی میں ہو چاہے اردو ہندی یا انگریزی میں۔

اصل میں دنیا کے تمام سیلر ایک ہی قوم کے لوگ ہیں اور ان کی زبان بھی ایک ہے اور چاہے جو ریڈیو اسٹیشن لگ جائے ہر سیلر اپنے کام کی بات سن لیتا ہے اور ہر ملک کے گانے پر ناچ بھی سکتا ہے۔

لیکن خود میں ان سیلروں میں سے ہوں جن کو جب جہاز پر چڑھ جائیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ گھر والے آٹا کس ریٹ سے لیتے ہوں گے اور گوشت ہفتے یا مہینے میں کتنی دفعہ کھاتے ہوں گے مجھے تو سمندر پر زلزلے تک کا پتہ نہیں چلتا، ان چھوٹے موٹے سائیکلونوں کو کیا خاطر میں لاتا۔ آج بھی مجھ سے جب کوئی پولیٹیکل باتیں کرنے لگتا ہے تو مجھے وحشت ہوتی ہے۔ ان دنوں اگر کوئی مجھ سے کہتا تھا۔ "ریڈیو نہیں سنتے ہو ملک میں کیا ہو رہا ہے" تو میں کہتا تھا "میرا ریڈیو صرف وہ اسٹیشن پکڑتا ہے جہاں گانے لگتے ہوں، جیسے سیلون۔ خبروں والے اسٹیشن سنانے سے اس کا گلا خراب ہو جاتا ہے"۔۔۔ اب جو بوجھل سر سے میں نے غور کیا تو خیال آیا جہاز کا کرو کچھ عرصہ سے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک وہ جو ملک کی فکر میں گھلا جارہا تھا۔ دوسرا وہ جو پریشان تھا۔ موبیئر دوسرے گروپ میں سے تھا اور مجھے لگا یہ لوگ ہر وقت کانا پھوسی کرتے رہتے ہیں۔

اس دن میں نے پہلی بار موبیئر کی آنکھوں کو ڈبڈباتے دیکھا۔ شاید اس جرمن لائن کے جہاز پر اس کی طرف کے بہت سے سیلر تھے اور ان میں کوئی موبیئر کی جان پہچان والا بھی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسی نے موبیئر کو ساری بات بڑھا چڑھا کر بتائی ہے کہ پہلے سائیکلون آیا، سارے ٹین تیرا اڑا کے لے گیا اور جو کسر بھی رہی تھی اُسے حکومت کے آدمیوں نے پورا کر دیا یعنی جو امداد باہر کے ملکوں نے بھیجی تھی اس کی ریدا بیدی ہو گئی۔ پتہ نہیں وہ سامان کیا ہوا، کس کے کھٹے لگا۔ بہر حال ان ننگے بھوکے لوگوں تک نہیں پہنچا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تاکہ سب بنگالی لوگ بھوکا مر جائے"۔

یہ بات میری سمجھ سے اونچی تھی۔ ٹھیک ہے اس کے کہنے کے مطابق چاول، دال، کمبل ترپال مشرقی پاکستان کو باہر کے ملکوں نے بھیجے تھے۔ مغربی پاکستان نے نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے جیسے کاہل اور بےحس ہمارے لوگ ہیں، دونوں ہی طرف کے، اس حساب سے وہ مال گودیوں ہی میں یا ایئر پورٹوں پر پڑا گلتا سڑتا رہا ہوگا۔ لیکن یہ بات کہ حکومت یا مغربی پاکستان والے یہ چاہتے ہیں، سب بنگالی لوگ اس طرح بھوکے مر جائیں اور ایسے سائیکلون روز آئیں مجھے کچھ جچی نہیں۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے بولا "اب پتہ نہیں ہمارا بہن کس حال میں ہے۔ اُس کا بچہ کیا ہوا۔ ادھر سب ڈرا ہوا ہے۔ جو آدمی اودھر سے بھاگ کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے جادھر سیف ہے اُس کو مشین گن سے سوٹ کر دیتا ہے۔ لگتا ہے ہمارا بہن کا آدمی بھی اُسی ناؤ میں تھا جس پر اتنا پھائرنگ کیا کہ ناؤ الٹ گیا اور جس جس نے تیر کر بچنا چاہا اُس کو بھی سوٹ کر دیا۔ جو پہچان اس آدمی نے بتایا او وہ بالکل اومار بھائی کا تھا، بہن کا سوہر کا۔۔۔" آنسو اس کے گالوں پر بھی تھے اور حلق میں بھی۔

مجھے کچھ دیر خاموش رہنا پڑا۔ پھر میں نے پوچھا "تم نے اپنی بہن کو کب دیکھا تھا؟"

"تین سال ہوئے"۔

میں چونک پڑا۔ "تم ہر سال گھر جاتے ہو اور بہن کو دیکھنے بھی نہیں گئے۔ نہ وہ تمہیں دیکھنے آئی؟"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کوئی کسی ناسمجھ بچے کو دیکھتا ہے۔ پھر آنسو پونچھتا ہوا بولا "جہاز سائن اوف کر کے ہم بنگال گیا کب ہے تین سال سے۔ پتہ ہے اُدھر جانے آنے میں کتنا کھرچہ آتا ہے؟ اتنے میں تو تین مہینے بی بی بچہ ماں باپ گذارا کر ناسکتا ہے"۔

"اور چھٹیاں تم کہاں گذارتے ہو؟"

"کراچی میں مزدوری کر کے، کوئی سوٹا موٹا کام"۔

میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے اپنے کیبن میں جا کر لیٹ گیا۔

اُس دن کے بعد مجھے پتہ چلا موبیٹر کی قوم کے لوگ ہمیں کیا سمجھتے تھے۔ ویسا ہی جیسے ساؤتھ افریکا کے نیگرو وہاں کے گوروں کو سمجھتے ہیں کہ گنتی میں کم ہیں پھر بھی ملک کی ہر چیز پر ان کا قبضہ ہے۔ حکومت، فوج، نیوی، ایئر فورس سب پر۔ بلکہ میں غلط کہہ گیا۔ ساؤتھ افریکا کے گوروں کی طرح نہیں، ایسے جیسے ادھورو[1] کے زمانے میں کینیا کے نیگرو انگریزوں کو سمجھتے تھے کہ انگلینڈ سے ان پر حکومت کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں رہ کر زندگی بھر کماتے ہیں اور جاتے ہوئے ملک کو لوٹ کر بھی لے جاتے ہیں۔

"تو پھر؟" میں کھٹکا۔

اُدھر تو میرے بھی بہت سے رشتے دار تھے، پورب کی طرف کے۔ گرے پڑے قسم کے لوگ جو ہندوستان پاکستان بنتے وقت نزدیک ہونے کی وجہ سے بجائے کراچی آنے کے جا لنا، کشور گنج اور نجانے کہاں کہاں جا بسے تھے۔ لیکن اگر واقعی اس بیوقوف کی بات صحیح تھی اور بلا وار چھڑ گئی تھی تو اُن لوگوں کا کیا بنے گا؟ ان کے پاس لوٹنے کے لئے کونسا انگلینڈ تھا۔

اُن میں سے کچھ پہلے ہی بھاگ کر کراچی آ چکے تھے جب وہاں ملوں وغیرہ میں اسٹرائک ہوتی یا کسی اور قسم کا جھگڑا۔ اس سفر کے بعد ایک اور وو ئیج[2] ہمیں پورا کرنا تھا۔ پھر سائن اوف۔ یعنی تقریباً ۹ ہفتے ابھی ہمیں اس جہاز پر اور گذارنے تھے اور مجھے یاد نہیں پڑتا اتنا بُرا وقت کبھی سمندر پر گذرا ہو۔ لوگ خاموشی سے کام کرتے تھے اور فالتو وقت کیبنوں میں بیٹھ کر موبیٹر کی قوم کے لوگوں کو گالیاں دیتے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ بھی آپس میں ہمیں گالیاں دیتے ہوں گے۔

کراچی میں سائن اوف کرنے جب ہم شپنگ آفس گئے تو مجھے موبیٹر نظر آیا۔ خلاف توقع اس نے سلور کا وہ ڈرنکنگ سیٹ بھی اُس آدمی کو نہیں دیا جس کے لئے اُس نے اُسے خرید ا تھا۔ اس دن مجھے وہ کوئی دوسرا ہی موبیٹر نظر آیا۔ ذرا سی خماش آجانے پر "ہم کو بڑا سوٹ ملا" کہنے والا موبیٹر نہیں ـــــ اس کے ساتھی بھی اسی کی طرح اکڑے ہوئے تھے اور شپنگ آفس میں ہر ایک سے بڑے رعب سے بات کر رہے تھے، جس طرح جب کوئی آدمی طے کر لیتا ہے کہ یہ نوکری چھوڑنی ہے تو اپنے مالک سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے لگتا ہے۔

میں نے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے یونہی کہا "بھالو؟"

اُس نے کہا "ہم سمجھتا ہے اب تم آگے ہم کو بھالو نہیں کرنے سکتا۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

اُس نے کہا "کھو بور پڑ جائے گا۔ وقت آنے دو۔"

وہ اور اُس کے ساتھی جلد سے جلد مشرقی پاکستان پہنچنے کی عجلت میں تھے اس لئے اس سے آگے بات نہ ہو سکی۔

واقعی وہ وقت آیا جس کی پیش گوئی موبیٹر نے کی تھی اور مجھے خبر پڑ گئی۔ میرے اپنے کچھ دور کے رشتے دار اور پہچان والے مشرقی پاکستان میں مارے گئے۔ باقی وہاں کیمپوں میں پڑے تھے اور جب ان میں سے کسی کا خط مختلف ملکوں میں گھومتا گھماتا ہم تک پہنچتا تھا تو اس پر ٹکٹیں تو پاکستان ہی کی ہوتی تھیں لیکن اوپر سے بنگلہ دیش کا ٹھپہ لگا ہوا۔

وہ جنہیں وہاں کے ڈچ یا انگریز کہا جا سکتا تھا بُری گھڑی آنے سے پہلے ہی مغربی پاکستان پہنچ چکے تھے۔ باقی رہے ایرے غیرے وہ لٹے کھٹے آہستہ آہستہ کر کے کراچی پہنچ رہے تھے۔ کچھ کو وہاں کیمپوں میں زندگی کے بقیہ دن گذارنے تھے۔

مغربی پاکستان کا نام اب پاکستان ہو گیا تھا جیسے رتبے میں بڑھ گیا ہو۔ پہلے تو وہ پاکستان کا ایک حصہ تھا۔

---

[1] آزادی کی تحریک (سواحلی)

[2] جہاز کے سفر کا پھیرا

میں نے سمندر کی نوکری چھوڑ دی اور اُسی کام میں مجھے جوت دیا گیا جس سے مجھے نفرت تھی۔ ہینڈ لوم کا کام۔ صبح سے شام تک کرگھے پر بیٹھ کر تہمد کا کپڑا بنانا جو ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ وقت نے مجھے بھی سیاست میں دلچسپی لینا سکھا دیا تھا کیونکہ بنگلہ دیش سے بھارت کے راستے چھپتے چھپاتے وہاں پھنسے ہوئے ہمارے لوگ برابر کراچی پہنچ رہے تھے اور ان کی رام کہانیاں میرے کانوں میں بھی پڑتی رہتی تھیں۔ کس کس کے خاندان نے کتنے دکھ اُٹھائے تھے۔ کتنوں کو خود بنگالیوں نے بنگالیوں سے بچایا تھا اور کتنے وہاں سے کراچی آکر بھی خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے کہ وہی حال یہاں کا بھی ہونے والا ہے۔ جیسے ہر چیز لوٹ رہی تھی اور دنیا اپنے خاتمے پر آپہنچی تھی۔ اُن لوگوں کی زبان سے کومیلا، باڑیسال، نواب گنج قسم کے نام سُن کر مجھے اپنے بہت سے بنگالی ساتھی یاد آجاتے تھے۔ پتہ نہیں کون کس حال میں تھا اور بچا بھی تھا یا مارا گیا تھا۔

کبھی کبھی شہر میں کسی بنگالی سے ملاقات ہو جاتی تھی تو مجھے ایک طرح کی خوشی ہوتی تھی یہ وہ لوگ تھے جو کراچی اور سندھ میں آبسے تھے۔ میرے پوچھنے پر وہ بتاتے تھے "اُدھر کا حالت اچھا نہیں ہے۔"

اور میں دل میں کہتا تھا "تو اِدھر کا حالت کونسا اچھا ہے" —— فرق صرف انیس بیس کا تھا!

ایک دن اپنے کام سے بیزار ہو کر میں یوں ہی شپنگ آفس جا نکلا، جہاز چھوڑنے کے کئی سال بعد۔ دراصل باپ اور چچا سے میری تھوڑی کھٹ پٹ ہو گئی تھی اور میرے دل میں کچھ اور بھی تھا چچا میرا سسر بھی ہے۔ کوئی گھریلو بات تھی۔

وہاں کچھ پرانے چہرے نظر آئے، اسلم جو میرے ساتھ کسی جہاز پر چیپی تھا یعنی بڑھئی، نذیر جو سیرنگ تھا، دو ایک کیٹرنگ ڈیپارٹمنٹ والے، ایک ٹنڈل، بہت سے سیلر۔ سب کی شکلیں بدل گئی تھیں۔

ہجوم میں اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے میری نظر اچانک موہیئر رحمن پر پڑی۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ مجھے معلوم تھا ان لوگوں کو جہاز پر نوکری کے لیے ہوم پورٹ پورے نہیں پڑتے تھے اور کچھ نجانے کیسے کیسے بھی جہاز پکڑنے پہنچ جاتے تھے یعنی بغیر ویزے اور پاسپورٹ کے۔ ظاہر ہے وہاں خود کو انڈین بتاتے ہوں گے۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اُسے کندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا "موہیئر تم؟"

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ اُس وقت اس کے چہرے پر وہ غرور نہیں تھا جو جہاز سائن اوف کرتے وقت میں نے دیکھا تھا۔

"تمہارا بی بی بچہ بچ گیا؟ — ماں باپ؟ — بہن بھائی —؟"

وہ ہر سوال کے جواب میں سر ہلاتا رہا۔

پھر میں نے پوچھا "کسی کام سے کراچی آئے ہو؟"

"نہیں جہاز سائن کرنے۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔

"مگر تمہارا تو بنگلہ دیش بن گیا ہے نا؟" میں نے اُسی بے تکے پن سے کہا جس سے سُنا ہے ہندوستان میں ہندو اور سکھ، مسلمانوں سے کہتے ہیں —— "تمہارا تو پاکستان بن گیا ہے وہاں کیوں نہیں جاتے۔"

پھر میں نے بدلہ لینے والے انداز میں کہا "تم بنگلہ دیش نہیں گیا؟"

اُس نے میری بے رحمی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "امار بونگلہ دیش اے ٹی۔"

میں نے پوچھا "کیا؟"

اُس نے ایسے لہجے میں اپنی بات دُہرائی جیسے کسی ناسمجھ سے کہہ رہا ہو "امار بونگلہ دیش اے ہی ہے۔"

مختار

رفعت مرتضیٰ

اُس چھوٹے سے قصبے میں نہر کا اترنا بھی ایک بڑی خبر تھی۔ مگر یہاں بات نہر کے اترنے کی نہیں تھی اور نہ ہی گیلی ریت میں سیپیاں اور گھونگھے پانے کی حیرت آمیز خوشی کی۔

باجی، فردوس کو ڈھاک پہ بٹھائے اپنی سفید چنری سے سر ڈھکے نہر کے کنارے کھڑی تھیں اور سب سے پہلے انھیں نے اس گھڑسوار کو دیکھا تھا جو گہرے بھورے رنگ کے گھوڑے پر سوار اسے ہوا سے زیادہ تیز دوڑاتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُس کی سفید پگڑی کا شملہ سر سے اوپر اُٹھا ہوا، اصیل مرغ کی کلغی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی باجی نے چیخ کر مختار کو پکارا اور فردوس کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے سنبھالتی، ریت پر پھسلتی، بھاگتی نہر کے کنارے سے اُتر کر ہمارے پاس آ گئیں۔

"کیا ہے جیناں ہ؟" مختار نے ہاتھ میں پکڑے گھونگھے پرے ریت جھاڑتے پلٹ کر پوچھا۔ اسی وقت اس کی نظر بھی اس گھوڑسوار پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی وہ میری طرف لپکی اور مجھے گود میں اٹھا کر باجی کے پیچھے پل کی طرف بھاگی۔ باجی کی گود میں فردوس نے رونا شروع کر دیا تو انھوں نے جلدی سے پل کے نیچے دیوار سے لگ کر فردوس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگیں۔ مختار نے میرے کان میں سرگوشی کی "بس بچی چپ رہنا۔ گنڈے نے دیکھ لیا تو ٹانگیں چیر دے گا۔" میں نے سہم کر سر اُس کی چادر میں چھپا لیا۔ گھوڑسوار پل کے اوپر عین ہمارے سروں پر آ کر رک گیا۔ جوش میں آیا گھوڑا مسلسل ٹاپیں مار رہا تھا۔ گھوڑسوار بھی شاید ہمیں دور ہی سے دیکھ چکا تھا۔ پل پر کھڑے کھڑے اُس نے گاؤں کی ریت رواج کے مطابق براہِ راست تخاطب کی بجائے کسی اَن دیکھے سے مخاطب ہو کر زور سے کہا "ساری بی بیاں بالے گھروں کو جائیں۔ ساتھ کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کیا ہے ———" باجی کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ مختار نے مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اپنی بات ختم کرتے ہی گھڑسوار نے چخ چخ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا ہو گیا۔ میں مختار کی گود میں اور باجی فردوس کو لئے گرتی پڑتی نہر سے نکل کر بھاگیں۔ آدھے راستے میں حاضر بھیا ملے جو ہمیں ہی ڈھونڈتے آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے دور ہی سے چیخ کر کہا ——— جلدی بھاگو۔ اماں نے کہا ہے سب جنے شیخوں کی حویلی میں جائیں گے۔" شیخوں کی حویلی قصبے کے بیچوں بیچ ایک اونچے ٹیلے پر تھی، اور اس کے لوہے کے بڑے بڑے دروازے ہمیشہ بند رہتے تھے اور فصیل کے جیسی اونچی اونچی دیواروں میں لگے شیشوں کے رنگا رنگ ٹکڑے دھوپ میں چمکتے اپنی چکا چوند سے دیکھنے والوں کو اندھا کیا کرتے تھے۔

آج اس کا بڑا دروازہ کھلا تھا اور سب عورتیں بچے بالے اندر جا رہے تھے۔ حویلی کی چڑھائی چڑھتے ہوئے میں نے نیچے گلی میں دیکھا تو کتنے ہی مرد سر پہ بڑے بڑے پگڑ باندھے شملے میں منہ میں دیئے، پیتل اور لوہے کے مٹھوں والے ڈانگ لئے پھر رہے تھے۔ اماں نے ہمیں دیکھا تو سکھ کی سانس لی اور باجی سے فردوس کو لے کر گلے سے لگا لیا۔ مختار مجھے بھی گود میں لئے اماں

کے سامنے جا کھڑی ہوئی مگر اماں نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر پھر دوسری نظر نہ ڈالی۔ مختار نے میرا سر اپنی چادر کے اندر کیا اور بڑے کمرے کے دروازے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی "بس ہم دونوں یہاں ٹھیک ہیں۔ گنڈوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا ـــــ" میں اُس کی چادر کے اندر چھپی، تھوڑی دیر اُس کے سینے سے آتی آواز سنتی رہی، پھر اس مہربان سینے سے لگی سو گئی ـــــ یہ میری مختار تھی ـــــ!

مگر مختار یہی نہیں تھی ـــــ وہ بھی مختار ہی تھی جس نے سردیوں کی ایک دوپہر میں اُستانی مقبول کی چھڑی کی مار سے مجھے بچایا تھا۔ استانی مقبول نے سارے لڑکے لڑکیوں کو اردو کے پہلے قاعدے کے تیسرے صفحے کی نقل تختیوں پر کرنے کو کہا اور خود چھڑی ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگیں۔ ہر بار جب وہ اونگھ جاتیں اور اُن کا سر ایک جھٹکا کھا کر پھر سیدھا ہو جاتا تو اِدھر اُدھر سے ایک نہ ایک "ٹھی" کی آواز آتی جس کے ساتھ ہی استانی مقبول اپنی چھڑی دو تین بار میز پر مارتیں اور فوراً ہی پھر اونگھنے لگ جاتیں۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بیزار ہو کر اٹھیں۔ طاق میں رکھی تیل کی شیشی اٹھا کر مختار کے ہاتھ میں دی اور کہا ـــــ "لے ذرا میرے بالوں میں تیل ڈال دے اڑیئے ـــــ" اور خود بان کا پلنگ دھوپ میں کھینچ کر اُس پر چت لیٹ گئیں۔ مختار نے چارپائی کے سرہانے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنا تہبند کھینچ کر دونوں ٹانگوں کے بیچ کیا اور ایک ہاتھ سے تیل کی شیشی سے دوسرے ہاتھ پر تیل انڈیلا۔ پھر بوتل چارپائی کے نیچے پائے کے پاس کھڑی کر کے دونوں ہتھیلیوں پر تیل ملا اور اُستانی مقبول کے کھلے، کالے، گھنیرے بالوں میں ہاتھ ڈال دیئے۔ استانی مقبول نے ایک گہری سانس سکھ کی لی اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئیں۔ کافی دیر اُن کے بالوں میں تیل گھسنے کے بعد جیسے ہی مختار نے ہاتھ ہٹائے، اُستانی مقبول نے پہلو میں پڑی چھڑی سے چارپائی کا ڈنڈا بجایا!

"نی کُتیے تیرا ہاتھ کھڑ گیا ہے؟" مختار نے جلدی سے پھر سر گھسنا شروع کر دیا۔ میں بہت دیر سے چارپائی کے پاس ہی چٹائی پر اکڑوں بیٹھی مختار کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاید اس وقت وہ بھی گیارہ نہیں بارہ برس کی ہو گی مگر بڑے بڑے مضبوط ہاتھ پیر والی وہ لڑکی میرے لئے ایک پناہ گاہ تھی۔ مجھے نہیں معلوم اُس نے کب اور کیوں مجھے اپنی سرپرستی میں لینے کا فیصلہ کیا ہو گا مگر میں نے ہر اچھے بُرے موقعے پر خود کو اُس کی گود میں پایا تھا۔ وہ آس پاس رہتی تو میری دنیا سجی سجائی اور مضبوط ہوتی۔ وہ دور ہوتی تو میرے لئے زمین آسمان تاریک ہو جاتے ـــــ استانی مقبول کی ڈانٹ کھا کر مختار نے میری طرف دیکھا اور اپنی شریر آنکھوں سے ہنستی، اپنے بڑے بڑے سفید چمکدار دانت نکال کر مسکرا دی۔ مگر میرا صبر اب آخری حد پار کر چکا تھا۔ میں آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور جا کر استانی مقبول کے کھلے، کالے، گھنیرے بالوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر انہیں پوری طاقت سے کھینچ لیا۔ وہ ایک چیخ مار کر اٹھیں اور بھڑکے ہوئے وحشی جانور کی طرح میری طرف دیکھا۔ پھر اپنی چھڑی اٹھا کر پوری طاقت سے میرے سر کا نشانہ لیا۔ مختار نے چشم زدن میں جھپٹ کر مجھے گود میں لیا اور دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے سے نکلتے نکلتے اس کا پیر اُس کے تہبند میں الجھا اور ہم دونوں لوٹتی پوٹتی دہلیز پر آ گریں۔ اس کے ساتھ ہی اُستانی مقبول کا جوتا میری کمر پر آ کر گرا۔ مختار نے پھر مجھے اٹھایا اور گرد اڑاتی بھاگتی چلی گئی۔ شاہنواز کے باجرے کے کھیت کے پاس پہنچ کر اس نے مجھے ڈھاک سے نیچے کیا اور کھالے کے کنارے اُگی گھاس پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پھر مجھے بھی گود سے اتار کر گھاس پر بٹھاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ مارا ـــــ "چل کھوچی کدرے کی۔ ہن توں ہی دس تینوں بچا واں کہ خود مار کھاواں؟" ـــــ پھر زور سے ہنس دی۔ اسے ہنستا دیکھ کر میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر ہنستے ہنستے ہم دونوں ہی گھاس پر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد جب ہنسی رُکی تو اس نے کھڑے ہو کر اپنا تہبند ٹھیک سے باندھا اور بیٹھ کر کھالے کے ٹھنڈے برف ایسے پانی سے میرا منہ دھلایا۔ پھر اپنے ہاتھ پیر دھوئے، چادر ٹھیک سے سر پر اوڑھی اور مجھے

پھر سے اٹھا کر ڈھاک پر بٹھا لیا "چل فیر ہن چلئے ——— نئیں تے تیری ماں کھچری سارے پنڈ وچ شور مچاسی ——— کدر گئی میری پتری" ——— اس نے منہ بنا کر اماں کی نقل اتاری۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر خود ہی بولی "پر تیری ماں کھچری نوں تیری فکر تاں کوئی ناں ———"

مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ اماں کو بالکل ہی میری کوئی فکر نہیں تھی۔ میرے گال پہ چلتی جوں دیکھ کر وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹیں ——— "دیکھو مردار کو ——— کیسے کیڑے پڑ گئے ہیں اس کو۔ سارا سارا دن قطامہ کے ساتھ چپکی رہے گی تو اور کیا ہوگا ——— اماں ہے نا وہ اس کی ——— جا مر اُسی کے پاس جا ——— سر صاف کرا اپنا ورنہ اس گھر میں نہیں آنے دوں گی۔" اور اماں کی اس دھمکی سے ڈر کے مجھے یوں لگا جیسے اچانک زمین آسمان اندھے ہو گئے ہوں۔ میں نے جھپٹ کر اپنی ایک ٹانگ کی کانی گڑیا اٹھا کر سینے سے لگائی اور تیل کی کٹوری اور کالی لکڑی کی کنگھی اٹھا کر شیخوں کی حویلی کی طرف بھاگی جہاں دن میں مختار گھر کا کام کاج کیا کرتی تھی۔ میں حویلی کے چھوٹے دروازے سے جیسے ہی اندر گئی، سامنے ہی صحن کے بیچوں بیچ مختار منہ سر لپیٹے بیٹھی مرچیں کوٹ رہی تھی اور پورے صحن میں مرچوں کی دھانس پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی چھینکنا شروع کر دیا۔ مختار نے اپنی چادر کے ڈھاٹے میں سے اپنی ٹکٹکی سیاہ ہنستی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر ڈنڈا ایک طرف رکھ کر میرے پاس آئی اور اپنا ڈھاٹا ہٹایا "کیا ہے کھچری ——— کیوں آئی ہے؟" میں نے ڈر کی ہچکی لی اور اماں کی دھمکی حرف بہ حرف اسے سنا دی۔ اُس نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا، پھر ایک طرف منہ کر کے تھوک دیا۔ کچھ دیر کھڑی بیچ صحن میں رکھے موسل کو دیکھتی رہی پھر دور کونے میں دری پر بیٹھی چاول بینتی عنایت کے پاس گئی۔ "عنیتے میں جاندی آں ——— دھندا مکم کل تے سئی ———" اور مجھے گود میں اٹھا کر حویلی کے دوسرے صحن میں چلی گئی۔ شام تک میرا ایک ایک بال ہاتھ میں لے کر اس نے ساری جوئیں، اُن کے انڈے بچے میرے سر سے نکالے پھر حویلی کی کھوئی کے پاس لے جا کر دہی اور بیسن سے میرا سر دھویا۔ سوئی کی نوک سے میری کنگھی کا ایک ایک دانہ صاف کیا۔ پھر مجھے سامنے کھڑا کر کے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا ——— "جا ——— ہن جا کے اپنی ماں کھچری نوں دس دینا وچ ہور وی کوئی تیرا ہوندا اسی۔" پھر اپنے چوڑے چمکتے دانتوں سے مسکرا دی۔ میں نے بھاگ کر اُس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور طاقت بھر زور لگا کر اُسے بھینچ لیا۔

"چل جا ———" اُس نے تھوڑی دیر کے بعد اپنے گلے سے میرے ہاتھ نکالے۔ کنگھی اور دھلی دھلائی چمکتی ہوئی صاف کٹوری میرے ہاتھ میں دے کر کہا "چل جا ——— ہن گھر نوں جا۔" دروازے سے نکلتے نکلتے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس نے اپنے سر سے چادر اتاری ہوئی تھی اور اُسے جھٹک جھٹک کر ادھر اُدھر سے دیکھ رہی تھی۔

یہی مختار تھی جس کی بڑی بہن عنایت کی شادی کی خبر پورے گاؤں کو منادی نے گھر کی چھت پر چڑھ کر ڈھول بجاتے ہوئے دی تھی جس کے مانجھے کے دس دن میں باقاعدگی کے ساتھ ہر شام دلہن اور اُس کی سکھی سہیلیوں کے ساتھ شام کو جنگل میں پھول چننے جاتی رہی تھی۔ پھلاہیں اور کیکر کے پیلے پھول جنگل کی پگڈنڈیوں پر بکھرے نظر آتے ہی میں مختار کا ہاتھ چھوڑ کر جھولی میں پھول بھرنے بیٹھ جاتی۔ ساری لڑکیاں بالیاں پگڈنڈیوں، جھاڑیوں، درختوں کے پیچھے ادھر اُدھر پھیل جاتیں۔ دلہن جیسے ہی کسی جھاڑی کے پیچھے بیٹھتی دو چار لڑکیاں پہرہ دینے کھڑی ہو جاتیں۔ ہنسی مخول ٹھٹھا ہوتا رہتا۔ کوئی بڑی بوڑھی جو نگرانی کے لئے ساتھ ہوتی اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ بھی جاری رہتا مگر کوئی سنتا نہیں۔ کبھی لڑکیوں کی باتوں پر وہ بھی منہ پر چادر کا پلہ ڈال کر ہنسنے لگتی۔ آدھے پونے گھنٹے کے بعد پھر یہ ہنستا ہوا قافلہ واپس ہوتا اور اس پورے قافلے میں ایک میری ہی جھولی پھولوں سے بوجھل ہوتی۔ گھر کے پاس پہنچ کر مختار میری جھولی کے سارے پھول دروازے کے پاس گرا دیتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا کرتا جھاڑ کر صاف کرتی۔

"پھجری ـــــ توں کاتوں اپنے پھول چھکتی ہے ـــــ ساریاں توہگ موت کے 'ہولی ہوکے آندیاں۔ توں نگروں ہور بھاری ہوکے آندی ـــــ پھجری نا ہوئے تے ـــــ!" مگر اس کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود بھی میں اسی طرح جھولیاں بھر کے لاتی رہی اور وہ میری جھولی صاف کرتی رہی۔ نکاح والے دن منادی پھر اپنا ڈھول لے کے چھت پر چڑھ گیا اور بارات کے آنے کی اطلاع سب کو دی۔ دلہن کی رخصتی پر مختار سب سے زیادہ اونچی آواز میں چیخ چیخ کر روئی۔ اسے روتا دیکھ کر میں نے بھی اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی چادر منہ پر ڈالے بھوں بھوں روتی رہی۔ پھر جھک کر مجھے اٹھا لیا۔ اس کی گود میں آتے ہی میں نے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اُس نے اپنا سر تھوڑا سا میری طرف کر کے چادرے کی اوٹ سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی شرارت سے چمکتی، ہنستی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ نام کو بھی ایک آنسو نہ تھا۔ پھر اس نے اپنے چوڑے چمکتے دانتوں سے مسکراتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی ـــــ "توں کیوں روتی ہے پھجری ـــــ مینوں تاں روناں ضروری ـــــ نئی تے بے بے گُت پُٹ سی ـــــ" اور پھر سے چادر میں منہ چھپا کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ میرے دل پر رکھا بوجھ ایکدم ہٹ گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن بھینچ لی اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ جس کے ساتھ ہی کسی نے میرے سر پر زور سے دھپ ماری میرا قہقہہ حلق میں پھنسا رہ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو اماں کی غضبناک آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے۔ مختار کے ہاتھ اور بھی مضبوطی سے میرے گرد لپٹ گئے اور وہ مجھے لے کر ایک طرف ہٹ گئی۔

گھر جاتے ہوئے، راستے میں اماں نے میرے کان مروڑے ـــــ "بدذات کہیں کی ـــــ اس مردار کے ساتھ رہ کر یہ بھی ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اب جانا اُس اپنی اماں کے پاس، ٹانگیں نہ چیر دیں تو ـــــ"

مگر اس دھمکی کے عملی جامہ پہننے کی نوبت ہی نہیں آئی ـــــ آخری بار میں نے آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں سے اُسے ہمارے تانگے کے پیچھے پیچھے آتے دیکھا تھا اور اماں نے اچانک آگے بیٹھے ابا کی طرف سر موڑ کر غصے سے کہا ـــــ "کوئی اس کو کہتا کیوں نہیں ـــــ گھر جائے اپنے ـــــ" اور تانگے والے نے پیچھے مڑ کر زور سے کہا ـــــ "نی مختیارے، باؤجی کہندے نے توں گھر نوں جا" اور وہ وہیں گرمیوں کی پیلی دھوپ میں کچی سڑک کے بیچوں بیچ مٹی دھول میں پیر ڈبائے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ میں دونوں ہاتھ مختار کی طرف پھیلائے دھاڑیں مار مار کر روتی رہی اور بیچ کا فاصلہ بڑھتا رہا۔ پھر جیسے ہی اسٹیشن کی طرف جانے والی پکی سڑک کا موڑ آیا مختار بھی گاؤں کے ساتھ ہی پیچھے رہ گئی۔

اور یہ بھی مختار ہی تھی جس کو میں نے آنسوؤں سے بھیگے اپنے چہرے کو فراک کے دامن سے صاف کرتے ہوئے یاد کیا تھا اور بیچ صحن میں چارپائی پر پڑے حاضر بھیا کے پاس روتی، بین کرتی، دو دو ہاتھ سینے پر مارتی اماں بے ہوش ہو ہو کے گرتی تھیں اور بابا باہر بیٹھک میں چپ چاپ بیٹھے اچانک بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے اور اندرونی صحن کے دروازے میں آکر کھڑے ہو جاتے تھوڑی دیر کھڑے عجیب بے چارگی اور بے یقینی سے حاضر بھیا کی طرف دیکھتے رہتے۔ پھر چپ چاپ واپس چلے جاتے، اور میں ناک پونچھتی، آنسوؤں دھلا چہرہ صاف کرتی، مختار کے مضبوط ہاتھوں، اُس کے مہربان سینے، اُس کی ہنستی آنکھوں اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اندر سچے سچے موتیوں ایسے دانتوں کو یاد کرتی رہی۔ اُس کی ڈھاک پہ بیٹھ کے، اُس کی موٹی چادر کے اندر چھپ جانے میں کتنا سکھ تھا، حفاظت تھی، پناہ تھی ـــــ وہ ہوتی تو یوں نہیں ہو سکتا تھا۔ رہ رہ کے بس یہی بات میرے دھیان میں آتی اور میرے آنسوؤں کی لڑی اور بھی بے تار ہو جاتی۔

حفاظت اور پناہ کا یہی احساس پھول بنا میرے چہرے پہ کھلا تھا اور سینے کے اندر دل ایک جانی بوجھی خوشی سے تھرتھرا رہا

تھا جب ہمارا تانگہ اسٹیشن کی پکی سڑک سے گاؤں کی طرف جاتی کچی سڑک پر آیا مجھے یوں لگا جیسے، اتنے برس گذر جانے کے بعد بھی مختار وہیں بیچ سڑک کے کھڑی میری منتظر مجھے ملے گی اور مجھے دیکھتے ہی بھاگتی ہوئی آ کے مجھے گود میں اٹھا لے گی ——— پھر خود ہی اپنی سوچ پر ہنس دی۔ گاؤں ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی مکئی اور باجرے کے کھیت اور ہوا میں بسی تازہ سبزی کی مہک۔ رہٹ پر گول گول گھومتے بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن اور دور سے آتی چکی کی ہوک ——— ہمارے تانگے کی آواز کے ساتھ ہی ادھر ادھر سے کتنے ہی بچے بھاگتے چیختے چلاتے نکل آئے اور تانگے کے پہیوں، پائیدان سے لپٹنے کی کوشش ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ اتنے چہروں میں ایک بھی چہرہ پہچانا نہیں تھا اور سامنے پوری سڑک خالی پڑی تھی۔ دور ٹیلے پر شیخوں کی حویلی جیسے دم سادھے کھڑی تھی۔ صرف اس کی اونچی دیواروں پر لگے کانچ کے رنگ برنگے ٹکڑے سورج کی روشنی میں متحرک تھے۔ ڈاک بنگلے کی چڑھائی چڑھتے تانگے کے دائیں بائیں ٹاہلی اور سفیدے کے اونچے اونچے درختوں کے پتے کسی وقت ہوا ذرا سے چلتی تو جیسے تالیاں سی بجانے لگتے اور گھوڑے کے گلے میں پڑی گھنٹی کی ٹن ٹن سے ان کی تال مل جاتی کہیں درخت چھدرے ہو جاتے تو نیچے گہرائی میں بنے کچے گھروں کے خالی صحن یا صحن میں لگے ہینڈ پمپ کے نیچے کوئی بیٹھا نہاتا یا کپڑے، برتن دھوتا نظر آ جاتا۔ کسی وقت نہر کی جھلک دکھائی دیتی اور دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے اس کے پانی میں کتنے ہی ننگ دھڑنگ بچے چھلانگیں مارتے، پانی اچھالتے دکھائی دے جاتے۔ ہر مانوس منظر کے ساتھ ساتھ مختار سے ملاقات کا خیال اور خوشی میرے اندر لبالب بھرتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر سب پرانے نوکر، ملاقاتی، گاؤں کی عورتیں ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ نواب کا بوڑھا چہرہ مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا ——— "توں اینی وڈی ہو گئی کاکی ——— ؟" اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتا پھیرتا وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا "نواب چاچا، مختار کدھر ہے ؟" اور وہ اپنے بوڑھے حافظے پر زور دیتا رہ گیا۔ میں شاید کچھ اور کہتی مگر اسی وقت سلطان بھیا آ کر مجھے اندر لے گئے اور جاتے ہی اماں نے زور سے میری چوٹی کھینچی ——— "نامراد کیسے سارے آدمیوں میں سینہ تان کے کھڑی تھی ——— حیا بھی ہے کچھ کہ نہیں ؟" ——— میں چپ ہو کر پلنگ کے کنارے ٹک گئی۔

شام کو ڈاک بنگلے کے باغ میں بنی پکی صحنچی میں گاؤں کی عورتیں جمع ہو کر رات گئے تک ڈھولک بجاتی، ماہیے گاتی رہیں۔ صحنچی کی چھوٹی منڈیر پر بیٹھی میں عورتوں میں مانوس چہرے ڈھونڈتی تھی کہ اچانک میں نے جیواں کو پہچان لیا۔

"جیواں ماسی ——— مختار کدھر ہے ——— ؟" میں نے خوشی سے تھرتھراتی آواز میں پوچھا۔

"وہ بیٹھی ہے نا ادھر ——— نی مختیارا ایدر آ ——— بی بی بلاندی ہے تینوں ———" اور ایک دس گیارہ برس کی بچی اپنا تہبند سنبھالتی، عورتوں میں راستہ بناتی پاس آ گئی۔

"یہ نہیں جیواں ماسی۔ میں مختار کی بات کر رہی ہوں، مختار یاد نہیں ؟ ——— شیخوں کی حویلی میں دن کو کام کیا کرتی تھی وہ۔"

"نی جنتے ——— اے بی بی کیہڑی مختیارے نوں پچھدی پئی ——— ؟" جیواں نے پھر ایک عورت کو آواز دی۔

"مینوں کی پتہ ——— !" اس عورت نے سر پر چادر ٹھیک کر کے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

اچانک ڈھولک بجاتی لڑکی نے ناراض ہو کر ہاتھ روک دیا ——— "اے کی اے ——— ؟ یا تے گون گا ؤ یا فیر جاؤں چاؤں کر لو ——— جا میں نئیں وجاندی ——— پھڑ اپنی ڈھولکی ———" کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور ساری گاتی، تالیاں، ونٹے گھڑے بجاتی عورتیں چادریں سنبھالتی سیدھی ہو بیٹھیں۔ گاؤں میں کتنی ہی مختاریں تھیں مگر میری مختار کسی کو بھی یاد نہیں تھی۔

صحنچی کے بیچوں بیچ آرام کرسی پر بیٹھی اماں نے اپنا مہین جارجٹ کا دوپٹہ ایک چٹکی میں پکڑ کر ماتھے پر برابر کیا اور کہا

جیواں ـــ یاد نہیں۔ عنیتے کی چھوٹی بہن۔ قادرے کی کڑی ـــ!"

"او جگو جانی ـــ،" جیواں نے اماں کے پیروں پر سے ہاتھ ہٹا کے، ایک ہاتھ ماتھے پر مارا، پھر میری طرف دیکھا "او بی بی چھڈ پران ـــ اوس نوں مل کے توں کی کرسیں ؟" اُس نے ناگواری سے کہا اور پھر اماں کے پیر دبانا شروع کر دیئے جیسے اپنی طرف سے بات ختم کر دی ہو۔ ایک دو عورتوں نے دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسنا شروع کر دیا۔

"اُسے کسی نے نہیں بتایا میں آئی ہوں ـــ؟" میں نے جیسے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"اُدھر ڈاک بنگلے کے نیچے ہی تو رہتی ہے وہ۔ بی بی اُسے ملنا ہوندا تے آپی آپ آجاندی ـــ"

"ہور کی ـــ اپنے کان بولے ـــ اپنے کان بولے ـــ سارا پنڈ جان گیا۔ اوس او تری نے نئیں سنیا سی؟" ایک عورت نے زور سے کہا۔

"توں بی بی جی نوں دسیا؟ قادرا وی تے مر مرا گیا ـــ"

"ہور عنیتے دی اپنے کسم تے کرٹے کڑی توں چھڈ کے بچ گئی ـــ" مجمع میں سے ایک اور آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی جیواں نے اماں کے کان میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ اچانک اندھیرے سے نکل کے دو سترہ اٹھارہ برس کے لڑکے آ کھڑے ہوئے۔

"سلام بی بی جی ـــ،" آگے کھڑے لڑکے نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اماں کو سلام کیا۔

"اینا جیرا کریانے والے کا بچہ ہے بی بی ـــ ساتھ وچ باغ دے مالی کرم داد دا پتر۔ دونوں ساتھ کے گاؤں میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے ہیں۔" جیواں نے تعارف کی رسم ادا کی۔ پھر لڑکے کی طرف دیکھا "کی کم ہے کاکا توں ایس ویلے ایتھے کی کرن توں آیا؟"

"جیواں بے بے ـــ دن میں تو کام پر جاتا ہوں آ نہیں سکتا ـــ اپنے بی بی حاضر سے ملنے آیا ہوں ـــ"

اماں ایک دم جیسے سکتے میں آ گئیں۔ پھر جیواں کا ہاتھ جھٹک کر اٹھیں اور تیز تیز اندر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اٹھی اور بنگلے کے پیچھے جا کر باغ کی منڈیر سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ نیچے کچھ نہ تھا سوائے اندھیرے غار کے جس میں ایک دیئے کی لَو کہیں کسی طاق میں لرز رہی تھی۔ میں کچھ دیر یونہی لٹکی جھانکتی رہی پھر زور سے آواز دی "مختار ـــ"، مگر اس اندھیرے غار سے ابھر کے کوئی جواب اوپر نہ آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اترنے لگے تو میں منڈیر سے پیچھے ہٹی اور اندر کی طرف چلی گئی۔ سامنے گیٹ کی طرف سے نواب ہاتھ میں لالٹین لئے چلا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو ٹھٹھک کے کھڑا ہو گیا۔ پھر لالٹین اوپر کر کے میرا چہرہ دیکھا ـــ "کیا ہے بی بی؟ توں اس ویلے باغ وچ کی کردی پئی ایں؟ اندر جا ـــ"

میں نے بھرے گلے سے کہا "نواب چاچا نیچے کے گھر میں جو مختار رہتی ہے ناں ـــ میں اُسی مختار کو پوچھتی تھی۔ صبح اُس کو بلا کر لانا۔ کہنا میں آئی ہوں ـــ" نواب لالٹین کی روشنی میں غور سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر کچھ بھی کہے بنا خاموشی سے اپنا سر ہلا دیا۔

صبح دس بجے میری مختار گیٹ سے بنگلے تک آتے راستے پر دو رویہ لگے سفیدے کے اونچے اونچے درختوں کے سائے تلے آہستہ چال چلتی میری طرف آئی۔ مگر جو بھرپور جوان عورت جوانی کی مستانہ چال چلتی میری طرف آ رہی تھی وہ میری مختار نہیں ہو سکتی تھی۔ لال رنگ کے دھاری دار لاچے کے دونوں لڑ کمر سے نیچے آ کے جیسے زمین کو چھو کر اوپر اُٹھ جاتے تھے اور سر آگے اٹھتے پیر کے ساتھ اس کا لاچہ سامنے سے کھل جاتا اور موٹی موٹی سانولی پنڈلیاں گھٹنوں تک چھب دکھا کر چھپ جاتیں۔ وہ قریب آ کر میرے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔

"توں مینوں کیوں بلاندا ہی؟ کی کم نیں توں میرے نال ؟" اُس کے اس روکھے پھیکے بغیر کسی تمہید کے بات کرنے کے انداز نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر میں نے کہا۔

"میں ہوں مختار ـــ تمہاری بینو ـــ تمہیں یاد نہیں ؟" میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا اور چپ ہو کر

جیسے پر امید اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں — پتہ سی مینوں —" اُس نے چادر پیچھے پھینک کر اپنی قمیض کے کھلے گلے کے بٹن بند کرنے شروع کر دیئے۔

"مختار، استانی مقبول اب بھی اپنے گھر پر بچوں کو پڑھاتی ہے کیا؟" میں نے اُس کے دل میں کسی پرانی سہانی یاد کو جگانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔

"مر گئی کنجری — ایک دن سوٹی تے فیر اُٹھی ناں — کہندے اوس دے کھسم گلا گھٹ کے مار سٹیا —" اُس نے بیزاری سے کہا اور بات ختم کرتے کرتے پورا منہ کھول کر جمائی لی۔

"کنجریاں ساری رات گوں گاندیاں رہیاں۔ نہ سوتیاں نہ سون دتا کسی نوں —" میں اب اس بات کا اُسے کیا جواب دیتی بے بس اُس کی صورت دیکھتی رہی۔ کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر اپنے تہبند کے اندر ہاتھ ڈال کر رانیں کھجاتی باغ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اے کنجر مالی تاں مینوں ہتھ نئیں لانے دیندا — میں نیم دی چھٹی اک توڑلاں؟" — میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے جلال دین کو آواز دی۔ "جلال دین چاچا مختار کو نیم کی ایک ٹہنی توڑ دو —" وہ میری بات سن کے بھی جیسے انجان بنا بیٹھا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد خود ہی اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا نیم کے درخت کے پاس جا کر ایک ٹہنی کھینچ کر توڑی اور لا کر مختار کے سامنے پھینک دی اور کچھ بھی کہے بنا واپس چلا گیا۔ اسی وقت بابا کا اردلی بھی کہیں سے ٹہلتا ٹہلتا آنکلا اور آہستہ آہستہ چلتا کن انکھیوں سے مختار کو تاکتا پاس سے گزرا۔ مختار نے جھک کر نیم کی شاخ اٹھاتے ہوئے اردلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُسے آنکھ ماری اور ایک عجیب مبہم سا اشارہ کیا۔ پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"روز کیکر دی مسواک — روز کیکر دی مسواک — کنجر منہ دا مزا ای پھیکا ہو گیا ای —" ایک ہاتھ سے اس نے سارے پتے نوچ کر نیچے گرا دیئے اور خالی ڈنڈی توڑ کر تین ٹکڑے کر دیئے۔ دو ٹکڑے اس نے چادر کے پلے میں باندھے اور تیسرا منہ میں ڈال لیا۔

"فیر میں جاواں کاکی —" اُس نے مسواک دائیں بائیں دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ میں نے کچھ کہا نہیں بس آہستہ سے سر ہلا دیا اور وہیں کھڑی اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ مجھے اچانک یوں لگا جیسے وقت کا نٹڈی دل میرے وجود پر سایہ کئے چھتنار درخت پر اتر آیا ہو اور اُس کی کونپل شاخوں اور نرم ہرے پتوں کو چاٹ کر ننگا کر گیا ہو — میں اچانک بے پناہ ہو گئی۔

چند قدم آگے جا کر وہ پھر پلٹی اور دانتن منہ سے نکال کر بولی — "اپنی ماں کنجر —" ایک دم ہی اُس نے اپنی بات روک دی اور خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی — پھر ان خالی آنکھوں میں وہی بچپن کی شرارت بھر گئی اور اُس کے چمکتے ہوئے چوڑے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور موٹے موٹے ہونٹوں سے اس کے سفید موتیوں ایسے چوڑے چوڑے دانت جھلکنے لگے: "اپنی ماں کھچری نوں جا کر کہنا — مختار سلام کہندی سی —" اور پھر مڑ کر تیز تیز چلتی گیٹ سے نکل گئی۔ ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ اس کے دوپٹے کے لڑ دائیں بائیں لہراتے جھلکتے۔ الھڑپن لیتے اُس کی چال کو اور بھی مستانہ بنا رہے۔ باغ کی منڈیر سے جھانک کر میں نے دیکھا مختار وہی مستانہ چال چلتی، سڑک کی ڈھلان اترتی اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی — کبھی منہ سے مسواک نکال کر منہ ایک طرف کر کے تھوک کی پچکاری چھوڑتی اور پھر سے مسواک منہ میں ڈال کر دائیں بائیں دانتوں پر ملتی نیچے ہی نیچے جاتی رہی۔

سامنے سے ایک سولہ سترہ برس کا لڑکا چڑھائی چڑھتا اوپر آ رہا تھا — مجھے دیکھا تو وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ "سلام بی بی — میں رشید ہوں، حاضر بھیا سے کہو ماسٹر نثار دا پتر آیا ہے ملنے کو —" میں جواب دیئے بنا پلٹی اور اندر چلی گئی۔

اُس رات بھی گاؤں کی عورتیں صحنچی میں جمع ہو کر گاتی بجاتی رہیں مگر اماں اندر سے باہر نہیں آئیں اور دور نہر کے کنارے کوئی بودا کیے حاضر بھیا کو آوازیں دیتا رہا۔

روشنی کا سفر

ضیاء بٹ

بلبوں کی روشنی کچھ اتنی تیز تھی کہ زمین پر پڑی ہوئی سوئی تک نظر آرہی تھی۔ مگر اوپر فضا میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا اور یوں "چراغ تلے اندھیرا" والا محاورہ متروک ہو کر رہ گیا تھا۔ سامنے سٹیج پر قوال حضرات اپنا اپنا ساز سُر میں کر رہے تھے محلے کے چند اوباش اور تلنگے سروں پر سبز پٹکے باندھے پنڈال میں اہلِ محلہ کی نشستوں کا اہتمام کر رہے تھے۔ شریف، معزز اور سرکردہ لوگوں کو ان کے مقام کے مطابق جگہ مہیا کی جا رہی تھی اور میں حیران تھا کہ تلنگوں کو لوگوں کی کتنی پہچان ہوتی ہے جو لوگ کسی گنتی میں نہیں تھے وہ از خود دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔

میر محفل فجا پنج مین تھا۔ اس کے ڈیل ڈول سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ جوانی میں واقعی پانچ جوانوں کی طاقت رکھتا ہوگا ——— ہوا یوں کہ چند روز پیشتر اس کی جیب کٹ گئی۔ فجا پنج مین نے اپنی سابقہ شہرت اور تعلقات کی بنا پر مختلف علاقوں کے جیب کتروں کے سربراہوں سے رابطہ قائم کیا اور نتیجتاً اس کی پانچ ہزار کی رقم واپس مل گئی ——— کیسا زمانہ ہے! شریفوں کی نسبت اچکوں میں ایک دوسرے کے لئے زیادہ مروت ہے ——— رقم ملنے کی خوشی میں آج کی محفل محلہ کے ان تلنگوں کی فرمائش پر برپا تھی جن کے ہاتھ میں پنڈال کا انتظام تھا۔

قوالی شروع ہوئی۔ عشقیہ غزل تھی۔ رفتہ رفتہ ہارمونیم کی آواز، طبلے کی تھاپ، تالیوں کی گونج اور قوالوں کی لَے زیادہ سُر میں ہوتی چلی گئی اور منتظمین جھوم جھوم کر نوٹ نچھاور کرنے لگے۔ عقلمند لیکن عشق سے عاری لوگ منتظمین کے جوش اور قوالوں کی حرکات سے محظوظ ہو رہے تھے۔ سادہ اور تہی دست حاضرین دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی "واہ۔ واہ" کا نذرانہ پیش کر رہے تھے پڑھے لکھے حضرات کبھی کبھی کسی اچھے شعر پر ان تہی دستوں کے ہم رائے ہو جاتے۔

جب دوسری غزل ختم ہوئی تو ایک تھڑے سے آواز آئی "یار کوئی نعت سناؤ"۔ یہ بابا ماہیا کی آواز تھی جس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو اکٹھا کر کے ایک پٹکے سے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ——— تیسری بار پنجابی کلام شروع ہو گیا "مُڑ نہ عاشقاں نوں مہناں ہائے تبھانی بینی آں ——— ہیلوں اگ اپنی جھگی نوں لائی بیٹی آں"۔ تلنگوں نے اپنی آنکھیں بند کرکے گردنیں جھکائے، بازوؤں کو ہوا میں بلند کئے، اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو اوپر کھولتے اور قدموں پر رقص کرتے ہوئے ایک ساتھ "ہائے" کا نعرہ بلند کیا اور پھر نوٹوں کی بارش ہونے لگی اور مجھے پہلی دفعہ مادری اور قومی زبان میں واضح فرق کا احساس ہوا۔

لاشعوری طور پر میری نگاہیں بابا ماہیا پر پڑیں۔ وہ ایک گٹھڑی بنا تھڑے پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ میں اسے پچھلے بیس سال سے جانتا تھا۔ اس سے میرا غائبانہ تعارف محلے کے ایک بزرگ نے کرایا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں کالج سے واپس آرہا تھا۔ بابا ماہیا ٹوکرے میں نہایت صاف ستھرا سنڈے خانی انگور رکھے آواز لگا رہا تھا "بچے میٹھے موتی

بہشتی پھل چھ روپے سیر" میں نے بابا ماہیا سے آدھ سیر انگور طلب کئے۔ انگور دینے سے پہلے اس نے مجھ سے تین روپے مانگے میں نے دے دیئے۔ بابا ماہیا مجھ سے پیسے لے کر انگور دینے کی بجائے اپنی جگہ سے اٹھا۔ ساتھ ہی دیوار پر پڑے دو برتن اٹھائے اور سامنے والی دکان پر چلا گیا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن وہ جلد ہی واپس آگیا۔ ایک برتن میں دہی اور دوسرے میں دودھ تھا۔ دہی والا برتن اس نے ایک کتے اور دودھ والا برتن ایک بلی کے آگے رکھ دیا جو تھوڑے ہی فاصلے پر بابا ماہیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے ہاتھ دھوئے اور میرے لئے انگور تولتے ہوئے بولا "بابو، صبح سے بھوکے تھے۔ میں نے سوچا آپ کو انگور دینے سے پہلے ان بے زبانوں کا کچھ بندوبست کر لوں۔"

میرے لئے یہ ایک انوکھا مشاہدہ تھا جس کا ذکر میں نے محلے کے ایک بزرگ سے کیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا بابا ماہیا کی بات کرتے ہو؟" پھر اس نے بابا ماہیا کا غائبانہ تعارف اس طرح کرایا "جوانی میں بڑا حرامی تھا۔ جوا، شراب، بھنگ اور چھینا جھپٹی اس کے محبوب مشغلے تھے۔ سارا دن اگر کوئی واردات نہ ہوتی تو اندھیرا ہوتے ہی کسی نہ کسی سپاہی کے سر سے پگڑی اتار کر بھاگ جاتا۔ ایک دن والد مرحوم نیویں مسجد میں نمازِ عشا ادا کرنے کے بعد گھاٹی سے اُترے۔ انھوں نے دیکھا کہ بابا ماہیا باغ کی ایک نکڑ میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔ سخت سردی تھی لیکن بابا ماہیا صرف قمیص اور دھوتی میں اپنے شکار کی تلاش میں تھا۔ والد مرحوم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ او ماہیے، کتنا بدبخت ہے تو، اس سردی میں جب سب لوگ اپنے گھروں میں بیوی بچوں کے ساتھ آرام کر رہے ہیں تو کسی کارِ بد کے لئے یہاں ٹھٹھر رہا ہے۔ کم بخت محنت مزدوری کر اور اپنا گھر بسا تاکہ تجھے معلوم ہو کہ عزت کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ جوانی سدا نہیں رہتی بے وقوف!"

"بہت اچھا میاں جی" بابا ماہیا بولا۔

میرے والد مرحوم بڑے نیک اور شب بیدار آدمی تھے۔ بڑے چھوٹے سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی بات کا بابا ماہیا پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ اس نے اگلی صبح ہی ٹوکرے میں فروٹ بیچنا شروع کر دیا۔ چند سال بعد اس کی شادی بھی ہو گئی اور ہمارے ہی محلے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ بظاہر میاں بیوی کی زندگی ٹھیک گزر رہی تھی لیکن ایک دن اہلِ محلہ نے عجیب تماشہ دیکھا۔ بابا ماہیا کی بیوی جو بڑی صحت مند تھی۔ ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے ہاتھ میں ماہیا کا گریبان پکڑے بلند آواز سے کہہ رہی تھی "تو ایک دن اور ایک رات کہاں غائب رہا ہے؟ مجھے ہر روز دو روپے چاہئیں، خواہ کہیں سے لاؤ۔ اس کے بعد جہاں جا ہو جاؤ۔" غالباً چور نے چوری تو چھوڑ دی تھی لیکن ابھی ہیرا پھیری سے باز نہیں آیا تھا۔ بابا ماہیا بالکل خاموش اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ بیوی نے ڈنڈا اور گریبان ایک ساتھ چھوڑ دیئے۔ بابا ماہیا نے وہاں جمع اہلِ محلہ کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ فوراً وہاں سے کھسکنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد بابا ماہیا فروٹ بیچنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ کوئی سات آٹھ سال بعد اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بے چاری کو کوئی اولاد نصیب نہ ہوئی۔ بیوی کے مرنے کے بعد بابا ماہیا کی زندگی یکسر بدل گئی۔ وہ نہایت خاموش طبع ہو گیا۔ البتہ کبھی کبھی محلے کے بچوں سے پیار کرتا دکھائی دیتا۔ وہ چپکے سے کسی نہ کسی تنگ دست کی مدد بھی کر دیا کرتا۔ کتوں اور بلیوں کا بھی خیال رکھتا۔ آخر مکان چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔"

اس تعارف کے بعد میں جب بھی بابا ماہیا کو دیکھتا ایک دو بلیاں اور ایک دو کتے اس کے پیچھے پیچھے ضرور چل رہے ہوتے اور مجھے خیال آتا کہ مشترکہ مفاد کس طرح دوستی اور دشمنی کا امتیاز ختم کر دیتا ہے۔ کتے اور بلیاں اس سے اس طرح مانوس تھیں جس طرح بچے جو سودا لینے میں کم اور چونگا مانگنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں۔

تیسری قوالی بھی ختم ہونے والی تھی اور جوں ہی قوالوں نے آخری بول دہرائے بابا ماہیا نے فجا پنج مین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "پہلوان یار کوئی نعت سنوا دو۔"

فجا پنج مین نے پہلے بابا ماہیا کی طرف دیکھا اور پھر قوالوں کو نعت کے لئے کہا۔

نعتیہ کلام شروع ہوا "تو ہے دنیا کا والی، میری جھولی ہے خالی" ——— محفل پر مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ تلنگے جو چند لمحے پہلے بھنگڑا ڈال رہے تھے نہایت مؤدب اپنی اپنی جگہوں پر گردنیں جھکائے بیٹھ گئے۔ ان بازاریوں کے دلوں میں نبی کریمؐ کے لئے سچے اور سُچّے جذبات دیکھ کر مجھے پیشہ ور واعظ یاد آنے لگے ——— محفل کا رنگ یکسر بدل چکا تھا، نعتیہ کلام آگے بڑھتا رہا اور حاضرین کیف میں ڈوبتے چلے گئے۔ وقفہ وقفہ سے سبحان اللہ، اللہ اکبر اور یا رسول اللہ کی بے اختیار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نعتیہ کلام اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ قوالوں نے مدھم آواز میں "تو ہے دنیا کا والی ——— میری جھولی ہے خالی ——— اسے بھر دیا محمدؐ!" دہراتے ہوئے آواز اور ساز کو ایک ساتھ ختم کرتے ہوئے بابا ماہیا کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا مگر نعت کے آخری الفاظ کے تعاقب میں اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔

خاک کے دریا

سلطان جمیل نسیم

امداد حسین نے مکمل رپورٹ پڑھنے کے بعد چشمہ اتار کے میز پر رکھا اور ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کے اپنے پی اے کو مخاطب کیا۔ مسٹر منظور سے کہو کہ مجھ سے آ کر ملیں ــــــ مگر ٹھہرو۔ پہلے بڑے صاحب سے میری بات کراؤ اس کے بعد مسٹر منظور۔" بڑے صاحب کا فون آنے سے پہلے امداد حسین نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھا۔ چشمہ اٹھا کے اچھی طرح آنکھوں پر جمایا پن اسٹینڈ سے قلم اٹھا کے ہاتھ میں لیا ــــ فائل کھول کے رپورٹ کی اُن سطروں کو پھر بہ غور دیکھا جن کو سرخ پنسل سے نشان زد کیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عجلت کے ساتھ ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو ــــ مزاج بخیر سر ــــ پارٹی میں کل بہت اچھی تقریر تھی۔ فی البدیہہ اور ٹو دی پوائنٹ ...... جی ہاں سر ــ جی سر سب ہی تعریف کر رہے تھے ...... جی ہاں ...... جی میں نے سنا ہے ...... مگر سر ...... آج اخبار میں بہت مختصر کر کے دیا ...... جی ...... جی ہاں تصویر بہت اچھی ہے ...... سر وہ ...... اُس لڑکے کی رپورٹ بنوائی ہے ...... سر جب تک انتظامیہ پر دباؤ ڈال رہا تھا ہم خاموش تھے ...... جی صاحب ...... یہی تو بات ہے سر ...... یہ تو ناقابلِ معافی جرم ہوا نا ...... نہیں سر ...... اپوزیشن کے ایسے لیڈر کو ادارے کے ایسے معاملات کو تنقید کے لئے اُکسایا جس کو گورنمنٹ بھی ...... جی ہاں یہی مقصد تھا ...... جی سر میں وہ رپورٹ ...... سر میرا خیال ہے یہی موقع ہے ...... نہیں صاحب کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا ...... جی ...... جی ...... سر لیبر کورٹ میں ہم دیکھ لیں گے ...... نہیں سر ۔ اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے ...... جی سر ...... میں نے مسٹر منظور کو بلایا ...... آپ فرمائیں تو فائل خود لے کے حاضر ہو جاؤں ...... بہتر ہے سر ــ جی ہاں ...... بس ابھی پانچ سات منٹ میں منظور آپ کے پاس حاضر ہو جائیں گے ...... جی سر ...... سر وہ آج صبح میں نے گھر بھجوا دیا ہے ...... جی ...... نہیں سر آپ بیگم صاحب کو فون کر کے معلوم کر لیجئے اگر پسند نہ ہو تو دوسرا آ جائے گا ...... کوئی پرابلم نہیں ہے سر ...... جی ...... تھینک یو سر ......" ٹیلی فون بند کر کے امداد حسین نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھے کو اس طرح صاف کیا جیسے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بھی پسینہ آ گیا ہو۔

دو منٹ کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ "آیئے مسٹر منظور ــ بہت اچھی رپورٹ لکھی ہے آپ نے۔ ابھی میری بڑے صاحب سے بات ہوئی۔ میں نے آپ کی اور اس رپورٹ کی بہت تعریف کی ــ یہ خبیث تو بالکل ہی سر پہ سوار ہو گیا ہے۔"

"بس صاحب۔ قدرت نے یہ ایک موقع فراہم کر دیا ہے ہمیں ــ شامت ہی آئی تھی جو بندے علی کو بلوا لیا۔ اگر بڑے صاحب اس رپورٹ کو انڈورس کر دیں تو اسے فوراً ہی گرفتار کرایا جا سکتا ہے پھر اس کا ٹرمینیشن بھی آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ لیکن زیادہ پُرجوشی سے کام نہ لیجئے ــــ ابھی بڑے صاحب کو بھی میں نے یہی بات بتائی۔ وہ پوچھنے لگے کہ اس ایکشن سے لیبر اَن ریسٹ کی کیفیت تو پیدا نہیں ہو جائے گی۔"

"ارے نہیں صاحب۔ لیبراَن ریسٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنے سرغنہ کے ہتھکڑیاں لگے دیکھ کر حالی موالی سہم جائیں گے۔"

"لیکن وہ بھی کچی گولیاں تو نہیں کھیلے ہیں۔ کچھ وکیل بھی ہائر کر رکھے ہیں انھوں نے ...... پھر لیبر کورٹ ہے ــــــ"

"وہاں کچھ نہیں ہوگا صاحب۔ قانونی پوزیشن ہماری پکی ہے۔"

"سوچ لیجئے لیبر کورٹ والے ہمارے اثر میں آنے والے نہیں ہیں۔"

"میں نے بندوبست کر لیا ہے کہ اول تو یہ لوگ لیبر کورٹ تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے اور بالفرض پہنچ بھی گئے تو وہاں ہماری لیگل سائڈ بہت اسٹرانگ ہوگی دوسرے ہم ان کے خلاف دوسری عدالتوں میں اتنے مقدمے کھڑے کر دیں گے کہ ان کی یونین کا سارا فنڈ برابر ہو جائے گا ــــ"

"اور اگر اُن لیڈر صاحب نے ــــــ کیا نام ہے ان کا؟"

"بندے علی۔"

"ہاں بندے علی نے بیان داغنے شروع کر دیئے ہمارے خلاف......"

"یہ روٹین کی بات ہوگی ــــ حکومت کے خلاف بھی بیان دیتے رہتے ہیں۔"

"اگر اُن لوگوں نے اسمبلی میں یہ مسئلہ کھڑا کر دیا۔؟"

"میرا خیال ہے اختر کو اتنی امپورٹنس یہ اپوزیشن والے دیں گے نہیں۔"

"سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے کوئی ویک پوائنٹ نہیں رہنا چاہیئے۔"

"ہم چاروں کھونٹ مضبوط ہیں صاحب۔"

"یہ بھی سوچیئے کہ اگر اسٹرائک کا سلسلہ شروع ہو گیا تو......"

"صاحب اس کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ اُن کی جو حریف جماعت ہے اُس سے بات ہو گئی ہے۔ اختر کے الگ کرتے ہی ہم اُس یونین کا جلسہ کرائیں گے جس میں وزارت محنت کے کسی بڑے کو بلائیں گے ...... یہ دیکھئے اس فائل میں وہ تمام مراعات موجود ہیں جو اِن کا چارٹر آف ڈیمانڈ ہے اور بورڈ نے جن کو منظور کر لیا ہے ــــ ان مراعات کا اعلان ہوتے ہی اختر کے ساتھیوں کی کمر ٹوٹ جائے گی۔"

"پھر بھی عجلت سے کام لینے کا موقع نہیں ہے۔ آپ کا سارا ایکسپیرینس اپنی جگہ ــــ مگر اس شہر کا مزاج دوسرا ہے۔ یہاں کا ماحول ــــ یہاں کے حالات سب بہت مختلف ہیں۔ لمحہ بھر میں موسم کی طرح لوگ بدل جاتے ہیں۔ آج جو آپ کا ساتھی ہے کل وہ مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ پانسہ پلٹتے ہی تمام کمزوریاں آپ کے گلے میں ہار کی طرح ڈال دی جائیں گی۔ اور کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔"

"سر آپ تو......"

"میری بات چھوڑیئے ــــ میں تو آپ کے ساتھ ہوں ہی ــــ بلکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ میں نے ہی INITIATE کیا ہے۔"

"تو پھر صاحب مجھے پروا نہیں ــــ کئی یونینیں بھگتا چکا ہوں ایسی تو ــــ آپ اس فائل پر نظر ڈال لیجئے ــــ میں نے ساری

اسٹریٹیجی بھی لکھ دی ہے۔"

امداد حسین نے منظور سے فائل لے کر پکھی۔"آپ ایسا کیجئے ۔۔۔ یہ رپورٹ اور یہ فائل لے کر خود چلے جایئے بڑے صاحب کے پاس ۔۔۔ ان کو تفصیل سے ہر بات بتا دیجئے اور وہ جو کچھ کہیں۔ ان کے پوئنٹ نوٹ کر لیجئے ۔۔۔ خدا کرے بات اُن کی سمجھ میں آجائے۔"

"صاحب۔ آپ ان کو بتا دیتے کہ اب ہمارے لئے کام کرنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل پیرالل مینجمنٹ قائم کر لی ہے۔"

"بھئی ان کو سب پتہ ہے۔ اونچی کرسی پر بیٹھنے والوں کی سب پر نظر رہتی ہے۔ کل ہی ایک فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی ۔۔۔ مجھ سے کہنے لگے ادارے کے اخراجات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں پروڈکٹ بھی کم ہو گیا ہے۔ میں نے کہا یونین ..... بس اس سے آگے مجھے بولنے ہی نہیں دیا گیا۔ کہنے لگے ہاں مجھے سب خبر ہے کچھ تدارک کیجئے یونین کا ۔۔۔ میں نے کہا قدرت نے بہترین موقع فراہم کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے بندے علی کو یونین کی طرف سے استقبالیہ دیا اور انھوں نے ادارے کے ساتھ ساتھ اپنی تقریر میں حکومت کو بھی تنقید کا نشانہ بنا لیا۔ اسی بات پر ہمیں اسٹینڈ لینا چاہیئے ۔۔۔ یہ حکومت کی تحویل میں آیا ہوا ایک پبلک انسٹی ٹیوشن ہے کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں ہے جہاں کوئی بھی لیڈر آ کے حکومت کو چیت کر دینے کے نعرے لگانے لگے ۔۔۔ یہ سُن کر کہنے لگے۔ آپ فوراً ایک رپورٹ پیش کر دیجئے میں کل ہی بات آگے بڑھاتا ہوں ۔۔۔ میں نے کہا رپورٹ تو ہم نے تیار کر رکھی ہے۔ تو فرمایا، کل مجھ سے فون پر بات کر کے مجھے رپورٹ بھیج دیجئے۔"

"صاحب آپ نے بہت اچھا کیا جو اتنی تفصیل سے بات کر لی۔"

"ہاں میں نے سوچا موقع مل گیا ہے تو کیوں ضائع کروں۔ ان معاملات پر بات کرنے کے لئے میٹنگ وغیرہ میں وقت ہوتا نہیں ۔۔۔ تو بس، اب آپ یہ رپورٹ لیجئے اور چلے جایئے اُن کے پاس۔"

منظور نے رپورٹ کی فائل اُٹھائی لیکن کرسی چھوڑنے سے پہلے کہا "وہاں، اگر انھوں نے واٹر ٹینک والی بات پوچھ لی تو....."

"ارے نہیں ۔۔۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کو یاد کہاں رہتی ہیں ۔۔۔ یاد بھی ہوں تو وہ اہمیت نہیں دیتے۔ مجھ سے پوچھ لیا تھا اور میں نے جواب دے دیا تھا ۔۔۔ آپ سے وہ نہیں پوچھیں گے ۔۔۔"

"سر۔ یہ لوگ کتنے بدمعاش ہیں ۔۔۔ اوور ٹائم ۔۔۔ میڈیکل ۔۔۔ کنوینس اور پتہ نہیں کس کس مد میں ہر مہینے لاکھوں روپے کھا جاتے ہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ میری اس چھوٹی سی بات کو کتنا اچھالا ۔۔۔"

"بات یہ ہے مسٹر منظور ۔۔۔ جس طرح آپ نے ان کے مقابلے میں ایک یونین کھڑی کر دی ہے اور اُس میں جو لوگ ہیں اسی طرح دو ایک کالی بھیڑیں ہم لوگوں میں بھی ہیں ۔۔۔ خیر ۔۔۔ اس لڑکے سے نمٹ لیں پھر اُن کو بھی دیکھیں گے ۔۔۔"

منظور نے اُٹھ کر باہر جانے کے لئے ابھی دروازہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ امداد حسین نے کہا۔

"بڑے صاحب کے پاس سے آنے کے بعد مجھے بتا دیجئے گا کہ کیا بات رہی ...."

"جی اچھا۔"

منظور کے جانے کے بعد امداد حسین زیرِ لب مسکرائے۔"ہمیشہ اپنے نمبر بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے۔" اتنی بات سوچی۔ پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے سفید کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگے ۔۔۔ قلم ہاتھ سے رکھا اور دوسرے ٹیلی فون سے کوئی نمبر ڈائل کیا۔ دو تین منٹ تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا "دو تین دن میں تمہارا کام بھی کر دوں گا ۔۔۔ آج کل ایک اہم کام میں مصروف ہوں ۔۔۔ تم اطمینان سے بیٹھو۔" پھر فون بند کیا۔ دو ایک سیکنڈ تک ٹائپ رائٹر کی طرح ٹیلی فون کو انگلیوں سے بجاتے رہے۔

پھر دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ "کون —؟ کہیئے کیا حال ہیں — ہاں ہو گیا۔ اب آپ کا کام ہے۔۔۔ مجھے اسٹیمیٹ دے دیجیئے — نہیں بھئی میں بہت اسٹیٹ فارورڈ آدمی ہوں — بات شروع میں ہی کلیئر کر لیتا ہوں ہاں — ہاں کورڈ ایریا کوئی ڈھائی ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے — ہاں — اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ مانگیئے گا — ٹھیک۔۔۔۔۔۔ اور ہاں — وہ کیسا سیٹ بھجوایا تھا —؟ — بڑے صاحب کے ہاں پسند ہی نہیں آیا وہ تو واپس کر رہے تھے میں نے کہا اس کو رکھ لیجیئے میں دوسرا بھجوا دوں گا — ہاں — نہیں بھئی — بالکل — اب کے ذرا بہتر ہو۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی — معلوم ہے کہ آفیشل ہیمنٹ ہے پھر ہزار دو ہزار کا کیا منہ دیکھنا — بالکل چیز اچھی ہونی چاہیئے — لا ثانی — ہاں — ہاں۔۔۔۔ ٹھیک ہے آپ دوسرا دو ایک دن میں بھیج دیجیئے — اور سنیئے — دونوں کا بل ایک ہی — ہاں یہ ٹھیک ہے۔ بل بک نہیں لے آئیے۔۔۔۔۔۔ ہاں ہاں وہ۔ کہہ تو دیا آپ کا کام تقریباً ہو گیا۔۔۔۔۔ تو کل آکے ذرا سائٹ دیکھ لیجیئے — او کے۔۔۔۔"

ٹیلی فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ اٹھایا "فرمایئے بول رہا ہوں — اخّاہ کہیئے کیسے مزاج ہیں۔۔۔ جناب جناب۔۔۔ منظور صاحب کو ذرا کام سے بھیجا ہے آجائیں تو معلوم کرتا ہوں۔۔۔۔۔ فائل میرے پاس پڑی ہے —؟ — نہیں میرے پاس تو نہیں ہے — کیا —؟ — کس کا —؟ — اچھا اچھا — نہیں بھئی ابھی اس پلاٹ کا سودا نہیں ہوا ہے — میں کیا کروں گا اپنے پاس رکھ کے — میں نے مکان شروع کرا دیا ہے اس کے لیئے بھی رقم چاہیئے — ارے نہیں بھئی — ملازمت پیشہ لوگ ہیں ہم — گی بندھی آمدنی ہے — کون — آپ لیں گے —؟ ہوں — ٹھیک ہے — مارکیٹ ویلیو معلوم کر لیجیئے — گھر کی بات ہے — اس علاقے میں ڈھائی تین سے کم قیمت نہیں ہے — ہوں۔۔۔۔۔ ڈاکومنٹ گھر ہیں — گھر پہ — ٹھیک ہے — کل شام کو گھر تشریف لے آئیے۔ ڈاکومنٹ بھی دیکھ لیجیئے گا اور ایک کپ چائے بھی ہمارے ساتھ پی لیجیئے گا۔۔۔۔۔ کام کی پروا نہ کیجیئے — کل گھر تشریف لائیے۔ ساری باتیں وہیں ہو جائیں گی — او کے — ہاں چھ بجے ٹھیک ہے — او کے — بائی —"

امداد حسین نے دفتری اوقات کار ختم ہونے کے بعد بھی منظور کا انتظار کیا — پھر گھڑی دیکھی — کہاں رہ گیا یہ۔۔۔۔ گھنٹی بجائی چپراسی آیا، بریف کیس اور اخباروں کے پلندے کی طرف دیکھا — چپراسی نے بریف اٹھایا، اخباروں کو بغل میں دابا، پھر دروازہ کھول کے ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا — امداد حسین کے باہر آنے کے بعد اس نے دفتر کا دروازہ بند کر کے چابی گھمائی اور ساری چیزیں لے کر امداد حسین کے پیچھے لفٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

"کوئی ٹیلی فون آیا تھا —؟" گھر پہنچتے ہی امداد حسین نے بیوی سے پہلا سوال کیا۔

"ہاں ابھی ابھی مسز منظور کا فون تھا۔ بتا رہی تھیں کہ منظور صاحب ابھی تک گھر نہیں پہنچے ہیں اور دفتر میں بھی نہیں ہیں — پھر آپ کے بارے میں پوچھنے لگیں کہ آ گئے یا نہیں۔ میں نے کہا ابھی کہاں آئے ہیں وہ تو سب سے آخر میں آتے ہیں — پھر وہ کہنے لگیں کہ آپ کے گھر کے لیئے جو الیکٹرک فٹنگز اور قالین امپورٹ ہوئے تھے اسی وجہ سے یونین والوں نے مسئلے کھڑے کر دیئے ہیں اور منظور صاحب ان ہی کو سلجھانے میں لگے رہتے ہیں۔"

بیوی کی بات سن کر امداد حسین نے کہا "بہت بکواس کرتی ہے یہ عورت بھی — اور میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اس مسز منظور کے ساتھ زیادہ فری ہو کر باتیں نہ کیا کرو۔"

"میں کب فری ہوتی ہوں — اسی نے ٹیلی فون کیا تھا اور خود ہی بولتی رہی۔ میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا حالانکہ جی تو چاہا تھا کہ کہہ دوں ذرا اپنے گریبان میں تو جھانکو۔ تم نے جو ٹھیکیدار سے رشوت میں سارا مکان بنوا لیا — مگر میں نے کہا چلو چھوڑو

اب کیا فائدہ اس عورت کے منہ لگنے کا——"
"خیر خیر—اب تم چائے پلواؤ——"
امداد حسین نے رات نو بجتے ہی ٹی وی آن کر دیا۔ خبروں کا وقت تھا مگر خبریں شروع ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
امداد حسین نے ٹی وی کی آواز مدھم کی اور ٹیلی فون اٹھایا۔ "ہیلو—ہاں مسٹر منظور——اچھا——ہوں——آپ ایسا کیجئے ابھی آسکتے ہیں؟——تو آجایئے——کھانا میرے ساتھ کھائیے——ہاں ہاں بھئی سب کو دیکھ لیں گے——آپ آجایئے——"
بات ختم کر کے امداد حسین نے بیوی کی طرف دیکھا "منظور آرہا ہے——کھانا یہیں کھائے گا——ذرا ٹی وی کی آواز تو بڑھا دینا۔"
منظور کے آنے تک امداد حسین نے ٹی وی کے سامنے بیٹھے بیٹھے تمام اخبارات کے صفحے ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے
ملازم نے منظور کے آنے کی اطلاع دی تو امداد حسین نے کہا "بٹھاؤ ان کو——میں آتا ہوں۔" پھر بیوی سے کہا "کھانا فوراً ابھی نہ بھیج دینا——میں کہلوا دوں گا۔"
امداد حسین کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر منظور نے کھڑے ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ امداد حسین نے دبیز صوفے کے کونے میں دھنستے ہوئے پوچھا "ہاں بھئی——اب بتایئے کیا رہا——؟"
"میں بڑے صاحب کے پاس پہنچا تو وہ ایک کال آگئی تھی اسلام آباد سے اس میں مصروف تھے——پھر منسٹری سے کچھ افسر آگئے——تو صاحب اس میں مصروف ہو گئے——میں پی اے صاحب کے پاس بیٹھا انتظار کرتا——گھنٹہ بھر بعد صاحب ان لوگوں کے ساتھ ہی نکلے——مجھے دیکھا تو کہا انتظار کرو ابھی آتا ہوں——میں تقریباً دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔"
"اس عرصے میں مجھے تو ٹیلی فون کر کے بتا دیتے کہ یہ سلسلہ ہے——" امداد حسین نے کہا۔
"میں آپ کو ٹیلی فون ملانا چاہتا تھا——مگر اسی وقت صاحب کی کال آگئی۔ انھوں نے پی اے سے کچھ ضروری پیپر نکالنے اور لے کر آنے کو کہا——میں سمجھ گیا کہ اب صاحب سے ملاقات ممکن نہیں۔ اٹھنے ہی والا تھا کہ وہاں اختر آگیا——وہی فرعونیت——میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کہنے لگا حالات بدلنے والے ہیں سنبھل جاؤ۔ اتنی دیر پی اے کے پاس بیٹھ کے بس سُن گُن تو مل ہی گئی تھی کہ کیبنٹ میں رد و بدل کی توقع ہے۔ اپوزیشن کے کچھ لوگ ٹوٹ کر سرکاری پارٹی میں شامل ہونے والے ہیں——اختر کے آنے کے بعد میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا——باہر نکل کر دوسرے کمرے سے آپ کو فون کیا——آپ شاید گھر کے لئے چل دیئے تھے۔ میں وہاں سے نکل کے منسٹری آف لیبر کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی دو ایک بندے اپنے ہیں——مگر وہاں کوئی تھا ہی نہیں——دیر بھی تو خاصی ہو گئی تھی۔ سکریٹریٹ کے قریب میرے ایک دوست کا گھر ہے میں اس کے ہاں جا بیٹھا——وہاں سے میں نے دو چار جگہ فون کئے——صرف اتنی خبر لگی کہ وہ لوگ جو حزبِ اختلاف کی سیٹیں چھوڑ کر حکومت کی طرف آئے ہیں ابھی اُن سے وزارتوں کے مسئلہ پر مباحثہ ہو رہا ہے۔ جب یہ معاملات طے ہو جائیں گے تو وہ لوگ اپوزیشن چھوڑنے کا اعلان کریں گے——اور ان لوگوں میں بندے علی بھی شامل ہے——"
"پالیٹکس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ——" امداد حسین نے کہا۔
"صاحب اگر بندے علی منسٹری میں آگیا تو بُرا ہوگا——اختر کا اچھا خاصا اثر ہے اُس پر——"
"وائس چیف صاحب کا ٹرانسفر نہیں ہونا چاہیئے منظور صاحب——اُن پر بڑے صاحب کا بڑا اثر ہے۔ اگر چیف صاحب کا ٹرانسفر نہیں ہوتا تو مجھے پروا نہیں ہے کوئی بھی وزیر بن کے آجائے——اس اختر کو نہیں چھوڑوں گا——جینا دوبھر کر دیا ہے کمبخت

نے ——— اپنی مرضی سے کوئی کام کرہی نہیں سکتے ——— میرا خیال ہے اب کھانا کھالیا جائے ———"

منظور نے کھانے پر ایک ہی خاص بات کہی "صبح تک معلوم ہو جائے گا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو لگا دیا ہے اس کام پر۔"

امداد حسین نے صبح کا انتظار جس بے چینی سے کیا اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ نوکر کے اخبار لانے کا انتظار نہیں کیا بلکہ خود گیٹ کے قریب جا کے اخبار اٹھایا ——— وہیں کھڑے کھڑے تمام سرخیوں کو دیکھا ——— کسی تبدیلی کی خبر نہیں تھی ——— دفتر پہنچتے ہی منظور کو بلایا۔ "بھئی آج اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں ہے۔"

"جی ہاں ——— میں نے بھی دیکھ لیا ———"

"پھر آپ ایسا کیجئے ——— مگر نہیں ——— وہ فائل مجھے لا دیجئے ——— میں خود جاتا ہوں بڑے صاحب کے پاس ——— یا آپ بھی چلئے میرے ساتھ ——— میں چاہتا ہوں اسٹاف کو ملنے والے بینی فٹ کا کریڈٹ اختر کو نہ ملے ——— اس لئے آج اس معاملے کو طے ہو جانا چاہئے۔"

"فون تو کر لیجئے ——— کوئی بیٹھا تو نہیں ہے اُن کے پاس ———"

"ٹھیک ہے ——— ملوائیے ذرا ———"

منظور نے امداد حسین کے پی اے سے بڑے صاحب کا نمبر ملانے کے لئے کہا۔ چند سیکنڈ کے بعد گھنٹی بجی۔ امداد حسین نے بات کی "ہلو سر، معاف فرمایئے گا آتے ہی آپ کو زحمت دے رہا ہوں ——— کل منظور صاحب آپ کے پاس پہنچے تھے تو آپ ——— جی ——— جی جی ——— اچھا ——— کب ——— تو گویا چیف صاحب ——— اوہ مائی گاڈ ——— جی صاحب جی ——— بہتر ہے ——— جی بہت اچھا ——— بہتر ہے سر ———"

امداد حسین نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی فون رکھا ——— پژمردہ نظروں سے منظور کی طرف دیکھا۔ "وہ فائل مجھے لا دیجئے ——— اور بورڈ کی میٹنگ کے منٹس کہاں ہیں ——— ؟"

"میرے پاس ———"

"وہ بھی لے آیئے ——— ہری اپ ———"

"خیریت تو ہے صاحب ———"

"بندے علی اپنی پارٹی کے ساتھ ——— وہ وزیر بھی بن گئے ——— اور چیف صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا۔"

"اوہ ——— یہ تو بُرا ہوا صاحب ———"

"آپ وہ فائلیں یہاں لے آیئے ——— اور آپ کو یاد ہے ——— اختر ایک کیس لایا تھا بندے علی کے کسی آدمی کا تھا ——— جس کو ہم نے ریگرٹ کر دیا تھا ——— وہ فائل بھی نکالئے ——— اُس کیس کا نوٹ بدلئے اور اُس کو فوراً او کے کیجئے ———"

منظور کے جاتے ہی ایک نوجوان لڑکا نہایت لاپروائی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ایک لحظہ کے لئے امداد حسین کے چہرے پر سختی آئی ——— پھر ایک دم اپنی کرسی سے اُٹھ کر اس لڑکے کی جانب مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "آیئے اختر صاحب۔ آپ ہی کی بات ہو رہی تھی۔ بھئی آپ کی ڈیمانڈ سے زیادہ منظور کرا یا ہے ——— ویسے آپ بھی جادوگر ہیں ——— بورڈ کا ہر ممبر آپ کی تعریف کر رہا تھا ——— میں نے بھی میٹنگ میں کہا اس ادارے اور تمام ورکرز کی ترقی میں اختر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے ——— اپنے ذاتی فائدے کے مقابلے میں ہمیشہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں ——— یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے یہ بتایئے۔ چائے پئیں گے آپ یا ......"

نروان

منیر الدین احمد

وہ پرتگال کے شہر گوار دا سے لامیگو جانے والی سڑک پر کھڑا تھا اور بیچ ہائیکنگ کی خاطر اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت لوگوں کو بیچ ہائیکنگ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کتنوں کو ہی اپنی کار میں لفٹ دے چکا ہوں۔ مگر اُس روز تک کسی راہب کو لفٹ دینے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُس نے پادریوں والا کالے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کی پتلون۔ وہ اونچے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ پرتگالی عام طور سے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں۔ میرا اپنا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے جس کے سبب شمالی یورپ میں میرا شمار چھوٹے قد والوں میں ہوتا ہے۔ مگر جب میں پرتگال میں کسی مجمع میں کھڑا ہوتا ہوں تو اکثر لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھ سکتا ہوں۔ اس ملک میں ساڑھے چھ فٹ کا آدمی عجوبے سے کم نہیں۔ میں نے پہلی نظر میں ہی راہب کے قد کا ساڑھے چھ فٹ ہونا طے کر لیا تھا۔

اسے مانگوالڈے جانا تھا جو لامیگو کے رستے میں واقع ہے۔ اُس نے کار میں بیٹھتے ہی باتیں شروع کر دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت باتونی تھا۔ وہ صرف ایک روز قبل آٹوسٹاپ کے ذریعہ سپین کے شہر سالامانکا سے لوٹا تھا۔ رہتا وہ فاطمہ میں تھا جو پرتگال میں عیسائیت کے مذہبی اہمیت رکھنے والے شہروں میں سے ہے۔ اس مقام پر ۱۹۱۷ء میں تین بچوں پر جو بھیڑیں چرا رہے تھے حضرت مریم کا ظہور ہوا تھا۔ اس معجزے کی یاد میں وہاں پر گرجا گھر تعمیر کیا گیا تھا اور لوگوں نے اس مقام کی زیارت کے لئے آنا شروع کر دیا تھا۔ ہر سال ہزارہا انسان اس شہر میں آتے ہیں۔

اس کا نام برادر تھومے تھا اور وہ ڈومینیکان کانونٹ میں رہتا تھا۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا وہ وہاں پر رہ رہا تھا۔ سفر کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ کانونٹ سے انھیں سال میں چار ہفتے کی چھٹیاں ملتی تھیں جن کے دوران وہ اکثر آٹوسٹاپ کے ذریعہ سپین اور پرتگال کے ڈومینیکان کانونٹوں میں رہنے والے اپنے دوستوں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اس کی تعطیلات کے ختم ہونے میں صرف ایک روز باقی تھا۔ مانگوالڈے اس کا آخری سٹاپ تھا۔ دوپہر کا کھانا اُس نے وہاں پر کھانا تھا اور پچھلے پہر بیچ ہائیکنگ کرتے ہوئے فاطمہ کا رخ کرنا تھا۔

ہمیں آپس میں جرمن بولتے ہوئے سن کر اُس نے جان لیا تھا کہ ہم جرمنی سے آئے تھے۔ اُس کے پوچھنے پر ہم نے بتایا کہ ہم ہمبرگ سے آئے تھے البتہ میں رہنے والا پاکستان کا تھا۔

"پاکستان کیا برصغیر کا حصہ نہیں ہے؟" برتھومے نے جاننا چاہا۔

میرا جواب اثبات میں پاکر اس کی آنکھیں اٹھیں۔

"پھر تو آپ مجھے ارواح کے بار بار جنم لینے کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟"

"ہندو مت کے پیروکار اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی روح اس وقت تک بار بار جنم لیتی رہتی ہے جب تک وہ نروان حاصل نہ کرے۔" میں نے اپنی معلومات کی حد تک اس عقیدے کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ساتھ ہی بتایا کہ میں اس بات پر ایمان نہیں رکھتا تھا کیونکہ مجھے بار بار پیدا ہونے کا تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کسی ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جو اپنے تجربے کی بناء پر اس عقیدے کا درست ہونا ثابت کر سکتا۔

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں"۔ برادر تھومے نے کہا۔ "مگر مجھے اپنے سابقہ جنم کے بارے میں بہت دھندلی سی یادداشت ہے۔ میں جرمنی میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے والدین کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ مگر یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری دو بہنیں تھیں۔ ایک مجھ سے عمر میں بڑی تھی اور دوسری چھوٹی۔ میں نے کسی جنگ میں بطور فوجی کے حصہ لیا تھا اور زخمی ہوا تھا۔ میری بقیہ زندگی کس طرح گزری تھی۔ اس بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ شاید میں نے شادی بھی کی تھی اور میرے بچے بھی تھے۔ ایک نام جوزیف بار بار میرے ذہن میں آتا ہے۔ شاید یہ میرے بیٹے کا نام تھا۔ میں کس شہر میں رہتا تھا، اس بارے میں بھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ وہ شہر کسی دریا کے کنارے پر آباد تھا۔ وہاں بہت بڑی بندرگاہ تھی جس پر بڑے بڑے جہاز آ کر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ شاید میرا کاری تعلق اسی بندرگاہ اور جہازوں کے ساتھ تھا۔"

ہمارے کریدنے کے باوجود وہ ہمیں بتا نہ سکا کہ یہ یادداشت آیا کسی خواب پر مبنی تھی یا اُس کے اپنے دماغ کی اختراع تھی، اس کا کہنا تھا کہ یہ تفصیلات آہستہ آہستہ سالوں کے دوران خود بخود اس کے سامنے آئی تھیں۔ اس بارے میں کبھی سوچ بچار نہیں کیا تھا۔ اُسے جرمن زبان کا ایک لفظ تک نہ آتا تھا۔ پرتگالی کے علاوہ اُسے ہسپانوی زبان آتی تھی۔ کانونٹ میں اس کا بیشتر وقت پرتگالی زبان کی مذہبی تحریرات کو ہسپانوی میں ترجمہ کرتے گزرتا تھا۔ مگر ان کو چھپوایا نہیں جاتا تھا۔ ان کی نقلیں وہ اپنے ہسپانوی راہب دوستوں کو بھیج دیا کرتا تھا۔

کانونٹ میں اپنی زندگی سے وہ پوری طرح مطمئن تھا۔ سب سے زیادہ تعریف اس نے جس چیز کی کی وہ کانونٹ کا برادرانہ ماحول تھا جس میں کسی قسم کے مادی جذبات نہ پائے جاتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ کانونٹ کے باسی مادی اعتبار سے گرجا گھر کے روایتی چوہے سے بڑھ کر غریب ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے لئے زندگی کی جائز آسائشیں مہیا کی جاتی ہیں۔

ہم جس علاقے میں سے گزر رہے تھے وہ پہاڑی علاقہ ہے۔ ہر طرف سرسبزی نظر آتی ہے۔ پہاڑوں کے ڈھلوان پر انگور لگایا جاتا ہے۔ یہاں کی سرخ شراب کو پورٹ وائن کا نام دیا جاتا ہے جو اپنے ذائقے اور لطافت کے سبب مشہور عالم ہے۔ برادر تھومے نے اس کی تعریف کچھ ایسے والہانہ انداز سے کی جیسے اس نے شراب کا پیگ ہاتھ میں اُٹھا رکھا ہوا اور مزے لے لے کر اپنی محبوب وائن کے ننھے ننھے گھونٹ بھر رہا ہو۔

پرتگال کے شمال مشرقی پہاڑی علاقے میں پانی کی بہتات ہے۔ جگہ جگہ چشمے پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہوں پر چشموں کا پانی پہاڑ پر سے تار کر نل کے ذریعہ سڑک تک پہنچایا جاتا ہے جہاں پر ایک سبیل بنا دی جاتی ہے۔ مسافر ایسی جگہوں پر رکتے ہیں۔ خود بھی پانی پیتے ہیں اور اپنی کاروں کے انجنوں کو بھی اس سے ٹھنڈا کرتے ہیں۔ ایک ایسی سبیل پر ہم نے کار روکی تو موٹر میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہم خوش ہوئے کہ سبیل بروقت آ گئی تھی اور ہمیں انجن میں ڈالنے کو پانی ملے گا۔ ہم تینوں نے منہ ہاتھ دھوئے اور جی بھر کے ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا۔ کار کی پیاس دور کی۔

جب آدھ گھنٹے کے بعد روانگی کی خاطر میں نے کار کو سٹارٹ کرنا چاہا تو وہ دو ایک بار کسی دق زدہ مریض کی طرح کھانس کے روٹھ گئی۔ میں کار چلانے کو تو بہت عرصے سے چلا رہا ہوں۔ مگر کار خراب ہو جائے تو بالکل بے بس ہو جاتا ہوں موٹروں

کی خرابی کو سمجھنے اور اس کو دور کرنے کی مہارت مجھ میں اتنی ہی ہے جتنی ڈنگروں کی بیماری کو جاننے کی۔ خراب کار یا بیمار گائے کے گرد میں ناچتا پھروں گا مگر کار کی خرابی یا گائے کے روگ کے خلاف مجھ سے کچھ نہیں ہو پائے گا۔

برادر تھومے نے تھوڑے عرصے تک میرا ڈانس دیکھا۔ پھر خود ہاتھ آزمانے کی پیش کش کی۔ میں نے کسی قدر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سچ مچ اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ یہ بوڑھا راہب کار کے انجن کی شد بد رکھتا ہوگا۔ برادر تھومے نے اس عرصے میں اپنا کوٹ اتار دیا تھا اور دونوں بازوؤں پر سے قمیص کو ہٹانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے آستین کے بٹن کھولے۔ اور قمیص کو کہنی سے اوپر لے جا کر اڑس لیا۔ پھر اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں موٹر کی جانچ پڑتال شروع کر دی۔ میری نظر اس کے ننگے بازو پر پڑی جس پر ایک تصویر گودی ہوئی تھی۔ اس میں دو مچھلیاں اس طرح بنی ہوئی تھیں کہ ان کی دمیں ایک دوسرے کو کراس کر رہی تھیں جب کہ ان کے دھڑ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے وہ اپنے جسموں سے ایک دائرہ بنائے ہوئے تھیں۔ ان کے درمیانی فاصلے میں تین لاطینی حروف ای اے جی اس طرح لکھے ہوئے تھے کہ ان سے ایک گلاب کی شکل بنتی تھی۔

برادر تھومے نے پھرتی سے پلگ نکال کر صاف کیے۔ ان کے دوبارہ لگنے پر کار سٹارٹ ہونے پہ ذرہ بھر وقت نہ ہوئی رستے میں بات میں نے برادر تھومے کے بازو والی تصویر کی طرف پھیری۔ مگر وہ اس بارے میں کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے غالباً جوانی کے زمانے میں دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ تصویر گودوائی تھی۔ مگر ان تین حروف کی تشریح اسے معلوم نہ تھی اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ تصویر کہاں پر گودوائی گئی تھی۔

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ مانگوالڈے آ گیا۔ ہم نے برادر تھومے کو کانونٹ کے سامنے اتارا تو اس نے ہمیں کانونٹ کو دیکھنے کی دعوت دی۔ کانونٹ میں ہمارا استقبال گرمجوشی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی وجہ یقیناً برادر تھومے کی وہاں پر مقبولیت تھی۔ ہم کافی کا ایک ایک کپ پینے کے بعد روانہ ہونے کے لیے گیٹ پر آئے تو برادر جوزے ایک بقچہ ہاتھ میں اٹھائے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی اور ہماری منزل ایک ہی تھی۔ صرف ایک روز بعد لامیگو میں پہاڑی کی چوٹی پر بنائے گئے گرجا گھر میں رکھے ہوئے حضرت مریم کے بت کی زیارت ہونے والی تھی۔ برادر جوزے نے اس میں شامل ہونے کی منت مان رکھی تھی۔

برادر جوزے بہت دلچسپ اور خوش مذاق آدمی ثابت ہوا۔ وہ کانونٹ کے لطیفے سناتا رہا۔ پھر بات برادر تھومے کی طرف چلی گئی۔ مجھے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس کی کار کو درست کرنے کی مہارت سے میں مرعوب ہوا اور جاننا چاہتا تھا کہ اسے یہ ہنر کیسے آتا تھا۔

"برادر تھومے تو پیدائشی مکینک ہے۔" برادر جوزے نے کہا "اس وجہ سے وہ کانونٹوں میں بہت مقبول ہے۔ کہیں اسے ان کو ہیٹنگ سسٹم کی مرمت کرنے کے لیے بلاوا آجاتا ہے تو کوئی دوسری کانونٹ اپنی کاروں یا سائیکلوں کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے اس کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دیتی ہے۔"

"کیا اس کو باقاعدہ طور پر اس کی تربیت دلوائی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے آنے سے قبل اس نے مکینک کا پیشہ سیکھا ہو۔"

"ہمیں تو برادر تھومے نے بتایا تھا کہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ کانونٹ میں رہ رہا تھا۔"

"اس کی بات لفظ بلفظ درست ہے مگر اس طرح نہیں جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔ برادر تھومے کو کانونٹ میں رہتے ہوئے بیس برس ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کہاں پر رہتا تھا اور کیا کرتا تھا اسے کوئی نہیں جانتا۔ خود برادر تھومے اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ دراصل

وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔ مگر ٹھہریئے میں آپ کو اس کی کہانی سناتا ہوں تاکہ ساری بات آپ کی سمجھ میں آسکے۔"

برادر جوزے نے جو کہانی سنائی وہ مختصراً یہ تھی کہ کانونٹ کے ایک راہب نے ستمبر ۱۹۶۳ء کی ایک سہ پہر کو ایک کار کا حادثہ ہوتے دیکھا بلکہ خود بمشکل کار کی زد میں آنے سے بچا تھا۔ پہاڑی علاقے کے ایک خطرناک موڑ پر سامنے سے آنے والی ایک کار اپنی تیز رفتاری کے سبب موڑ نہ کاٹ سکی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک گہرے کھڈ میں جا گری تھی۔ البتہ ڈرائیور نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے کار کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی تھی اور سڑک کے کنارے پر نصب شدہ حفاظتی پتھر سے جا ٹکرایا تھا۔ اس طرح وہ کھڈ میں گرنے سے تو بچ گیا تھا مگر شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو بے ہوشی کے عالم میں کانونٹ میں لایا گیا تھا۔ اس کی مرسیڈیز کار کو آگ لگ گئی تھی اور وہ مکمل طور پر جل گئی تھی۔ ڈرائیور تین روز تک بے ہوش رہا تھا۔ اس کی جیب میں کسی قسم کے کاغذات موجود نہ تھے جن سے اس کی شناخت ہو سکتی۔ اگر وہ کار میں دھرے تھے تو جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

جب ڈرائیور نے تیسرے روز اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ اپنی یادداشت کھو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اس کو اپنی مادری زبان تک بھول چکی تھی اس دن سے برادر تھومے کانونٹ میں رہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ پرتگالی زبان سیکھ لی تھی۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ اس کی مادری زبان کیا تھی اور وہ کس ملک کا رہنے والا تھا۔ اپنے قد بت سے وہ شمالی یورپ رہنے والا لگتا تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جرمن تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ اس کی کار جو حادثے میں جل گئی تھی مرسیڈیز تھی جو جرمن کار ہے۔ اُسے کوئی ڈھونڈنے نہیں آیا تھا اور خود برادر تھومے کو اپنا نام پتہ تک یاد نہیں تھا۔ وہ اگر جانا بھی چاہتا تو کہاں جاتا۔ اس لئے وہ کانونٹ میں رہ گیا تھا اور اس کو تھومے نام بھی کانونٹ والوں نے دیا تھا۔"

واضح ہے کہ ان تفصیلات کو جاننے کے بعد میرے اندر تجسس کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ یوں بھی میرا پیشہ ایسا ہے جس میں میرا واسطہ آئے دن ایسے معاملات سے پڑتا رہتا ہے۔ آپ کو جاننا چاہیئے کہ میرا تعلق ایک ڈیٹیکٹیو بیورو سے ہے۔ یہ بات یقیناً آپ کے علم میں آئی ہوگی کہ لوگ لائف انشورنس یا حادثے کا بیمہ کروانے کے بعد طرح طرح کے حیلے بہانے استعمال کر کے انشورنس کمپنیوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انشورنس کمپنیاں ہر ایسے واقعہ کی پوری طرح چھان بین کرتی ہیں جو انہیں مشکوک نظر آئے۔

برادر تھومے کے قصے میں مجھے کسی ایسے دھوکے کا امکان تو نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم اس کا الجھاؤ میرے لئے ایک چیلنج کا رنگ رکھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اپنے تجربے کے بل پر اور اپنے تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا۔ بالخصوص مجھے اس میں اس لئے بھی دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ برادر تھومے کا تعلق جرمنی سے لگتا تھا۔ خود اس کی اپنی سنائی ہوئی باتیں جنہیں وہ اپنے پچھلے جنم سے متعلق سمجھتا تھا اس بات کی غمازی کر رہی تھیں۔

جرمنی واپس پہنچنے کے بعد میں نے آرکائیوز میں سے ۱۹۶۳ء کی اخباریں نکلوائیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اکتوبر کے مہینے میں ایک اخبار نے ایک خبر اس مضمون کی چھاپی تھی کہ ہمبرگ کی ایک شپنگ کمپنی کے مالک کا چند ہفتوں سے کوئی اتہ پتہ نہیں مل رہا تھا۔ ماہ اگست میں وہ اکیلا اپنی مرسیڈیز کار میں سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو یا اپنی فرم میں کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا اور کب واپس لوٹے گا۔ اس کے سفر پر روانگی کے بعد سے اس خبر کے چھپنے تک اس نے کسی سے رابطہ قائم نہ کیا تھا۔

اس خبر میں گمشدہ کا نام ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ دیا گیا تھا۔ ان ناموں کے ابتدائی تین حروف ای اے جی عین وہی حروف تھے جو میں نے برادر تھومے کے بازو پر گودے ہوئے دیکھے تھے۔ یہی اس کی شپنگ کمپنی کا نام بھی تھا۔ اب مزید تحقیق کرنا آسان ہو گیا تھا۔ انشورنس کمپنیوں کے باہمی تعاون کے معاہدہ جات کے نتیجے میں یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون کس کمپنی کے پاس بیمہ شدہ ہے۔ اور آیا اس کو کبھی انشورنس کلیم ادا کیا گیا تھا اور یہ کہ کن حالات میں ایسا کلیم کیا گیا تھا۔ ایک دوسرے کو ایسی معلومات بہم پہنچا کر

انشورنس کمپنیاں دھوکہ بازوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کی لائف انشورنس کا کلیم اس کے گم ہونے کے بعد کیا گیا تھا جس پر انشورنس کمپنی نے اس کے مرنے کا ثبوت مانگا تھا مگر یہ ثبوت پیش نہ کیا جا سکا۔ کسی کا محض گم ہو جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں تصور کیا جاتا کہ وہ مر چکا ہے۔ بعض اوقات لوگ، انشورنس کمپنیوں کو دھوکہ دینے کی خاطر کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں یا ملک چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مڈلائف کرائسس کا شکار ہو کر وہ اپنا تعلق اپنے اہل و عیال کے ساتھ توڑ دیتے ہیں اور کسی دوسری جگہ جا کر نئی زندگی شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے انشورنس کلیم بھی تسلیم نہیں کئے جاتے۔ کلیم داخل کئے جانے کے بعد انشورنس کمپنیاں اپنے طور پر ایسے تمام الجھے ہوئے معاملات کی تحقیقات کرواتی ہیں۔ اس کام کے لئے اپنے کارندوں یا ایجنٹوں کے علاوہ پرائیویٹ ڈیٹیکٹو بیورو سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کی گمشدگی کے سلسلے میں بھی مختلف وسائل کے ذریعہ تحقیقات کروائی گئی تھی۔ میں نے متعلقہ انشورنس کمپنی کو لکھا کہ میں اس کیس کی از سر نو تحقیق کرنی چاہتا ہوں۔ انھیں فیس ادا نہیں کرنی ہوگی۔ میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے انشورنس کمپنی نے اس کی فائل مجھے بھجوا دی اور ساتھ ہی یہ پیش کش کی کہ اگر میں اس معاملے کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ فیس ادا کرنے کو تیار ہیں۔

فائل میں ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کے ذاتی اور اصلی حالات کے علاوہ اس کی فرم کے بارے میں ہر قسم کا مواد موجود تھا۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گم ہونے سے کئی سال قبل سے اچھے نہ تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے ایک دوست کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی جس کا علم اُسے گم ہونے سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس بات کی بنیاد پر پولیس کو شبہ پیدا ہوا تھا کہ شاید اس کی بیوی اور اس کے آشنا نے مل کر اسے ٹھکانے لگا دیا ہو مگر لاش کے نہ ملنے کے سبب ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

جہاں تک اس کی فرم کا تعلق تھا، اس بارے میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے۔ فرم کی مالی حیثیت اس کی گمشدگی سے کئی ماہ قبل سے خراب چلی آ رہی تھی۔ تجارتی حلقوں میں فرم کی ساکھ ان دنوں اچھی نہ تھی اور کئی بار اخباروں میں اس کے دیوالیہ نکل جانے کے خدشات کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ نے باربرداری کے کئی جہاز یکے بعد دیگرے بنوائے یا خریدے تھے مگر یورپی ممالک میں تجارت کے ماند پڑ جانے کے نتیجے میں اس کی فرم کے جہاز بیکار پڑے تھے۔ بالآخر اسے اپنی فرم کو بچانے کے لئے کئی جہاز بیچنے پڑے تھے۔ اس کے اس طرح یکایک گم ہو جانے کی وجہ سے تجارتی حلقوں میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ نے دیوالیہ نکلنے کے ڈر سے فرم کا سرمایہ کسی دوسرے ملک مثلاً سوئٹزرلینڈ منتقل کر دیا ہوگا اور خود روپوش ہو گیا ہوگا۔

مجھے چونکہ اس معاملے کی تہہ میں جانے کا شوق تھا۔ اس لئے میں نے متعلقہ انشورنس کمپنی سے باقاعدہ تعارفی چٹھی جاری کروائی تاکہ ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کی بیوی، اس کے بیٹے اور اس کی فرم سے رابطہ قائم کر سکوں اور اس کیس کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کر سکوں۔

ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کی شپنگ کمپنی کا امبلیم انہی تین حروف ای اے جی پر مشتمل تھا جو ایک گلوب کی صورت میں لکھے ہوئے تھے جن کے گرد مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ عین اسی رنگ میں جس طرح میں نے یہ نقش برادر تھومے کے بازو پر گودا ہوا دیکھا تھا۔ کمپنی کا ڈائریکٹر اب اس کا بیٹا تھا جس کا نام جوزیف آرنولڈ گیلنگ تھا۔ گویا عین وہی نام جس کا ذکر برادر تھومے نے کیا تھا۔ جب میں نے اس کے بیٹے جوزیف سے اپنا تعارف کروایا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے اپنے باپ کے کیس میں کچھ ایسی دلچسپی نہ دکھائی۔ اس کا کہنا تھا کہ پرانے مردے اکھاڑنے میں کچھ نہ دھرا تھا۔ اس کا باپ کبھی کا مر چکا تھا اور اگر نہ بھی مرا ہوتا تو اس کے لئے شپنگ کمپنی میں اب کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ درست تھا کہ اس نے جنگ عظیم کے بعد دوبارہ فرم کو چلایا تھا اور اپنے قدموں پر کھڑا کیا تھا۔ مگر آخری دنوں میں اس نے قریب قریب دیوالیہ نکال دیا تھا۔ یہ تو محض اتفاقیہ بات تھی کہ اس کے گم ہونے کے تھوڑے عرصے کے بعد ویتنام کی جنگ

کی وجہ سے امریکہ کو مال بردار جہازوں کی ضرورت پڑی تھی اور اس طرح ان کی فرم کو آرڈر ملنے لگے تھے اور ان کے تمام مسائل حل ہو گئے تھے
اپنے باپ کے بارے میں اس کی عام رائے اچھی نہ تھی۔ بطور باپ کے وہ شخص اُس کی نظروں میں صفر تھا کیونکہ اسے سوائے اپنی ذات کے کسی دوسرے شخص سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا سلوک اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا تھا جیسا لوگ غیروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ درست تھا کہ اُس نے اُسے کبھی جسمانی سزا نہ دی تھی۔ مگر محبت اور شفقت کا فقدان ہر جسمانی سزا سے بدتر تھا۔ اس کی سرد مہری کو بیٹا معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ رہا کمپنی کا معاملہ تو وہ اپنے باپ کو اس قابل نہ گردانتا تھا کہ وہ مینجمنٹ کے عصری اصولوں کو سمجھ سکتا۔ بیٹے کو یقین تھا کہ اس کے باپ نے اپنی ناکامی بطور انسان اور بطور مینیجر شپنگ کمپنی کو جان لیا تھا اس لئے خودکشی کر لی تھی۔

میرے آفس نے ایرہارڈ آر نولڈ گیلٹنگ کی بڑی بہن کا پتہ تلاش کر لیا تھا، چھوٹی بہن فوت ہو چکی تھی۔ بڑی بہن کو اپنے بھائی کی گمشدگی کا افسوس تھا اور اُسے بھی یقین تھا کہ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی تمام تر ذمہ داری اس کی رائے میں ایرہارڈ کی بیوی انگے کے سر پر تھی۔ اس عورت نے عمر بھر اپنے میاں سے بے وفائی کی تھی۔ جب وہ جنگ میں تھا تو انگے ہر اُن دو ٹانگوں کے پیچھے بھاگتی پھری تھی جن پر مردوں والی پتلون چڑھی ہوتی تھی۔ ایرہارڈ کی جنگی قید بندی کے دنوں میں تو اُس نے ایرہارڈ کے دوست کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ ایرہارڈ کی روس کی قید سے رہائی کے بعد بھی یہ دوستی چوری چھپے قائم رہی تھی۔ ماسوا ایرہارڈ کے ہر کوئی اس بات سے واقف تھا۔ ایرہارڈ کو اپنی شپنگ کمپنی سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ آخر تنگ آ کر بہن نے اس کی آنکھیں کھولی تھیں۔ مگر اب اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ایرہارڈ کے لئے اس راز کا کھلنا اتنا بڑا صدمہ تھا کہ وہ بالکل بجھ گیا تھا۔ مرجھا کے رہ گیا تھا۔ پھر شپنگ کمپنی میں خسارے نے اس کی کمر ہی توڑ کے رکھ دی تھی۔ ان حالات میں اس کا اپنا خاتمہ کر دینا بالکل منطقی بات تھی۔ اس کی بیوی نے ایرہارڈ کی گمشدگی کے تیسرے سال اسے عدالت سے مردہ قرار دلوانے کے بعد اپنے یار سے بیاہ رچا لیا۔ ایرہارڈ کی بہن نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ ایرہارڈ کی سابقہ بیوی سے جا کے ملوں۔ اس کا نام اور پتہ بھی مجھے اُسی نے مہیا کیا۔

بہن کی رائے بھی ایرہارڈ کے بارے میں کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ اس کو اپنے بھائی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ اُس نے جائیداد میں سے اپنی بہنوں کا حصہ مارنے کی کوشش کی تھی۔ یوں بھی ماں باپ نے بہنوں کے مقابلے میں اپنے اکلوتے بیٹے کو ہمیشہ ترجیح دی تھی۔ اس بات سے ایرہارڈ نے پوری ڈھٹائی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ شپنگ کمپنی ان کے دادا کی قائم کردہ تھی۔ ان کے باپ نے اسے خوب توسیع دی تھی۔ ایرہارڈ کو بطور جانشین کے تیار کیا گیا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد فرم پر اُس نے قبضہ کر لیا تھا۔ دونوں بہنوں کو بہت جونیئر قسم کا کام دیا گیا۔ ایک بہن کے سپرد فرم کی اطلاعات کا بلیٹن شائع کرنا تھا جب کہ دوسری بہن عمر بھر دوسروں کے لکھوائے ہوئے خط ٹائپ کرتی رہی۔ ایرہارڈ نے اپنی بہنوں کو نہ تو فرم کے منافع میں سے کوئی حصہ دیا تھا نہ ہی ان کے کام کو کبھی سراہا تھا۔

ایرہارڈ کی سابقہ بیوی انگے پہلے پہل مجھ سے بات کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے سال گزرنے کے بعد اب اس معاملے پر بھلا کیا روشنی ڈالی جا سکتی تھی۔ یہ بات کہ ان کی آپس میں نہ نبھتی تھی کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ تصور ایرہارڈ کی بہن کا تھا جس نے اپنے بھائی کو اس کے خلاف ورغلایا تھا۔ رہا ایرہارڈ تو اس کے اندر وہ چیز پائی ہی نہ جاتی تھی جسے عرف عام میں انسانی محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے سینے میں دل نہ تھا بلکہ برف کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب وہ سال بنے ہوں، جو اس نے محاذِ جنگ پر گزارے تھے۔ وہ مزے لے لے کر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بربریت کے قصے سنایا کرتا تھا۔ انگے نے اپنے آپ کو اس سے اندرونی طور پر جنگ کے دنوں سے علیحدہ کر لیا تھا۔ طلاق محض اس وجہ سے نہ لی تھی کہ ان کا بیٹا اس وقت چھوٹی عمر کا تھا۔ ان کا آپس میں جسمانی تعلق بہت لمبے عرصے سے ختم تھا۔ چونکہ یہ بات ہر کوئی جانتا تھا اس لئے انگے کو بتانے میں

ہچکچاہٹ نہ تھی کہ اس کا جنسی رابطہ اپنے بعد میں ہونے والے خاوند کے ساتھ سالہا سال سے قائم تھا۔ یہ ایرہارڈ تو وہ بھی کوئی راہب نہ تھا وہ اپنی سکریٹری کے ساتھ وابستہ تھا۔ انگے نے مجھے مشورہ دیا کہ ایرہارڈ کے بارے میں اس کی سیکرٹری سے بات کروں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ انگے کو ایرہارڈ کے گم ہونے کا ذرہ برابر افسوس نہ تھا۔ اُسے صرف اس بات پر رنج تھا کہ اگر اس نے خودکشی ہی کرنی تھی تو ایسے طریقے سے کرتا کہ اس کی لاش مل جاتی یا کم از کم اُس کے مرنے کا کوئی ثبوت موجود ہوتا۔ اس صورت میں اس کی لائف انشورنس کی رقم تو وصول کی جا سکتی مگر جو شخص زندگی بھر دوسروں کے لئے غیر نافع وجود تھا۔ اُسے مرتے وقت دوسروں کی بھلائی کی بات کیوں کر سوجھ سکتی تھی۔

ایرہارڈ کی سابقہ سیکرٹری یقیناً کسی زمانے میں بیوٹی کوئین رہ چکی ہوگی۔ ایرہارڈ کی گمشدگی کے سلسلے میں اس کی معلومات دوسروں سے کہیں بہتر تھیں۔ میرے سامنے پہلی بار اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ دراصل وہ خود بھی گمشدگی کے پلان کا حصہ تھی ایرہارڈ نے اپنے گردوپیش سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کی خاطر یہ سکیم بنائی تھی کہ فرم کے سرمائے سے ایک حصہ نکال کر نوٹوں کی صورت میں سوئٹزرلینڈ پہنچایا جائے اور کسی بنک میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ کار میں پرتگال جانا چاہتا تھا۔ جہاں پر ان کو دو ہفتے کے بعد لزبن کے ہوٹل رٹز میں ملنا تھا۔ سکینڈل سے بچنے کی خاطر پروگرام یہ تھا کہ وہ یہ سفر کار میں اکیلا کرے گا جب کہ اس کی سیکرٹری بذریعہ ہوائی جہاز دو ہفتے کے بعد فرم سے چھٹی لے کر لزبن جائے گی۔

وہ تو عین مقررہ دن پر لزبن پہنچ گئی تھی مگر ایرہارڈ نے نہ آنا تھا اور وہ نہ آیا۔ سیکرٹری نے اس کا انتظار رٹز ہوٹل میں ایک ماہ تک کیا۔ اتنے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے رقم اسے ایرہارڈ نے دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کار کے سفر کے دوران اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اور وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کہاں پر اور کس رنگ میں بسر کرے گا۔ ایرہارڈ کی سیکرٹری کا کہنا تھا کہ ایرہارڈ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ شاید اُسے رستے میں کوئی اور عورت مل گئی تھی یا یہ کہ اُس نے اپنا پروگرام بدل لیا تھا اور کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ آج وہ جزیرہ ہوائی یا شاید ہونولولو میں عیش کر رہا ہو گا۔ دس ملین مارک کی رقم آخر اتنی چھوٹی موٹی نہیں ہوتی اور وہ اتنی جلد ختم بھی نہیں ہوتی۔ اس بات کو کہ کار رستے میں خراب بھی ہو سکتی ہے اس نے ہاتھ کے اشارے سے رد کر دیا۔ ایرہارڈ اتنا اچھا میکینک تھا کہ وہ ہر مشین کا پرزہ پرزہ کھول کر اسے ٹھیک کر سکتا تھا۔ البتہ رستے میں حادثے کا پیش آجانا اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ مگر اس صورت میں اس کے وارثوں کو اطلاع ملنی چاہیے تھی۔ آخر اس کی کار کہاں گئی تھی۔ اس کا بھی تو کوئی سراغ نکلنا چاہیے تھا۔

اس کی سابقہ سیکرٹری کا قیام ہوٹل رٹز میں اس کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ وہاں پر اس کی ملاقات ایک جرمن انڈسٹری منیجر کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اُس کے ہمراہ واپس ہمبرگ پہنچی تھی۔ ان کی شادی کو اب انیس برس ہو چکے ہیں۔ ایرہارڈ کو وہ اپنی یادداشت سے بالکل نکال تو نہیں سکتی مگر اس کی زندگی میں اب ایرہارڈ کے لئے کوئی گوشہ باقی نہیں ہے۔

اس گفتگو کے بعد میں نے ایرہارڈ کے بارے میں مزید تحقیق کو بے سود جانتے ہوئے انشورنس کمپنی کو فائل اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی کہ مجھے ایرہارڈ آرنولڈ گیلنگ کی گمشدگی کا معمہ حل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ایرہارڈ کے بیٹے، اس کی بہن، اس کی سابقہ بیوی یا سابقہ سیکرٹری سے بھی میں نے اپنی ایرہارڈ کے ساتھ ملاقات کا ذکر نہ کیا۔ وہ اپنی سابقہ زندگی سے ناتا توڑ کر نروان پا چکا تھا اور میں اس کو دوبارہ اس جنم میں واپس لانے کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔

عرضی

نیلوفر اقبال

بشیر کے باپ نے اس کی ساری کتابیں پھاڑ دیں۔ اسے خوب مارا۔ پھر کمرے میں بند کر دیا۔ وہ مار کے درد سے بڑی دیر تک روتا رہا۔ اس کی ماں دروازے کے باہر کھڑی اسے سمجھاتی رہی۔ ماں تھی۔ اسے مار پڑتی دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ اگر وہ باپ کی بات مان لیتا تو مار نہ پڑتی۔ "ضد نہ کر پتر۔ ابا ٹھیک کہتا ہے —— میرا بچہ، باپ کا کہنا مان لے۔ پھر میں تجھے باہر نکالوں گی —— دیکھ تیرے لئے پراٹھا پکایا ہے۔"

پراٹھے کا نام سن کر اتنے گھنٹوں سے بھوکے بشیر کی ضد کمزور پڑ گئی۔ اسے لگا شاید ابا ٹھیک ہی کہتا ہے —— ضد کا کیا فائدہ۔ پراٹھا تو کھائے نکل کے۔ "اچھا بے بے۔ کھول دروازہ۔"

ماں نے جلدی سے دروازہ کھول کر اسے لپٹا لیا۔ اپنی چادر سے اس کا منہ اور ناک صاف کئے۔ پیشانی سے بال ہٹا کر چوما "پتر، ضد نہیں کرتے باپ کے ساتھ —— آ میرا سوہنا۔"

ماں نے واقعی پراٹھا پکا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کٹوری میں گھی گرم کر کے اس میں گڑ کی شکر ڈالی اور بشیر کے سامنے رکھ دیا۔ "حلوہ بنا دوں ساتھ؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماں جلدی جلدی حلوے کے لئے ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ وہ شکر کے ساتھ پراٹھا کھاتا رہا —— لیکن ابا کی بات مان کر وہ بڑا ہی اداس تھا۔

اسے اپنے سکول سے بڑا ہی پیار تھا۔ وہ صبح سویرے شوق سے اٹھ کر تیار رہتا تھا۔ بھاگا بھاگا سکول جاتا تھا۔ وہ شروع ہی سے جماعت میں اول رہتا تھا۔ ماسٹر سے اسے روز ہی شاباش ملتی تھی۔ اس میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ ماسٹر نے اسے مانیٹر بنا دیا تھا۔ اکثر گرمیوں کی دوپہروں میں ماسٹر صاحب کو نیند آنے لگتی تو وہ بشیر کو سبق سمجھا کر کرسی میں بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ بشیر اپنی کلاس کے سامنے کھڑا ہو کر لڑکوں کو پہاڑے یاد کرواتا رہتا یا کوئی دوسرا سبق یاد کروا دیتا۔ وہ آگے آگے بولتا لڑکے پیچھے پیچھے زور زور سے دہراتے۔ یہ آوازیں لوری کا کام دیتیں اور ماسٹر صاحب آہستہ آہستہ میٹھی نیند میں کھو جاتے۔ ٹوپی ان کی ناک پر سرک آتی۔ بشیر خاص خیال رکھتا کہ کلاس میں بے ہنگم شور نہ ہو تاکہ ماسٹر کی نیند خراب نہ ہو۔ بشیر کو ان سب باتوں میں بڑا مزا آتا تھا۔ اسی لئے وہ پوری شام سبق یاد کرتا رہتا تھا۔ اگلے دن باقی بچے اٹک رہے ہوتے تھے بلکہ کئی تو بالکل ہی پڑھ نہیں سکتے تھے اور بشیر فر فر سبق سنا دیتا تھا۔

پھر آدھی چھٹی کے وقت کھیلوں میں کتنا مزا آتا تھا۔ وہ کھیلوں میں بھی دوسرے لڑکوں کا نمبر کاٹتا تھا۔ سب سے تیز دوڑتا تھا۔

چوہدریوں کا لڑکا بھی اسی جماعت میں تھا۔ وہ بشیر کو اچھا سمجھتا تھا۔ وہ بشیر کا خاص دوست تو نہیں تھا لیکن ضرورت پڑنے پر بشیر اس کی مدد کر دیتا تھا۔ حساب کا گھنٹہ آدھی چھٹی کے فوراً بعد ہوتا تھا۔ بشیر اس کی کاپی میں سوال حل کر دیتا تھا۔ چوہدریوں

کا لڑکا اکثر گھر کا کام کر کے نہیں لاتا تھا۔ بشیر صبح صبح سکول کی گھنٹی بجنے سے پہلے جلدی جلدی اس کا کام کر دیتا تھا۔ چوہدریوں کا لڑکا بشیر کو دوست سمجھتا تھا اور اب ....!

اس کا باپ چوہدریوں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی گائیں وغیرہ بھی سنبھالتا تھا۔ بدلے میں اسے تھوڑے بہت پیسے اور اناج وغیرہ مل جاتا تھا جس سے بڑی مشکل سے گھر کا کھانا پینا چلتا تھا۔ اس کی ماں تھوڑی بہت سلائی جانتی تھی۔ چوہدرانی نے اس پر مہربانی کر کے اسے سلائی کی مشین لے دی تھی ——— وہ چوہدرانی کی بڑی احسان مند تھی۔ اسے ذرا بھی فارغ وقت ملتا تو وہ اس کی مٹھیاں بھرنے یا سر پر تیل لگانے چلی جاتی تھی۔ اسے وہاں سے چوہدرانی کے اترے ہوئے تقریباً نئے جوڑے مل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے بھی کپڑے مل جاتے تھے۔ سلائی کرنے سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ کسی کی شلوار قمیض سی دیتی کبھی رضائیوں کا استر جوڑنے یا دوپٹوں پر گوٹا کناری کا کام مل جاتا۔ اس کے علاوہ چوہدریوں کے گھر سے بھی کام مل جاتا تھا۔ ویسے تو چوہدریوں کے کپڑے شہر سے سل کر آتے تھے۔ درزی آ کر کپڑے لے جاتا تھا اور دو تین دن میں سی کر لا دیتا تھا لیکن چھوٹا موٹا کام پھر بھی نکل آتا تھا۔ جو چوہدرائن بشیر کی ماں کو پکڑا دیتی تھی۔ وہ چوہدرائن سے اس کام کے پیسے نہیں لیتی تھی ——— چوہدرائن نے مشین جو لے کر دی تھی۔

جونہی گاؤں میں مڈل سکول کھلا۔ بشیر کی ماں نے بڑے لڑکے مجید کو اس میں ڈال دیا۔ اس کے خاوند نے کچھ لیس و پیش سے کام لیا لیکن ماں اڑ گئی۔ اس نے کہا جب وہ دن رات محنت کر کے خرچہ پورا کر رہی ہے تو باپ کو کیا اعتراض ہے ویسے بھی سرکاری سکول میں فیس برائے نام تھی۔ ماں کی ضد کے آگے وہ خاموش ہو گیا، اور مجید اسکول جانے لگا۔

مجید پڑھائی میں اچھا چل نکلا تھا۔ چھٹی جماعت پاس کر لی تھی کہ چودھری کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اسے گائیوں کو چارہ وغیرہ دینے اور دودھ دوہنے کے لئے صحت مند جوان لڑکوں کی ضرورت تھی۔ اس کا پہلا آدمی بیمار رہنے لگا تھا۔ چوہدری کو اس کے کام سے تسلی نہیں تھی۔ گائیوں کو سنبھالنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ ان کو چرانا، نہلانا، اُن کے چھپر صاف کرنا، ان کا دودھ سنبھالنا، یہ بوڑھے بیمار آدمیوں کا کام نہ تھا۔ اس نے منشی سے کہہ چھوڑا تھا کہ نئے تگڑے لڑکوں کو پرانے آدمیوں سے ٹریننگ دلا کر پرانے لوگوں کو چھٹی کر دی جائے۔ اس سلسلے میں مجید کے باپ کو بلا کر کہہ دیا گیا کہ اگلے دن سے اپنے بڑے لڑکے کو حویلی بھیج دے۔

اگلے دن سے مجید کا سکول جانا بند ہو گیا اور وہ چوہدریوں کا نوکر ہو گیا۔ مجید کی ماں تو چاہتی تھی کہ لڑکا پڑھ جاتا مگر مشین نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ پھر ان کی روزی بھی چوہدریوں کے کھیتوں سے لگی ہوئی تھی کس منہ سے کہتے کہ لڑکا نہیں آئے گا۔ ان کی اتنی مجال نہیں تھی۔ مجید کا سکول جانا چھٹ گیا تو وہ آہستہ آہستہ سکول سے جو کچھ سیکھا تھا بھول گیا ——— روز منہ ہاتھ دھونا، کھیل سے آ کر نہانا، دُھلا ہوا جوڑا پہننا، ملیشیا کا یونیفارم جو اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے سیا تھا ——— سب کچھ چھٹ گیا۔ اب وہی یونیفارم چھوٹا کر کے ماں نے چھوٹے بھائی بشیر کے ناپ کا کر دیا تھا۔ اس کے کپڑوں کا اب کیا ذکر تھا۔ اسے ڈنگر سنبھالنے تھے، جو بھی ملتا پہن کر چلا جاتا۔ اب تو وہ خود ڈنگروں جیسا ہو گیا تھا ——— اس کے کپڑوں اور جسم سے ہر وقت گوبر کی بو آتی تھی۔ وہ رات گئے تھکن سے بے حال گھر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں خالی خالی اور گائیوں کی طرح پھٹی پھٹی ہوتیں۔ انگلیوں اور ناخنوں میں چارا اور گوبر پھنسا ہوتا۔ اس کے کپڑوں سے گوبر اور بھینسوں کے جسموں کی اتنی شدید بو آتی کہ بشیر کئی دفعہ اپنا سانس روک لیتا۔ مجید اسے منہ بناتا دیکھ لیتا تو بپھر کر اس پر پل پڑتا۔ بڑا آیا لاٹ

صاحب کا بچہ ـــــ بڑا صاف بنا پھرتا ہے"
اس دھینگا مشتی میں ماں چیختی۔ گود کا بچہ رونے لگتا۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ مجید کے بسانڈے، کیڑوں والا جسم جب بشیر سے بھڑ جاتا تو مار سے زیادہ کراہیت سے بشیر کا بُرا حال ہو جاتا۔
"جا پتر مجیدے۔ ہاتھ دھولے میرا بچہ ـــــ گندے ہاتھوں سے روٹی نہ کھانا"
وہ بڑبڑ کرتا گالیاں بکتا گھرے پر ہاتھ دھونے چلا جاتا۔ اتنی دیر میں ماں روٹی نکال دیتی۔ وہ روٹی کھانی شروع کرتا تو کچھ سکون ہو جاتا۔ بشیر کن انکھیوں سے اس کی دال میں لتھڑی انگلیوں اور منہ سے باہر لٹکتے ہوئے روٹی کے لقموں کو دیکھتا جنھیں وہ انگلیوں سے دبا دبا کر تیزی سے منہ میں ٹھونس رہا ہوتا۔ گھن سے بشیر کا دل اوبھ جاتا اور وہ اپنی تمام توجہ اپنے سکول کے کام میں لگا دیتا۔ اتنے ہنگامے میں بھی بشیر سکول کے کام کو نہیں بھولتا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ اگلے دن کا سبق یاد کرتا تاکہ فر فر سنا سکے۔ اسے تعریفوں اور شاباشی کی ایسی چاٹ پڑ گئی تھی کہ اس کا دل سب سے زیادہ اپنا سبق یاد کرنے میں ہی لگتا تھا۔

ایسے میں چوہدریوں کا پیغام ملا کہ گھر کے اوپر کے کاموں اور چوہدرانی کے سب سے چھوٹے بچے کو کھلانے کے لئے دوسرے بچے کو بھیج دیا جائے تو بشیر کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے رو رو کر کہا کہ وہ نہیں جائے گا۔ نوکر نہیں بنے گا۔ وہ سکول جائے گا ـــــ اس کا امتحان ہونے والا تھا۔ لیکن اس کے باپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو ماں بھی جوش میں آئی تھی۔ کہنے لگی "ایک لڑکا تو دے دیا، ساری اولاد کا ٹھیکہ تو نہیں لیا" ـــــ مگر پھر سلائی کی مشین اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ بشیر کی سسکیوں کے جواب میں باپ کی ایک ہی رٹ تھی ـــــ "چوہدری صاحب نے مجھے خود بلا کر کہا ہے ـــــ جائے گا کیسے نہیں ـــــ میں چوہدری کو کیا جواب دوں گا"
"ابا میں سکول میں پڑھوں گا"
"سکول میں پڑھے گا ـــــ کتنا پڑھے گا سکول میں ؟۔ پڑھ تو لیا اتنے سال ـــــ نوکری ہی کرنی ہے نا آخر۔ اب نوکری مل رہی ہے تو بُری لگ رہی ہے ؟"
"ابا میرا امتحان ہے ـــــ بس چار دن رہ گئے ہیں"
"چپ کر امتحان کے بچے۔ جب میں نے کہہ دیا ہے سویرے چوہدریوں کے جانا ہے تو بس جانا ہے"
"میں نے نہیں جانا"
"تو نے مار کھانی ہے بشیرے"
"میں نہیں جاؤں گا ابا"
اس پر باپ بالکل پاگل ہو گیا۔ اس نے بشیر کو گردن سے پکڑ کر پٹائی شروع کر دی۔ پھر اسے ایک طرف پھینک کر سارے فساد کی جڑ ـــــ اس کا بستہ اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ساری کتابیں اور کاپیاں زمین پر بکھر گئیں ـــــ سیاہی کی دوات الٹ کر کھل گئی ـــــ پینسل ربر سب زمین پر بکھر گئے ـــــ "سارا فساد اسی کا ہے" باپ کہتا جاتا تھا اور ٹھوکروں سے اس کی کتابوں کے چیتھڑے اڑاتا جاتا تھا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور بشیر کی ایک ایک کتاب، اور کاپی کو پھاڑ کر کاغذوں کا انبار بنا دیا۔

بشیر کی سسکیاں دبی دبی چیخوں میں بدل گئیں۔ دھینگا مشتی اور شور سن کر ساتھ والے گھروں سے عورتیں جھانکنے لگیں ——اس پر باپ اور آگ بگولا ہو گیا اور بشیر کو بازو سے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا اور بند کر دیا۔ خود پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر دروازے سے پلٹا اور صحن کے کونے میں بنے ہوئے چولہے پر سر جھکائے تیزی سے روٹیاں اتارتی ہوئی بشیر کی ماں سے بولا۔ "جب تک نہ مانے۔ اگر دروازہ کھولا تو پھر یاد کرو گی"

پراٹھا کھاتے ہوئے بشیر کو پھر رونا آ رہا تھا —— اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے —— ماں بھی باپ کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بولے جا رہی تھی۔

"ہاں بیٹا۔ اب تو تو گیارہ سال کا ہو گیا ہے۔ ماشاءاللہ بارھواں لگنے والا ہے —— اتنے بڑے بڑے لڑکے تو کمانے لگتے ہیں —— چوہدرانی نیک عورت ہے —— تیرا کھانا بھی وہیں سے لگ جائے گا —— کپڑے بھی دے گی۔ اپنے بچوں کی طرح رکھے گی —— تو ان کی خدمت کرنا۔ وہ بہت خوش ہو گی تجھ سے ——روتا کیوں ہے —— بیٹا لڑکوں نے کمانا ہی ہوتا ہے آخر —— تیری تو قسمت اچھی ہے۔ ابھی سے نوکری لگ رہی ہے —— بس اب بند کر رونا —— پڑھ تو لیا پانچ سال۔ کب تک تیرا باپ پڑھائے گا۔ مجید بھی تو پانچ جماعتیں پڑھا ہے۔ کافی ہیں پانچ جماعتیں —— نہ رو میرا بچہ —— پتر تو بات نہیں مانے گا تو تیرے باپ کا کام جائے گا۔ چوہدری غصے ہو جائے گا —— بیٹا چوہدرانی سمجھے گی ہم اکڑ دکھا رہے ہیں —— پھر اس نے تیری ماں کو مشین بھی تو لے کر دی ہے"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پراٹھا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ماں کی کوئی بات بھی نہیں سنی تھی۔ اس کا ذہن کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کی دہلیز میں بیٹھ گیا —— اس نے اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ دیے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ سوچنے لگا —— سوچتا رہا —— دیر تک سوچتا رہا —— پھر اس کے چھوٹے سے ذہن نے ایک بڑی سکیم سوچ لی —— امید کی ایک لہر سی اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا پتر۔ حلوہ بن گیا ہے۔" ماں نے حلوہ طشتری میں نکال کر ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھ دیا تھا۔ وہ آ کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں اپنے ہاتھ سے اسے حلوے کے نوالے کھلانے لگی۔ ساتھ ہی وہ کچھ کہتی جا رہی تھی —— اسے اپنی ماں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا —— اسے کچھ اور سوچنا تھا —— وہ بالکل کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن کچھ جملے ترتیب دے رہا تھا —— وہ کسی لفظ کو رد کر دیتا —— پھر کوئی نیا جملہ سوچتا —— پھر کسی جملے کو رد کرتا۔ جونہی حلوہ ختم ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جلدی سے جلدی کمرے میں اپنی پھٹی ہوئی کتابوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی کتابوں کے کاغذ سمیٹ کر واپس بستے میں رکھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے دیکھا —— کافی محنت لگے گی، بلکہ پورا دن لگے گا، لیکن لئی سے جڑ جائیں گی۔ پھر سیاہی کی دوات کو اٹھا کر دیکھا۔ سیاہی فرش پر خشک ہو چکی تھی۔ دوات کے پیندے میں تھوڑی سی باقی تھی۔ اس نے دوات کے اوپر ڈھکن کس کر بند کیا۔ اسے کاغذ سے اچھی طرح پونچھا اور واپس بستے میں رکھ دیا۔ پرانا زنگ آلود جیومیٹری بکس جو اسے چوہدریوں کے لڑکے نے دیا تھا، لڑھک کر چارپائی کے نیچے چلا گیا۔ اس نے چارپائی کے نیچے گھس کر اسے نکالا۔ پھر اپنی پنسل، ربڑ، فٹا اور پنسل تراش کمرے کے مختلف کونوں سے اکٹھے کر کے جیومیٹری بکس میں رکھے۔ اب اسے اپنے ہولڈر کی تلاش تھی۔ کافی ڈھونڈنے کے بعد وہ دروازے کے نیچے پھنسا ہوا ملا

لیکن اس کا نب مڑ گیا تھا۔ اس نے دبا دبا کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اسے آج اس نب کی ضرورت تھی۔ اس نے بچی کچی سیاہی میں ڈبو کر لکھ کر دیکھا لیکن بالکل لکھا نہ گیا۔ اس نے ہولڈر کو بھی بستے میں ڈال دیا۔ پھر جیومیٹری بکس سے پنسل نکالی۔ پھر پنسل تراش سے اسے خوب نوکدار تراشا۔ بستے میں کاغذوں کے انبار میں سے بڑی مشکل سے اسے دو سادے ورق ملے۔ اس نے ایک کاپی نکال کر ورق اس کے اوپر رکھے اور چارپائی کے کنارے پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرنے لگا۔

اسی وقت اسے باہر سے باپ کی آواز آئی۔ اس نے لپک کر کاغذ اور پنسل بستے میں گھسا دیئے۔ باپ کی آواز آئی "کیا کہتا ہے؟"

"ٹھیک ہو گیا ہے ــــ اب اس کو کچھ نہ کہنا ــــ اچھا ہوشیار تھا پڑھائی میں ــــ خیر جو قسمت ــــ مان گیا ہے بے چارہ ــــ بچہ ہے۔"

"ہوں۔" باپ نے کہا اور کمرے میں آ گیا۔ وہ اس وقت بستے میں چیزیں رکھ کے اُٹھ رہا تھا۔

"کیا کر رہا ہے؟"

"یہ سب ہٹا رہا تھا۔"

"روٹی کھائی؟"

"ہاں۔"

باپ باہر نکل گیا۔ پھر اس کے چارپائی پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر چولہے کے پاس سے برتنوں کی آواز آنے لگی۔ ماں اس کے لئے کھانا نکال رہی تھی۔

اب جب تک باپ گھر میں تھا وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا ــــ کل زمیندار کے گھر جانا تھا۔ جو کرنا تھا آج ہی کرنا تھا۔ اس کی نظریں باپ پر لگی تھیں۔ وہ اندر چارپائی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اسے باپ کی پشت تھوڑی سی نظر آ رہی تھی ــــ باپ گھر سے باہر جائے تو وہ کچھ کر سکتا تھا۔ روٹی کھا کر باپ وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ اب کمرے میں ٹکنا فضول تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

صحن میں بیری کا سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے خوب ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ اس درخت پر اس کی پتنگیں لٹک رہی تھیں۔ درخت کے تنے کے ساتھ ٹین کا چھوٹا سا ڈبہ رکھا تھا اس میں اس نے لئی پکا کر رکھی ہوئی تھی۔ درخت کے دو شاخے کے بیچ میں سرخ رنگ کی ڈور کا بڑا سا پنا پھنسا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کی ڈور بڑی خاص تھی۔ بسنت سے پہلے اس نے اپنے یار پتنگ والے سے خاص طور پر خوشامد کر کے بنوائی تھی۔ اسے بنانے میں سریش اور شیشے کا چورا استعمال کیا تھا۔ اس نے یہ راز اپنے ساتھیوں کو نہیں بتایا تھا۔ پھر تو سب ایسی ڈور بنوا لیتے ــــ اور بسنت میں اس نے کیا پتنگیں کاٹی تھیں! کتنی گڈیاں لوٹی تھیں! کتنی ڈور لوٹی تھی۔ اس نے اپنی لوٹی ہوئی تمام پتنگیں بیری میں لٹکا دی تھیں۔ اور لوٹی ہوئی ڈوروں کے چھوٹے بڑے پنے شاخوں میں اٹکا رکھے تھے۔

اس نے ایک پھٹی ہوئی پتنگ اُٹھائی اور ایک اور بہت پھٹی ہوئی پتنگ کے کاغذ پھاڑ کر جوڑ لگانے لگا ــــ پتہ نہیں چوہدریوں کے گھر جا کر پھر کبھی پتنگ اڑا سکے گا یا نہیں۔ مجیدے کا بیچا سارے گاؤں میں مشہور تھا لیکن اب اس کا سارا دن ڈنگروں کی خدمت میں گذر جاتا تھا۔ کسی نے اس کی ماں کو بتایا تھا کہ وہاں اس کو مار بھی پڑتی تھی پہلے تو وہ

ذرا ہوشیار ہوتا تھا۔ اب بالکل کوڑمغز ہوگیا تھا۔ منشی اور دوسرے بڑے نوکروں کے دھموکوں نے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ کبھی کبھی چوہدری کو بھی اس کی کسی بے وقوفی پر غصہ آجاتا تو وہ بھاری بھاری ہاتھ اس کی گردن پر مار دیتا۔ وہ گھر آ کر کچھ نہیں بتاتا تھا۔ دراصل وہ اتنا کوڑھ دماغ ہوگیا تھا کہ اسے گھر آکر سوائے اپنی بھوک کے اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ تو اب پتنگوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ اس بسنت میں پتنگ اڑانا تو گیا وہ سامنے گرتی پتنگوں اور سامنے جھولتی ڈور کو لوٹنے تک کو نہیں بڑھا ـــــ دور سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر میں بشیر کا باپ اُٹھ گیا۔ اس نے گھڑے سے پانی نکال کر پیا۔ پھر کھیس کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ اب اسے رات سے پہلے واپس نہیں آنا تھا۔ ماں مشین پر بیٹھ چکی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی باہر احاطے میں کھیل رہے تھے۔

بشیر لپک کر کمرے میں گھس گیا۔ اس نے بستے سے کاغذ اور پنسل نکالی اور چارپائی کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک پنسل کے پچھلے سرے کو منہ میں دبا کر چوستا رہا۔ پھر لکھنے لگا۔

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب

اسلامیہ مڈل سکول

جناب عالی!

گذارش ہے کہ میں جماعت پنجم کا طالب علم ہوں۔ میرا امتحان ہونے والا ہے۔ میں جماعت میں ہمیشہ اول آتا ہوں۔ زمیندار نے مجھے کام پر بلا لیا ہے۔ اس نے میرے بھائی مجیدے کو بھی بلایا تھا۔ مجیدا چوہدریوں کے ڈنگر سنبھالتا ہے۔ اس کے کپڑوں سے ڈنگروں کی بو آتی ہے اور منشی اس کو ٹھڈوں سے مارتا ہے۔ آپ مجھے وہاں نہ بھیجیں مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں جماعت میں اول آتا ہوں۔ آپ زمیندار سے بات کرلیں۔ ابا بات نہیں مانتا۔ آپ ابا کو مت بتائیں۔ اس نے مجھے مارا ہے۔ آپ مجھے سکول واپس بلالیں۔ ابا کو نہ بتائیں۔ مجیدے کو بہت مار پڑتی ہے۔ مجھے وہاں نہ بھیجیں زمیندار آپ کی بات مان لے گا۔ ابا نے میری ساری کتابیں پھاڑ دی ہیں۔ اس کو نہ بتائیں۔ کتابیں جڑ جائیں گی۔ آپ بات کرلیں۔ اس کو بتا دیں یہ بچہ اول آتا ہے اس کو سکول جانے دیں۔ ابا کو بالکل کچھ نہ بتائیں۔ آپ ضرور بات کرلیں عین نوازش ہوگی۔

عرضی

محمد بشیر

طالب علم جماعت پنجم بی

عرضی لکھ کر بشیر کی تسلی ہوگئی۔ اس نے اسے تہہ کیا اور قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔ سکول میں چھٹی ہو چکی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب شہر کے رہنے والے تھے اور روز شہر سے سکول آتے تھے۔ ان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اب عرضی کیسے پہنچائے اگلے دن صبح تو زمینداروں کے جانا تھا۔ سکول تو اب ابا نے جانے نہیں دینا تھا۔ وہ سوچتا سوچتا گھر کے دروازے میں کھڑا ہوگیا کہ کیا کرے، سامنے چھابڑی والا چاچا دولا آواز لگاتا گزر رہا تھا۔ اگر چاچا دولا عرضی پکڑ لے اور کل ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دے تو ـــــ لیکن نہیں چاچا دولا تو ابا کا بڑا یار ہے۔ روز رات کو ابا کے ساتھ بیٹھ کر حقہ پیتا تھا۔ وہ ضرور ابا کو

بتا دے گا ——— وہ کھڑا سوچتا رہا ....

اتنے میں دور سے خاکی کپڑے پہنے سائیکل پر ڈاکیا دین محمد نظر آیا۔ وہ ایک گھر کے آگے رُکا۔ بشیر دیکھنے لگا کہ اب اس کی طرف آئے گا۔ لیکن اس نے وہیں سے سائیکل موڑلی اور گلی سے نکلنے لگا ——— بشیر سمجھ گیا کہ یہی موقع ہے۔ وہ سائیکل کے پیچھے دوڑا۔ "چاچا۔ چاچا۔"

ڈاکیے نے بریک لگا دی "کیا بات ہے کاکا۔"

"چاچا" بشیر ہانپتا ہوا قریب پہنچا۔

"کیا بات ہے۔"

"چاچا یہ میری عرضی ہے۔ کل ضرور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دینا۔"

"اس کو لفافے میں تو بند کر دیتا کاکا۔"

"لفافہ نہیں ہے۔ چاچا ابا کو نہ بتانا۔"

"اچھا کیا لکھا ہے تو نے اس میں ؟"

"کچھ نہیں چاچا بس ابا کو نہ بتانا" بشیر نے بڑی منت سے کہا۔

"اچھا دے دوں گا"

چاچا ڈاکیا عرضی کو تھیلے میں ڈال کر سائیکل پر سوار ہو گیا اور آگے بڑھ گیا۔

"ابا کو نہ بتانا" بشیر نے پیچھے سے آواز لگائی۔

چھ سات گھر آگے جا کر ڈاکیا دین محمد تھیلے میں سے خط نکال رہا تھا۔ بشیر کی عرضی لفافوں کے ساتھ تھیلے سے نکل کر زمین پر گر گئی ——— پھر ہوا کے ساتھ اڑ کر دور گوبر کے ڈھیر پر جا کر اٹک گئی۔

ڈاکیا گھنٹی بجاتا سائیکل پر سوار ہو کر اگلے گھروں کی طرف نکل گیا۔

آخری پتہ

عبدالوحید رانا

اگلی صبح جب سارے پرندے تلاشِ رزق میں اپنے گھونسلوں سے اُڑے تو وہ واپس لوٹ آئی۔ یہ اس کی غیر حاضری کا پہلا دن تھا۔

اس کے سامان میں سے دو سونے کی بالیاں، چار ڈگریاں، ایک بنک کی چیک بک، چار اَن سلے ریشمی جوڑے، تین دوپٹے، ایک خطوں سے بھرا ہوا لفافہ، ایک بنارسی کامدار ساری، اپنے باپ بھائی بھتیجے اور دونوں بھانجوں کی تصویریں اور پچاس پچاس کے تین نوٹ نکلے۔ کل یہی اس کی کائنات تھی اور کتنی محدود کائنات تھی۔

وہ بہاولنگر کے حاجی عطاء الرحمٰن کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، جو بڑا غیرت مند شخص تھا اور ذات کا جاٹ تھا۔ وہ اسلام آباد کے ملک شفیق الرحمان کی بہن تھی جو درجہ اول کا افسر تھا اور غیرت مند ہونے کے علاوہ باعزت بھی تھا۔

شفیق الرحمٰن کا کہنا تھا کہ اسے عزت کی موت ملی ہے۔ وہ ایم اے پاس تھی۔ خوبصورت تھی اور اس کا دامن شفاف تھا، اس لئے اس کی موت افسوسناک ہونے کے باوجود باپ اور بھائی کے لئے باعثِ اطمینان تھی۔

غلام فاطمہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ دوپہر سے اب تک وہ تین مرتبہ اپنے ہوش گم کرچکی تھی اور بے ہوشی کے وقفوں کے دوران اس نے بڑے دل خراش بین کئے تھے۔ باقی سارا منظر ویسا ہی تھا جیسا کسی جوان عمر اور غیر شادی شدہ عورت کی موت پر ہوا کرتا ہے۔

رات ہونے سے قبل وہ دفنا دی گئی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ نسیم کی زندگی کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ اللہ ایسا صدمہ کسی کو نہ دے مگر عزت داروں کی بیٹیاں یوں ہی مرا کرتی ہیں۔ یہاں موجود ہر شخص نے نسیم کی زندگی کے صرف دو صفحے پڑھے تھے۔ پہلا جہاں حاجی عطاء الرحمٰن کے دستخط تھے جس کے گھر نسیم پیدا ہوئی اور آخری جس پر شفیق الرحمٰن کا نام لکھا تھا جس کے گھر اس کی موت ہوئی۔ بیچ کے صفحے غائب تھے۔ اب آپ ہی بتایئے۔ دو صفحوں کی اس کتاب میں جو کہانی درج ہے وہ کتنی طویل ہوسکتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ نسیم کی داستان کے زیادہ صفحوں پر غلام فاطمہ کا نام درج ہے۔ بہاولنگر سے اسلام آباد کے سفر میں گو دھوپ بہت تیز تھی اور راستہ کٹھن تھا مگر غلام فاطمہ کے پہلو میں چلتی ہوئی نسیم کو کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ کنیر کے سائبان تلے اس تتے جھلسا دینے والے موسم اپنی نحیف جان پر جھیلے پر لُو کے نشان صرف غلام فاطمہ ہی کے چہرے پر رہے ہے۔

حاجی عطاء الرحمٰن کی اوقات تو نہیں تھی کہ وہ دوسری شادی کرتا مگر وقت ایسا تھا کہ اس نے یہ کام کرلیا۔ اس وقت نسیم بہت چھوٹی تھی اور دراصل عطاء الرحمٰن کی دوسری شادی کے بعد ہی اس نے بڑا ہونا شروع کیا۔ غلام فاطمہ ان دنوں بھرپور جوان

تھی، اتنی بھرپور اور جوان کہ اس سے باپ کی یہ حرکت برداشت نہ ہو سکی۔ تیسرے ہی دن وہ اپنی ماں، دو چھوٹی بہنوں اور ایک بھائی کے ہمراہ اپنے بڑے بھائی شفیق الرحمٰن کے پاس کراچی جا پہنچی جو وہاں کسی سرکاری دفتر میں کلرک تھا اور ابھی اتنا زیادہ باعزت نہیں ہوا تھا۔

غلام فاطمہ نے سلائی کا کام شروع کر دیا۔ اس سے چھوٹی فاخرہ تھی وہ سکول جانے لگی اور نسیم کو اپنا باپ عطاء الرحمٰن یاد رہا۔ ماں یوں مطمئن تھی کہ گھر بیٹے کا تھا اور وہ فرماں بردار تھا۔

یہ کہانی جو میں نے نسیم کے نام سے شروع کی تھی اس میں اور بھی بہت سے کردار آ گئے ہیں۔ دراصل یہ کہانی غلام فاطمہ کی ہے۔ فاخرہ کی ہے، ان کی ماں کی ہے اور اس بھائی کی ہے جو کراچی آنے کے چند سال بعد مر گیا تھا اور جس کی موت پر عطاء الرحمٰن نے بہاولنگر سے اپنی بیوی سمیت آ کر انشورنس کی رقم وصول کی تھی۔

شفیق الرحمٰن کا تبادلہ جب اسلام آباد ہوا تو فاخرہ کالج میں داخل ہو چکی تھی اور ان کا بھائی میٹرک کرنے کے بعد کسی دفتر میں ملازم ہو چکا تھا۔ نسیم تیسری جماعت میں تھی اور غلام فاطمہ کی سلائی مشین ابھی نئی تھی۔ مکان کا مسئلہ شفیق الرحمٰن کے ایک دوست نے حل کر دیا، وہ خود تو کسی اور کے ساتھ رہتا تھا۔ اس لئے اپنا مکان دوست کی ماں اور بہنوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کچھ صفحات خالی ہیں۔

غلام فاطمہ نے جب بہاولنگر سے کوچ کیا اس وقت وہ بھرپور جوان تھی اور اپنے بدن پر کھلے پھولوں کی قدر سے خوب واقف تھی اسی لئے کسی کو کبھی حوصلہ نہ ہو سکا کہ وہ حاجی عطاء الرحمٰن کی غیرت سے بھرے اس پیڑ کی ناقدری کرتا۔

ماں غلام فاطمہ کے اس خیال سے پوری طرح متفق تھی کہ بیٹیوں کی شادیاں صرف باپ ہی کی مرضی سے ہو سکتی ہیں اور وہ مناسب وقت پر یہ کام ضرور سر انجام دے گا۔ بہاولنگر ہی کے ایک شخص نے انھیں بتایا تھا کہ حاجی عطاء الرحمٰن اپنی بیٹیوں کی خبر لوگوں سے معلوم کرتا رہتا ہے اور مطمئن ہے کہ ان کے نام کو کوئی بٹہ نہیں لگا۔ اسی لئے وہ فی الحال آنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔

صرف چار سال بعد ایک ایسا وقت آیا کہ اس نام کو بٹہ لگ گیا۔ فاخرہ نے اپنے بھائی شفیق الرحمٰن کے اس دوست سے شادی کر لی جو ان کی دیکھ بھال کے لئے آیا کرتا تھا اور جس نے انھیں رہنے کے لئے مکان دیا تھا۔

غلام فاطمہ کو ایک مرتبہ پھر بہاولنگر کا سفر کرنا پڑا اور حاجی عطاء الرحمٰن اپنی دوسری بیوی سمیت بڑی آن بان سے کراچی آ پہنچا۔ وہ بڑا غیرت مند آدمی تھا۔ چنانچہ فاخرہ پیٹ میں تین ماہ کے بچے سمیت بازیاب کرائی گئی۔ پولیس کچہری ہوئی۔ عطاء الرحمٰن نے اپنے بھتیجے سے فاخرہ کا جعلی نکاح نامہ پیش کیا۔ سارے محلے کی گواہی ہوئی۔ مگر فاخرہ کو اپنے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دیدی گئی۔

عطاء الرحمٰن نے بہاولنگر واپسی سے قبل غلام فاطمہ اور بیوی کو سختی سے تنبیہہ کی کہ وہ فاخرہ سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور اس کے نام اور خاندان پر آنچ نہ آنے دیں۔ مزید یہ کہ اب نسیم بھی جوان ہو رہی ہے اس کا خیال رکھیں "میں لوگوں سے تمہارے بارے میں معلوم کرتا رہوں گا۔"

یہاں سے نسیم کی کہانی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جسے غلام فاطمہ نے تحریر کیا۔ فاخرہ نے جس طرح سے خاندان کی عزت کو مجروح کیا تھا وہ ناقابلِ معافی جرم تھا۔ مگر اسے معاف کر دیا گیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ نسیم کو ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔ دھوپ تیز تھی اور موسم میں برہمی تھی مگر غلام فاطمہ کے سائبان تلے نسیم ایم اے پاس کر گئی اور ایک سکول میں ملازم ہو گئی۔

سنا ہے عطاء الرحمٰن کو بیٹی کی کامیابی کی خبر ملی تو اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ وہ اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس کی بیٹی نے سولہ

جماعتیں پاس کی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کبھی کراچی نہیں گیا۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہاں سب کچھ ٹھیک تھا۔
جب حاجی عطاء الرحمٰن کا قتل ہوا تو غلام فاطمہ کو ایک بار پھر بہاولنگر آنا پڑا۔ شفیق الرحمٰن غلام فاطمہ اور اپنی ماں کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ ان کے باپ کو ان کی دوسری بیوی نے قتل کرایا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مرنے والے کی آخری رسوم کے بعد مکان اور ۱۰ ایکڑ زمین کو آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔

غلام فاطمہ نے نسیم کو کراچی میں لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں چھوڑا اور ماں سمیت بہاولنگر کی عدالت میں قتل کا مقدمہ درج کرا دیا۔ شفیق الرحمٰن اسلام آباد واپس ہو گیا۔

نسیم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بہاولنگر سے پہلی بار رخصت ہوتے وقت اس کے سینے میں خاموشی سے ایک گھاؤ ابھرا تھا بڑا ہلکا اور مدھم سا۔ اتنے سالوں میں غلام فاطمہ سرسبز ڈالی سے سوکھی شاخ بن گئی، ماں، عورت سے پتھر ہو گئی۔ بھائی کلرک سے افسر ہو گیا اور عطاء الرحمٰن کی غیرت پر کچھ اور بور آ گیا، مگر گھاؤ چپ رہا اور اب اسے محسوس ہوا کہ وہ رِس رہا ہے بہت آہستہ آہستہ، چپ چاپ۔ فاخرہ کی بغاوت سے لے کر اپنے بھتیجے کے ڈاکٹر بن جانے تک نسیم نے سارے موسموں کو صرف اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس کی آنکھ میں جب شناسائی کی پہلی کرن پھوٹی تو بہت وقت گزر چکا تھا۔ اتنا زیادہ کہ چھٹیوں میں وہ بہاولنگر آئی تو اس کے چہرے کی ایک ایک رگ پڑھی جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے نیچے بھیانک اندھیرا ابھر آیا تھا۔

وہ اس لمبے سفر پر چلتے چلتے نہ تو تھکی تھی اور نہ ہی راستہ بھولی تھی۔ اس نے حاجی عطاء الرحمٰن، ماں، بھائی اور غلام فاطمہ کی کھینچی ہوئی لکیر کے اندر ساری زندگی گزاری تھی۔ اس کے پاس کرنے کو اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ثابت قدمی کی اس مختصر عمر کا آخری نشان ناموس کی صورت اس کے دامن میں باقی تھا اور یہی سب سے بھاری بوجھ تھا۔

آج صبح یہ نشانی بھی اس نے واپس کر دی بالکل اسی طرح، جیسا کہ اسے واپس کرنے کا حق ہوتا ہے۔

نسیم کی اس کہانی کا سب سے گمنام کردار خود نسیم ہے اور یہی سبب ہے کہ انجام بھی اسی کے مقدر میں لکھا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ کہانی ختم ہو گئی۔ مگر ناموس کے درخت پر ابھی ایک پتہ باقی ہے جس کا نام غلام فاطمہ ہے اور ہر نئے موسم میں جب نئے پھول کھلتے ہیں تو فقط یہی ایک سوکھا پتہ ایسا ہے جو بڑی آن بان سے باقی رہ جاتا ہے۔ پچھلے برس کی یاد میں ـــــ

چھوٹی عورت

طلعت اخلاق احمد

میری شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ ان دس سالوں میں گھر، شوہر اور تین از حد شریر بچوں میں گھر کر میں خود کو بھی بھول بیٹھی تھی۔ میکے کو بھی تقریباً بھول چکی تھی۔ مگر وہ مخصوص خوشبو تو نہیں بھولی تھی نا جسے ماں کی خوشبو کہتے ہیں اور جو پھیل کر پورے میکے کی خوشبو بن جاتی ہے۔

اسی لیے تو اُس دن نشاط خالہ کو دیکھ کر میں بے تابانہ آگے بڑھی" ارے نشاط خالہ! پہچانا مجھے؟" خالہ نے لحظہ بھر کو سوچا اور پھر" ارے ننھی تو!" کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا۔ مگر میں بے اختیار اُن سے لپٹ گئی۔ شاید اس لیے کہ اُن کے پاس سے میرے میکے کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور میں دراصل اس خوشبو سے لپٹی تھی۔ خالہ میرے والدین، بہن بھائیوں، شوہر اور بچوں کے متعلق پوچھتی رہیں اور پھر بڑے خلوص اور اصرار سے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی "بس ننھی تم کل ہی آجانا۔ جمعہ ہے۔ میں گھر پر ہی ملوں گی۔"

نشاط خالہ ہمارے خاندان کی وہ فرد ہیں جن کی خاندان میں حیثیت واضح کرنے کے لئے "شجر ممنوعہ" سے بہتر کوئی لفظ غالباً مجھے نہ مل سکے گا۔ ہم لوگ کھرے سید ہیں۔ ابا میاں سید، اماں سیدانی۔ یہ نشاط خالہ امی کی پھوپی زاد تھیں اور ان کے والد عبداللہ سید غالباً ہمارے ابا میاں کے رشتے میں ماموں لگتے تھے۔ اور دونوں ہی سید

ہمیں بڑے ہونے پر معلوم ہوا کہ نشاط خالہ کے والد عبداللہ سید نے خاندانی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی اس اکلوتی لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی سوچی۔ چنانچہ نشاط خالہ انگریزی سکول میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ اور یہی وہ پہلا موقع تھا جب نشاط خالہ چھوٹی ہی عمر میں تمام خاندان کا موضوع بن گئیں۔

پانچویں جماعت میں تھیں جب ایک سید زادے سے نکاح کر دیا گیا۔ آٹھویں جماعت میں تھیں تو دولہا میاں امریکہ سدھارے اور میٹرک کرنے پر جب گھر میں نشاط خالہ کی شادی کا "ذکر خیر" ہونے لگا تو عقدہ کھلا کہ سید جمال نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر رکھی تھی۔ چنانچہ نکاح ختم ہو گیا۔ نشاط خالہ ایک مرتبہ پھر تمام خاندان کے لیے موضوع بن گئیں"۔ ارے سب جھوٹ بکتے ہیں۔ لڑکے نے شادی وادی کوئی نہیں کر رکھی۔ انھوں نے خود ہی نشاط آرا کے پر پُرزے نکلتے دیکھ لیے تو بہانہ کیا کہ لڑکے نے شادی کر رکھی ہے۔" ہماری دادی اماں ہمیشہ دور کی کوڑی لاتیں۔ اور بتول چچی نے اس بیان میں مزید چار باتوں کا اضافہ کیا اور ایک ایک سے کہتی پھریں "ارے انگریزی سکولوں میں پڑھ کر لڑکی کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا تھا۔ ساس نندوں نے جو اُس کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو پہلے ہی پیچھا چھڑا لیا" —— "اچھا!" —— "ہیں؟" —— "ارے توبہ توبہ!"

پھر نشاط خالہ میٹرک کر کے ایف اے کرنے کالج پہنچ گئیں تو ہماری دادی اماں نے بانو پھپھو اور بتول چچی سے کہا

"اور لو! اب سید زادی بھی کالج میں پڑھیں گی۔ قربِ قیامت کے آثار ہیں!"

پھر نشاط خالہ نے بی اے کر لیا اور ہم نے سنا کہ ان کی شادی کسی غیر سید گھرانے میں ٹھہرا دی گئی ہے۔ غالباً وہ لوگ پٹھان تھے۔ ہمارے ابا میاں صحن میں کھڑے ہو کر دھاڑے "حد ہے۔ خاندان میں کوئی اُلّو کا چرخا نہیں رہا تھا نشاط آرا کے لیے؟"

"ارے لڑکوں میں بڑھی ہے۔ خاندان والے سب اس کے رنگ ڈھنگ جانتے ہیں۔ کون آنکھوں دیکھی مکھی نگلتا ہے؟" دادی اماں نے ابا میاں کو سمجھایا۔

"ارے منگنی ٹوٹ جائے تو کون پوچھتا ہے لڑکی کو؟" بتول چچی نے ٹکڑا لگایا۔

چوتھی مرتبہ نشاط خالہ موضوعِ گفتگو کے ساتھ ساتھ "شجرِ ممنوعہ" بھی قرار دے دی گئیں۔ وہ اس طرح کہ خاں صاحب سے شادی کے دوسرے مہینے ہی طلاق ہو گئی اور وہ واپس آ گئیں "ہاں ایسی لڑکیاں گھر کہاں بسا پاتی ہیں۔ ان کو تو گھر داری عذاب معلوم ہوتی ہے۔" بتول چچی نے تبصرہ کیا۔ دادی اماں اور بانو پھوپی نے کچھ رائے نہ دی لیکن کسی نے اس چیز کا ذکر نہیں کیا کہ بوقتِ نکاح جب دولہا میاں سے پوچھا گیا کہ "سیدہ نشاط آرا بنت عبداللہ سید بعوض اتنے سکۂ رائج الوقت قبول ہیں؟" تو یہ حضرت چپکے رہے اور تیسری مرتبہ جب پوچھا گیا تو دروغ برگردنِ راوی، سنا گیا ہے کہ دولہا میاں نے کہا "نہیں" مگر اس کو پٹاخے چھوڑ کر اور مبارک سلامت کا شور مچا کر دانستہ دبا لیا گیا۔ بندوقوں کی تڑاتڑ ایک بزدل دولہا کی کمزور سی "نہیں" کو دبانے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ بہر حال نکاح ہو گیا مگر مہینے بھر بعد ہی نشاط خالہ کے شوہر نے کھلم کھلا بیزاری کا اعلان کر دیا اور شادی کے دوسرے مہینے بات تین مرتبہ "طلاق" کہنے پر اختتام پذیر ہوئی۔

اکلوتی چہیتی بیٹی کا یہ حشر دیکھ کر عبداللہ سید پر دل کا دورہ پڑا۔ ہفتہ بھر ہسپتال میں پڑے رہے۔ زندگی کے لیے موت سے لڑتے لڑتے ہمیشہ کے لیے ہتھیار پھینک دیئے۔ عبداللہ سید کی بے وقت موت گویا سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ اس کا ذمہ دار بھی نشاط خالہ کو ٹھہرایا گیا۔ ابا میاں حسبِ سابق بیچ صحن میں کھڑے ہو کر دھاڑے "میرے گھر سے کوئی عبداللہ سید کے ہاں پرسہ تک دینے نہیں جائے گا۔ میں ٹانگیں توڑ دوں گا!"

"ارے گھاس چر گیا ہے اکبر علی تو؟ موت پر بھی نہ جائیں گے کیا؟" دادی اماں نے ابا میاں کو ٹھوکا۔

"نہیں ہر گز نہیں آپ بھی نہیں جائیں گی۔ نام ڈبو دیا سیدوں کا۔ حد ہے۔"

"اے ہے اکبر بھیا" بانو پھوپی بوکھلا بولیں۔

"ہاں کہہ دیا بس ختم۔ سب تعلق سب رشتے۔ کوئی وہاں سے آیا تو گولی مار دوں گا۔ سن لیا زہرا بی بی" ابا میاں اماں کی طرف گھوم کر دھاڑے اور سدا کی خاموش اور کم گو اماں دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اس اعلان کے بعد عبداللہ یا اس گھرانے کے کسی فرد کا نام ہماری زبانوں پر نہیں آیا۔ اور نشاط خالہ ہمارے خاندان کی سب سے بُری، ناکارہ، بے شرم اور بے کردار لڑکی قرار پائیں۔

جن دنوں سید ابرار شاہ سے میرے رشتے کی بات چل رہی تھی تو میمونہ خالہ نے یہ دھماکہ کیا کہ سید جمال شاہ اپنی امریکن بی بی کو چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ تین بچے ہیں دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑا لڑکا کسی ملٹری کالج میں ٹریننگ لے رہا ہے۔ لڑکی ایف اے کی طالبہ ہے اور چھوٹا لڑکا آٹھویں جماعت میں ہے۔ جمال شاہ نے توبہ تلا کرنے کے بعد دوبارہ نشاط خالہ کو پروپوز کیا ہے۔ ہفتہ بھر میں شادی ہو جائے گی۔ نشاط خالہ ایک مرتبہ پھر موضوعِ گفتگو بن گئیں۔

اپنے بڑے لڑکے سید عباس کی پیدائش پر میں میکہ آئی تو سننے میں آیا کہ نشاط خالہ اپنے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہیں۔ طلاق

یا کوئی اور عدالتی کارروائی تو نہیں ہوئی لیکن اب وہ الگ اپنے ذاتی مکان میں رہتی ہیں۔ کسی اسکول میں ڈگری بھی کر رہی ہیں اور یوں زندگی کی گاڑی کھینچ رہی ہیں۔" "اے میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی کہیں نہیں بس سکتی۔ پڑھ لکھ کر لڑکیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ پھر گھر اور گھرداری انھیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔" بتول چچی تبصرہ کرنے سے باز نہ رہ سکیں۔ "اس لڑکی کے رنگ ڈھنگ اچھی لڑکیوں کے سے نہیں ہیں۔"

میں اپنے گھر، گھرداری، شوہر اور بچوں میں الجھ کر نشاط خالہ کو بالکل بھول چکی تھی۔ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ شاید کبھی بچپن میں دیکھا ہو۔ بڑے ہو کر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن پھر بھی کل فوزیہ کی شادی میں ان کو دیکھ کر میں ذرا پہچان گئی۔ شاید اس لیے کہ ان کے پاس سے میرے میکے کی خوبصورت خوشبو آ رہی تھی۔

اور جب نشاط خالہ نے اگلے دن اپنے گھر آنے کو کہا تو میں جلد از جلد کام نمٹا کر وہاں پہنچنا چاہتی تھی۔ اس لیے کہ میں اس نشاط آرا سے ملنا چاہتی تھی جس نے بے حساب گناہ کیے۔ جس کی "فردِ جرم" خاصی طویل تھی۔ اچھی تعلیم حاصل کی۔ ایک جرم۔ نکاح ٹوٹ گیا۔ دوسرا جرم۔ غیر سید گھرانے میں شادی۔ تیسرا جرم۔ طلاق ہوئی۔ چوتھا جرم۔ دوبارہ شادی ہوئی۔ پانچواں جرم۔ اور اب پھر شوہر سے علیحدگی۔ چھٹا جرم۔ اور تمام جرائم ناقابلِ معافی۔ گو ان جرائم میں اور بھی بہت سے نام ملوث تھے مگر ہم نے تو بطور مجرم صرف نشاط خالہ کا نام سنا تھا۔

اور پھر بہت سی باتیں کرنے کے بعد آخر میں نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو شاید نہیں پوچھنا چاہیے تھا —— نشاط خالہ کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ "ننھی تیرے والد اکبر علی تو مجھے بہت ہی بری لڑکی سمجھتے تھے۔" صرف وہی کیا: تمام خاندان ہی سمجھتا رہا کہ نشاط آرا کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ بے شرم اور بے غیرت ہو گئی ہے۔ "ہے نا یہی بات!؟" میں خاموش رہی۔ کہتی تو کیا کہتی!

"باقی سب باتوں پر مٹی ڈالو۔ تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ علیحدگی کیوں ہوئی؟" کافی دیر بعد نشاط خالہ بولیں۔ "سید جمال شاہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اس کی تلافی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ہم ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ ننھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ساری زندگی دھوپ میں جل جل کر گھنی چھاؤں نصیب ہوئی ہے لیکن ——" خالہ لمحہ بھر کو رکیں۔ "لیکن جمال شاہ کے بچے مجھ سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ماں سے جدائی، نیا ماحول، نئی آب و ہوا ان سب چیزوں نے ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ پھر نئی ماں، اجنبی چہرے! نتیجہ یہ ہوا کہ چھٹیاں ہونے پر جب میں اور سید صاحب انھیں لینے ہوسٹلوں میں پہنچتے تو بچے گھر آنے سے صاف انکار کر دیتے۔ حالانکہ وہ باپ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن میرا وجود قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کے پھول سے چہرے کملا کر رہ گئے تھے۔ ماں کو تقدیر نے جدا کر دیا۔ باپ گویا میں نے چھین لیا۔ نہیں ننھی میں ایسا ظلم نہیں کر سکتی تھی اور اس الجھن کا صرف ایک ہی حل تھا میرے پاس۔" نشاط خالہ خاموش ہو گئیں۔ میں سراپا گوش بنی سن رہی تھی۔ پھر وہ بولیں "صرف ایک ہی حل تھا کہ میں جمال شاہ کے گھر سے نکل آؤں۔ یہ گھر ابا میاں نے ترکے میں میرے لیے چھوڑا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پڑھ لکھ لیا تھا۔ ملازمت کر لی اور سید صاحب سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ ان کی زندگی سے نکل آئی تاکہ ان کے بچے ان کی زندگی میں دوبارہ داخل ہو سکیں۔ سید صاحب نے بہت کہا کہ جلد بازی مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میں ان بچوں کے اجڑے ہوئے چہرے دیکھتی تھی تو دل کٹتا تھا۔"

"خالہ آپ ... آپ تو ..." میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

"اور میں خوب جانتی ہوں کہ خاندان بھر نے کیا کچھ نہ کہا ہو گا! نشاط کا دماغ عرش پہ پہنچ گیا ہے، کہیں نباہ کر ہی

نہیں سکتی۔ بے شرم ہے۔ بے غیرت ہے۔ مگر نتھی میرے لیے یہ کرنا ضروری تھا۔ میرے ایک ذرا سے عذاب سہہ لینے سے وہ تین معصوم بچے ایک گھر اور ایک باپ پا سکتے تھے اور میں اتنی سنگدل نہیں تھی نتھی۔ اور شاید مجھے اپنے بہت سے ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا سو وہ اس صورت میں ادا کر رہی ہوں۔ اچھا اب ایک بات تم بتاؤ مجھے؟"

"پوچھیے" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"نتھی سچ سچ بتاؤ کیا میں واقعی کوئی بری اور خراب عورت ہوں؟ تم ایسا سمجھتی ہو؟"

میں سن سی رہ گئی۔ اس لیے کہ میں ایسا سمجھتی تھی۔ ایک میں کیا۔ سب خاندان نشاط خالہ کو برا سمجھتا تھا۔ بڑی دیر بعد میں نے اپنی حالت پر قابو پانے کے بعد کہا "مگر کل تک سمجھتی تھی۔" میرے لہجے میں صداقت پا کر خالہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ پھر خالہ نے مجھے ماضی کی بہت سی باتیں بتائیں۔ عبداللہ سید کا شوق کہ بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ سید جمال شاہ کی امریکن لڑکی سے شادی۔ خان صاحب کی دبی دبی "نہیں"۔ اور کہیں اور خواہشمند ہونے کی وجہ سے خالہ سے بیزاری اور پھر طلاق۔ اور اب تین معصوم بچوں کے لیے یہ بیش بہا قربانی۔ میں نے محسوس کیا کہ نشاط خالہ ایسی بری کبھی نہ رہی ہوں گی جیسا کہ انہیں پیش کیا گیا ——— پھر رخصت کرتے ہوئے خالہ نے میرے اور میرے شوہر کے لیے خوبصورت سوٹ پیس دیئے۔ آخر کو ان کا تعلق میرے میکے سے تھا۔ اور میں گویا میکے سے سسرال جا رہی تھی۔ خالہ نے مجھے ماں کی طرح لدا پھندا رخصت کیا۔

اور کل رات کو خالہ کے ہاں سے آ کر کھانا کھاتے ہوئے میرے نجیب الطرفین شوہر سید ابرار شاہ نے بغور میری طرف دیکھا اور کہا "آج تو آپ بڑی خوش نظر آ رہی ہیں۔"

"جی ہاں آج میری ملاقات ایک بہت بڑی شخصیت سے ہوئی ہے۔" میں نے ان کی طرف پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا!! میں بھی تو سنوں۔" انھوں نے کتنے ہی نام لے ڈالے "صدر صاحب؟ وزیر اعظم صاحب؟ گورنر صاحب؟" کتنے ہی نام لینے کے بعد وہ چڑ کر بولے "اچھا آپ خود ہی بتا دیں کہ آخر وہ کون سی ایسی بڑی شخصیت ہیں؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "بتانے سے کچھ فائدہ نہیں کہ آپ اور آپ جیسے بہت سے لوگ ان کو بہت چھوٹی شخصیت سمجھتے ہیں۔"

اور سید صاحب کچھ نہ سمجھتے ہوئے صرف کندھے اچکا کر رہ گئے۔

سہارا

عفت گل اعزاز

زاہدہ چارپائی پر میزپوش سنبھالے بیٹھی تھی۔ اس میزپوش میں لکڑی کا گول فریم لگا ہوا اور پنسل سے ایک گلدستہ بنا ہوا تھا۔ پاس ہی رنگ برنگے ریشم کی لچھیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں پر ریشم سے پھول بوٹیاں کاڑھنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ماں کی ہدایت کے مطابق وہ کبھی کسی تکیہ کا غلاف کاڑھ لیتی یا کسی قمیص پر پھولوں کی بیل بنا لیتی۔ اب تک وہ کئی سارے میزپوش، تکیے کے غلاف اور دو چادریں کاڑھ چکی تھی۔ ان تمام چیزوں کو ایک بڑے صندوق میں رکھ دیا گیا تھا۔ صندوق میں اور بھی کئی سارے کپڑے تھے۔ کچھ سلے ہوئے کچھ بغیر سلے۔ وہ سوچتی خدا جانے وہ وقت کب آئے گا جب اس صندوق میں رکھی گئی چیزیں استعمال میں آئیں گی۔ اُس کی ماں اُٹھتے بیٹھتے اُس کے لیے اچھے رشتے کی دعا مانگتی مگر اُس کا نصیبہ ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ اس گھر سے جلدی رخصت ہونا اُس کے لیے بھی اچھا ہے اور گھر والوں کے لیے بھی بہتر ہے۔ اس کے والد ایک چپراسی تھے اور دو تین سال پہلے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ مسلسل بیمار تھے اور بستر پر کراہتے رہتے تھے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اُن کے پانچ بچے تھے۔ بھائی سے چھوٹی خود زاہدہ تھی۔ اُس سے چھوٹی بہنیں تھیں۔ پھر سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ زاہدہ گھر کے کام کاج میں ماہر ہو چکی تھی۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا ان کے ہاں کوئی دستور نہ تھا۔ گھر میں پیسے کی تنگی تھی۔ غربت کی وجہ سے کوئی اُن کے ہاں رشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی۔ پھر ایک ٹھنڈا سانس لے کر سوئی میں دھاگہ ڈالنے لگی۔ رفتہ رفتہ پھول میں رنگ سا بھرتا چلا گیا۔ میزپوش پر پھول مکمل ہوا تو دل مسرور سا ہو اٹھا۔ کافی دیر تک وہ سر جھکائے کڑھائی کرتی رہی۔ جب تھک گئی تو اُس نے کپڑا اور دھاگے لپیٹ کر رکھ دیئے۔

کچھ دن بعد عبداللہ کی ماں اُن کے گھر آئی اور اُس نے اپنے بیٹے کے لیے زاہدہ کا رشتہ مانگا تو گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اُس کی عمر چالیس بیالیس سال تھی۔ اُس کے منہ پر چیچک کے گہرے اور سیاہ داغ تھے اور اس کا سر تقریباً گنجا تھا۔ اسے عبداللہ کی ظاہری شباہت تو نہ بھائی مگر وہ جانتی تھی کہ ماں باپ کے لیے وہ ایک بوجھ ہے۔ اچھا ہے اُن کے سر سے یہ بوجھ اُترے اور پھر شادی کے بعد اُس کا ایک اپنا گھر ہو گا جہاں وہ ہنسی خوشی زندگی گذارے گی۔ شادی اُس کے لیے ایک اچھی تبدیلی ثابت ہو گی۔

شادی ہو گئی تو ماں باپ نے بھی سکون کا سانس لیا مگر چند ہی روز بعد زاہدہ کے سہانے خواب ٹوٹ گئے۔ عبداللہ کے ماں باپ کا رویہ اُس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اُس کی ماں بات بے بات اُس پر غصہ کرتی اور اُسے جھڑکتی رہتی تھی۔ تمام دن وہ کام کرتی پھر بھی کوئی اُس سے خوش نہ ہوتا۔ عبداللہ انتہائی غصہ ور طبیعت کا مالک تھا۔ ہنڈیا میں ذرا سا نمک تیز ہو جاتا تو وہ چیخ کر پلیٹ نیچے دے مارتا۔ کھانا پکنے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو وہ گالیوں پر اُتر آتا۔ روٹی ذرا سی جل جاتی تو مار پٹائی شروع کر دیتا۔

وہ ہراساں ہو جاتی اور سوچتی کس طرح اس ظلم کی بھٹی میں گذارہ کرے گی۔ اُسے گھر سے کہیں باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی، اُسے عبداللہ کی پسند کے مطابق کھانے پکانے ہوتے، اُس کی مرضی کے کپڑے پہننے ہوتے۔ وہ ایک فرماں بردار لڑکی تھی مگر اس شدت کی حاکمیت اُسے بالکل نہ بھائی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم عبداللہ سے جو عمر میں اُس سے پندرہ بیس سال بڑا تھا وہ کیسے مقابلہ کر سکتی تھی وہ بے چاری تو ایک صدائے احتجاج بھی بلند نہ کر سکی۔ چپ چاپ اس کے ظلم سہتی رہی۔ اُس کی زیادتیاں برداشت کرتی رہی۔ مار کھا کھا کے اس کے جسم پر نیل پڑ جاتے، کبھی اتنی گہری چوٹ لگ جاتی کہ زخم پڑ جاتے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں مگر عبداللہ کو اس پر کبھی رحم نہ آتا۔

شادی کے تین چار ماہ بعد عید آئی تب بھی وہ خاموش خاموش سر جھکائے گھر کے کام کاج کرتی رہی۔ ماں باپ سے ملنے کو دل بے قرار تھا مگر اس کو یہ کہنے کی ہمت نہ تھی کہ میں اپنی ماں کے ہاں جانا چاہتی ہوں۔ شام ہوئی تو عبداللہ نے خود اُس سے کہا۔ "چل اپنے ماں باپ کو سلام کر آ۔" وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔

ایک عرصہ کے بعد ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ ماں اور بھابی اُس کی خاطر مدارات میں لگ گئیں۔ عبداللہ دوسرے کمرے میں ابا کے پاس بیٹھا تھا۔ تنہائی ملی تو ماں نے زاہدہ سے پوچھا۔ "بیٹی تو اپنے گھر میں خوش تو ہے نا؟"

ماں کے اس سوال نے اُس کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ سسرال میں ایسی محبت ملے گی کہ آپ لوگوں کو بھول جاؤں گی مگر آپ نے مجھے کس جہنم میں پھینک دیا ہے؟"

"کیوں؟ آخر کیا بات ہوئی؟" ماں حیران ہو اٹھی۔ زاہدہ نے اپنا پائنچہ الٹ کر پنڈلی کا زخم اس کے سامنے کر دیا۔ "یہ زخم دیکھو ــــ میرے بازوؤں پر پڑے نیل دیکھو ــــ میرے ماتھے پر یہ چوٹ کا نشان دیکھو ــــ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جو میری مار پٹائی نہ ہوتی ہو ــــ ماں! تم نے مجھے کس درندے کے حوالے کر دیا ہے۔ کیا سب لوگ اسی طرح بیوی کی قدر کرتے ہیں؟ دن رات اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی خدمت کرتی ہوں۔ پھر بھی مار کھاتی ہوں۔ گالیاں کوسنے سنتی ہوں۔ نہ میری کچھ عزت ہے نہ کوئی میرا خیال کرتا ہے ــ کیا اسی لیے مجھے اس گھر میں بھیجا گیا ہے؟" ــــ زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ اُسے یقین تھا کہ ماں اُس پر یہ ظلم ٹوٹتے نہیں سکتی اور اب ہرگز وہ اسے اُس جہنم میں واپس نہ جانے دے گی۔ مگر ماں کے چہرے پر ایک اداسی پھیل کر جامد ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوئی! زاہدہ نے خود ہی فیصلہ سنایا۔ "ماں! میں اب وہاں نہیں جاؤں گی ــــ میں یہیں رہوں گی ــــ تمہارے پاس!!"

ماں ٹھنڈا سانس بھر کر بولی "بیٹی! اب وہی تیرا گھر ہے ــــ تجھے وہیں گذارہ کرنا ہے!"

"چاہے وہ مجھے ذلیل و خوار کرتا رہے ــــ مجھ پر ظلم کرتا رہے ــــ چاہے میری ہڈیاں توڑ دے؟" زاہدہ نے سوال بھری آنکھیں ماں کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"یہ تیرا نصیب ہے بیٹی! ہم کچھ نہیں کر سکتے؟" ماں بے رخی سے بولی!

"نہیں نہیں! مجھے وہاں مت بھیجو! میری جان عذاب میں ہے ــــ مجھے تم کچھ نہ دینا ــــ کپڑے اور زیور ــــ کوئی بھی چیز ــــ یہاں تک کہ روٹی بھی مت دینا ــــ مگر مجھے یہیں روک لو ماں!!"

"جب بیٹی کی شادی ہو جاتی ہے اور پھر وہ ماں کے گھر لوٹ آئے تو لوگ اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں! ساری برادری میں ہماری ناک کٹ جائے گی ــــ تمہارے بھائی اور ابا کی آنکھیں جھک جائیں گی!"

"کیا اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں رہا؟"

"تم جب چاہو یہاں آکر ہم سے مل سکتی ہو بیٹی! مگر اب یہ گھر تمہارا نہیں ـــــ ہر عورت کو اپنا گھر بسانا ہوتا ہے ـــــ چاہے وہاں پیار محبت ملے یا شوہر کی جوتیاں ملیں! ہم مجبور ہیں!"

زاہدہ کو ماں سے ایسی سنگ دلی کی توقع نہ تھی۔ ایک لمحے کو تو اس کا جی چاہا کہ وہ نہ تو اُس گھر میں واپس جائے اور نہ کبھی ماں کو اپنا منہ دکھائے ـــــ بلکہ گاؤں کے قریب نہر میں جا کر چھلانگ لگا دے۔ وہ مایوس ہوگئی تو ماں نے اسے سینے سے لگایا اور بے اختیار ہو کر رو دی ـــــ بے بسی اور مجبوری کے آنسو دیر تک دونوں کی آنکھوں سے بہتے رہے!

رات کے کھانے کے بعد عبداللہ اسے گھر لے آیا۔ راستے میں وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کے دل میں جو تھوڑی بہت امید تھی کہ ماں اُس پر ہونے والے ظلم و ستم کا سن کر اُس کو دوبارہ اس جہنم میں نہ آنے دے گی ـــــ وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ تب زاہدہ نے بھی اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی! اُس نے سوچ لیا کہ اب جو کچھ ہوگا وہ چپ چاپ برداشت کرتی رہے گی۔

اس احساس کے ساتھ اُس نے عبداللہ کے ہر ظلم و ستم اور ہر زیادتی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ بیوی کی اس خاموشی اور بے بسی پر وہ اور بھی شیر ہو گیا۔ برتن پھینکنا، چیخنا چلانا، مارنا پیٹنا اُس کا معمول بن گیا۔ وہ صبح اذانوں کے وقت اُٹھ کر کام کاج میں لگ جاتی، تمام دن محنت اور دھیان سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی۔ رات کو جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹتی تب اُس کے بدن کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا ہوتا تھا۔ وہ سوچتی جب عورت کو اپنا گھر بسانا ہوتا ہے تو اُسے اسی طرح دن بھر کام کرنا ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے اڑوس پڑوس میں بسنے والی عورتوں کو دیکھا تو اُسے کچھ تسلی سی ہوگئی کہ سوائے ایک دو کے سبھی کا حال تقریباً اُس جیسا تھا، کہیں شوہر کی زیادتی تھی کہیں سسرال والوں کے ظلم تھے، کہیں غربت تھی۔ سب ایک دوسرے کے سامنے اپنے دل کھول کر رکھ دیتیں وہ دل جن میں حسرتوں کے ہجوم دفن تھے، جب کوئی عورت زیادہ پریشان ہوتی تو سب مل کر اُسے دلاسا دیتیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ اب اُن کے پانچ بچے تھے۔ عبداللہ کی معمولی سی تنخواہ میں گذارا بمشکل ہوتا تھا۔ گھر میں تنگی تھی وہ اور بھی برہم رہنے لگا تھا اور اپنے غصہ کو بچوں کی مار پیٹ اور زاہدہ سے لڑائی جھگڑے میں اتار لیا کرتا تھا مگر اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ زاہدہ اپنا غصہ کس طرح اتارے؟ ـــــ کبھی ایک بچے کی کاپی نہ ہوتی، کبھی دوسرے کو جوتے کی ضرورت ہوتی۔ کبھی چھوٹی بچی کو دودھ نہ ملتا ـــــ عبداللہ نے اسے ایک ایک پیسے سے محتاج کر رکھا تھا، ہر ضرورت کے لیے اُس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ وہ کئی کئی دنوں تک صبر کرتی رہتی کہ شاید اُسے خود خیال آجائے مگر ایسا بہت کم ہوتا۔ بار بار وہ یاد دہانی کراتی اور وہ جھنجھلا کر انکار کر دیتا۔ کبھی اُس پر برس پڑتا "مجھے بیچ کر کھا لو تم لوگ! میں کما کما کر مرا جا رہا ہوں، مگر تمہاری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں!" جب زیادہ غصہ آتا تو دو چار تھپڑوں سے بیوی کی تواضع کر دیتا۔ اور زاہدہ اُسے قسمت کا لکھا جان کر چپ چاپ برداشت کر لیتی۔

ایک دوپہر وہ چارپائی پر لیٹی تھی۔ تھکن سے چور تھی۔ اُسے صبح کا منظر یاد آگیا۔ جب چائے گرم تھی۔ عبداللہ نے پیالہ منہ کو لگایا تو اُس کی زبان جل گئی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ـــ پیالہ اٹھا کر زاہدہ کے منہ پر دے مارا! اگر وہ منہ پر ہاتھ نہ رکھتی تو منہ جھلس گیا ہوتا۔ بچے دم سادھے کھڑے رہ گئے۔ ایک دم وہ چیخ اٹھی "میرا کیا قصور ہے اس میں؟"

"تیرا قصور؟" اور عبداللہ نے اسے لات مار کر گرا دیا۔ اور بک بک کرتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

دو تین دن پہلے وہ گھر میں تربوز لے کر آیا۔ اتفاق کی بات کہ تربوز بہت پھیکے اور بے ذائقہ تھے۔ سب بچے ارد گرد بیٹھے تھے۔

عبداللہ خود تربوز کی پھانکیں کاٹ کاٹ کر بچوں کو دے رہا تھا۔ بچے منہ بنا بنا کر کھا رہے تھے مگر بولے کچھ نہیں۔ زاہدہ نے تربوز چکھا تو اُس کے منہ سے نکل گیا "ارے — یہ تو بڑا پھیکا ہے!" عبداللہ نے یہ سنتے ہی باقی تربوز اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔ تربوز کا گلابی گلابی گودا ٹوٹ پھوٹ کر اس کے منہ گردن اور دوپٹے پر چپک گیا۔ کالے کالے بیج ہر طرف بکھر گئے — وہ شرمسار ہو کر گودے کے ٹکڑے اور بیجوں کو چن چن کر الگ کرنے لگی۔

"جب بھی کوئی چیز لاؤں گا یہ اُلّو کی پٹھی ایسے ہی بکواس شروع کرے گی! تربوز کوئی میں نے بنایا ہے؟ پھیکا ہے — پھیکا ہے!" وہ انتہائی بدتہذیبی سے اُس کی نقل اتارنے لگا۔ زاہدہ کی آنکھوں میں تذلیل کے احساس سے آنسو بھر آئے۔ وہ کبھی اپنا منہ اور دوپٹہ صاف کرتی کبھی آنسو پونچھتی۔ بچے سہمے بیٹھے تھے۔ کوئی بھی تو اُس کے حق میں نہ بولا تھا۔ اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور وہاں سے اُٹھ گئی!

آج جب اسے یہ منظر یاد آیا تو وہ سوچنے لگی کہ حقیقت میں تنہا، اپنی زندگی کا سفر طے کر رہی ہے نہ تو شوہر اُس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے نہ بچے اُس کا سہارا بنے — ماں باپ تو ماضی کا حصہ بن چکے تھے، بھائی بہن سب اپنے اپنے گردابوں میں چکرا رہے تھے — اسے یوں لگا جیسے وہ ہمیشہ سے ایک تنہا روح ہے اور ہمیشہ تنہا ہی رہے گی۔ کوئی اُس کے دل کی بات سننے والا نہیں تھا۔ نہ کوئی اس کا خیال رکھتا تھا نہ قدر کرتا تھا۔ وہ سوچتی شاید کوئی دن ایسا آجائے کہ جب بچے اُس کی ڈھال بن جائیں اس کا ساتھ دے سکیں — اس کی حمایت کر سکیں — مگر عبداللہ جیسے جلاد کے سامنے کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ ہوگی! وہ کبھی اپنے خلاف کسی کو برداشت نہ کر سکے گا! کبھی نہیں! اگر کبھی کسی نے اُس کی مرضی کے خلاف چوں بھی کی تو وہ بچوں کی گردن نہ مروڑ دے گا۔ ہاں — وہ ہمیشہ سے اکیلی ہے اور ہمیشہ اسی طرح ظلم کی چکی میں پستی رہے گی۔ جو اندھیرا اس کی قسمت پہ چھایا ہے وہ کبھی دور نہ ہوگا! وہ اسی طرح روتی اور سسکتی رہے گی۔ ہاں ہاں! بس یہی میرا مقدر ہے — اس سے زیادہ میرے نصیب میں کچھ نہیں! کسی کی ہمدردی، کوئی تسلی کا لفظ کوئی ساتھ — کوئی آواز — کوئی حمایت — نہیں کوئی نہیں! یہ بچے بھی سنپولیے ہیں۔ اسی سانپ کے بچے ہیں نا! یہ بھلا کیوں میرا سہارا بنیں گے؟ یہ کیوں میرا ساتھ دیں گے۔ اسے اندازہ تھا کہ قدیر اور منیر دونوں بڑے لڑکے اپنے باپ کی طرح ضدی اور غصہ ور تھے۔ اپنی ہر بات منوا کر چھوڑتے۔ وہ ماں کو ایک نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے بچپن میں۔ جب یہ حال ہے تو آگے ان سے کوئی امید رکھنا بیکار ہے۔ آنے والے وقت میں جب یہ جوان ہوں گے تو مجھے اپنے باپ ہی کی طرح ستائیں گے — جلائیں گے — اذیت دیں گے — اور میں ہمیشہ کی طرح ان کے مظالم سہتے سہتے کسی روز قبر کی تاریکی میں جا لیٹوں گی۔ مایوسی کے گہرے بادلوں نے اُس کے دل کو ڈھانپ لیا۔ وہ سوائے رونے کے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو آنسو بھی خشک ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔

گذرتے وقت نے اس سوچ پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ حالات بھی اُسی طرح سنگین تھے۔ اور دل کی اداسی اپنی جگہ برقرار تھی۔ گھر کی فضا میں عبداللہ کی بالادستی پوری طرح قائم تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح بے زبان، مظلوم اور مجبور ہستی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا وہ باورچی خانہ میں کام کر رہی تھی۔ عبداللہ صحن میں وضو کر رہا تھا، کچھ دیر پہلے ہی وہ کام سے لوٹا تھا۔ اچانک اُس نے صحن کے کونے پر نگاہ ڈالی، روزانہ جہاں وہ سائکل کھڑی کرتا تھا، سائکل وہاں نہیں تھی — وہ منہ دھوتے دھوتے رک گیا اور چیخ کر پوچھنے لگا "سائکل کہاں گئی؟"

زاہدہ گھبرا کر باورچی خانہ سے باہر نکلی۔ اُس نے سائکل کی مخصوص جگہ پر نظر ڈالی تو وہاں سائکل موجود نہ تھی تاہم وہ تجاہل عارفانہ سے بولی "مجھے کیا پتہ؟ وہیں ہوگی جہاں تم نے رکھی تھی!"

"بے وقوف عورت! سائیکل اُدھر نہیں ہے!"

زاہدہ دل ہی دل میں ڈر گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ چھوٹا بیٹا احمد سائیکل چلانے کا بے حد شوقین تھا۔ باپ کی نظر بچا کر سائیکل وہی باہر لے گیا ہوگا —— وہ یہ سوچ کر سہم گئی کہ احمد کا غصہ کہیں اس پر نہ اترے۔ عبداللہ سے کچھ بعید نہ تھا۔ "مجھے کیا معلوم؟" زاہدہ نے نیچی آواز میں کہا "کیوں، تجھے کیوں نہیں معلوم؟" وہ بازو دھونے کے لیے آستین کو اوپر چڑھاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر غصہ سے چیخا۔ جبھی احمد سائیکل سنبھالے اندر داخل ہوا۔ سائیکل چلا لینے کی مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اُسے اندر آتے دیکھ کر تو عبداللہ کا پارہ چڑھ گیا۔ بجلی کی طرح وہ ایک دم کھڑا ہو گیا —— اور احمد کی طرف لپکا۔ عین اسی لمحے اندر کمرے میں بیٹھے قدیر نے جو اسکول کا کام کر رہا تھا، جلدی سے باہر نکل کر غسل خانہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جہاں منیر کپڑے تبدیل کر رہا تھا اور جلدی سے بولا "منیر —— ریڈی!" منیر پتلون کی بیلٹ باندھتا ہوا جھپٹ کر باہر نکل آیا۔ اسی اثنا میں عبداللہ نے احمد کے ہاتھ سے سائیکل چھین لینے والے انداز میں اٹھائی اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے سر کے اوپر کو اٹھا لی —— اس ارادے سے کہ اسے زاہدہ کے اوپر دے مارے گا —— احمد حیرت اور خوف کے احساس سے وہیں جما کھڑا رہ گیا —— اور زاہدہ حیرت زدہ سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی —— اس سے ہلا تک نہ گیا۔

اچانک دونوں لڑکے نذیر اور منیر دوڑ کر آئے اور انھوں نے ماں کو کھینچ کر پیچھے گھسیٹ لیا اور خود تن کر آگے آ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ نے دیکھا کہ دونوں لڑکوں کی آنکھوں میں کچھ ایسی تندی اور خونخواری تھی کہ وہ گھبرا سا گیا اور آپ ہی آپ اُس کے اوپر اُٹھے ہاتھ سائیکل سمیت نیچے گر گئے۔ سائیکل زمین پر ٹکاتے ہوئے اُس نے پست آواز میں لڑکوں سے پوچھا "تم کیوں بیچ میں آئے؟"

زاہدہ کی ٹانگیں اب بھی خوف سے لرز رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ عبداللہ اس مداخلت کو بھلا کب برداشت کرے گا —— وہ خدا جانے کیا کر ڈالے؟ تب منیر کی آواز آئی جو ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا "ہم اپنی ماں کو بچانے آئے تھے —— اور کیوں آئے تھے؟"

قدیر آگے کو ہو کر مضبوط لہجہ میں بولا "ابا! بہت ظلم کر لیا تم نے! اب یہ تماشہ بند کرو! اگر کسی نے ہماری ماں پر ہاتھ اٹھایا تو اچھا نہ ہوگا!"

زاہدہ نے سنا اور اُسے یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ عبداللہ کے بیٹے آج اس کا ساتھ دے رہے تھے! اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی اس نے جو کچھ دیکھا ہے —— کیا واقعی ایسا ہو چکا ہے؟

اس کے ایک کندھے پر منیر کا ہاتھ ابھی تک رکھا تھا اور دوسری طرف سے قدیر اُس کا بازو تھامے کھڑا تھا۔ دونوں بیٹوں کی مضبوط پناہ کا اطمینان سے بھرپور سا احساس دل کی گہرائیوں میں اترا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی تھی۔

کرسمس کی شب

عطیہ سیّد

دریا ہڈسن کے کنارے ایک شہر آباد ہے جسے عروس البلاد سمجھا جاتا ہے۔ یہ اُسی کی ایک رات یعنی کرسمس کی شب کی بات ہے۔

ہڈسن کی جانب سے اُٹھتی ہوئی برفیلی ہوائیں شہر کی سربفلک عمارتوں سے ٹکراتی ہیں تو اُن کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں "دریا کنارے" کے ایک اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ہوں۔ میز پر کتابوں کا انبار لگا ہے۔ کرسمس کی چھٹیوں کے باوجود مجھے ایک اسائنمنٹ پر کام کرنا ہے۔ نرجی کرائسس کی وجہ سے کمرہ خنکی کی طرف مائل ہے۔ برف کے گالوں کو جب تند خو ہوائیں دھکیلتی ہیں تو وہ ایک عجیب کرختگی سے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتے ہیں۔ میرے اس چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک کھڑکی ہے، اور اس سے بھی کسی روشنی کی توقع بے سود ہے کہ اس شہر پر ہول کی آسمان کو چھوتی عمارتوں نے ہر طرف اندھیرے کے حصار کھینچ رکھے ہیں۔ اسی لیے یہاں چمکیلے سورج بھرے دنوں میں بھی بیکین، تمازتِ آفتاب کی دریا دلی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور یہ تو دسمبر کے کہر آلود، ابر آلود ایام ہیں۔ دن پر رات کا گمان ہوتا ہے سو میری میز پر بھری دوپہر میں بھی لیمپ روشن رہتا ہے۔

میں اس وقت کتابوں کے انبار میں گھری اُن پہیلیوں کو سلجھانے میں مصروف ہوں جو صدیوں سے انسانی ذہن میں موجود ہیں، جنھیں شاید ققنس نے جنم دیا تھا، اسی لئے ہر دفعہ وہ اپنی ہی راکھ سے دوبارہ سر اٹھاتی ہیں۔ یہ پہیلیاں دانشوروں کے سروں سے بلند، مغرور، نہ سر ہونے والی چوٹیوں کی طرح انسانی فہم کی شکست پر مسکراتی ہیں۔ ایسی ہی ایک پہیلی وہ اسائنمنٹ ہے جو پروفیسر رڈک نے ہمیں دی ہے۔ میں اسی سلسلے میں روسو کے "اعترافات" پڑھ رہی ہوں۔

روسو کی تحریر سے جو تصویریں میرے ذہن میں ابھرتی ہیں، وہ مجھے اس شہر سے بہت دور یورپ کے ایک حسین خطّے کی جانب لیے جا رہی ہیں۔ رُوسو کی ابتدائی زندگی ایک خواب کی مانند حسین اور مختصر ہے۔ اُس سے محبت کرنے والی ماں، جو وقت سے پہلے جہانِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے، اُسے چاہنے والا باپ، جو اُسے تنہا چھوڑ کر دور دراز کے ملکوں کی راہ لیتا ہے۔ وہ اندھیرا جو اچانک اُس کی زندگی کو آگھیرتا ہے ___!

اب پڑھتے پڑھتے میری آنکھیں تھکن کے احساس سے بوجھل ہیں۔ میرے جسم کے پٹھے اکڑ چکے ہیں اور میری سوچ بڑی حد تک مفلوج ہو چکی ہے۔ کچھ دیر سستانے اور اپنے تھکے ہوئے ذہن اور جسم کو تازہ دم کرنے کے خیال سے میں کرسی کو پیچھے دھکیل کر اُٹھتی ہوں۔ کمرے میں ایک دو چکر لگا کر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ کھڑکی سے باہر دنیا سفید و سیاہ کا مرقع نظر آتی ہے۔ آسمان سیاہ اور ابر آلود ___ زمین اور عمارتیں سفید اور برف پوش ___ برفباری کی وجہ سے منظر میں ایک سپاٹ

یک ہیئت دکھائی دیتی ہے۔

کھڑکی سے باہر سامنے والی بلند و بالا عمارت کے سنگ و خشت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ اُس کا قوی ہیکل وجود میری تیسری منزل پر واقع ننھی سی حقیر کھڑکی کی سکرین پر حاوی ہے۔ تاحد نظر برف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہوگا، لیکن میری نظر کی حد تو سامنے والی عمارت ہے۔ یہ عمارت مجھے اپنی طرف کھینچتی بھی ہے اور خوفزدہ بھی کرتی ہے۔ اس میں ایک عجیب سحر ہے۔ بظاہر یہ سلیٹی رنگ کی ایک پرانی عمارت ہے لیکن یقیناً "دریا کنارے" کی اکثر عمارتوں کی طرح گذرے وقتوں میں شہر کے رئیس زادوں کا مسکن ہوگی۔ وقت کے دھوئیں نے اس کے در و دیوار کو سنولا دیا ہے۔ تاہم اس کی بلند و بالا برجیاں، چوڑا چکلا صدر دروازہ، گل بوٹوں سے مزین دیواریں، اور یونانی دیومالا کے کرداروں کے مجسمے اس کی عظمتِ رفتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ یوں گمان گذرتا ہے کہ کسی انگریز رئیس زادے کی طرح، نشیب و فراز زمانہ کے ہاتھوں مجبور، اس کے پاس صرف نمائشی دکھاوے کی خارجی شان و شوکت کے سوا کچھ نہیں، اور وہ بھی وقت کی گرد سے اٹی ہے۔ اس کی بلند و بالا قامت، اونچی برجیاں، مزین صدر دروازہ، گل بوٹے اور یونانی دیوتاؤں کے مجسمے صرف بھرم ہیں اس خستہ حالی کو چھپانے کا جو اس کے ٹوٹے پھوٹے کمروں، اکھڑے ہوئے پلستر اور سیلن زدہ دیواروں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔

میں کمرے میں ایک اور چکر لگا کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں اور میری نظروں کی طرح میری سوچ بھی گھوم پھر کر سامنے والی عمارت پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ جب سے میں گلوریا کے ہاں مقیم ہوں۔ میں نے کبھی کسی شخص کو اس عمارت میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اور نہ کبھی اس کے مکینوں کے چہرے سڑک پار کھڑکیوں میں دکھائی دیئے۔ البتہ کبھی کبھی رات کے گہرے سناٹے میں اس سے بلند ہوتی ہوئی آہ و بکا سنائی دیتی تھی جو شمالی ہواؤں کی غضبیلی آوازوں میں آرکسٹرا کے مختلف سازوں کی طرح گھل مل جاتی تھی ـــ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہوا کبھی کرب سے چلا رہی ہے اور کبھی درد سے دھیمے سروں میں رو رہی ہے۔ ایک دو مرتبہ گلوریا سے میں نے ان آوازوں کا ذکر بھی کیا، لیکن اس نے جواب اپنے سپاٹ چہرے اور حوصلہ شکن خاموشی کی صورت میں دیا۔ البتہ مجھے معصوم مشرقی اجنبی سمجھتے ہوئے اُس عمارت کے قریب پھٹکنے سے منع کیا۔

روسو کی زندگی اس دور میں داخل ہوتی ہے جب وہ تعلیم کے درسی ضوابط و قواعد سے بغاوت کرتا ہے۔ روکھی سوکھی نصابیات اور مکتب کی روٹین کو الوداع کہنے کا علامتی اظہار وہ فرار کے بعد اپنی گھڑی جنگل میں پھینک کر کرتا ہے۔ لمحوں کی گنتی کی زنجیر کٹتی ہے اور وہ حسین جنگلوں کی راہ لیتا ہے۔ مناظر فطرت کا حسن دیکھتا چلا جاتا ہے ـــ وہ حسن جو ہمیشہ کے لئے اس کی روح اور سوچ پر چھا جاتا ہے اور انسان کی قبل از تاریخ حالتِ فطری کو مثالی جان کر اس کی تمنا کرتا ہے۔

برفباری کی وجہ سے سورج کی روشنی سرے سے مفقود ہے۔ وقت کے بہاؤ کا احساس صرف سامنے رکھی ہوئی گھڑی سے ہو رہا ہے جس کی مسلسل ٹک ٹک میرے شعور کو لمحوں کی زنجیر میں مقید رکھتی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں بتا رہی ہیں کہ دن ڈھل چکا ہے برف کا سیلِ رواں بھی رک گیا ہے اور ہواؤں کا غیظ و غضب بھی مدھم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس فرصت عناصر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر کے اکا دکا جیالے سڑکوں پر نمودار ہونے لگے ہیں۔ ابھی آسمان اور ہوا کے تیور پوری طرح بدلے نہیں ہیں لیکن اس شہر کے باسی اس مختصر سے وقفے کو فرصتِ دو جہاں، اور فراغتِ جسم و جاں جانتے ہیں۔ میرے کلاس فیلو برنیلی نے کیا خوب کہا تھا کہ تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ تم ابدیت میں بستے ہو اور ہم لمحوں میں۔ تم سمجھتے ہو کہ شاید تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لمحے ہماری زیست کا اصل جوہر ہیں۔

میں کھڑکی میں کھڑی سڑک پر آنے جانے والوں کا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ لوگ اکیلے یا جوڑوں یا ٹولیوں کی شکل میں لمبے کوٹوں میں ملبوس، مفلروں میں منہ لپیٹے، سڑک پر آجا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ خاموش ہیں، کچھ باتوں میں مصروف ہیں، کچھ ہنسی ٹھٹھول کر رہے ہیں اور کچھ بدمستی کے عالم میں ہنگامہ کرتے جا رہے ہیں۔

اچانک ایک گلی کے موڑ سے روزانا لنگڑاتے اٹھلاتی ہوئی نکلتی ہے۔ روزانا ایک ہسپانک نژاد حبشن ہے۔ اس کی رگوں میں ہسپانوی امریکن سیاہ خون ہے۔ یہ اس کے چہرے کے نقوش، جسمانی ساخت اور باتوں کے انداز میں واضح ہے۔ میں روزانا کو اپنی کھڑکی کے حوالے سے جانتی ہوں۔ ہر روز میں جب رات گئے لکھنے پڑھنے کی مشقت سے چند لمحوں کی فرصت حاصل کرنے اس کھڑکی میں سڑک کے نظارے کے خیال سے آن کھڑی ہوتی ہوں، تو روزانا کو اسی طرح سامنے والی چوتھی گلی سے نکلتے دیکھتی ہوں۔ وہ ہمیشہ بڑے شوخ رنگوں کے بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہے لیکن ان بھڑکیلے کپڑوں اور سرخی پوڈر کے بے جا استعمال کے باوجود مجھے ہمیشہ اس پر ترس آتا ہے۔ اس کی مبالغہ آمیز شوخیوں اور فلمی اداؤں کے باوجود وہ ایک مظلوم اور قابلِ رحم مخلوق نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی روح کی گہرائیوں میں عدم تحفظ کا کوئی بیج موجود ہے، جو آہستہ آہستہ پھل پھول رہا ہے، اس نمائشی پُر اعتمادی کی کھوکھلی زمین کے نیچے جو بظاہر اس کے انگ انگ سے چھلک رہی ہے۔

روزانا ان بے شمار مہاجرین میں سے ہے جو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں لاطینی امریکہ سے غیر قانونی طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے شہروں میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ انگریزی پر عبور نہ ہونے، کم تعلیم یافتگی اور مقامی امریکن کے مقابلے میں ذہنی پسماندگی کی بنا پر تیسرے درجے کے شہری شمار ہوتے ہیں۔

روزانا رات گئے اپنی گلی سے نکلتی ہے، اور مرکزی ایونیو کے شراب خانوں کی جانب غائب ہو جاتی ہے۔ وہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے، مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کبھی اُسے گھر لوٹتے نہیں دیکھا۔

اب روسو کی ملاقات اُس خاتون سے ہوتی ہے جسے وہ "ماما" کے نام سے موسوم کرتا ہے، لیکن جس سے اس کے رشتے کئی ایک ہیں، اور غالباً ناقابلِ بیان ہیں بعضوں کی رائے میں جدید نفسیات کی روشنی میں انھیں سمجھنا ممکن ہے بشرطیکہ روسو کے "اعترافات" حقیقت پر مبنی ہوں۔ کسی عہد کی "تاریخ" کو پرکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ دو انسانوں کے باہمی تعلق کی شہ رگ تک پہنچنا۔ ہم اعتراف تو کرتے ہیں لیکن کہاں تک؟ روسو کے اعتراف میں کس مقام تک حقائق اس کے قلم کے ہمرکاب رہتے ہیں، اور کس نقطے سے تخیل کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں حتمی جواب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا یہ دعویٰ کہ ہم کسی کی شخصیت کا مکمل احاطہ کر سکتے ہیں۔ کسی شخص کے باطن کے پاتال کو چھونا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ صرف خود وہی شخص اپنے باطن تک رسائی رکھتا ہے —— لیکن کیا وہ خود بھی اندر کے تمام اطراف کو پاٹ سکتا ہے، چاہے وہ کوئی عظیم مفکر یا ماہرِ نفسیات ہی کیوں نہ ہو۔

روسو نے "اعترافات" میں اپنے کئی گناہوں کا اقبال کیا ہے۔ لیکن کیوں؟ کیا اس کی محرک خود شناسی کی پُرخلوص کوشش ہے یا جرأت مندی کی نمائش اور سنسنی خیزی۔ یا مغلوب کرنے والی یہ خواہش کہ دوسرے اس کی کوتاہیوں کے محرکات کو سمجھ سکیں؟ کیا وہ خود ذمہ دار ہے اپنی روحانی پستیوں کا، یا وہ معاشرہ جو منافقت اور عدم مساوات کی بنیادوں پر استوار ہے؟

میں کھڑکی کے سامنے انہی سوالوں پر کمندیں ڈالنے میں مصروف ہوں کہ اتنے میں روزانا خلافِ معمول واپس آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ کسی اجنبی کے بازوؤں میں بازو ڈالے اٹھلاتی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی واپس آ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ درانہ سرمستی سے کبھی شوخ د

تنگ قہقہے لگاتی ہے، اور کبھی اُس اجنبی کے کندھے پر ایک ادائے دلبری سے سر کو تھوڑی دیر کے لئے رکھتی ہے۔ وہ چلتے چلتے میری کھڑکی کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ اس سارے خاموش ناٹک (PANTOMIME) میں جو بات میری توجہ کو کھینچنے کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ روزنا اور اس کا ساتھی سامنے والی عمارت کے صدر دروازے میں جا پہنچتے ہیں۔ دونوں کچھ دیر صدر دروازے میں کھڑے رہتے ہیں۔ غالباً مطلوبہ اپارٹمنٹ کا بٹن دبا کر عمارت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی ہوگی۔ اس شہرِ غدار کے باسی مکمل طور پر عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ وہ ایک ایسے خوف سے اعصاب زدہ ہیں جس نے انھیں گھروں میں قلعہ بند رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ نت نئے حفاظتی انتظامات کا سوچتے رہتے ہیں۔ اس خوف نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ کبھی کبھی یوں گمان گذرتا ہے کہ وہ اس سے لاشعوری طور پر کسی قسم کی طمانیت حاصل کرتے ہیں کہ اگر یہ خوف بھی نہ ہو تو شاید وہ خلائے محض میں معلق ہوں۔

روزنا اور اس کے ساتھی کو اُس پُراسرار عمارت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے اور وہ دونوں اس کے باطن کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب باہر سڑک پر میری دلچسپی کو کھینچنے والی کوئی چیز نہیں۔ ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح میں پھر میز پر رکھی کتابوں کے انبار کی طرف واپس آتی ہوں اور اپنی شمسی سوچ کے دھارے میں نئی حرارت پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہوں، مگر یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی کہ میرا ذہن نہ صرف تھکن کے احساس سے بوجھل ہے بلکہ دل بھی ناسٹیلجیا کی زد میں ہے۔ وطن سے ہزاروں میل کی دوری نے قلب و فکر پہ دھند کی دبیز چادر پھیلا رکھی ہے جس سے ذائقۂ حیات پھیکا اور سوچنے کی صلاحیت کند سی لگتی ہے۔ کیا ایسی ہی کیفیت روسو کی نہیں ہوگی جب وہ مقابلتہً سادہ اور قدرے دیہاتی ماحول سے نکل کر پیرس کی بظاہر مہذب اور چندھیا دینے والی مگر درحقیقت گھناؤنی زندگی سے دوچار ہوا تھا؟ کیا اُسے بھی ایسے ناسٹیلجیا کے کرب سے گذرنا پڑا ہوگا؟ ـــ شاید ـــ!

اپارٹمنٹ میں گھنے جنگلوں کا سا گہرا سناٹا ہے۔ گلوریا گھر میں موجود نہیں۔ وہ شاید کرسمس کے موقع پر اپنے شوہر کے پاس گئی ہے۔ اس کا شوہر چار بلاکس پرے مقیم ہے۔ ان کی شادی نہایت کامیاب ہے۔ اور غالباً کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ اس حکمت سے واقف ہیں کہ زیادہ قربت عظیم فاصلوں کو جنم دیتی ہے۔ سو اپارٹمنٹ میں میرے سوا اس وقت اور کوئی ذی روح موجود نہیں اسی لئے کرسمس کی شب کے باوجود یوں احساس ہوتا ہے جیسے کانے کاچھے کے کسی چک کی رات، جہاں آٹھ بجے ہی ایک ہُو کا عالم ہوتا ہے اور جھینگروں کی آوازوں سے ہُو کی گمبھیرتا اور بڑھ جاتی ہے۔

اچانک سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک چیخ سنائی دیتی ہے جو میرے دل کی طرح اپارٹمنٹ کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ شاید مجھے اس کی صوتی شدت کا تاثر اس لئے بھی زیادہ محسوس ہوا ہے کہ میں کام کرتے کرتے اونگھنے لگی تھی۔ اس چیخ کے کرب سے میرے سارے جسم کو ایک شدید جھٹکا سا لگتا ہے۔ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میرے نیم خوابیدہ ذہن کو صورتِ حال سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ کچھ تاخیر سے میرے ذہن کی صلاحیتیں پھر سے کام کرنا شروع کر دیتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بحال ہو جاتی ہے۔ "یا خدا! یہ کس کی چیخ ہے؟"

میں میز سے اُٹھ کر کھڑکی کی جانب آتی ہوں۔ سڑک سے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سامنے والی عمارت کا صدر دروازہ کھلا ہے اور ڈیوڑھی میں اُس کے دو مکین کھڑے ہیں جنھیں میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا" یا خدا! یہ کیسا غول بیابانی ہے ـــ!"

اُن کے حلیے عجیب و غریب ہیں۔ آنکھوں سے دہشت برستی ہے۔ چہروں پر ایک مظلوم شیطانیت ہے اور بےبسی میں ایک دیوانگی ہے۔ ان میں سے اکثر کے کپڑے بوسیدہ اور غلیظ ہیں۔ جوتے پھٹے ہوئے ہیں۔ ڈیوڑھی کی مدقوق روشنی میں وہ کوئی جہنمی ٹولہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتا رہے ہیں کہ وہ کسی چیز سے ـــــ کسی تماشے سے ظالمانہ لطف اٹھا رہے ہیں وہ چیز جو اُن کے درمیان پڑی ہے اور جس کے تماشے سے وہ ایک گھٹیا لذت محسوس کر رہے ہیں، روزانا ہے جو نیم برہنگی کی بےبسی کے ساتھ ساتھ مظلومیت کے غیظ و غضب کی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ صرف بلاؤز اور جانگیے میں ملبوس ہے۔ اُس کی سنہری وگ تقریباً ڈھلک چکی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بےبسی کے آنسو ہیں لیکن وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی ہے ـــــ "کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں ایک اپاہج ہوں" وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کی طرف بار بار اشارہ کر کے چلاتی ہے "کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ میں معذور ہوں"

یہ لرزہ خیز نظارہ غول بیابانی کے دلوں کو چھونے کے بجائے ان کی تفریح طبع کا سبب بن جاتا ہے۔ روزانا کی حالت اس لومڑی سے کم نہیں جسے امیرزادوں کے کتوں نے گھیر رکھا ہو۔ اس ٹولے میں وہ اجنبی بھی موجود ہے جو سرِ شام روزانا کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوا تھا۔ روزانا کا اصل مخاطب وہی ہے۔ یہ ایک سفید فام اجنبی ہے۔ چہرے مہرے سے لاطینی امریکہ کے بجائے اینگلو سیکسن نسل کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے نقوش کے علاوہ اس کے چہرے کے تاثرات میں لاطینی نژاد جوشیلی جارحیت کے بجائے ایک سرد مہر منافقت نمایاں ہے جو اینگلو سیکسن لوگوں کا خاصہ ہے۔

خدا کے لئے مجھے میرے پیسے تو دو" ـــــ روزانا چلاتی ہے۔ غالباً وہ شب بسری کی اجرت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ روزانا کی چیخ پکار کے جواب میں اجنبی کے ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکراہٹ ابھرتی ہے لیکن وہ لفظوں میں جواب دینے کی تکلیف نہیں کرتا۔ جب روزانا دیکھتی ہے کہ پیسوں کی وصولی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ ہاتھ بلا کر اُس شیشی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو سفید فام کی مٹھی میں ہے۔ پھر وہ جیسے فریاد کرتی ہے ـ" اچھا پیسے نہیں دیتے تو نہ دو۔ مگر مجھے میری شیشی تو واپس کر دو۔ یہ میری دوا ہے۔ میں اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی"

اس پر سفید فام اجنبی کی آنکھوں میں ایک ایسی یخ کر دینے والی ٹھنڈک اتر آتی ہے جو برفاب کی تہہ میں کھولتے پانیوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہ ٹھوکر سے روزانا کو سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیتا ہے۔ روزانا کی مصنوعی ٹانگ میں یقیناً کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے کہ نہ وہ اُٹھ سکتی ہے اور نہ اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہے۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔ ڈیوڑھی میں کھڑا غول بیابانی اُس کی مدد کرنے کے بجائے اُس کی اس حالت سے محظوظ ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کے اندر کو دھنسے ہوئے گالوں دہشت ناک آنکھوں اور نشے سے پیلے دانتوں سے ایک مظلوم سنگدلی ٹپک رہی ہے جو اُن لوگوں کی صفت ہوتی ہے جو ستم زدہ ہونے کے باعث پہلے بے حس، پھر سنگ دل اور آخر میں ظلم سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں اسی لئے خود ظالم کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اب روزانا سڑک کے کنارے رکھے کوڑے کرکٹ کے تھیلوں اور ڈرموں کے درمیان پڑی ہے جیسے وہ خود بھی اس معاشرے کی فالتو اور بیکار اشیاء میں سے ہے جنہیں ان کے متمول مالک کسی معمولی سے نقص یا محض دل بھر جانے کی بنا پر سڑک کے کنارے پھینک جاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں عموماً اچھی خاصی کرسیاں، گدے اور تصاویر وغیرہ کوڑے کے ڈرموں کے پاس پڑی نظر آتی ہیں جنہیں ہمارے ہاں پھینکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

سفید فام اجنبی اُس شیشی کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر رخصت ہو چکا ہے جس کا مطالبہ روزانا کر رہی تھی۔ مظلوم عفریتوں

کا گروہ بھی آخر کار اس تماشے سے اکتا کر ڈیوڑھی سے غائب ہو چکا ہے، اور ڈیوڑھی کا دروازہ حسبِ معمول بند ہو گیا ہے۔ روزانا اپنی بے کسی کے چیتھڑوں میں لپٹی کوڑے کے ڈھیر کے درمیان چیخنے چلانے اور پھر آنسو بہانے کے بعد اب کوڑے کا خاموش گٹھڑ دکھائی دے رہی ہے۔ لوگ اس کے پاس سے بے نیازی سے گزر رہے ہیں۔ وہ اپنی سوچ میں اتنے مگن ہیں کہ انھیں کوڑے کے ڈھیر میں ایک انسانی لوتھڑے کی خبر تک نہیں۔ کچھ ٹولیاں سرمستی کے عالم میں اور کچھ حمدیں گاتی جا رہی ہیں کہ یہ کرسمس کی بابرکت رات ہے۔ رحمتوں کا در وا ہے۔ کچھ غالباً ایسے بھی ہوں گے جنھیں کوڑے کے تھیلوں میں کسی انسانی وجود کا شک گزرا ہو گا مگر وہ اسے اپنے مروجہ ضابطۂ اخلاق کے خلاف سمجھتے ہوں گے کہ کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دیا جائے، لہٰذا وہ انتہائی شریفانہ بے نیازی سے سر جھکائے، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے گزر گئے۔

اس سارے تماشے سے مجھ پر ہیبت سی طاری ہو چکی ہے۔ ایک غیر معاشرے کی اجنبیت جو بے بسی پیدا کرتی ہے، اس کے سبب مداوے کا کوئی رستہ سجھائی نہیں دے رہا۔ اچانک ساتھ والے کمرے سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے پھر کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی ہے۔ غالباً گلوریا گھر واپس آ چکی ہے، میں نے شاید سڑک پر کھیلے جانے والے ڈرامے کی دہشت کی بنا پر گھر میں اس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ میں لپک کر کمرے کا دروازہ کھولتی ہوں اور گلوریا کے پاس جا کر سارا ماجرا بیان کرتی ہوں۔ وہ بڑی خاموشی سے روزانا کا قصہ سنتی ہے، لیکن اس کی آنکھوں کے تاثر سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ اس کی تفصیلات سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی خاموش بے دلی سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس قصے میں ملوث نہیں ہونا چاہتی۔ مگر میرے اضطراب کو دیکھتے ہوئے وہ آہ بھر کر ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ گلوریا ان امریکیوں میں سے ہے جو مشرقی لوگوں کی جذباتیت کو بوالعجبی سمجھنے کے باوجود اُسے شفقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک لمبی سرد آہ کے ساتھ وہ پولیس کو گمنام فون کال کرتی ہے۔

کچھ ہی دیر میں گشتی پولیس کی گاڑی کا سائرن سڑک پر سنائی دیتا ہے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں تو دو پولیس والے گاڑی سے اترتے ہیں، اور سڑک پر روشنی کی کمی کے باعث اپنی بیٹریوں کی مدد سے کوڑے کے تھیلوں میں انسانی جسم تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر وہ روزانا کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس کے نیم برہنہ جسم کو، جو اب سردی سے یخ ہو چکا ہو گا، کمبل میں لپیٹ کر پولیس کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

میرے تنے ہوئے اعصاب کو قدرے سکون محسوس ہوتا ہے۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس ساری ہلچل میں گلوریا کو کرسمس کی مبارکباد نہیں دی جا سکی۔ میں کمرے کا دروازہ کھولتی ہوں۔ گلوریا دو فٹ کے فاصلے پر سامنے باورچی خانے میں کھڑی کرسمس ڈنر کی تیاری کر رہی ہے۔

”گلوریا، میری کرسمس!“

”تھینک یو“ گلوریا شکریہ ادا کرتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہوں۔ انجانے میں میرے قدم کھڑکی کی طرف اٹھتے ہیں اور میں شیشوں میں سے باہر جھانکتے ہوئے سوچتی ہوں، ”میری کرسمس گلوریا —— اینڈ یو ٹو —— روزانا!“

جرمِ آشنائی

ساجدہ صبا

افریقہ سے آئے حبشیوں کا ایک اور ریلا اُس کی طرف بڑھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تنکے کی طرح ان کے درمیان پھنس گیا ہو۔ لوگوں کا ہجوم اُسے جس طرف چاہتا موڑ دیتا۔ اُسے اپنی پسلیاں سکڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور اس کا سانس حلق میں پھنسنے لگا۔ اچانک کسی لمبے ہاتھ نے اسے گرداب سے کھینچ نکالا۔ اب وہ سنگ مرمر کے ستون سے لگا ہانپ رہا تھا۔ اور اس کی احسان سے بھیگی آنکھیں اپنے محسن کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کی نظروں کے سامنے سفید احرام میں لپٹے لمبے تڑنگے توے جیسی سیاہ چمکتی جلد والے حبشی تھے جن کے رخسار داغے ہوئے تھے۔ جن کے بال اس قدر گھنے گھنے اور گھنگریالے تھے کہ زم زم ان کے سروں کی سردن کی جلد کو چھوئے بغیر نیچے پھسل جاتا۔ اُس نے ناکام ہو کر آنکھیں موند لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ آج حرم میں آئے اسے تیسرا دن تھا مگر اُس کے قدم جکڑے ہوئے تھے۔ وہ حسرت سے کعبہ کو دیکھتا مگر اسے چھو نہ سکتا تھا۔ ان تین دنوں میں جانے کتنی بار اُس کے قدم کعبے کی سمت بڑھے تھے مگر اُسے ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کبھی لبیک لبیک کرتے حاجی سدِ راہ بن جاتے اور کبھی انجانی قوتیں اسے اٹھا کر پیچھے پھینک دیتیں۔ سنگ مرمر کی مرمریں پگڈنڈیوں کے درمیان بچھے کنکروں پر سر مل کر اس کی پیشانی لہولہان ہو چکی تھی۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگ مانگ کر اس کا حلق خشک ہو چکا تھا مگر مقام ابراہیمؑ تک اُس کو نہ پہنچنا تھا نہ پہنچا۔ سارا سارا دن وہ مسجد کی ٹھنڈی چھاؤں کو چھوڑ کر صحن کی کسی سیاہ صحرائی دھوپ میں تپتی سل پر سر رکھے اپنے بلاوے کا منتظر رہتا اس کے ارد گرد سے بھانت بھانت کے لوگ گذرتے رہتے۔ طرح طرح کی بولیاں اس کی سماعت سے ٹکراتی رہتیں۔ ایمان کی دولت سے مالا مال حجازی، محبت و سرور کے نشے میں مست اہلِ بخارا و نجد، سرخ و سپید فلسطینی، عیاش شیخ، موتیوں کی سرزمین سے آئے خوشحال یمنی کویتی اور انڈونیشیا کے سانولی رنگت والے حاجی، سمر قند، بغداد، بیروت، کراچی اور انقرہ کے حاجی، دولت کے طالب، ایمان کے خریدار، شرمسار، عاجز، دولت مند، غریب، لٹے ہوئے مصیبت زدہ مسلمان ..... ایک خدا کے بندے، ایک رسولؐ کے پیروکار، ایک مالا کے موتی، ایک جسم کے خلیے، ایک ہی ستارے کی روشنی کے ذرے ..... ایک ساتھ صفیں باندھنے والے، ایک دوسرے کی نماز سے بے خبر، اپنے میں گم، تہجد کے پابند متقی، پرہیزگار، دنیا دار، خود غرض، بغیتے ____ سب ایک ہی صف ایک ہی خدا اور ایک ہی رسولؐ .....!!

"لبیک اللھم لبیک..... اے اللہ میرے گناہ معاف کر دے ..... اے اللہ مجھے دنیا اور آخرت میں سرخرو کر..... اے اللہ مجھے غنی کر دے ..... اے اللہ میرے ملک و ملت کو تباہی سے بچا لے ..... اے اللہ میری بیٹیوں کی عصمت محفوظ رکھ..... اے اللہ مسلمانوں کی عصمت کو بچا لے ..... اے اللہ ..... اے خدا ..... اے مولا ..... اے آقا ..... میرے مالک ....." بھانت بھانت کی آوازیں، التجائیں، گڑگڑاہٹیں ..... اس کی سماعت سے ٹکراتی رہیں اور

وہ آوازوں کے اس سیلِ رواں میں بہتا رہا...... اس کی گردن اس کے سینے تک جھکی تھی اور حواس معطل تھے وہ خود بھی تو کتنی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ یہاں آیا تھا، مگر پتھر سے چنی دیواروں نے اس کی قوتِ سماعت چھین لی تھی، اس کے حواس چپ، خیالات منجمد اور زبان گنگ ہو چکی تھی۔ احساسِ گناہ ...... کردہ و ناکردہ گناہوں کا بوجھ.... اسے اپنے رواں رواں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے وجود کو قاش قاش کر کے کتوں کے آگے پھینک دے..... حرم کی چار دیواری سے برستا نور، بھیک کی صداؤں سے لبریز فضا اور زم زم کا تبرک بھی اس کے دل کے بوجھ کو ہلکا نہ کر سکا۔

آسمان پر ستارے جھلملانے لگے مگر حرم کی روشنیاں، حرم کا تقدس اور حرم کی پُرنور فضا میں ستاروں کی تابانی بے احساس اور حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ "اے اللہ...." اس نے ستون کی آڑ سے جھانک کر حرم کی طرف دیکھا۔ "مجھے اتنا تو بتا دے میرا جرم کیا ہے؟..... میں نے چوری نہیں کی۔ ڈاکہ نہیں ڈالا۔ کسی کو بے عزت نہیں کیا۔ کسی کے سر سے دوپٹہ نہیں چھینا۔ کسی کی پگڑی سرِ بازار نہیں اچھالی۔ کبھی رشوت نہیں لی۔ پھر یہ احساسِ گناہ کیوں ہے؟" اس نے سفید سنگِ مرمر کے ملائم پُروقار ستون کی اوٹ سے جھانک کر کعبے کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جا رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیاہ تاریک اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں اترتا ہی چلا جا رہا ہو۔ نیچے ہی نیچے بس ڈوبتا ہی جا رہا ہو۔ "اے خدا!" وہ چلایا اور روتا وہ دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا۔ ہزاروں سیکڑوں دھکے کھاتا وہ اس ریلے میں جا شامل ہوا جو زمان و مکان کی قید سے بیگانہ یادِ الٰہی میں مشغول تھا۔ وہ کچلا جا رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ مگر وہ چلا جا رہا تھا بلکہ لوگ اسے چلائے چلے جا رہے تھے۔ جانے کتنے چکر ہو گئے ..... دو تین، سات آٹھ، پندرہ ..... اچانک عشا کی اذان ہوئی مگر طواف جاری رہا... لوگ پھیرے پورے کر کے لوٹتے رہے۔ رات بھیگتی چلی گئی مگر وہ چلتا چلا گیا۔ خالی الذہن، گنگ، ماؤف۔ کبھی کبھی وہ نظر اٹھا کر کعبے کی پُروقار ریشمی دیواروں کو نزدیک دیکھتا مگر اس تک پہنچنے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتا۔ اچانک وہ رک گیا اور دائرے کو توڑ کر اس کی ریشمی پناہوں کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب اور قریب۔ اور پھر قریب تر..... اس نے ڈرتے ڈرتے غلاف کو چھوا۔ وہ کسی زبردست جھٹکے کا منتظر تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو اور آگے بڑھایا اور پھر ہتھیلی کے اندرونی حصے کو بھی اس کے ساتھ گھسنا چلا گیا۔ اور پھر دونوں ہاتھوں کو دیوانہ وار پھیرتا چلا گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ گھٹنوں کے بل حطیم کے مرمریں فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے اردگرد عورتیں اور مرد نفل پڑھتے رہے رحمتوں کے نزول کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ گیلی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو اور دل سے بلند ہوتی فریادیں لیے ہزاروں ہاتھ فضا میں بلند تھے۔ جانے کن ہاتھوں کی امیدیں بر آتی تھیں؟۔ اس نے کعبے کی دیوار پر پیشانی لگا دی اور کعبے کی انوکھی مسحور کن خوشبو اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔

میں کون ہوں؟ اس نے خود کو خود میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ آخر کس گناہ کی پاداش میں کرب کی صلیب پر چڑھا ہوا ہوں۔ اس نے خود کو ٹٹولا۔ شاید میں دجلہ و فرات کے میدان میں کسی خوبصورت پھلوں کے باغ میں پیدا ہوا تھا جن کے ذائقے اور خوشبو کی دھوم سمرقند تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ باغ میرے اپنے لہو سے رنگا جانے لگا اور میں بت کی طرح بے حرکت ساکت کھڑا رہا۔ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگے۔ مگر میں پھر بھی نمرود کی طرح گردن اکڑا کر اپنی جگہ موجود رہا۔ یہ وہ سرزمین تھی جس کے بطن نے ان شہیدوں اور مجاہدوں کو جنم دیا تھا جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدائیں آج بھی اس دھرتی میں گونج رہی ہیں۔ اس دھرتی نے وہ لعل زمانے کو عطا کئے تھے جو کوسوں دور سے آنے والی ایک بے کس عورت کی فریاد پر برق بن کر گرتے تھے۔ مگر میرے لہو میں ان عظیم المرتبت ہستیوں کا لہو نہیں

بلکہ بابل و نینوا کے ان باشندوں کا لہو گردش کر رہا ہے جو تہذیب کے نام سے ناآشنا اور بے بہرہ تھے ورنہ میں اپنے لہو سے خود اپنے گلستان کو رنگ سکتا تھا؟ ۔۔ اور کیا میں دجلہ و فرات کے نیلے پانی کو لہو کی سرخی میں بدلتے دیکھ سکتا تھا۔ نہیں مجھے تو مرجانا چاہیے تھا مگر میں زندہ ہوں اور نہ صرف زندہ ہوں بلکہ بڑی خوشحال سرمست زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرے باغوں سے اُگنے والے انگور کے خوشوں سے بابل و نینوا کے زمانوں جیسی پرانی شراب بنائی جاتی ہے اور میں ڈالروں میں کھیلتا ہوں ـــ شہیدِ کربلا کی اس مبارک سرزمین پر میں ۔۔۔۔!!

مگر نہیں میں تو شاید نیل کے ساحل پر پیدا ہوا تھا کیونکہ مجھ میں فراعنۂ مصر کا سا غرور پایا جاتا ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جس میں سیدنا عمرؓ پاپیادہ داخل ہوئے تھے مگر میں ان کے پیروں تلے آئی اس خاک کو چومنے کے بجائے بے عملی اور بے حسی کا شکار ہوں کیونکہ میں اپنی حدود میں بالکل محفوظ ہوں۔ فلسطین میں مسلمانوں کا لہو بہتا رہے نیل کا پانی اس کی سرخی سے محفوظ ہے۔ پیغمبروں کی سرزمین پر رسولِ مدنی کی سجدہ گاہ پر خون کے چھینٹے پڑتے رہیں اور میں اہرامِ مصر کی پرستش میں مگن رہوں ۔۔۔۔۔۔

مگر نہیں، میں تو استنبول کا مزاحمت کرتا، اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا، ایک کمزور سا انسان ہوں جس کو ورغلانے یورپ سرہانے کھڑا ہے۔ میں عاجز مسکین ازبکستان سے اترے آسمانی خداؤں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں؟؟ ۔۔۔۔

مگر نہیں، میں تو اس سرزمین کا باشندہ ہوں جو سلطنت عثمانیہ کے ٹوٹنے کے وقت معرضِ وجود میں آئی تھی۔ وہ جس کے ذرے ذرے میں ہزاروں شہیدوں کے لہو کا رنگ جھلکتا ہے مگر اس سرزمین کو بھی میں نے کملی والے کے نام کے بجائے موہنجو ڈرو کی رقاصہ سے موسوم کر دیا ۔۔۔!! ۔۔۔ میں مالکِ ارض و سما کا ناامید مایوس نائب ـــ!

اب پوچھ اپنا جرم یورپ کے طلسم کدے کے اسیر، یروشلم کی بے آباد مسجدوں کے نوحے سنانے والے بے عمل جانشین، بے عمل، خود غرض، خود پرست، قدیم تہذیبوں کے زعم میں گرفتار مسلم بے نوا ۔۔۔۔!! ۔۔۔۔۔

"اٹھو۔ یا اخی وقت نکلا جاتا ہے" حرم کے دروازے کے نگہبان نے اسے جھنجھوڑا۔ "چلو منیٰ کی راہ لو ۔۔۔۔ کیوں اپنا حج ضائع کرتے ہو"

کعبے کے سائے میں صرف چند سو نفوس باقی تھے جو جلدی جلدی منیٰ کی طرف لپک رہے تھے۔

"سیدی صرف چند گھنٹے باقی ہیں"

اس نے اپنی خشک زبان کو تر کیا اور بے بسی سے اس کی طرف دیکھا "میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں دوست قدم نہیں اٹھتے"

"اس گھر کے مالک سے توفیق مانگو جو یہاں تک لایا ہے وہ حج بھی نصیب کرے گا"

وہ کافی دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ اپنی زندگی کے بارے میں اپنی نیکیوں اور گناہوں کے بارے میں، اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے بارے میں اور پھر وہ حطیم کی چار دیواری پر جا کھڑا ہوا۔

"اے لوگو۔ سنو میں تم کو خبردار کرتا ہوں، کیا تم میری بات کا اعتبار کرو گے ۔۔۔"

"بے چارہ پاگل ہو گیا" ایک بزرگ نے کہا۔

"افسوس بے چارہ حج بھی نہ کر سکا کب سے حطیم میں گھٹنوں میں بیٹھا رو تا رہا ہے" دوسرے ساتھی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے، نہ جانے کیسے گناہ کیے ہیں اس نے کہ آج اپنا محاسبہ کرتے کرتے دیوانہ ہو گیا"

"واللہ میں پاگل نہیں ہوں ۔۔۔۔ میں دیوانہ نہیں ہوں ۔۔۔۔ میں تو تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔"

"چہ چہ بے چارہ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"

جگر خوار

گریس اوگوٹ (کینیا)
محمد سلیم الرحمٰن

سوڈان کے نیم صحرائی علاقے میں چھٹ برسات کا آغاز ہوا ہی تھا۔ اول وقت کی کہر ابھی ابھی چھٹی تھی اور گرم دھوپ پڑنے سے گیلی زمین سے ہلکی نیلگوں بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

"پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی
پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی"

بچے ایک دوسرے کو گیلی ریت کے ڈلے مارتے ہوئے چلا رہے تھے۔

"چل بھئی، اوپی جا"، تیکایو نے پکار کر اپنے لڑکے سے کہا۔ "میرا ہاتھ بٹا۔ دھوپ بہت تیز ہونے سے پہلے پہلے مجھے گائیں دریا تک لے جانی ہیں۔"

اوپی جانے جاتے جاتے اپنے چھوٹے بھائی پر آخری بار مٹھی بھر کر ریت پھینکا اور پھر دوڑ کر باپ کا ہاتھ بٹانے چلا گیا۔ گائیں جلد ہی گاؤں سے باہر پہنچ گئیں اور تیکایو نے ادھوڑی کی تھیلی اٹھائی جس میں اس کا کھانا تھا اور گایوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ابھی وہ گھر سے زیادہ دور نہ گیا تھا کہ تیکایو کو سر پر ایک عقاب نظر آیا جو پنجوں میں گوشت کا بڑا سا لوتھڑا دبائے اڑا جا رہا تھا۔ عقاب نیچا ہو کر اڑ رہا تھا کیوں کہ وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر سکے۔ تیکایو نے فوراً چھڑی پھینک کر ماری۔ چھڑی گوشت کو لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ وہ کلیجی کا خاصا بڑا حصہ تھا اور تازہ لہو ابھی اس میں سے رِس رہا تھا۔ تیکایو کلیجی کو پھینکنے ہی لگا تھا کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ اگر کلیجی یوں پھینکنی ہی تھی تو عقاب سے اس کا نوالہ چھیننے کی کیا تک تھی؟ کلیجی دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ترکاری لے کر آیا تھا۔ کلیجی کے اضافے سے کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اس نے کلیجی ایک پتے میں لپیٹ کر تھیلی میں ڈال لی۔

وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں بہتیری گھاس تھی۔ تیکایو نے گایوں کو چرنے چھوڑ دیا اور خود ادبیر کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا مگر تیکایو سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ کلیجی کو چکھنے کی خواہش اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے کلیجی نکالی اور ادبیر کے تلے لکڑیوں کی آگ جلا کر بھونی۔ جب کلیجی بھن گئی تو وہ اسے ندیدوں کی طرح جوار کی روٹی سے کھا گیا جو اس کی بیوی نے رات پکائی تھی۔

"واہ جی واہ! کیسا لذیذ گوشت ہے۔" تیکایو نے بے اختیار کہا۔ انگلیوں پر لگی گاڑھی چکنائی کو چاٹتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ کاش تھوڑی سی کلیجی کھانے کو اور مل جاتی۔ اس نے باقی ماندہ کھانا جو کڑوی کسیلی جڑی بوٹیوں پر مشتمل تھا، اٹھا کر

پھینک دیا۔ کلیجی اتنی خوش ذائقہ دار تھی کہ جڑی بوٹیاں کھانے سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔

دھوپ بہت تیز ہو چلی تھی مگر گائیں دریا کنارے جا کر پیاس بجھانے کی طرف مائل نظر نہ آتی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر چھاؤں میں لیٹ کر جگالی کرنے لگیں۔ تیکایو پر بھی سہ پہر کی تمازت غالب آگئی۔ وہ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر سو گیا۔

سوتے میں تیکایو نے خواب دیکھا کہ وہ لکڑیوں کی آگ جلائے کلیجی کا ویسا ہی بڑا سا ٹکڑا جیسا تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا بیٹھا بھون رہا ہے۔ بھنتے بوٹے میں سے گندر چربی ٹپ ٹپ آگ میں گرتی دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آگیا۔ اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے کلیجی کے پوری طرح بھننے کا انتظار بھی نہ کیا، اسے پہلے ہی آگ پر سے اتار لیا۔ شکاری چاقو سے کلیجی کے ٹکڑے کیے لیکن ابھی وہ پہلا لقمہ منہ میں رکھنے ہی والا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

تیکایو نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کلیجی آخر گئی کہاں؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ ”نہیں نہیں“ اس نے زور سے کہا ”خواب اتنا صاف اور روشن کب ہوتا ہے۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر اس امید پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کراماتی طور کہیں آس پاس لکڑیوں کی آگ پر کلیجی کا ٹکڑا بھنتا نظر آ جائے لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اسے بس سال خوردہ درخت کی بڑی بڑی جڑیں دکھائی دیں جو زمین سے اس طرح ابھری ہوئی تھیں جیسے ریتلی مٹی میں شکر قندیاں دبی ہوں۔

گائیں بھٹک بھٹکا کر بہت دور نکل گئی تھیں۔ تیکایو اٹھا اور اُن کے پیچھے چل پڑا۔ چلتے چلتے دریا کا کنارہ آگیا اور پیاس کی ماری گائیں دریا کی طرف دوڑیں۔ جتنی دیر گائیں پانی پیتی رہیں، تیکایو ایک سفید پتھر پر بیٹھا پاؤں ٹھنڈے کرتا رہا اور الکسائے ہوئے انداز میں لبالب بہتے دریا کو دیکھا کیا جو زور شور سے میدان کی طرف رواں دواں تھا۔

دریا کے پرے، بڑا بھاری ”بھوت بن“ واقع تھا۔ پُرنعمت گوشت کھانے کی شدید آرزو تیکایو پر دوبارہ غالب آگئی اور اس نے دبی آواز میں کہا جس جانور کی مزے دار کلیجی میں نے کھائی تھی وہ ضرور اسی جنگل میں ہوگا۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ اس جانور کا شکار کھیلنے کی ہوس اسے ستا رہی تھی، لیکن اس نے اپنے ہوکے پر قابو پا ہی لیا۔ سہ پہر خاصی ڈھل چکی تھی۔ گھر سے بہت دور تھا۔

اگلی صبح تیکایو معمول کے وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑا۔ بیوی نے منت کی کہ دوپہر کا کھانا تیار ہونے کا انتظار تو کر لو مگر اس نے ایک نہ سنی۔ شکار کھیلنے کے برچھے اٹھائے اور لپکا چلا گیا۔

تیکایو نے گایوں کے لیے گھاس چرنا ناممکن بنا دیا۔ وہ انھیں دوڑاتا ہوا لے چلا اور اگر کوئی گائے کسی جگہ ذرا ٹھٹھک جاتی تو اسے مارنے لگتا۔ وہ گلے سمیت ”بھوت بن“ کے کنارے جا پہنچا اور وہاں گایوں کو اکیلا چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے چرتی پھریں۔

اسے کوئی لیک یا ڈگر ”بھوت بن“ میں جاتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سارے کا سارا صبح سویرے کی اوس میں تربتر گھنی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کا انبار تھا اور محوِ اختلاط پرندوں کی آوازوں کے سوا جنگل پر عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا جس سے تیکایو پر ہول طاری ہو گیا لیکن اس کے جی میں جو زور آور خواہش بسی ہوئی تھی وہ اسے گھنی گیلی گھاس میں اندھا دھند ہانکتی گئی۔

کچھ دیر تک چلنے کے بعد وہ رُکا اور کان لگا کر سننے لگا۔ کوئی چیز اس کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو واقعی ایک بڑا سا امپالا بے تحاشا اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ تیکایو کے بدن میں گرم لہو تیزی سے گردش کرنے لگا اور اس نے جانور کو مارنے کے لیے برچھا تان لیا لیکن برچھا پھینکنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک بڑی تیندوی جو امپالے کا پیچھا کر رہی تھی، اس کے عین سامنے آ گئی۔ تیندوی تیکایو پر کئی مرتبہ گرجی جیسے اسے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے للکار رہی ہو لیکن تیکایو نے آنکھ چرالی، برچھا کانپتے ہاتھوں میں پکڑا کا پکڑا

۱؎ بڑے جثّے کا بھورا افریقی ہرن۔

رہ گیا۔ رہنے کو وہاں کوئی تھا ہی نہیں اور تیندوی اپنے شکار کے پیچھے چلی گئی۔

"کیسی خراب شروعات ہوئی" تیکایو نے دل کی دھڑکن معمول پر آجانے کے بعد ٹھیر ٹھیر کر دبی آواز میں کہا۔

"یہ جنگلی بلی اب میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

اپنی ناکامی ہونٔی ایک پر اُلٹے پاؤں میدان کی طرف پھر گیا۔ تیندوی کو دیکھ کر اس کا دم ہوا ہو گیا۔

اسے ایک اور ڈگر دکھائی دی جو جنگل کے اندر جا رہی تھی۔ وہ ذرا سا ہچکچایا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی پہلی چھوڑ کر نئی ڈگر پر چلا جائے۔ راستہ چوڑا ہونا شروع ہوا اور چوڑا ہوتا چلا گیا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ تیکایو کو کوئی سن گن ملتی ولڈے بیسٹ[ا] کا ایک بچھڑا اچانک سامنے آگیا جو ایک پہاڑی کے دامن میں چرنے والی بڑی ڈار کے پیچھے جا رہا تھا۔ تیکایو نے بغیر کسی وقت کے اسے مار ڈالا اس نے بچھڑے کی کھال اتاری، کلیجی نکال لی اور سر دھڑ وہیں پڑا رہنے دیا۔

وہ اپنے گلے کے پاس لوٹ آیا اور لکڑیوں کی آگ جلا کر کلیجی بھوننے بیٹھ گیا۔ جب کلیجی بھن گئی تو اس نے جلدی جلدی ماری اور جلدی جلدی چبانے لگا لیکن لقمہ اس کے حلق سے نہ اُترا۔ اس نے جتنا چبایا تھا سارے کا سارا تھوک دیا۔ کلیجی ان انتہائی چرپری ہری بوٹیوں جلتی بکسیلی تھی جو قبض میں مبتلا بچوں کو دی جاتی ہے۔ تیکایو کو ایسے لگا جیسے اس کی جیبھ کا پچھلا حصہ جل گیا ہو۔ اس نے باقی کلیجی پھینک دی اور گایوں کو لے کر گھر چلا گیا۔

تھکا ہارا اور مایوس وہ گھر پہنچا، اور جب جوان بیوی نے کھانا لا کے آگے رکھا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ پیٹ میں درد ہے۔ اور کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ اس رات تیکایو بہت پژمردہ تھا۔ اس کی طبیعت جوان بیوی کی طرف بھی راغب نہ ہوئی جو ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ صبح کو جوان بیوی دل شکستہ ہو کر اپنے جھونپڑے کو لوٹ گئی۔ وہ حیران تھی کہ اس کا مرد اس کی طرف ملتفت کیوں نہیں ہوا۔

جب تیکایو نے اپنے دروازے سے جھانکا تو باقی سب جھونپڑوں کے دروازے ابھی بند پڑے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ جلدی سے دوبارہ دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر ہو چلی تھی اور بچھڑے ڈکرا رہے تھے لیکن بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ تیکایو دودھ دوہنا شروع نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنے سخت بستر پر بیٹھا الاؤ کی ٹھنڈی راکھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھر سے شکار کھیلنے نکل جائے۔

بارش تھمی تو تیکایو نے جلدی جلدی گایوں کو دوہا۔ جھونپڑے کے پاس دوپہر کا کھانا لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھایا اور گاؤں سے نکل گیا۔ جس بیوی کا رات اس نے دل توڑا تھا وہ اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ گاؤں کے بڑے دروازے سے گزر کر او جھل ہو گیا۔

وہ بھوت بن پہنچا تو بوندا باندی دوبارہ شروع ہو گئی۔ جنگل بے حد اجاڑ اور سیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے حسب معمول گایوں کو چرتے چھوڑا اور جھاڑ بن میں قدم رکھا۔ وہ ٹپ ٹپ کرتے پتوں میں دبے پاؤں چلتا گیا۔ جنگل کے زیادہ گنجان حصے سے دور رہنے کے لیے بائیں طرف مڑا۔ قسمت یاور تھی۔ اسے ہرنوں کا ایک گلہ چرتا ہوا نظر آیا۔ ہرن اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔ تیکایو گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا یہاں تک کہ ان کے بالکل پاس جا پہنچا۔ پھر اس نے برچھا پھینک کر مارا اور ایک جانور کو فی الفور ہلاک کر دیا۔ کھال کھینچنے کے بعد اس نے کلیجی نکال لی۔ اور گوشت کے چند عمدہ پارچے گھر والوں کے لیے کاٹ کر الگ کر لیے۔

[ا] بڑے جثے کا بدار سینگوں والا افریقی ہرن۔

جب وہ پیڑ کے نیچے کلیجی بھوننے بیٹھا تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے لیکن جب اس نے کلیجی چکھی تو سر ہلا کر رہ گیا۔ گوشت خستہ تھا لیکن اس میں وہ خاصیت نہیں تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

وہ دریا کے کنارے جا پہنچا۔ پانی پینے کے بعد گایوں نے چرنے کا شغل جاری رکھا اور تیکایو، جو ابھی تک یہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اس عجوبہ کلیجی والے جانور کو ڈھونڈ کر رہے گا، گھومتا گھامتا کہیں سے کہیں نکل گیا اور اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ گلّہ بہت پیچھے رہ گیا ہے اچانک اس نے گھوم کر دیکھا تو دور دور تک گلّے کا پتہ نہ تھا۔ سورج کوہ پاجولو کے عقب میں ڈوب رہا تھا اور تیکایو اپنی گایوں کو تلاش کرنے کے لیے دوڑنے دھوپنے لگا۔

گائیں جن کے تھنوں سے دودھ ٹپکا پڑ رہا تھا، تیکایو کے بغیر ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھیں کیوں کہ ایک دن تیکایو کے بچے جنگل میں رستہ بھول گئے تھے اور گائیں اسی پرانی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی جو اُن کی جانی پہچانی تھی ان کے بغیر ہی گھر پہنچ گئی تھیں۔ اس دن پورا گاؤں بچوں کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ گاؤں والوں کو ڈر تھا کہ جنگلی جانوروں سے بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

جب تیکایو گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ انھوں نے دودھ دوہنا شروع کیا اور دودی پوکنے لگا "ارے بابا، آج تو تمہیں گھر آتے آتے دیر ہو گئی۔"

"سچ کہتے ہو" تیکایو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ کالا بیل دیکھ رہے ہو اُدھر؟ یہ دریا پار کر کے ایک اور گلّے میں جا ملا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ غائب ہے۔ پلٹ چلنے کے سمے خیال آیا۔ اب کسی دن اسے خصی کرنا پڑے گا۔ اس نے بڑا دق کیا ہے۔"

وہ چپ چاپ دودھ دوہتے رہے۔ یہاں تک کہ گھرانے کی ایک لڑکی تھوڑا سا دودھ لینے آ گئی جو ترکاری کے سالن میں ڈالنے کے لیے درکار تھا۔

کھانے کا وقت ہوا تو خاندان کے سب مرد لکڑیوں کی آگ کے گرد بیٹھ کر انتظار کرتے اور بتیانے لگے۔ مختلف جھونپڑوں سے ایک ایک کر کے باجرے کی روٹیوں کی چنگیریں اور مٹی کی رکابیوں میں گوشت اور ترکاری کے سالن آنے شروع ہو گئے۔ پچھلی تھی، سکھایا ہوا گوشت تھا، تلی ہوئی دیگ اور چڑی بوٹیاں تھیں۔ تھوڑا سا سالن، آباؤ اجداد کی خاطر زمین پر ڈال دیا گیا اور اس کے بعد وہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ جو سالن ان کے سامنے تھے ان کی لذت کا موازنہ کرنے اور فرق بتانے لگے لیکن تیکایو چپ رہا۔ اس رات جو چیز بھی اس نے کھائی وہ اسے پت کی طرح کڑوی معلوم ہوئی۔

کھانا ختم ہوا تو بڑے، چھوٹوں کو جنگوں اور قبیلوں کی کہانیاں سنانے لگے۔ بچے غور سے سنتے رہے لیکن تیکایو اپنے آپ میں گم تھا۔ وہ ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا۔ وہ دھواں دھار بادلوں کو دیکھتا رہا جو آسمان پر کٹتے جا رہے تھے۔

ان بادلوں کے پچھواڑے، ان بادلوں کے پچھواڑے میرے پردادا اوکین یو بسرام کر رہے ہیں۔ "دیا کرو، دیا کرو!" تیکایو نے گڑگڑا کر کہا "اے باپ، دیا کرو، مجھے اس ہوکے سے چھٹکارا دلا دو۔ مجھے میری مردمی لوٹا دو تاکہ میں اپنی بیویوں کی طرف راغب ہو سکوں۔ کیوں کہ وہ مرد ہی کیا جو اس رغبت سے محروم ہو۔"

ایک بڑے بادل نے چاند کو ڈھک لیا جس سے دنیا میں وقتی طور پر اندھیرا چھا گیا۔ آنسوؤں کی وجہ سے تیکایو کی آنکھوں میں جلن ہوئی اور اس نے اہل خاندان سے کہا کہ جا کر سو جائیں۔ جب اس نے اپنے جھونپڑے میں قدم رکھا تو ایک عورت چھوٹے چھوٹے کندے الاؤ میں ڈال رہی تھی۔

اس نے رفتگاں کی ارواح سے بار بار چوری چھپے دعا مانگی لیکن پُراسرار کلیجی کھانے کی تمنا کبھی اس کے جی سے فرو نہ ہو سکی۔

روزانہ صبح سویرے وہ اپنی برچھیوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکل جاتا۔ اور جنگل کے پاس پہنچ کر انہیں اکیلا چھوڑ دیتا اور جا کے شکار کھیلنے لگتا۔ جو پرصعوبت اور یاس انگیز زندگی تیکایو گزار رہا تھا وہ جلد ہی اس کے اہل خانہ پر واضح ہو گئی۔ وہ یکایک بوڑھا ہو گیا۔ اسے زندگی سے دلچسپی نہ رہی۔ رات کے وقت جب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھتا تو اس پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ اسے اپنی بیویوں کی طلب نہ رہی۔ تیکایو کے بیٹے لایچ کے پاس گئے اور کہنے لگے "اماں، ابا سے بات تو کرو وہ بیمار ہیں۔ نہ ہم سے بولتے چالتے ہیں نہ کچھ کھاتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجہ کیسے حاصل کی جائے۔"

اگرچہ لایچ عمر کے اس حصے میں تھی جب عورت بچہ جننے کے قابل نہیں رہتی اور اس نے رات کو تیکایو کے جھونپڑے میں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ اس کی پہلی بیوی تھی اور تیکایو کو اس سے محبت تھی۔ لہٰذا وہ اس کے پاس گئی اور پوچھنے لگی "اے میاں، تجھے کیا تکلیف ہے؟" تیکایو نے لایچ کی طرف دیکھا مگر اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ اس نے لایچ کی صراحی دار گردن پر نظر ڈالی اور اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھنے لگا "تو پیتل کے ان وزنی کڑوں سے چھٹکارا پانا پسند کرے گی، جو تیری گردن میں پڑے ہیں؟"

"کیوں؟" لایچ نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔

"کیونکہ یہ اتنے تنگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ تنگ تو نہیں ہیں۔" لایچ آہستہ سے بولی۔ "ان کے بغیر مجھے یوں لگے گا جیسے ننگی ہو گئی ہوں۔"

اور تیکایو اپنی بیوی سے نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لایچ کو سب کچھ بتا دے اور اس پاگل بنا دینے والی خواہش کا بھید کھول دے جو اس کے تن بدن کے پرزے اڑا رہی تھی لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ لایچ کو ہرگز خبر نہ ہونی چاہیے۔ وہ بات کو سمجھ نہ پائے گی۔ پھر اس نے لایچ سے جھوٹ بولا۔

"مجھے پرانا عارضہ ہے بدہضمی کا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے تکلیف میں مبتلا ہوں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

لایچ کے ہونٹوں پر ترحم آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگی اور تیکایو سمجھ گیا کہ وہ قائل نہیں ہوئی۔ اتنے میں چند ملاقاتی آ گئے اور لایچ شوہر کے پاس سے اٹھ گئی۔

تیکایو مہینوں تک کھیلتا رہا لیکن اس جانور کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی مزیدار کلیجی اس نے کھائی تھی۔

ایک رات جب اس کی آنکھ نہ لگی تھی، لیٹے لیٹے اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ اور کہاں جا کر شکار کھیلے اور وہ جانور کونسا ہے جو اسے تلاش کرنا ہوگا؟ وہ "بھوت بن" میں تمام جانوروں کو مار چکا تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر شیر ببر، تیندوے اور لکڑ بھگے کا شکار کیا تھا اور ان کی کلیجی کھائی تھی اور یہ تینوں جانور اس کے قبیلے پر حرام تھے۔

تیکایو کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ نیند کی جھپکی آئی تو اس نے شکر کیا۔ لیکن تب اس کی بیٹی سرہانے آ کھڑی ہوئی اور پکارنے لگی۔ "دادا جان، دادا جان میں آئی ہوں۔" تیکایو اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن چھوٹی بچی وہاں نہیں تھی۔ وہ دوبارہ سو گیا۔ اور آبیٹی آ موجود ہوئی اور پکار کر بولی۔

"آپ کو میری آواز سنائی نہیں دے رہی دادا جان؟"

تیکایو دوبارہ جاگ گیا لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بغیر لیٹا رہا۔ بچی کی انگلیاں پھر سے بوڑھے کے جسم کو گدگدانے لگیں۔ تیکایو تیسری بار اٹھا اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن وہ اکیلا تھا۔ مرغ نے تیسری بار اذان دی اور صبح ہو گئی۔

اور لایچ اپنے شوہر کے راز سے آشنا ہوئے بغیر ہی فوت ہو گئی اور پہلی بیوی ہونے کے ناتے اسے گاؤں کے بالکل بیچ

میں دفن کیا گیا۔ تیکایو ایک مدت تک صبح شام اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھا رہا اور اپنے غم کے مارے نامعلوم جانور کی کلیجی کی جو بھوک اسے لگی رہتی تھی وہ جاتی رہی۔ وہ روتا رہا مگر اس طرح جیسے اسے چین آ گیا ہو، جیسے کلیجی کھانے کی طلب بیوی کے ساتھ ہی دفن ہو چکی ہو۔

سوگ کے انھیں دنوں میں تیکایو نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ شکار کھیلنے نہ جائے گا۔ وہ گھر بیٹھے اپنے ڈھیر سارے پوتے پوتیوں پر نظر رکھتا اور خاندان کے نوجوان افراد روزانہ جا کر کھیتوں میں کام کاج کرتے۔

اور پھر ایک دن تیکایو صبح صبح کھلیان کے پاس بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اندھیرے کھلیان میں جمع اناج میں جو انکھوے پھوٹ رہے تھے ان کی باس سے اس کی طبیعت ذرا مالش کرنے لگی۔ اپنے پوتے پوتیوں کو شور و غل مچاتے اور گیت گاتے سنا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انھیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیران ہو کر سوچا ..... کیا دنیا کا کوئی جاندار ایسا بھی ہے جس کی کلیجی اس نے نہ چکھی ہو؛ وہی پرانی خواہش اس طرح عود کر آئی کہ اس کا بدن اندر سے دکھنے لگا۔

ان بچوں میں جو وہاں کھیل رہے تھے، آپٹی نام کی ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی بھی تھی۔ وہ تیکایو کے سب سے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ کہیں اور جا کر کھیلیں اور جب وہ وہاں سے جانے لگے تو اس نے آپٹی کو آواز دی اور کہا "چلو، میری ننھی بٹیا، دوڑ کے اپنی امی کے جھونپڑے میں جاؤ اور میرے لیے تونبے میں پانی لے آؤ"

آپٹی پانی لینے اپنی ماں کے جھونپڑے میں چلی گئی جب وہ گھر کے ایک اندھیرے کونے میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی تو اُسے یہ علم نہ تھا کہ تیکایو دبے پاؤں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھس آیا ہے۔ اس نے اپنی گردن پر دو کھردرے ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ بچی کا جسم ڈھیلا پڑ کے تیکایو کے ہاتھوں سے پھسل گیا اور دھم سے فرش پر جا گرا۔ اپنے قدموں میں پڑی لاش کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے اس کا جی متلا رہا ہو۔ جیسے وہ غش کھانے والا ہو۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس نے لاش اٹھائی اور جب وہ اُسے اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا تو فضا تاریک معلوم ہو رہی تھی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے نحوست بھرے انداز میں اس پر چلچلا رہے تھے لیکن تیکایو کو تو اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ اس نے قریب میں واقع ایک دیمک ٹیلے میں اتھلا سا گڑھا کھود کر آپٹی کو توپ دیا۔

جب تیکایو تھیلی میں کلیجی لے کر واپس آیا تو باقی بچے ابھی میدان ہی میں کھیل رہے تھے۔ اس نے جھونپڑے میں بیٹھ کر کلیجی کو جھٹ پٹ بھونا اور ندیدوں کی طرح کھا لی۔ اور افسوس! یہی وہ شے تھی جس کی اسے اتنے برسوں سے تلاش تھی۔ وہ الکسائے انداز میں کھلیان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ڈکارنے اور دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ بھوکے بچے کھلے میدان سے کھیل کود کر پلٹے تو چھاؤں میں بیٹھ کر شکرقندیاں کھانے اور چھاچھ پینے میں مصروف ہو گئے۔

بڑی عمر کے لوگ شام پڑے واپس آئے تو بچے اپنے اپنے والدین سے ملنے دوڑے، لیکن آپٹی ان کے درمیان موجود نہ تھی۔ بہت بوکھلا کر انھوں نے دادا سے بچی کے بارے میں دریافت کیا لیکن تیکایو نے جواب دیا بچوں سے پوچھو انھیں پتا ہونا چاہیے کہ آپٹی کہاں گئی۔ یہ سب مل جل کر میدانوں میں کھیلتے پھر رہے تھے۔

اس وقت تک اندھیرا گھپ ہو چکا تھا۔ آپٹی کے چھوٹے بہن بھائی الاؤ کے سامنے بیٹھ کر اپنی ماں کے ساتھ رونے دھونے لگے۔ تب انھیں یاد آیا کہ دادا نے آپٹی کو پانی لا کر دینے کے لیے بلایا تھا بے اوسان والدین نے یہ اطلاع بڑے میاں کے سامنے دہرائی اور پوچھا کیا آپٹی نے صبح اسے پانی لا کر دیا تھا۔

"دیا تھا" تیکایو بولا "اور پھر ادھر چلی گئی تھی جدھر باقی بچے گئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا جب

بچے واپس آئے تو میں سو رہا تھا۔"

غم سے نڈھال گھر والے سر پکڑ کر الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ نہ انھوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ باہر چھوٹے چھوٹے جھینگریں بول رہے تھے جیسے کوئی غمگین کہانی سنا رہے ہوں۔ تیکایو کو لگا کہ وہ معمول سے زیادہ بلند آواز میں جھنکار رہے ہیں۔

آیٹی کے ماں باپ بہت دن تک بچی کو ڈھونڈتے رہے۔ انھوں نے چپا چپا چھان مارا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ غائب ہو گئی تھی۔ مہینے گزر گئے اور لوگوں نے آیٹی کی گمشدگی کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف ماں کو آیٹی یاد آتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک پُر امید تھی کہ ایک نہ ایک دن اپنی بچی اسے زندہ سلامت مل جائے گی۔

تیکایو کو یاد بھی نہ رہا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی تھی اور اس نے اس نے اپنی وحشیانہ اشتہا کی تسکین کے لیے ایک اور بچے کی جان لی تو اسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ جب پریشان والدین نے بچے کے بارے میں تیکایو سے پوچھا تو وہ رو کر کہنے لگا "مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ بچے تو ادھر باہر میدانوں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ میں گھر بیٹھا رہتا ہوں۔"

اس سانحے کے بعد تیکایو کے بیٹوں نے آپس میں بات کی۔ "ہمارے بچے کون چرا کرے جا رہا ہے؟ یہ کونسے جانور کا کام ہے؟ کیا یہ لکڑبگھے کی حرکت ہے؟ یا تیندوے کی؟ لیکن یہ جانور تو صرف رات کو شکار کرنے نکلتے ہیں۔ کہیں یہ کسی عقاب کی کارستانی تو نہیں کیونکہ وہ دن کے وقت شکار پکڑتا ہے؟ لیکن نہیں! عقاب ہوتا تو ابا کو نظر آجاتا۔ وہ بچوں کی چیخوں کی آواز سن لیتے؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد آگندہ نے اپنے بھائیوں سے کہا: "شاید یہ کوئی موذی جانور ہے جسے بد روحوں نے ہم پر مسلط کیا ہے۔"

"پھر تو میرے ابا تنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ بچوں کی نگہبانی نہیں کر سکتے۔" اوسوگو بول اٹھا "ہاں، ابا بہت ضعیف ہو گئے ہیں، ان کی جان بھی خطرے میں ہے۔" باقیوں نے اتفاق کیا۔

اور اس وقت کے بعد سے بیٹے پوشیدہ طور پر اپنے باپ اور بچوں پر نظر رکھنے لگے۔ وہ کئی مہینے تک نگرانی کرتے رہے لیکن بڑے میاں اور بچوں پر کوئی آفت نہ آئی۔

بیٹے اس چوکی پہرے کو تقریباً ترک ہی کرنے والے تھے۔ لیکن ایک روز پہرہ دینے کی باری آیٹی کے باپ کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ جا کر دور کہیں کھلے میدان میں کھیلیں مگر ایک بچے کو روک لیا۔ تیکایو نے بچے سے کہا کہ جا کر اس کے جھونپڑے سے پائپ اٹھا لائے۔ جب بچہ دوڑا دوڑا جھونپڑے کی طرف گیا تو تیکایو اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے خوفزدہ بچے کو جا دبوچا اور اس طرف گھسیٹنے لگا جہاں الاؤ روشن کیا جاتا تھا جب تیکایو بچے سے زور آزمائی کر رہا تھا تو اس کی بوڑھی کمر پر بڑے زور کا گھونسا پڑا۔ بچے کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح پکڑے پکڑے تیکایو نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا آگندا، سامنے کھڑا تھا۔ تیکایو کے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں سے بچے نے خود کو چھڑا لیا اور آگندا کے گھٹنے پکڑ لیے۔ "ابا!" آگندا نے چیخ کر کہا۔

یہ دیکھ کر کہ بچے کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی آگندا نے اسے پرے دھکیل دیا اور کہنے لگا "اپنی ماں کے جھونپڑے میں جا کر لیٹ جاؤ۔"

پھر اس نے بوڑھے کو پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا اس چھوٹے سے جھونپڑے کی طرف لے چلا جو بھیڑ بکریوں کے لیے مخصوص تھا اور جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ جب اسے گھسیٹ کر لے جایا گیا تو بوڑھا زور زور سے یہی رٹ لگائے رہا "تیمو انگھو، تیمو انگھو؟ — میرا کیا قصور ہے؟ میرا کیا قصور ہے؟"

آگندا نے بوڑھے کو چھوٹے جھونپڑے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ اس طرح زنجیر کر دیا جیسے اندر کوئی جانور بند کیا گیا ہو وہ بچے کے پاس چلا گیا جو اب تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

خاندان کے باقی لوگ کھیتوں، میدانوں سے لوٹ کر آئے اور جب آگندا نے یہ خبر انھیں سنائی تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اہل خاندان نے ماتمی لباس پہن لیا اور کھانا نہ کھایا۔

"تھو! تھو!" انھوں نے سورج کی طرف منہ کر کے تھوکا جو ان کے لیے غروب لیکن ان کے اجداد کے لیے طلوع ہونے والا تھا۔

"اے ہمارے پرکھو! ہمیں پاک کر دو" ان سب نے پکار کر کہا۔

اور پھر انھوں نے بہت بڑا الاؤ جلایا۔ گاؤں میں اتنا بڑا الاؤ پہلے کبھی روشن نہ کیا گیا تھا۔ تیکایو کا سب سے بڑا بیٹا باپ کے جھونپڑے سے وہ پرانا، چربی سے چکنا ڈھول اٹھا لایا جو الاؤ کے اوپر ٹنگا رہتا تھا اور اسے بجانے لگا۔ دھم دھم بجتے ڈھول کی غم آلود دھنوں نے قبیلے کو خبر دار کر دیا کہ تیکایو کے ہاں کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے۔ ڈھول بجتا سن کے لوگ اپنے سب کام کاج چھوڑ کر تیکایو کے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈھول کی آواز ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں رشتے داروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے جن کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

"کیا خبر ہے؟ کیا خبر ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے ان کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔

"اور تیکایو کہاں ہے؟" ایک اور بوڑھے آدمی نے دریافت کیا

"اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کسی اور نے پوچھا۔

وہاں ابتری اور سراسیمگی کا عالم تھا۔

"موت کی موت، موت کی دوا ہمیں کون لا کے دے گا؟ موت تمہارے دروازے پر دستک دیتی ہے اور تمہاری طرف سے اندر آنے کی اجازت ملنے سے پہلے ہی گھر میں آ دھمکتی ہے۔"

"سنو۔" کسی نے اس بڑھیا کو چھو کر کہا جو موت کے بارے آہ و زاری کر رہی تھی۔ آگندا نے لوگوں سے خطاب کیا۔

"اے میرے قبیلے کے لوگو! ہم نے تمہیں یہاں خواہ مخواہ نہیں بلایا۔ جو میں کہتا ہوں سنو اور ہمارے غم میں شریک ہو کر ہمارے ساتھ مل کر رو۔ کئی مہینے ایسا ہوتا رہا کہ ہم تو باہر جا کر کھیتوں میدانوں میں اپنا کام کاج کرتے اور ادھر ہماری عدم موجودگی میں ہمارے بچے غائب ہو جاتے۔ سب سے پہلے میری اپنی بچی آپٹی گم ہوئی۔" بچوں کے نام سن کر عورتوں کے درمیان سے سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

"اے میرے لوگو" آگندا نے بات جاری رکھی "اس قبیلے کے بچے بیمار ہو کر مرتے ہیں لیکن ہمارے بچے ایسے غائب ہوئے کہ ان کو دفنانے کی نوبت تک نہ آئی۔ ہم نے سوچا کہ بچوں پر پہرہ دیا جائے تاکہ جو کوئی بھی ہمارے بچے اٹھا کر لے جاتا ہے اسے پکڑا جا سکے۔ کئی مہینے ہم چوری چھپے پہرہ دیتے رہے۔ ہم اس نگرانی کو تقریباً ختم ہی کرنے والے تھے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ غالباً ہم پر ہمارے اجداد کی طرف سے عذاب نازل ہوا ہے۔ لیکن آج میں نے اسے پکڑ لیا۔"

"کون ہے وہ؟ کون ہے وہ؟" لوگوں نے غصے میں آ کر معلوم کرنا چاہا۔

"اور اس کا کس قبیلے سے تعلق ہے؟" دوسروں نے پوچھا۔

"ہمیں لازمی طور پر اس قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیے۔ یہ ہم پر فرض ہو گیا۔ فرض ہو گیا!"

آگندا ذرا کے ذرا رکا اور پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں آواز میں انھیں بتایا "وہ آدمی اس چھوٹے جھونپڑے میں ہے۔ اور وہ اور کوئی نہیں ہے میرا ہی باپ ہے۔"

"ہائے ہائے" عورتیں چیخ اٹھیں۔ دھکم پیل ہوئی اور عورتیں اور بچے اس طرح چیخے جیسے تیکایو ان کے آس پاس موجود

ہو اور انھیں اس سے ڈر لگ رہا ہو۔ لیکن مرد خاموش رہے۔

جب افراتفری ختم ہوئی تو ایک بوڑھے نے پوچھا کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میاں؟"

بیٹے نے سر ہلایا۔ اب مرد عورت چلا چلا کر کہنے لگے "کہاں ہے وہ آدمی؟ مار ڈالو! اسے مار ڈالو۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے، وہ جانور ہے۔"

باہر کہی جانے والی کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو تیکایو کو سنائی نہ دی ہو اور جھونپڑے میں دو بچے جن کا اس نے خون کیا تھا اس کے اوسان پر سوار تھے۔ وہ جھونپڑے کی کھردری دیوار پر سر ٹکا کر لیٹ گیا اور رو پڑا۔

جھونپڑے کے باہر گاؤں والوں نے جنھیں غصہ چڑھا ہوا تھا، اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ وہ چیخ رہے تھے "اسی وقت سنگسار کر دو اسے۔ اسی وقت سنگسار کر دو اسے۔ اس نے خود اپنی ہلاکت کا سامان کیا ہے۔"

لیکن بڑے بوڑھوں میں سے ایک آدمی اٹھا اور اس نے لوگوں کا جوش ٹھنڈا کیا۔ "ہم اسے اس وقت سنگسار نہیں کر سکتے قبیلے کا دستور ہے کہ جو آدمی موذی بدذات ہو اسے دن دہاڑے گاؤں کے باہر سنگسار کیا جائے۔ ہم اس دستور سے روگردانی نہیں کر سکتے۔"

"مجھے اسی وقت سنگسار کر دو، مجھے اسی وقت سنگسار کر دو۔" تیکایو نے سرگوشی کی۔ "مجھے جلدی سے اس عذاب اور شرمساری سے نجات دلاؤ۔ مجھے مر جانے دو تاکہ میرا قصہ ختم ہو۔"

مردوں کی غصیلی ہو ہا اور خوفزدہ عورتوں اور بچوں کی چیخ چیخیں سن کر تیکایو سمجھ گیا کہ معاشرہ اسے دھتکار چکا ہے، یہی نہیں، اس کے زندہ رہنے کا حق بھی چھن چکا ہے۔ اس نے اپنا شکاری چاقو تلاش کرنے کے لیے کمر سے بندھی ادھوڑی کی تھیلی کو ٹٹولا لیکن چاقو تھیلی میں نہ تھا۔ چاقو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ باہر لوگ برابر شور کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ رونے دھونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ تیکایو اب یہ سب کچھ بہت فاصلے سے سن رہا تھا جیسے کوئی زور آور موج اسے اپنے لوگوں سے دور بہت دور لیے جا رہی ہو۔

صبح سویرے گاؤں والے الاؤ کے پاس سے اٹھے تاکہ آس پاس کے میدانوں میں جا کر پتھر اکٹھے کریں۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قبیلے کے ہر آدمی پر فرض تھا کہ وہ قاتل کو پتھر مارے۔ پتھر نہ مارنا خرابی کا باعث تھا کیونکہ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص قاتل کی خبیث روح کو پتھر مار کر دور دفان کرنے میں ہاتھ نہیں بٹائے گا تو روح اسی کو چمٹ جائے گی۔

جب سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو گاؤں والے اتنے پتھر اکٹھے کر چکے تھے کہ ان کے نیچے کئی جسم دب سکتے تھے۔ وہ گاؤں واپس آئے تاکہ تیکایو کو جھونپڑے سے نکالیں اور گاؤں کے باہر خود اس کے باغ کی طرف لے چلیں۔ وہ جھونپڑے کے چاروں طرف جمع ہو کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ تیکایو باہر آئے تو اس پر آوازے کسیں اور تھوکیں۔

آگندا اور تین دوسرے بوڑھوں نے نرسلوں کا بنا ہوا دروازہ دھماکے سے کھول دیا اور تیکایو کو باہر نکلنے کو کہا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ لپک کر جھونپڑے میں جا گھسے تاکہ اسے گھسیٹ کر لوگوں کے سامنے لے آئیں۔ جو لقاضا کر رہے تھے "باہر نکل! باہر نکل!"

شروع میں تو اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا لیکن جلد ہی ان کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ تب انھوں نے دیکھا کہ تیکایو کی لاش ایک چھوٹی سی رسی سے لٹکی ہوئی ہے جو اس نے چھپر میں سے کھول لی تھی۔

وہ چاروں سر ہلاتے ہوئے باہر آ گئے۔ مجمع نے باری باری جھونپڑے میں جھانکا، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے تیکایو کا لٹکتا ہوا جسم دیکھ لیا، اس آدمی کو دیکھ لیا جسے سنگسار کرنے کی وہ تیاری کر رہے تھے۔ کوئی بولا تک نہیں۔ انھیں پتا تھا کہ ایسے شخص کو گاؤں کے باہر دفنانا پڑے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ آئندہ کبھی کسی نوزائیدہ بچے کا نام تیکایو نہیں رکھا جائے گا۔

دھوبن

آئزک بی سنگر (امریکہ)
آصف فرخی

ہمارے گھرانے کا غیر یہودیوں سے کم ہی واسطہ پڑتا تھا۔ ایک تو ہمارا چوکیدار تھا، پھر وہ غیر یہودی دھوبنیں تھیں جو دُھلائی کے لیے میلے کپڑے لینے ہمارے یہاں آیا کرتی تھیں۔ میری کہانی ان میں سے ایک دھوبن کے بارے میں ہے۔

وہ چھوٹی سی عورت تھی، بوڑھی اور تمام جھرّیوں پڑی ہوئی۔ جب اس نے ہمارے کپڑے دھونے شروع کئے تو ستر برس سے زیادہ کی ہوگی۔ اس کی ہم عمر یہودی عورتیں عموماً کمزور اور شکستہ تن تھیں۔ ہماری گلی کی ساری بوڑھی عورتوں کی کمر جھک گئی تھی اور وہ چلتی تھیں تو لاٹھی ٹیک کر۔ مگر یہ دھوبن چھوٹی اور دُبلی تو تھی مگر اس میں کسان آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی طاقت تھی۔ وہ آتی تو اماں کئی ہفتوں سے جمع ہونے والے کپڑوں کا ڈھیر اس کے حوالے کر دیتیں۔ وہ اس بے ہنگم ڈھیر کو اٹھاتی، اپنے دُبلے پتلے کندھوں پہ لاد لیتی اور اپنے گھر کے لمبے راستے پر لے چلتی۔ رہتی تو وہ بھی ہماری طرح کروچ مالنا اسٹریٹ پر تھی۔ مگر وولا کے قریب دوسرے کنارے پر۔ بھو پیدل کا کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہوگا۔

دو ہفتے بعد وہ کپڑے دھو کر واپس لاتی۔ میری اماں آج تک کسی دھوبن سے اس قدر خوش نہ ہوئی تھیں۔ دُھلائی کا ایک ایک کپڑا چاندی کی طرح چمکتا، ہر کپڑے پر عمدہ استری کی ہوئی ہوتی۔ پھر بھی وہ دوسروں سے زیادہ اجرت نہ لیتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ ایک دریافت تھی۔ اماں اس کے پیسے ہمیشہ ہاتھ تلے رکھتی تھیں تاکہ اس بے چاری بڑھیا کو دوسری بار نہ آنا پڑے۔ اتنا فاصلہ اس کے لئے بہت تھا۔

اُن دنوں کپڑوں کی دُھلائی آسان نہیں تھی۔ وہ دھوبن جہاں رہتی وہاں نلکا نہیں تھا بلکہ اسے ہینڈ پمپ سے پانی لانا پڑتا تھا۔ کپڑوں کو بالکل صاف کرنے کی غرض سے پہلے انہیں ٹب میں خوب رگڑا جاتا، سوڈے سے کھنگالا جاتا، بھگویا جاتا، بڑے سے پتیلے میں کھولایا جاتا، پھر کلف دیا جاتا اور استری پھیری جاتی۔ ایک ایک کپڑا اس کے ہاتھوں سے دس دفعہ سے زیادہ گزرتا اور ان کا سکھانا! یہ کام باہر تو ہو نہیں سکتا تھا ورنہ چور کپڑے چُرا لے جاتے۔ کپڑے نچوڑ کے اوپر مچان پر لے جائے جاتے اور وہاں الگنیوں پر ٹانگے جاتے۔ جاڑے میں تو یہ شیشے کی طرح کڑے ہو جاتے اور چھونے پر تڑخنے لگتے۔ اور پھر دوسری گرہستنوں اور دھوبنوں سے گرما گرمی رہتی۔ کیونکہ الگنیوں پر وہ اپنے دھوئے ہوئے کپڑے ٹانگنا چاہتی تھیں۔ خدا جانے ہر دھلائی پر وہ یہ سب کیسے برداشت کرتی ہوگی! وہ اتنی بڈھی تھی کہ بآسانی گرجا کے دروازے پر جا کر بھیک مانگ سکتی تھی یا بے سہارا ضعیفوں کے ہوم میں داخل ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں خودداری اور کام کی لگن ایسی تھی جو خاص طور پر غیر یہودیوں کو تفویض کی گئی ہے۔ وہ خود بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اور اس طرح اپنا بوجھ اٹھاتی تھی۔

میری اماں کو تھوڑی بہت پولستانی زبان آتی تھی اور وہ بڑھیا ان سے خوب باتیں کیا کرتی۔ مجھ پر تو وہ خاص مہربان تھی اور

کہا کرتی کہ میری شکل یسوع مسیحؑ کی جیسی ہے۔ جب بھی وہ آتی یہ بات ضرور کہتی اور یہ سُن کر اماں کی تیوری چڑھ جاتی اور وہ چپکے چپکے بڑبڑاتیں: "دشمنوں کے کان بہرے، غارت ہوں اس بڑھیا کے الفاظ....."

اس بڑھیا کا ایک بیٹا تھا جو بہت مالدار تھا۔ اب یہ تو مجھے یاد نہیں کہ وہ کاروبار کیا کرتا تھا۔ مگر وہ اپنی ماں کے دھوبن ہونے پر خائف تھا اور اس سے ملنے نہیں آتا تھا اور نہ کبھی ماں کو ایک پیسہ بھی دیا۔ یہ ساری باتیں وہ دل میں کوئی رنجش یا بغض رکھے بغیر بتاتی تھی۔
ایک دن اس کے بیٹے نے شادی کر لی۔ غالباً اس نے کسی اچھی جگہ ہاتھ مارا تھا۔ شادی کی تقریب گرجے میں ہوئی۔ بیٹے نے بڑھیا ماں کو شادی میں نہیں بلایا۔ مگر پھر بھی وہ گرجے پہنچ گئی اور سیڑھیوں پر کھڑی ہو گئی تاکہ اپنے بیٹے کو دلہن کا ہاتھ تھامے آلٹر تک لے جاتے دیکھ سکے۔ میں متعصب تو نہیں ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی یہودی بیٹا بھی ایسا کر سکتا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی ایسا کرتا تو اس کی ماں چیخ چلا کے اور رو دھو کے آسمان سر پر اٹھا لیتی اور گرجا کے محرّر کو بلا بھیجتی۔ قصہ مختصر یہودی یہودی ہیں اور غیر یہودی غیر یہودی۔
اس بے مروت بیٹے کے واقعے نے میری اماں پہ گہرا اثر چھوڑا۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں اس کی باتیں کرتی رہیں۔ یہ نہ صرف اس بڑھیا کی توہین تھی بلکہ ماممتا کے جذبے کی ہتک تھی۔ اماں بحث کرتیں کہ بچوں کی خاطر قربانیاں دینے سے کیا حاصل ہے؟ ماں آخری دم تک اپنی جان بچوں پہ لگا دیتی ہے اور بچوں کو وفاشعاری کے معنی بھی نہیں معلوم۔
اور اس گفتگو میں وہ کئی بار اشارتاً کہتیں کہ انہیں اپنے بچوں سے کوئی توقع نہیں ہے۔ کون جانے وہ کس دن کیا کر ڈالیں۔
لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی ہم پر نچھاور کئے ڈالتی تھیں۔ گھر میں کبھی کوئی مزے دار چیز ہوتی تو بچوں کے لیے الگ رکھ دیتیں اور خود نہ چکھنے کے لیے ہزار باتیں، ہزار بہانے سوچ لیتیں۔ انہیں پرانے وقتوں کے ٹوٹکے یاد تھے اور وہ ایسے محاورے بولتی تھیں جو انہوں نے جان چھڑکنے والی ماؤں اور نانیوں دادیوں کی نسلوں سے ورثے میں پائے تھے۔ اگر کسی بچے کے درد اٹھتا تو وہ کہتیں "ارے میں تم پر واری جاؤں، صدقے جاؤں، تم میری ہڈیوں سے لمبی عمر پاؤ!" یا وہ کہتیں، "تمہاری ہڈیوں میں صحت اور گودا لگے۔" نئے چاند سے پہلے وہ ہمیں خاص طرح کی مٹھائی کھلاتیں جو پیٹ کے کیڑوں کے لیے اکسیر تھی۔ اگر کسی کی آنکھ میں کچھ پڑ جاتا تو اماں اپنی زبان سے چاٹ کر نکال لیتیں۔ وہ ہمیں کھانسی کے شربت بنا کر پلاتیں، اور نظر سے بچانے کے لیے دعا پڑھوانے لے جاتیں۔ اس سب کے باوجود وہ "فریضۂ قلبی" اور "کتابِ میثاق" اور دوسری سنجیدہ فلسفیانہ کتابیں بہت شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔
خیر اب اس دھوبن کی طرف واپس چلیں۔ کڑاکے کا جاڑا تھا۔ سڑکیں ٹھنڈک کی لپیٹ میں تھیں۔ ہم اپنے آتش دان کو جتنا بھی گرم کرتے کھڑکیوں پر کہرہ جما رہتا اور برف کی قلمیں سجی رہتیں۔ اخباروں میں اطلاعات آ رہی تھیں کہ لوگ سردی سے مرنے لگے ہیں۔ کوئلہ عنقا ہو گیا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو "ہیڈر" بھیجنا بند کر دیا اور لوستانی اسکول بھی بند ہو گئے۔
ایسا ہی ایک دن تھا کہ ہماری دھوبن جو اب اسی برس کی ہو چکی تھی، ہمارے یہاں آئی۔ اتنے دنوں میں بہت سارے میلے کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ اماں نے اسے چائے بنا کر دی اور روٹی ساتھ میں کھانے کو دی۔ بڑھیا باورچی خانے میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی، کپکپاتی جائے اور لرزتی جائے اور چائے کی کیتلی سے ہاتھ تاپتی جائے۔ کام کی زیادتی سے اس کی انگلیاں بد وضع ہو گئی تھیں یا شاید گٹھیا کا اثر بھی تھا۔ اس کے ناخنوں پر عجیب سفیدی سی تھی۔ یہ ہاتھ انسان کی ہٹ دھرمی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ اور کام کی لگن کی بات سناتے تھے۔ اپنی قوت کی انتہا تک کام بلکہ اس سے بھی آگے، اپنی طاقت کی حد سے بھی آگے۔ اماں نے کپڑے گنے اور اس کا حساب لکھا، مردانہ بنیان، زنانہ قمیض، تنگ مہری کے لمبے پاجامے، بلومرز، پیٹی کوٹ، پلنگ پوش، تکیے کے غلاف، چادریں اور مردوں کے بعض مذہبی لباس بھی اس غیر یہودی عورت سے دُھلوائے جاتے۔

کپڑوں کی لادی خوب بڑی تھی، عام دنوں سے زیادہ بڑی۔ جب اس نے اِسے کندھوں پر لادا تو کندھے ڈھیر میں چھپ گئے۔ پہلے تو وہ ڈگمگانے لگی جیسے بوجھ تلے گر پڑے گی۔ مگر اس کے اندر ہٹیلا پن آواز دینے لگا: دیکھو تم گرنا نہیں۔ گدھا تو اپنے بوجھ تلے گر سکتا ہے مگر اشرف المخلوقات انسان کو اس کی اجازت نہیں ہے۔

اتنے بھاری بوجھ تلے اس بے چاری کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھنا بہت برا لگ رہا تھا کہ وہ ہانپتی کانپتی اسے اٹھائے ہوئے باہر کہرے میں لپٹے جا رہی ہے جہاں برف ایسی خشک تھی جیسے نمک اور ہوائیں خاک بھرے سفید بگولے اڑ رہے تھے جیسے ٹھنڈک میں بھتنے ناچ رہے ہوں۔ وہ اس بوجھ کے ساتھ دولا پہنچ بھی سکے گی؟

وہ غائب ہو گئی۔ اماں اس کے واسطے آہیں بھرتیں اور دعائیں مانگتیں۔

عموماً وہ دو ہفتے یا بہت سے بہت ہوا تو تیسرے ہفتے تک دُھلائی لے آتی تھی۔ مگر تین ہفتے گزر گئے۔ چار ہوئے، پھر پانچ، مگر اس کی صورت نہ دکھائی دی۔ ہم دھلے کپڑوں کے بغیر گزارہ کرتے رہے۔ جاڑے میں اور شدت آ گئی تھی۔ ٹیلی فون کے تار برف کی وجہ سے جہاز کے رسّوں جتنے موٹے ہو گئے تھے۔ درختوں کی شاخیں کانچ جیسی نظر آتیں۔ اتنی برف گری تھی کہ سڑکیں ناہموار ہو گئی تھیں اور کئی سڑکوں پر تو برف گاڑیاں پہاڑی ڈھلانوں جیسی روانی سے پھسل رہی تھیں۔ رحم دل لوگوں نے سڑکوں پہ جا بجا آگ جلا رکھی تھی کہ آوارہ پھرنے والے آگ تاپ لیں اور آلو بھون لیں، بشرطیکہ ان کے پاس بھوننے کے لیے آلو ہوں۔

دھوبن کی غیر حاضری ہمارے لیے آفت سے کم نہ تھی۔ ہم سب کو کپڑوں کی ضرورت پڑ رہی تھی اور ہم میں سے کسی کو اس کا گھر بھی معلوم نہیں تھا۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ڈھیر ہو گئی ہے اور مر گئی ہے۔ اماں نے اعلان کر ڈالا کہ جب وہ پچھلی دفعہ کپڑے لے جا رہی تھی تو انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم اپنے کپڑے پھر نہ دیکھ پائیں گے۔ انہوں نے کہیں سے پرانی قمیصیں ڈھونڈ نکالیں اور ان کو دھو ڈالا۔ ان کی مرمت کی۔ ہم نے انہیں کو نتھ گانتھ کے پہن لیا۔ ہمیں دوہرا صدمہ تھا، ایک تو اپنے کپڑوں کا، دوسرے محنت کی ماری اس بڑھیا کا جو اپنی دیانت اور جذبۂ خدمت کے سبب ہمیں بہت پیاری ہو گئی تھی۔

دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ کہرا تھم گیا، پھر ٹھنڈک کی نئی لہر اٹھی۔ ایک شام جب اماں لالٹین جلائے ایک قمیض کی مرمت کر رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور بھاپ کا ایک چھوٹا سا مرغولہ اور اس کے پیچھے پیچھے بہت بڑا سا ڈھیر اندر داخل ہوا۔ اس ڈھیر کے نیچے وہ لڑکھڑا رہی تھی اور اس کا چہرہ لٹھے کی دھلی چادر سا سفید تھا۔ اس کے شال میں سے سفید بالوں کی دو چار لٹیں جھلک رہی تھیں۔ اماں نے گھٹی گھٹی سی چیخ ماری۔ ایسا لگا کہ کمرے میں لاش داخل ہو گئی ہو۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور بوجھ اتروانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ وہ اور بھی سوکھ گئی تھی، کمر اور زیادہ جھک گئی تھی۔ اس کا چہرہ سوکھا قاق ہو رہا تھا اور گردن یوں ہلتی رہتی جیسے کہہ رہی ہو نہ بھیا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور اپنے پتلے پتلے ہونٹوں سے کچھ بُدبُدا رہی تھی۔

جب ذرا اس کے دم میں دم آیا تو اس نے بتایا کہ وہ بیمار پڑ گئی تھی، بہت بیمار۔ اس کو بیماری کیا ہوئی تھی، یہ مجھے اب یاد نہیں آ رہا۔ اتنی بیمار ہو گئی تھی وہ کہ ڈاکٹر کو بلوانا پڑا۔ اور ڈاکٹر نے پادری کو بلوا بھیجا۔ کسی نے اس کے بیٹے کو خبر کروائی اور بیٹے نے کچھ پیسے دے دئیے اس کے کفن دفن اور جنازے کے لیے۔ مگر اللہ میاں ابھی اس دکھیاری روح کو اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے تھے۔ وہ بہتر ہونے لگی۔ پھر وہ اچھی ہو گئی اور جونہی اس میں اتنی سکت ہوئی کہ وہ کھڑی ہو سکے، اس نے پھر دُھلائی شروع کر دی۔ ہماری ہی نہیں بلکہ کئی اور گھرانوں کی بھی۔

"اس دُھلائی کے مارے میں پلنگ پہ آرام نہیں کر پاتی تھی۔" وہ کہنے لگی "دُھلائی نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔"

"اللہ نے چاہا تو تم ایک سو بیس برس تک جیو گی۔" اماں دعا دینے کے انداز میں بولیں۔

"اللہ نہ کرے۔ اتنی لمبی عمر کا میں کیا کروں گی؟ کام روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی!"

وہ بڑبڑانے لگی، اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ خوش قسمتی سے اس وقت گھر میں کچھ پیسے تھے اور اماں نے پیسے گن کر اس کا حساب پورا کر دیا۔ مجھے اس وقت ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے دُھلے دھلائے ہاتھوں میں سکے بھی اتنے ہی اجلے مانندے اور صاف ستھرے اور نیک معلوم ہو رہے تھے جیسی وہ خود تھی۔ اس نے سکوں پر پھونکا اور انہیں رومال میں باندھ لیا۔ پھر وہ یہ وعدہ کرتی، ہوئی چلی گئی کہ تھوڑے دنوں میں آئے گی اور نئی دُھلائی لے جائے گی۔

مگر وہ کبھی نہیں آئی۔ جو دھلائی وہ واپس کر گئی تھی اس دنیا میں اس کی آخری محنت تھی۔ اس کو ایک بے پناہ اور ناقابلِ شکست دُھن زندہ رکھے ہوئے تھی کہ بس وہ دھلائی کے کپڑے دھو کر ان کے مالکوں کو واپس کر دے اور جو کام اپنے ذمے لیا ہے اسے پورا کر دے۔

اور اب آخر کار وہ جسم جو مدتوں سے ٹوٹتا ہوا سفال بن کر رہ گیا تھا اور جس کو فرض شناسی اور دیانت نے سہارا دیا ہوا تھا گر پڑا۔ اس کی روح ان مقدس کمروں میں چلی گئی جہاں تمام ارواح بغیر اس لحاظ کے ملتی ہیں کہ دنیا میں ان کا منصب کیا تھا اور یہ کردار انہوں نے کس زبان میں اور کس عقیدے کے مطابق ادا کیا۔ میں اس بوڑھی دھوبن کے بغیر جنت کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتا جہاں اس محنت کا اجر نہ ملتا ہو۔

کل

لوشون (چین)

عذرا سیّد

"کوئی آواز نہیں آرہی —— جانے بچے کا کیا حال ہے؟" ہاتھ میں زرد شراب کا پیالہ تھامے، سرخ ناک والے کھونگ نے ساتھ والے گھر کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نیلگوں رنگت والا آہیو اپنا پیالہ ختم کرکے بڑبڑایا۔" اہوہ...... تم پھر جذباتی ہوگئے ہو!"

لوچن گاؤں الگ تھلگ ہونے کے باعث نسبتاً پرانی روایات کا حامل تھا۔ یہاں لوگ چوکیدار کی پہلی آواز پر ہی گھروں کے دروازے بند کرکے سو جاتے تھے۔ گاؤں میں صرف دو جگہیں ایسی تھیں جہاں لوگ آدھی رات تک جاگتے رہتے تھے۔ ایک شراب خانہ جہاں شرابی رات گئے تک پینے پلانے میں مصروف رہتے تھے، اور دوسرا شراب خانے کے ساتھ والا گھر جس میں شان کی بیوی رہتی تھی، اسے بیوہ ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ سوت کاتنے کے علاوہ اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا جس سے وہ اپنا اور اپنے تین سالہ بیٹے کا پیٹ پال سکتی، اس لیے وہ رات دیر تک جاگتی رہتی تھی۔

کچھ دنوں سے اس کے گھر سے سوت کاتنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ چونکہ رات کو دیر تک جاگنے والے صرف یہی دو گھر سے اس لیے قدرتی طور پر بوڑھا کھونگ ہی یہ بات جان سکتا تھا کہ شان کی بیوی کے گھر سے کوئی آواز آرہی ہے یا نہیں۔ شراب پیتے ہوئے بوڑھا کھونگ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس نے بڑا سا گھونٹ حلق سے اتار کر بانسری پر کوئی لوک دھن چھیڑ دی۔ اس لمحے شان کی بیوی اپنے اکلوتے بیٹے پاؤار کو گود میں لیے بستر کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کا چرخہ فرش پر خاموش پڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی پاؤار کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو بخار کی حدت سے سلگ رہا تھا۔

"میں نے مقدس درگاہ پر بہت سے نذرانے چڑھائے تھے"۔ وہ سوچ رہی تھی" اور دیوتاؤں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ پاؤار کی حفاظت کریں گے۔ لیکن وہ ٹھیک نہ ہوا تو کیا کروں گی؟ اسے ڈاکٹر خوشیا ڈشین کے پاس لے جاؤں گی لیکن ہو سکتا ہے پاؤار کی طبیعت صرف رات بھر کے لیے خراب رہے، اور کل صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کا بخار اتر جائے، اور وہ آسانی سے سانس لینے لگے۔ بہت سی بیماریاں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔"

شان کی بیوی ایک سادہ لوح عورت تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ "لیکن" کا لفظ کس قدر خوفناک ہے۔ اس ایک لفظ کی بدولت بہت سی بُری چیزیں اچھی اور بہت سی اچھی چیزیں بُری بن جاتی ہیں۔ موسم گرما کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ جونہی بوڑھے کھونگ اور اس کے ساتھیوں نے گانا بند کیا، آسمان کے مشرقی حصے میں روشنی پھیلنی شروع ہوگئی اور کھڑکی کی درزوں سے سپید روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی۔

دوسرے لوگوں کی نسبت شان کی بیوی کے لیے صبح کا انتظار اتنا آسان نہ تھا۔ وقت تکلیف دہ حد تک آہستگی سے گذر رہا تھا

پاؤار کا ہر سانس اُسے سال بھر میں ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جیسے ہی سانس لیتا اُس کے نتھنے کانپ کانپ جاتے تھے۔ بالآخر پو پھٹنا شروع ہو گئی اور صبح کی شفاف روشنی نے لیمپ کی روشنی کو دھندلا دیا۔

شان کی بیوی نے اپنی سسکی ضبط کر لی۔ وہ جانتی تھی یہ بُرا شگون ہے۔ "اُسے کیا کرنا چاہیے؟" اُس نے حیران ہو کر سوچا۔ ڈاکٹر خو اُس کی آخری امید تھا۔ اگرچہ وہ سادہ لوح عورت تھی لیکن وہ خود فیصلہ کر سکتی تھی۔ اُس نے اُٹھ کر الماری سے اپنی تمام جمع پونجی نکال لی ــــ جو چاندی کے تیرہ اور تانبے کے ایک سو اسی سکوں پر مشتمل تھی۔ یہ ساری رقم جیب میں ڈال کر اُس نے دروازے میں تالا لگایا اور پاؤار کو گود میں اٹھائے تیز تیز قدموں سے ڈاکٹر خو کے گھر کی طرف چل دی۔

اتنی سویرے بھی وہاں چار مریض پہلے سے موجود تھے۔ اس نے چالیس سکے دے کر رجسٹریشن سلپ بنوائی۔ پاؤار کی باری پانچویں نمبر پر تھی۔ ڈاکٹر خو نے اپنی انگلیاں بڑھا کر اس کی نبض محسوس کی، اُس کے ناخن چار چار انچ لمبے تھے۔ شان کی بیوی بھی ہوئی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "میرے پاؤار کی تقدیر میں زندہ رہنا ہے" لیکن ایسا سوچنے کے باوجود بھی وہ اپنی پریشانی پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ڈاکٹر، میرے پاؤار کو کیا تکلیف ہے؟"

"نظامِ ہضم کی مزاحمت۔"

"کیا یہ خطرناک ہے ـــ کیا وہ؟"

"یہ دو نسخے لو اور اسے دوائی دینا شروع کر دو۔"

"وہ سانس نہیں لے سکتا، اس کے نتھنے بُری طرح کانپتے ہیں۔"

"دل کی خرابی نے اس کے پھیپھڑوں کو......" اپنا فقرہ مکمل کیے بغیر ڈاکٹر خو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شان کی بیوی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے دوا تیار کر لی تھی

"یہ پہلی دوائی بچوں کی حفاظتی گولیاں ہیں۔" اس نے بتایا اور پھر کاغذ کے کونے پر لکھی ہوئی تحریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ دوائی صرف 'جی آفیملی' کی دوکان سے مل سکتی ہے۔"

شان کی بیوی نے وہ کاغذ لے لیا اور وہاں سے چل دی۔ اگرچہ وہ ایک سادہ لوح عورت تھی لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر خو کا گھر، کیمسٹ کی دوکان اور اس کا اپنا گھر ایک تکون میں واقع ہیں۔ اُس کے لیے گھر جانے سے پہلے دوکان سے دوا خریدنا نسبتاً آسان تھا۔ وہ جتنا ممکن تھا تیز چلتے ہوئے دوکان پر پہنچ گئی۔ کیمسٹ نے نسخہ پڑھتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کی انگلی بلند کی اور پھر اتنی ہی آہستہ آہستہ دوائی کو کاغذ میں لپیٹنے لگا۔ وہ پاؤار کو گود میں اٹھائے دوائی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اچانک پاؤار نے اپنا ننھا ہاتھ پھیلایا اور اپنے بالوں کو کھینچنے لگا۔ اس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ اُس کی ماں خوفزدہ ہو گئی۔

سورج اب خاصا بلند ہو چکا تھا۔ بچے کو گود میں اٹھائے اور دوائیوں کا پیکٹ پکڑے ہوئے وہ جتنا فاصلہ طے کرتی اسے اتنا ہی بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پاؤار ابھی تک بے چین تھا، اس وجہ سے بھی اسے راستہ بہت طویل لگ رہا تھا۔ بالآخر وہ تھوڑی دیر ستانے کے لیے سڑک کے کنارے ایک بڑے مکان کی دہلیز پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے کپڑے پسینے میں بالکل بھیگ چکے تھے۔ پاؤار گہری نیند سویا ہوا لگ رہا تھا جب وہ دوبارہ اُٹھ کر چلنے لگی تو اسے پھر بھی وہ بہت وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ قریب سے آواز آئی "مسز شان بچہ مجھے دے دو" یہ نیلگوں رنگت والے آہیو کی آواز لگ

رہی تھی، جب شان کی بیوی نے مڑ کر دیکھا تو واقعی وہ ہی تھا۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک نیند سے بوجھل تھیں۔

اگرچہ شان کی بیوی کسی غیبی مدد کی منتظر تھی لیکن اسے آہیو کی مدد قبول کرنا گوارہ نہ تھا۔ آہیو بھی خاصا ڈھیٹ واقع ہوا تھا اور برابر اس کی مدد کرنے پر مصر تھا۔ متعدد بار انکار کرنے کے بعد آخر اسے ہار ماننا پڑی۔ پاؤآر کو لینے کے لیے جیسے ہی اُس نے ہاتھ بڑھائے، اُس کے لمس کے احساس سے شان کی بیوی کانوں تک سرخ ہو گئی۔

وہ ایک دوسرے سے دو اڑھائی فٹ کے فاصلے پر چل رہے تھے۔ راستے میں آہیو کوئی نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن شان کی بیوی زیادہ تر خاموش ہی رہی۔ ابھی وہ زیادہ دور تک نہیں گئے تھے کہ آہیو نے یہ کہتے ہوئے کہ اس نے اپنے دوست کو کھانے پر بلایا ہوا ہے، جس کے لیے اُسے انتظام کرنا ہے، پاؤآر واپس شان کی بیوی کو دے دیا۔ خوش قسمتی سے اب راستہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ گلی کی نکڑ پر بیٹھی ہوئی چچی وانگ کو دیکھ سکتی تھی جو اُسے دیکھ کر اپنی طرف بلا رہی تھی۔

"بچے کا کیا حال ہے؟ ...... تم نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟"

"ہاں ڈاکٹر نے دیکھا ہے ...... چچی وانگ آپ بزرگ اور تجربہ کار ہیں۔ میری خاطر اسے دیکھ کر بتائیں کہ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

جب چچی وانگ پاؤآر کا معائنہ کر چکی تو اس نے دو مرتبہ سر ہلایا اور پھر دو مرتبہ سر کو جھٹکا دیا۔

پاؤآر کے دوائی پینے تک سہ پہر ہو چکی تھی۔ شان کی بیوی پوری دلجمعی سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اب وہ نسبتاً پرسکون تھا۔ اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر کہا "ماں" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سو گیا ہو۔ اُسے سوئے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اُس کی پیشانی اور ناک پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ اس کی ماں نے انھیں چھوا تو وہ سریش کی مانند اُس کی انگلی سے چپک گئے۔ گھبرا کر اس نے پاؤآر کے سینے پہ ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب تک اُس کے آنسو تھمے، اس وقت تک پاؤآر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ بین بھی کرنے لگی۔ جلد ہی لوگ ٹولیوں کی شکل میں آنے لگے۔ اندر کمرے میں چچی وانگ نے تجہیز و تکفین کے انتظام کی نگرانی سنبھال لی تھی۔ پہلے اُس نے کاغذ کے نوٹ جلانے کا حکم دیا۔ اور پھر دو اسٹول اور کپڑوں کے پانچ جوڑے گروی رکھ کر اُن کے عوض شان کی بیوی کے لیے دو ڈالر بطور قرض حاصل کیے تاکہ وہ اس رقم سے سب لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر سکے۔

پہلا مسئلہ کفن کا تھا۔ شان کی بیوی کے پاس ابھی دو چاندی کی بالیاں اور ایک چاندی کا کلپ تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا، یہ اُس نے شراب خانے کے مالک کو دے دیئے تاکہ وہ تابوت کے لیے آدھی قیمت کی نقد ادائیگی اور آدھی قیمت ادھار کے لیے ضمانت دے سکے۔ نیلگوں رنگت والے آہیو نے اپنا ہاتھ اٹھا کر رضاکارانہ طور پر کام کرنے کی پیش کش کی، لیکن چچی وانگ نے اسے نظرانداز کر دیا البتہ دوسرے روز تابوت اٹھانے کے لئے کہہ دیا۔ "بوڑھی کتیا" وہ چچی وانگ کو کوستا ہوا نفرت سے ہونٹ سکوڑے کھڑا رہا۔ شراب خانے کا مالک تابوت کا انتظام کرنے چلا گیا۔ شام کو واپس آ کر اس نے بتایا کہ تابوت آرڈر پر بنوانا پڑے گا، جو کل صبح سے پہلے تیار نہیں ہو سکے گا۔

شراب خانے کے مالک کے آنے تک باقی لوگ شام کا کھانا، کھا چکے تھے۔ چونکہ لوچن گاؤں پرانی روایات کا حامل تھا، اس لیے چوکیدار کی پہلی آواز پر ہی لوگ سونے کے لیے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صرف آہیو شراب خانے کے بار پر جھکا ہوا شراب پی رہا تھا اور بوڑھا گھونگ کوئی گیت گا رہا تھا۔

اس لمحے شان کی بیوی بستر کے کنارے پاؤار کی میت کے قریب بیٹھی رو رہی تھی۔ فرش پر چرخہ خاموش پڑا تھا جب اس کی آنکھوں میں مزید کوئی آنسو نہ رہا تو اس نے آنکھیں کھول کر حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، یہ خواب ہے"۔ وہ سوچنے لگی "محض ایک خواب ــــ کل میں سو کر اٹھوں گی تو پاؤار بستر پر میرے ساتھ لپٹا ہوا سو رہا ہو گا اور نیند سے بیدار ہو کر مجھے پکارے گا "ماں"، پھر چیتے کے بچے کی طرح نیچے چھلانگ لگا کر کھیلنے لگے گا"۔

خاصی دیر ہوئی، بوڑھے کھونگ کا گانا ختم ہو چکا تھا، اور شراب خانے کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ شان کی بیوی بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی، جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ مرغ کی آواز سنائی دینے کے ساتھ ہی مشرق میں آسمان روشن ہونا شروع ہو گیا اور سپید روشنی کھڑکی کی درزوں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی۔

رفتہ رفتہ صبح کی سپید روشنی تانبے کے رنگ میں ڈھلنے لگی اور سورج چھت پر چمکنے لگا۔ شان کی بیوی ابھی تک سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک کر اٹھی اور بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک اجنبی پشت پر کچھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چچی وانگ تھی۔

اہوہ، وہ تابوت لے کر آیا تھا۔

اس روز سہ پہر تک تابوت کا ڈھکن کھلا رہا۔ شان کی بیوی زار و قطار روتے ہوئے مسلسل میت کو دیکھے جا رہی تھی اور کسی طرح بھی تابوت کا ڈھکن بند ہونے نہیں دے رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر چچی وانگ نے اسے ایک طرف گھسیٹ لیا اور تب جلدی سے تابوت کا ڈھکن بند کر دیا گیا۔

شان کی بیوی نے پاؤار کی تجہیز و تکفین کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا ــــ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پہلے دن نوٹوں کی گڈی جلائی، آج صبح انچاس کتابیں نذرِ آتش کیں۔ پاؤار کو تابوت میں رکھنے سے پہلے اسے نئے کپڑے پہنائے اور اس کے سرہانے وہ سارے کھلونے رکھ دیئے جو اسے پسند تھے ــــ ایک چھوٹا سا مٹی کا باوا، دو چھوٹے لکڑی کے پیالے اور دو شیشے کی بوتلیں۔ چچی وانگ نے احتیاطاً انگلیوں پر گن کر تسلی کر لی تھی، اسے ایسی کوئی چیز یاد نہیں آئی جو باقی رہ گئی ہو۔

نیلگوں رنگت والا آہیو سارا دن غائب رہا، شراب خانے کے مالک نے تابوت کو قبرستان لے جانے اور قبر کھودنے کے لیے دو مزدوروں کا انتظام کر لیا تھا، جنھیں شان کی بیوی نے دو سو دس تانبے کے بڑے سکے ادا کرنے تھے۔ چچی وانگ نے شان کی بیوی کے ساتھ مل کر ان سب لوگوں کے لیے کھانا تیار کیا جنھوں نے کسی نہ کسی صورت تجہیز و تکفین میں حصہ لیا تھا۔ جلد ہی سورج غروب ہونے کا وقت ہو گیا اور سب لوگ معذرت کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

شان کی بیوی نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس کی حالت سنبھلی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی انہونی بات ہو گئی ہے۔ ایسی بات جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی اور جس کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ وہ ہو چکا تھا۔ اور دوسری بات جو اسے بہت عجیب لگی وہ کمرے میں پھیلی ہوئی گہری خاموشی تھی۔

اس نے اٹھ کر لیمپ جلا دیا، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے کی طرف گئی اور اسے بند کر کے واپس اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ فرش پر چرخہ خاموش پڑا تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے کمرے میں چاروں طرف دیکھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹھی رہے یا کھڑی ہو جائے۔ کمرے میں نہ صرف خاموشی تھی بلکہ وہ بہت کھلا اور بہت خالی لگ رہا تھا۔ اس ماحول میں بیزاری کا احساس اور بڑھ گیا

نے بجھن کی کتابیں جو بدھ عقیدے کے مطابق مرنے والے کی روح کو جنت تک لے جانے میں مدد دیتی ہیں۔

اور اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُسے یقین ہو چکا تھا، اُس کا پاؤار واقعی مر چکا ہے۔ وہ کمرے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے لیمپ بجھا دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اُسے یاد آنے لگا کس طرح پاؤار اُس کے پہلو میں بیٹھ کر تلی ہوئی مچھلیاں کھاتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں سے اسے چرخہ کاتتے ہوئے بغور دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگا "اماں، ابا بن تنگ بیچتے تھے، میں بھی بڑا ہو کر بن تنگ بیچوں گا اور بہت سارے پیسے کماؤں گا ــــــ اور وہ سارے پیسے تمہیں دے دوں گا۔"

اس وقت سوت کا ایک انچ کاتنا بھی اُس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب کیا رہ گیا تھا؟ شان کی بیوی کی نظر میں حال کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ایک سادہ لوح عورت تھی۔ اس کے علاوہ وہ اور سوچ بھی کیا سکتی تھی؟ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ کمرہ بہت خاموش، بہت کھلا اور بہت خالی ہے۔

اگرچہ شان کی بیوی سادہ لوح تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ مرنے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے اور اب وہ اپنے بیٹے پاؤار کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا "پاؤار، میرے خواب میں ضرور آنا"۔ پھر اُس نے اس امید پر اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ اُسے جلد نیند آ جائے اور وہ خواب میں پاؤار کو دیکھ سکے، خاموش، ویران اور تنہا کمرے میں اسے صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔

شان کی بیوی پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ بوڑھے کھونگ کا گانا کب کا ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شراب خانے سے نکل کر لڑکھڑاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

"مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ میری پیاری۔ بالکل تنہا......"

زرد رنگت والے آہیو نے بوڑھے کھونگ کے کندھے کا سہارا لیا ہوا تھا اور وہ قہقہے لگاتے ہوئے جا رہے تھے۔

شان کی بیوی سو گئی تھی، بوڑھا کھونگ اور دوسرے لوگ جا چکے تھے اور شراب خانے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ لوچن گاؤں گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف رات "کل" میں تبدیل ہونے کے لیے بے تاب، خاموشی میں اپنا سفر طے کر رہی تھی اور اندھیرے میں دور کہیں کتے بھونک رہے تھے۔

۵؎ ایک قسم کی پڈنگ

خام اور خورو

روبینہ امتیاز قزلباش

گلگت کی وادی سے ہٹ کر سڑک بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے۔ "نومل" میں چند درخت اور سرسبز جھاڑیاں نظر آتی ہیں پھر سارا راستہ بنجر اور ویران پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں، خاکستری پتھروں اور بھربھری ریت سے اٹا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دریا ہے تو بھی گزرتنگ ہوتی ہوئی گھاٹی میں زور و شور سے بہتا ہے۔ اس کی جوشیلی موجوں میں اس قدر تلاطم ہے کہ اگر ایک فوجی ٹینک بیچ میں ڈال دیا جائے تو یہ اس طرح ٹوٹے پھوٹے جائے گا جیسے کچے ٹین کا ہو۔

دریا کا پانی گدلا ہے۔ ایسے جیسے ابلتی ہوئی سلیٹی مائع رواں ہو۔ ایک طرف یہ مائع موجوں کے غضب ناک انداز دکھاتی تیزی سے سڑک کے ساتھ ساتھ بہتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف خشک ناقابل عبور پہاڑ ہیں جن کا سارا وجود ہی یہ احساس دیتا ہے کہ آگے مت جاؤ، آگے تمہارا جانا اچھا نہیں۔

شاہراہ ریشم بننے سے اسی سنگین اور تنگ گھاٹی نے ہنزہ کو پاکستان کے دیگر علاقوں سے الگ رکھا۔ انگریزوں کے زمانہ عروج میں بھی یہ جدا اور آزاد رہا۔ ہنزہ کی اس زمانہ کی تاریخ نے مسافروں کو کبھی خوش آمدید نہیں کہا۔ چوٹیوں پر ڈٹے اس کے چوکیدار تاک میں رہتے تھے اور آنے والے کو قریب پہنچنے سے قبل ہی بآسانی ختم کر دیا جاتا تھا۔

آج جبکہ ہم اسی راستے پر تھے تو ایسے ہی چند پرانے واقعات ذہن میں ابھرنے لگے۔ دریا کے شور اور گھورتی چٹانوں کے دبدبے سے سبھی خاموش تھے۔ ہر موڑ پر خطرے کا مبہم سا احساس اٹھتا مگر سڑک کی کشادگی اسے مٹا دیتی۔ یہی کیفیت رہی کافی عرصہ، خدا جانے کتنے میل طے کر لئے اسی طرح۔ پھر ایک موڑ مڑے، اتنا تیکھا کہ سامنے سوائے پہاڑ کے پردے کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس پردے سے جو باہر نکلے تو یکدم فضا کا انداز بدل گیا۔ ہماری کار جیسے رینگنے سی لگی۔ کوئی بھی نہ بولا۔ سبھی دم بخود اپنے سامنے پھیلے ہوئے نظارے کو دیکھ رہے تھے۔

وادی کشادہ ہو رہی تھی۔ پہاڑ سڑک کو چھوڑ کر دور ہٹ رہے تھے۔ ہٹتے ہوئے یہ پہاڑ اپنے نفیس کھیتوں کو اپنے سینے سے آگے بڑھا کر پھیلا کر یوں پیش کر رہے تھے جیسے طشتریاں ہوں۔ ان طشتریوں پر زمردی سبزہ تھا۔ ان کے کناروں سے لٹکتی ہوئی انگور کی بیلیں تھیں۔ دائیں بائیں، ادھر ادھر، آگے پیچھے، انہیں سنگلاخ پہاڑوں سے نکلے ہوئے یہ سرسبز کھیت اپنے حلقے میں خوبانیوں سے لدے ہوئے درخت لئے تھے اور تحفہ بنے خوش آمدید کے انداز میں پیش کئے جا رہے تھے۔ غضبناک سلیٹی مائع کبھی کی گلگت کی طرف بھاگ چکی تھی اور اب شفاف پانی کا ایک تازہ اور چمکتا ہوا دریا، نیلی موجیں اچھالتا، رواں تھا۔ دریا کی آواز میں نغمگی تھی۔ اس کے جوش میں مستی تھی۔ کھنکھناتی ہوئی بلوری ندیاں بلندیوں سے جھرنے بناتی دریا سے آکر مل رہی تھیں۔ چشم و دل دونوں سیراب ہو رہے تھے۔

ہم نے کار روک لی۔ پرندوں کی چہک، پانی کی آواز، سبزے کی سرسراتی موسیقی، پھلوں کی مہک، اور فضا کی فرحت میں ایک کیف

تھا جو پورے بلتستان میں کسی اور وادی کو اس حد تک میسر نہیں ——— ہمارے سامنے قدرت اپنے پُر محبت اور درخشاں حسن کو بے حجاب کئے کھڑی تھی۔

ہم محو دیکھتے رہے۔

اور اب بھی جبکہ ذہن اس نظارہ کو دیکھ رہا ہے اور روح اُس کے لطف سے سرشار ہے، قلم میں وہ مجال نہیں کہ اس کو بیان کر سکے۔ ہنزہ کی دید اور اس کا احساس ایک ایسی واردات ہے جس سے گذرنا ہی اس کو پاتا ہے۔ قلم اس کی پہچان کرنے سے قاصر ہے۔

پھر گاؤں در گاؤں، زمین کے جڑاؤ خطوں سے گزرتے، بل کھاتی سڑک پہ رواں، شفاف جھرنوں کی موسیقی کا مزہ لیتے 'نگر' سے ہوتے ہوئے ہم 'ہنزہ' پہنچے۔

ہر طرف ہنستے مسکراتے، مرد، عورتیں، بچے، توانا اور پر اعتماد چہرے لئے، صاف لباس، کشادہ آنکھوں اور کھلی پیشانی والے حسین لوگ نظر آئے۔

کار رکتی تو یہ ہمیں گھیر لیتے، خرمانیاں بیچنے کی کوشش کرتے۔ مگر انھیں بھاؤ اور تول کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ جو جی چاہے دے دیں اگر خریدنا ہے تو خرید لیں۔

بیچنے والے اکثر بچے ہوتے، اگر کوئی بڑا ان کے ساتھ جاتا تو چند باتوں کے بعد وہ مسکرا کر مہمان نوازی کے انداز میں خرمانیاں تحفۃً دے دیتا۔

ایک حقیقت کا انکشاف ہوا 'راکاپوشی' جس کا اکثر ذکر سنتے آئے ہیں اور جس کی تصویر پاکستان ٹورنگ کے سفری کتابچوں میں بھی دکھائی دیتی ہے، اسے ہنزہ کا ایک منظر لکھ کر دکھایا جاتا ہے مگر یہ حسین چوٹی ہنزہ میں ہے نہیں۔ یہ نگر میں واقع ہے۔ نگر پہلے آتا ہے 'ہنزہ' بعد میں۔ 'ہنزہ' اور 'نگر' دو بھائیوں کی دو ریاستیں ہیں جن میں ایک مدت تک جنگ رہی۔ دریا ان کے بیچ میں رواں ہے۔ ان کے درمیان جنگ کی بھی ایک لمبی اور دلچسپ داستان ہے۔

"ہنزہ" کی موجودہ باحیات رانی "نگر" کے راجہ کی بیٹی ہیں اور اسی رشتے کے بعد اُن کی انتہائی دشمنی اب صلح میں بدل گئی ہے۔

'ہنزہ' کا دارالحکومت کریم آباد ہے۔ کریم آباد کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ باہر نکلو تو سر پر یہاں کی عورتوں کی طرح ٹوپی پہن لینے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ ورنہ سر تپ جاتا ہے اور باقی دن درد سہتے رہیئے۔

راستے چوڑے کئے جا چکے ہیں مگر اسی طرح دھول سے اٹے ہوئے ہیں۔ پانی کی نالیاں انھیں راستوں کے ساتھ ساتھ بہتی رہتی ہیں۔ راستوں کے گرد پیڑ ہیں جو میٹھی شہد خرمانیوں سے لدے، جھکے، سایہ کئے رہتے ہیں۔ زمین پر تو دھول ہے مگر نہ درختوں پہ ہے، نہ سبزے پر۔ بس ان گنت گری پڑی خرمانیاں یا پھر پاؤں اس گرد سے اٹ جاتے ہیں۔ ویسے فضا صاف ستھری رہتی ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی موسم خنک ہو جاتا ہے۔ ہوا اپنے میں راکاپوشی، "اُس بڑ" اور "ہسپر" گلیشروں سے ہلکی سردی لئے سرکنے لگتی ہے۔ یہاں آدمی تازہ دم ہی رہتا ہے۔ خواہ سارا دن بھاگتا دوڑتا رہے۔ تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ میں نے سامنے 'بلتیت' کے سرسبز کھیتوں کو دیکھا۔ صدیوں پہلے اس ملک کی ایک کہانی تھی جب 'خامر' 'خوروں' کو لوٹ لیتے تھے۔ ان کی زمین چھین لیتے تھے انھیں لاچار کر دیتے تھے۔ ہر چیز سے لاچار۔ خوراک سے، لباس سے، سہولتوں سے، وہ دن رات کمر توڑ محنت کے بعد بھی مجبور ہی رہتے تھے۔ وہ روٹی، کپڑا، مکان کے دائرے میں ہی گھستے چلے جاتے تھے۔ اس دائرے سے باہر نکل کر کسی اور سطح پر زندگی گذارنے کا انداز انھیں کبھی میسر نہ آ سکتا تھا۔ اب جو راستہ کھلا تو دیکھا کہ یہ کتنا ترقی یافتہ معاشرہ ہے۔ اس میں مساوات ہے، انصاف ہے، باہمی تعاون ہے، اُن کی عزت ایک ہے، اُن کے گھر صاف ہیں، اُن کی سڑکیں محفوظ ہیں، جرم نام

کی کوئی حقیقت نہیں، چوری کے ڈر سے اس طرح آزاد ہیں کہ پورے ہنزہ میں کوئی کُتا تک نہیں رکھتا اور نہ ہی صدیوں سے کسی نے رکھا ہے۔ اُن میں میزان ہے۔ محنت کی لگن ہے۔ مرد، عورتیں صبح سے شام تک مل کر کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور فراواں خوراک اگاتے ہیں۔

دھوپ ڈھل رہی تھی جب ہم التیت کے پرانے محل سے ہوٹل کریم آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ جابجا لوگ کھیتوں میں مصروف تھے۔ ہر طرف مسکراہٹیں تھیں، صاف چہرے تھے، اجلے لباس تھے۔ عورتیں سفید دوپٹے اوڑھے مردوں کے شانہ بشانہ مصروف تھیں۔ اُن کے انداز میں ایک وقار تھا جو اُن کا سماج انہیں دے چکا تھا۔ ہر بچہ سکول جاتا ہے۔ سبھی خواندہ ہیں۔ وہ ایک ستھرا معاشرہ ہے۔ اندر سے صاف، باہر سے اُجلا، باہمی میل جول میں پاک۔

جی چاہتا ہے 'ہنزہ' کو پاکستان کہوں، 'ہنزہ' کو اس نام کا استحقاق حاصل ہے۔

ہوٹل کریم آباد، ایک سادہ سا ہوٹل ہے۔ ریسٹ ہاؤس (P.W.D) میں ہماری بکنگ ہو چکی تھی مگر اس ہوٹل کی انتظامیہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہاں نہ گئے۔ معمولی سے کمرے ہیں اور سادہ غسل خانے۔ گرم پانی بالٹی میں لایا جاتا ہے۔ لوہے کی نواڑی چارپائیاں کھٹملوں سے محفوظ ہیں، بستر صاف، چادریں بغیر مطالبہ کئے روزانہ بدل دی جاتی ہیں، اُجلے تولیے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کہیں نظر نہیں آتے۔ مسافر جو گند ڈالتے ہیں وہ اُسی دن غائب کر دیا جاتا ہے۔ کھانے کی ایک سادہ سی میز باورچی خانے میں رکھی ہے جس پر تقریباً دس بارہ لوگ کھانا کھا سکتے ہیں۔ کھانا مہمانوں کے سامنے ہی پکایا جاتا ہے۔

انتظامیہ تین افراد پر مشتمل تھی۔ تینوں میں نہ کوئی افسر تھا نہ کوئی ماتحت۔ ہر کام تینوں مل جل کر کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ تینوں ہی تعلیم یافتہ تھے اور اپنے لباس اور گفتار میں اُجلے تھے۔

کھانے کے بعد ہماری اُن سے کافی لمبی گفتگو رہتی، 'ہنزہ' کی تاریخ، اُس کی قدیم روایتیں، مقامی حالات، سڑک بن جانے کے بعد اُن کے سماجی اور سیاسی حالات اور حکومت پاکستان کی طرف سے یہاں جو انتظامی تبدیلیاں لائی گئی ہیں اُن سے متعلق اُن کے تاثرات ــــ اس قسم کے موضوعات پر سلجھی ہوئی گفتگو ہوتی جو ایک پڑھا لکھا ذہن ہی کر سکتا ہے۔

باہم زندگی گذارنے کا جو سلیقہ 'ہنزہ' کا چھوٹا سا معاشرہ سیکھ چکا ہے، ہم اُس سے متاثر رات گئے کمروں کو لوٹ آتے۔

اس رات بھی ایک ایسی ہی لمبی گفتگو ہوئی۔ واپس لوٹے تو ذہن کچھ زیادہ ہی متاثر تھا۔ کافی دیر خیالات کے تانے بانے بنتے رہے۔ کچھ حقائق اور اُن کی تلخ یادیں ابھرتی مٹتی رہیں ــــ اس رات میں نے عجیب خواب دیکھا کہ پاکستان کا نقشہ پھیل کر ایک وسیع سمندر ہو گیا ہے۔ سمندر تاریک ہے۔ کالے پانی سے مچلتا ہوا اور بے کراں ہے۔ کوئی کنارہ نظر نہیں آتا۔ پھر دیکھا کہ اس عریض تاریک سمندر کے بیچ ٹمٹماتے ہوئے چند روشن جزیرے ہیں ــــ صرف چند ــــ ان جزیروں کے چہرے ابھرے تو میں نے انہیں پہچان لیا۔ کراچی ــــ حیدر آباد ــــ لاہور ــــ ملتان ــــ فیصل آباد ــــ پھر میں نے کالے سمندر میں مبہم سی قطاروں کو رینگ رینگ کر بڑھتے محسوس کیا۔ یہ قطاریں عمیق تاریکی کے دور دراز کونوں سے رواں ٹوٹتی، پھر ابھرتی، مسلسل روشن جزیروں کی سمت رواں ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ان قطاروں کے دوش پر ان گنت بھوکے، کملائے ہوئے، بوسیدہ لباس میں ملبوس جسم ہیں بچوں کے، نوجوانوں کے اور کثرت میں لڑکوں کے۔

یہ کس کی اولاد ہیں؟

پھر میں نے اندھیرے سمندر سے دبا دبا شور سُنا۔ میں نے آہ و زاری میں لہراتی، کلبلاتی، باہیں دیکھیں، پھٹی آستینوں سے لٹکتی، محنت سے مجروح ہاتھ لئے، بین کرتی ماؤں کی باہیں جو ان روشن جزیروں کی طرف بھاگتے ہوئے بیٹوں کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ وہ شور میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر کی ہلکی تاریکی میں اس کا چہرہ اُبھر آیا۔ اُس چہرے کے ہونٹ ہلے۔ اور وہ بولی "میرے فیروز کو ڈھونڈ لاؤ بی بی"۔

اب کہ میں نے بستر ہی چھوڑ دیا، کمرے سے بھی نکل آئی اور برآمدے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ مگر اُس عورت کا چہرہ ساتھ رہا۔ اُس کے دکھ کا احساس میرے ضمیر پر چوٹ ہے جو سینے تک گہری ہے۔ میں اسے چند سال قبل ملی تھی۔

چھوٹا سا مختصر بدن، جھریوں بھرا ہاتھ، جن پہ رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ کھردری انگلیاں، جن کے جوڑ مشقت کے باعث گانٹھوں کی صورت میں نمایاں تھے —— وہ کمزور سی تھی۔ اُس کے کالے بالوں میں سفیدی کی دھاریاں تھیں۔ بھوؤں کے نیچے دھنسی ہوئی دھندلی آنکھیں، زرد رخسار اور ہونٹوں کے آس پاس گہری لکیریں۔

کیا عمر ہو گی اس کی؟ اِس نے جو گذاری اُسے کیا زندگی کہتے ہیں؟؟ یہ بھی رب کا تحفہ ہے یا پھر ہمارے ضمیر کے لیے کچو کا؟؟؟

"میرے فیروز کو ضرور ڈھونڈنا بی بی جی۔ گھر سے گئے اُسے چھٹا سال ہے۔ کوئی پتہ نہیں اُس کا یہی کوئی بارہ برس کا ہو گا کہ بھاگ گیا کہتے ہیں "بشام" کی بس پر چڑھا تھا۔ اُسے ہمارے گاؤں کے آدمیوں نے اُس وقت دیکھا جب بس روانہ ہو چکی تھی۔ بس یونہی کھڑکی سے جھلک سی پڑی تھی۔ بس جی اسے بشرے جنتا تھا"

اُس نے کرب سے بشرے کو دیکھا۔

"یہ کیوں بھاگ جاتے ہیں؟" میں نے دکھ سے سوچا۔

اُس نے شاید میری سوچ کو پکڑ لیا۔

"کیا کریں بی بی جی یہاں نہ بجلی ہے۔ نہ سڑک ہے۔ نہ سکول۔ باہر سے لوگ آتے ہیں۔ سیر کرنے۔ کھلا پیسہ لے کر مہنگی مہنگی جیپوں میں۔ کہتے ہیں ایک جیپ کی قیمت سے گاؤں کا حلیہ بدل سکتا ہے۔ میلوں لمبی سڑک، سکول اور ہسپتال بن سکتے ہیں۔ نالے سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہاں تو ہر سال کتنی ہی جیپیں آتی ہیں۔ ذرا ذرا سے کام کے دس روپے یوں پکڑا دیتے ہیں جیسے ردی کاغذ کے ہوں۔ خدا مارے اُس صاحب کو۔ فیروز کو ایک سو روپیہ دے دیا ہو گا۔ اُس کا سامان جو چھوڑنے گیا تھا تو پھر واپس نہ آیا۔ وہیں سے سیدھا بس پکڑی بشام کی اور میرے گھر کو اندھیرا کر گیا"۔

وہ سسکنے لگی پھر بولی "ہر سال جب شہر سے لوگ آتے ہیں تو میں یہی امید لے کر اُن کے پاس آتی ہوں۔ شاید کسی نے میرا فیروز دیکھا ہو۔ شاید کوئی میرا فیروز ڈھونڈ دے"۔

یہ عورت پاکستان کے اُن لاتعداد گاؤں میں سے ایک کی مکین ہے جن کی پرورش کے لئے ہمارے بجٹ میں ابھی کوئی خانہ بنا ہی نہیں۔ اسے ملے چند سال ہو چلے ہیں مگر اس کے دکھ میں رچا بسا لمحہ ابھی تک میرے دل میں ساکت ہے۔ جب کبھی یہ دل دھڑکتا ہے تو اس دکھ کی ایک ضرب ضمیر پر بھی پڑتی ہے۔

یہ ہمارے فیروز، یہ ہمارے خورو۔ ان پر ظلموں کے تنے ہوئے یہ جال جن کی ڈوریں ہم خاموں کے ہاتھوں میں ہیں۔

یہ جال کب ٹوٹیں گے؟
نہیں تو ہم خامروں کا کیا ہو گا؟؟

کل کا تجزیہ کا سفر ذہن و دل پر تمام دن حاوی رہا۔ کیا خوبصورت سرزمین ہے ہماری ــــــ! ہر چیز ہے، ہمارے پاس اور اس کو استعمال کرنے والے ذہن بھی ہیں۔ مگر ہم سب، ہمارے خوبصورت پہاڑ، ہمارے عمدہ لوگ، ایک ایسے نظام میں جکڑے جا چکے ہیں جو یہاں کی کسی بھی صلاحیت کو، نہ زمین کے وصف کو اور نہ ہی ہماری خوبیوں کو بروئے کار آنے دیتا ہے۔

وہ شام بہت ہی ہلکی پھلکی تھی۔ ماحول میں لطافت تھی۔ ہنزہ کی خوشگوار ہوا نے مجھے سہلانا شروع کر دیا۔ فضا کے سکون نے آہستہ آہستہ مجھے گود میں لے لیا۔ بادل ہٹ گئے۔ اندھیرے سے کالک چھٹنے لگی۔ میرے سامنے پوری وادی مدھر چاندنی میں نہائی پڑی تھی "اُسپر" کا پہاڑ چمک رہا تھا۔ اُسپر کا جھرنے بہتا پانی چاندی کی سی دھاروں میں بہہ رہا تھا اور اُسپر خود یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چاندی ہیرے سے جا ملی ہو۔ اُس پر اُسی کے ابھاروں کے پڑتے کالے سائے جیسے قدرت نے چاندی اور ہیرے کے جگمگاتے تھال میں کالے رومال سجا دیئے ہوں۔

آسمان صاف تھا۔ فضا پاکیزہ نور میں نہائی تھی ساری وادی ایسے نکھری ہوئی تھی جیسے ہر کوئی جاگ رہا ہو۔ درخت، خرمانیاں فصلیں گھاس، پتھر، سبھی زندہ تھے اور زمین کے سینے سے چمٹے اپنی ماں سے محبت و تحفظ کی دولت سمیٹے سانس لے رہے تھے۔

پریاں ایسی ہی جگہوں پر آتی ہیں۔ ہر ذی روح ایسے ہی مقامات پر آزاد پھرتا ہے۔ مسرور فضائیں خدا کے نام کی تسبیح کرتی ہیں اور اگر ہلکے سے کسی پھول، کسی جھاڑی، کسی پتے سے بات کرو، تو وہ جواب بھی دے دیتے ہیں۔ گذرے واقعات کی داستان سنا دیتے ہیں محبت کا سبق پڑھا دیتے ہیں۔ دل میں رس گھلتا ہے۔ انسان کی روح جسم سے باہر بہنے لگتی ہے۔ فضا کی وسعتوں میں گھل مل جاتی ہے یوں پھیلتی ہے کہ سارا جہان اپنا ہو جاتا ہے۔ معجزوں پر یقین کیوں نہ آئے۔ انسان ایسے لمحات میں از خود ایک اعجاز ہوتا ہے۔

"خامر نے خوردو سے کیا کہا؟" میرے تجسس سے سوال ابھرا۔

میرے سامنے بلتیت کے کھیتوں کا انداز بدل گیا۔ ایک کچا سا گھر بن گیا جس کے آگے کا آنگن کھیتوں سے اونچا تھا۔ آنگن تک پہنچنے کے لئے لکڑی کے ڈنڈوں کو جوڑ کر ایک سیڑھی بنا رکھی تھی۔ کھیت نیچے تھے اور آنگن اونچا اور آنگن سے بھی اونچا گھر جس کی نیچی دیواروں سے بیلیں لٹک کر کھیتوں پر آ رہی تھیں صحن میں کھڑا خوردو اپنے سامنے بیٹھے بیٹے کی بات غور سے سن رہا تھا۔

"بابا آپ کو خامر چچا سے بات کرنی ہوگی۔ لحاظ سے کام نہ چلے گا۔ آپ کا حصہ ہے۔ لیجئے، گاؤں کے بڑوں کو بیچ میں ڈالئے آخر رہنا تو خامر کو یہیں ہے۔ اور پھر صدیوں پرانی رسم کیسے توڑ سکتا ہے۔ میرے دادا وفات پا چکے ہیں۔ زمین کی بٹائی ہو کر رہے گی۔ اور انصاف سے ہی ہو گی۔"

"ہاں بیٹا میں خامر سے کل ضرور بات کروں گا" خوردو نے استقلال سے کہا "تمہاری ضرورت نہیں۔ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔ وہ ضرور سنے گا۔"

اس شام خوردو دیر تک سوچتا رہا۔ بابا کو فوت ہوئے کافی عرصہ گذر گیا۔ پچھلی فصلیں بھی خامر نے خود ہی لگوائیں اور خود ہی

اٹھائیں۔ کام کا سارا بوجھ مجھ پر اور میرے اکلوتے بیٹے پر رہا۔ خامر اور اس کے سات بیٹے فصل اٹھاتے وقت یوں دندناتے پھر رہے تھے جیسے ساری زمین صرف ان کی ہو۔ ہمارا کوئی حصہ اور دخل نہ ہو فصل اچھی خاصی ہوئی۔ مگر ہمیں جو حصہ دیا گیا وہ بہت کم تھا۔ جنگل گذارا ہوا زلیخا کے باپ کی بھیجی خرمانیاں اور سوکھا گوشت آڑے آیا ورنہ سردیوں کا آخری مہینہ تو فاقے سے ہی گذرتا۔" خورو نے پریشانی سے سوچا "اب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔"

دوسرے دن پو پھٹتے ہی وہ خامر کے گھر میں تھا۔ خورو کی بات مختصر تھی مگر ٹھوس۔ اس نے سادگی اور وقار سے اپنا حصہ مانگا تھا۔ خامر اور اس کے غراتے بیٹے اسے ذرا بھی خوفزدہ نہ کر سکے۔ "بس پانچ دن اور ہیں۔ آپ بڑے ہیں خود ہی بٹوارا کر دیجیے۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہوگا۔ میں نہیں چاہتا گھر کی بات باہر نکلے اور گاؤں والے ہمارے لئے فیصلے کو آئیں۔" خورو نے خلوص سے کہا۔

واپسی پر وہ سوچ رہا تھا "میں نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ حق کی بات کی ہے۔ پھر خامر اور اس کے بیٹے مجھ سے خفا کیوں تھے؟"

یہ تو خامر کو بھی پتہ تھا کہ وہ خورو اور اس کے بیٹے سے زیادہ دیر بیگار نہ لے سکے گا۔ خامر نے سوچا "بٹوارا کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی ہے۔ پھر ساری بات ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جیسا فیصلہ چاہوں کروں، جیسی زمین چاہوں خورو کو دوں۔ وہ ہر بات پہ راضی ہو جائے گا۔ اسے ابھی بڑی زمین کی عقل ہی نہیں۔ جو دوں گا لے لے گا۔ اگر گاؤں والے بیچ میں آ کودے تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

اور پھر دوسرے دن ہی زمین کو تقسیم کر دیا گیا۔ خورو کو چٹانوں سے اٹی ہوئی، درختوں سے خالی، جھاڑیوں سے پُر زمین دی گئی۔ بس چند ہی کھیت اچھے تھے۔ ان تک بھی پانی کی نالیاں درست نہ بہتی تھیں۔ ان کے اُٹ ٹوٹے ہوئے تھے۔ باقی زمین کچھ زیادہ ہی ٹیکھی ڈھلوان پر تھی۔ بنے باندھنے اور کھیت نکالنے کے لئے کچھ زیادہ ہی مشقت درکار تھی اس لئے خورو اور خامر کے نے اپنی جائیداد کے اس حصہ پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔

خورو نے اسے بھی بخوشی قبول کر لیا۔ بیٹے کو سمجھا بجھا کر چپ کرا دیا اور دن رات کام پر لگ گیا۔ وہ مخلص تھا محنتی تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کے عزیزوں نے فالتو وقت میں اس کی مدد کی۔ چند برس میں ہی زمین اپنا رنگ دکھانے لگی۔ کھیتوں میں خوب فصل اُگنے لگی۔ پانی کی نالیاں اور اُٹ بن گئے۔ خرمانیوں کے پودے پیڑ بننے لگے۔ اب کے تو ان سے فصل کی بھی امید تھی۔ خورو کی سادگی اس کے کام آئی۔ اس نے اچھے مشوروں پر عمل کیا۔

خرمانی کی پہلی فصل شاندار تھی۔ اس نے شکریہ کے طور پر ہر ایک کو تحفے میں خرمانیاں بھیجیں۔ بہترین قسم کی خرمانیوں سے لدی ٹوکری جب خامر کے گھر پہنچی تو وہ ٹھٹکا اور اسے پھر خورو یاد آیا۔

جب سے بٹوارا ہوا تھا۔ وہ خورو کے گھر نہ گیا تھا اور نہ ہی اس کی زمین کا چکر لگایا تھا۔ اس نے بہت ہی عمدہ زمین لی تھی۔ خورو کی سادگی سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ خود منصف بن کر وہ ایک تہائی حصہ غصب کر چکا تھا۔ پھر گاؤں والوں سے اس بات کو چھپانے کے اس نے حیلے کئے تھے۔ باڑیں اونچی لگائی تھیں۔ جگہ جگہ خرمانی کے پودے اگائے تھے۔ "درخت زیادہ ہوں تو زمین کم دکھائی دیتی ہے۔" اس نے سوچا۔

مگر گاؤں والے تو اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ کیونکہ خورو نے خامر کے ہر فیصلے کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ کوئی شکایت نہ کی تھی لہٰذا انھوں نے بھی کسی چیز پر غور نہ کیا۔

چند فصلوں کے اُٹھ جانے کے بعد خامر مطمئن ہو گیا۔ اب وہ خورو سے دھوکے سے حاصل کئے ہوئے حصے کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے مسرور ہو کر سرسبز کھیتوں کو دیکھا، ہوا سرسرائی تو دھپ سے چند خرمانیاں اُس کے قدموں میں آن گریں۔ "تم سب اب میری ہو" اس کا سینہ تن گیا۔

"بات پرانی ہو گئی ہے۔ خورو نے دوستی کا پھر سے ہاتھ بڑھایا ہے وہ ویسے ہی کمزور اور بے وقوف سا ہے صرف ایک بیٹے والے کا زور ہی کتنا ہوتا ہے۔ پھر بھلا میرے سات بیٹوں کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے وہ۔ ایسے کم عقل بھائی کے بھی بہت فائدے ہیں۔ اس سے اب ملنا چاہیئے۔" خامر نے ارادہ کیا۔

خامر درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا تو دنیا ہی بدلی تھی۔ یہ وہ زمین نہ رہی تھی جو خامر نے بیکار سمجھ کر خورو کو دی تھی۔ چٹانوں اور گرے پڑے پتھروں کی جگہ لہلہاتے کھیت تھے۔ ان کو سیراب کرتی پانی کی نالیوں کا بندوبست موزوں تھا۔ بنے اور اٹ صفائی سے بنے تھے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر، ٹیلوں کو ہموار کر کے کھیت بنائے جا چکے تھے۔ ان کی زرخیزی عیاں تھی۔ خرمانی کے درختوں میں بھی اضافہ کیا جا چکا تھا۔ سرسبز کھیت، جا بجا شفاف پانی کی نالیاں، چلنے کے راستے، خورو کا صاف ستھرا گھر ـــــ اور پھر کس اعتماد اور مسکراہٹ سے اُس نے خامر کو خوش آمدید کہا! ـــــ خامر تو دھک سے ہو گیا۔

خورو اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنی ترقی کر جائے گا کہ برابری کے امکان پیدا ہونے لگیں!! خامر نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔ اس کا انداز بدل گیا۔ وہ خفگی کا تاثر لیئے خورو کے آنگن میں کچھ دیر کے لئے رُکا۔ اُکھڑی اُکھڑی سی چند باتیں کیں اور واپس ہو لیا۔

"یہ کیسی ملاقات ہے۔ اتنے سالوں کے بعد آئے بھی تو ایسے جیسے ناراض ہوں۔ اس سے تو نہ ہی آتے تو اچھا تھا!" خورو کے بیٹے نے کہا۔

جلد ہی خامر نے اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا "زمین کا بٹوارا پھر سے کیا جائے گا۔ تم بہتر اور زیادہ زمین کے مالک بن بیٹھے ہو۔ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ میں تمہیں چھوٹا سمجھ کر خاموش رہا۔ میری زمین کم ہے اور کمزور بھی ہے۔ میرے سات بیٹے ہیں۔ ایسی صورت حال میرے لئے بہت تکلیف کا باعث ہے۔ تم محض ایک بیٹے کے باپ ہو۔ پھر بھی اتنی بہت سی زمین ہضم کر گئے اور تمہیں خیال تک نہ آیا!"

"ہمیں انصاف چاہیئے اور انصاف ہو کر رہے گا!" خامر کا بڑا بیٹا ہاتھ ہلا ہلا کر غرایا۔ اُس کے ہاتھ بھی عجیب تھے انگوٹھے کے ساتھ ایک اور بٹن نما چھوٹی سی انگلی تھی جس کا ناخن پچکا ہوا تھا۔ جب وہ غصہ میں ہاتھ ہلاتا تو خورو اُس کی بدکلامی سے بے نیاز اس کے اجنبی ہاتھ کو دیکھا کرتا اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی جانور کا پنجہ ہو۔

سب نے اتنا واویلا مچایا کہ خورو کچھ پشیمان سا ہو گیا۔ شاید وہ سچ ہی کہتا ہے۔ غلطی غالباً مجھ سے ہوئی ہے۔ بات تو ساری انصاف کی ہے۔ پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ زمین کا بٹوارا پھر سے کر لیتے ہیں۔ مگر اب کے بیچ میں ایک ضامن ہونا چاہیئے جو منصف ہو اور اپنی بات کا پکا ہو تاکہ اگر چند سال بعد پھر سے جھگڑا اٹھے تو وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اب کی تقسیم پکی اور مستقل ہونی چاہیے۔ خورو نے تہیہ کیا اور خامر کے گھر روانہ ہو گیا۔

"تو پھر ضامن زمین کو بنا لیتے"، خامر نے کہا۔

خورد کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر خامر بولتا چلا گیا "زمین سے بہتر ضامن کوئی نہیں۔ یہی تو پرورش کرتی ہے۔ پالتی ہے۔ دیتی ہے۔ یہ انصاف کیسے نہیں کرے گی۔ انصاف تو اس کی گھٹی میں ہے۔"

خورد مطمئن ہوگیا۔ "اب زمین جانے اور اس کا فیصلہ۔" اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ صبح زمین جو فیصلہ کرے گی وہ اسے بخوشی قبول کرے گا۔" ____ اس رات خورد بے فکر سویا۔

صبح ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ آسمان صاف تھا۔ تارے ماند تھے اور فضا ہلکی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ ایسے میں خامر کے گھر کا دروازہ کھلا۔ وہ اور اس کا بڑا بیٹا کدال لئے باہر نکلے تو اُن کے قدموں کی آہٹ سے اُن کے دروازے کے قریب ہی اگی انگوروں کی بیل چونک گئی۔

"یہ کیا ہے؟" خوشوں نے سر اٹھایا۔

اُن کی نیتوں کو بھانپتے ہی انگور شرما گئے۔ انھوں نے پتوں میں منہ چھپا لیا۔ پھر جہاں جہاں اُن کے قدم پڑے فضا میں ایک ارتعاش دوڑتا گیا۔ درخت اور بوٹے چونک اُٹھے۔ خرمانیاں رو پڑیں۔

"ایسا نہ کرو" انھوں نے التجا کی "اس میں برکت نہیں" وہ سسکیں۔ مگر ان کا مفہوم کون سمجھتا۔ یہاں تو لالچ حواس پر سوار تھی اور عقل حسد کی آگ میں پھنک رہی تھی۔

خورد کے کھیت شروع ہوگئے۔ پگڈنڈیوں نے غیر قدموں کے بوجھ کی شکایت کی۔ اٹ مچل گئے۔ پتھر چیخے اور جھاڑیوں نے خار پھیلا کر اور خامر کے لباس کو الجھا کر اُسے روکنا چاہا۔ چاند نے بادلوں کی آڑ لے کر فضا سے روشنی گل کر دی تاکہ وہ یہ غلط کام نہ کر سکے مگر خامر کچھ نہ سمجھا۔ جب دل اتنا سخت ہو جائے تو ایسی ہلکی دستک کہاں سنائی دیتی ہے۔

اس نے جب کدال اٹھائی تو زمین نے اپنا سینہ سخت کر لیا۔ مگر بے رحم نے وار پہ وار کئے ____ اپنے ہی ضامن کے سینے پر وار۔ جب ایک اچھا بڑا سوراخ تیار ہوگیا تو اس نے اپنے بیٹے کو نیچے اتر جانے کا حکم دیا۔ یہاں چھپ جاؤ۔ میں تمہارے گرد پتھر اور اوپر جھاڑیاں رکھ کر ہلکی مٹی سے تمہیں چھپائے دیتا ہوں۔ ویسے بھی ہم زیادہ نزدیک نہیں آئیں گے۔ تمہارا جواب بلند ہونا چاہیئے۔ اسے سنتے ہی خورد مطمئن ہو جائے گا۔ پھر میں اس کے جاتے ہی آکر تمہیں نکال لوں گا۔"

اس کا بڑا بیٹا شرارت سے مسکرایا۔ الوداعی انداز میں اپنا پنجہ نما ہاتھ ہلایا اور سوراخ میں اتر گیا۔ خامر نے کمال احتیاط سے سوراخ کو ڈھانپا۔ جب وہ آخری جھاڑی رکھ رہا تھا تو اس کے بیٹے نے سر اٹھا کر ہنستی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ خامر انہیں آنکھوں کا تاثر دل میں لئے، کدال کندھے سے لگائے تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

پو پھٹتے ہی دونوں بھائی خورد کی زمین میں خامر کے بنائے ہوئے سوراخ سے ذرا فاصلے پر تھے۔ خورد کا ایک بیٹا اور خامر کے چھ بیٹے اس کے ساتھ تھے۔

"بڑا کہاں ہے؟" خورد نے پوچھا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ گھر میں آرام کر رہا ہے۔" خامر نے جواب دیا۔

خامر کے اندر ایک تلاطم تھا۔ مرتعش لہریں اس کے وجود کو جکڑے ہوئے تھیں اور وہ ہوس کے پھندوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ شدت سے یہ خواہش کر رہا تھا کہ اس کی ترکیب کامیاب ہو۔ دوسری طرف خورد تھا مطمئن اور پرسکون۔ اس کی

نہ کوئی اُمید تھی۔ نہ وابستگی، نہ خواہش، سارا فیصلہ اس نے زمین پر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آزاد اور ہلکا پھلکا کھڑا تھا۔ اپنے ضامن پر کسے اعتماد تھا۔ "زمین دھوکا کبھی نہیں دیتی!" اسی ایمان پر وہ قائم تھا۔

"تم پوچھو،" خامر کی آواز لرزی۔

سوال خورو نے ہی کیا۔ "ہم میں سے زمین کس کے پاس زیادہ ہے؟ اے زمین! اے ہماری ضامن! بتا!!!" اس کی پراعتماد اور حلیم آواز گونجی۔

کچھ لحظہ خاموشی رہی۔ ان چند ساعتوں میں خامر پر جیسے ایک مدت گزر گئی۔

پھر ایک بھاری لرزتی آواز سنائی دی۔ "خورو کے پاس!"

یہ واضح آواز سب نے سنی۔ اس میں لرزش کو سب نے محسوس کیا۔ اس لرزش کے ساتھ اُن کے وجود بھی تھرائے۔ فضا کانپی، اشجار لہرائے۔ اس روز زمین خود بھی لرزی تھی۔

خورو نے اسے سُنا اور تسلیم کر لیا۔ فیصلہ سننے کے بعد بھی اس کا اعتماد اور سکون برقرار ہے۔ "انصاف کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ اسی میں سب کی عافیت ہے۔" یہ اُس کے اندر کی سوچ تھی۔

خامر کی نگاہیں خورو کا تعاقب کرتی رہیں۔ جوں جوں خورو دور ہوتا گیا، خامر کا حوصلہ واپس آتا گیا۔ اپنی فتح کا احساس آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر چھانے لگا۔ مگر اس جیت کے باوجود وہ اس اعتماد سے محروم تھا جو خورو کی تنی پشت سے عیاں تھا۔ جب خورو اپنے گھر پہنچ گیا تب خامر نے نگاہیں لوٹائیں اور جھاڑیوں کے نیچے کھُدے گڑھے کو دیکھا۔ پھر خامر نے سوراخ میں سے اپنے بیٹے کو باہر نکالنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مٹی ہٹائی، جھاڑیاں دور کیں، پتھر پرے رکھے، بیٹے کو آواز دی اور مدد کے لئے ہاتھ نیچے لٹکایا مگر سوراخ خالی تھا۔ اُس کا بیٹا وہاں نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے گھبرایا، مگر اس نے سوچا وہ کہاں جا سکتا ہے یہیں کہیں ہو گا۔ اس نے بیٹے کو آواز دی "تم کہاں ہو بیٹا؟"

"یہاں ہوں۔" ذرا دور کھیت کے دوسری طرف سے آواز آئی۔ خامر لپک کر وہاں پہنچا۔ زمین سپاٹ تھی۔ اسے لگا زمین کے اندر سے آواز آئی ہو۔ اس نے زمین کھود ڈالی مگر کچھ نہ نکلا۔

سارا دن خامر اور اس کے چھ بیٹے آوازیں دیتے اور زمین کھودتے رہے۔ انھوں نے کھیت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارا ہی کھود ڈالا مگر خامر کو اپنا بڑا بیٹا پھر نہ ملا۔ بس اُس کی آواز ہی اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

وہ رات خامر پر ایک عذاب کی رات تھی۔ اپنے لاڈلے بیٹے کی ہنستی آنکھوں کی یاد کی وحشت اسے گھیرے رہی۔ صبح ہوئی تو اُس کے لئے نئی قیامت برپا ہو گئی۔ اس کے سارے بیٹے اپنے بستروں پر مردہ پائے گئے۔

اس کے بعد خامر نہ کبھی گھر سے نکلا، نہ کبھی زمین کا رُخ کیا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، وہ کھانے پینے سے بھی رہ گیا۔ خورو نے ایسے غم کے وقت اپنے بھائی کی ہر طرح دل جوئی کی کوشش کی مگر چھوٹے بھائی کی قربت اُس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالتی۔ اُس کی سانس رکنے لگتی اور نزع کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اسی لئے عزیزوں کے سمجھانے پر خورو نے خامر کے گھر جانا چھوڑ دیا۔

خورو پر وہ کھیت بھی اب بھاری تھا۔ وہاں کی عدالت کے انصاف نے اُس کے بھائی کو سنگین سزا دی تھی۔ اُس نے وہاں کے راستے کو ہی بند کرنے کا سوچا تاکہ وہاں کوئی گذرگاہ ہی نہ رہے۔ وہ کدال لے کر سارا دن اُس کھیت میں مصروف رہا۔

اس نے پتھروں اور جھاڑیوں سے راستہ بند کیا، پانی کی نالیوں کا رخ موڑا، پھر نالیاں بند کیں۔ جب وہ آخری نالی بند کر رہا تھا تو اسی سوراخ میں سے جہاں اُس کا بھتیجا غائب ہوا تھا، ایک جانور نکلا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے چار پاؤں تھے، گول سا منہ تھا اور بالوں سے مرصع لمبی دم۔ اُس کی کھال بھورے رنگ کی تھی۔ خورو ٹھٹک گیا۔ اُس نے اس طرح کا جانور پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، مگر وہ جانور ایک پالتو کی طرح اُس کے قدموں میں لوٹنے لگا اور اُس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ جانور نے دم ہلاتے ہوئے آنکھیں اٹھا کر اُسے یوں دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ خورو کچھ دیر کے لئے ٹھٹھکا۔ مگر اُس چھوٹے سے جانور کی آنکھوں میں بے بسی اُس سے برداشت نہ ہو سکی۔ اُس نے کدال چھوڑ دی، اُسے اٹھا لیا اور قریب ہی پڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ جانور کو گود میں لٹا لیا اور اُس کی پشت سہلانے لگا۔ جانور نے سر خورو کی گود میں رکھ دیا اور جیسے ہچکیوں سے رو دیا۔

جب خورو اٹھا تو جانور نے ایک اور مانوس حرکت کی۔ اپنا پنجہ اٹھا کر خورو سے ہاتھ ملانا چاہا۔ اُس کے پنجے کی پانچ انگلیاں تھیں۔ انگوٹھے کے ساتھ میں ایک ننھی سی گول سی انگلی تھی جس کا ناخن پچکا ہوا تھا۔ جاتے ہوئے خورو نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اُسے غمناک گرسنتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

خامر کے مرنے کے بعد خورو نے اُس کی زمین کو جوں کا توں رہنے دیا۔ کہتے ہیں کہ پردیس سے ایک شخص داتو سنگ کو لایا گیا۔ اُس نے خامر کی زمین آباد کی۔ ہنزہ کے لوگ جب بھی جنگ پر روانہ ہوتے تو داتو سنگ کی اولاد میں سے کوئی ایک جھنڈا اٹھاتا۔ بلتیت میں آج کل بھی دو نسلیں آباد ہیں۔ خورو کی اولاد جن کو 'خورو کوٹ' اور داتو سنگ کی اولاد جن کو 'داتو سنگ کوٹ' کہتے ہیں۔

خامر کے بیٹے جس سال مرے، اُسی سال ہنزہ سے بہت دور 'مسگر'، 'خان والی قلعہ' سے آگے بلند چراگاہوں میں 'قرکش' اور 'منتاکا'، 'تلک'۔ 'قارا جوکر'، 'تنگ دم باش' کی وادیوں میں اور اُن دروں کے گرد جو کشمیر کو جاتے ہیں، ایک عجیب سا جانور نمودار ہوا۔ یہ جانور زمین کے اندر کئے گئے سوراخوں، اور تنگ غاروں میں چھپ کر رہتا ہے۔ سال میں صرف چار ماہ کے لئے باہر نکلتا ہے۔ گھاس اور کھمبیوں وغیرہ پر گزارہ کرتا ہے۔ اپنی خوراک کا ذخیرہ نہیں کرتا۔ اپنی نشو و نما کے لئے کسی اور زندہ جانور کا شکار بھی نہیں کرتا۔ ساری سردیاں تہ زمین بھوکا سویا رہتا ہے۔ ہنزہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ خامر کی اولاد مرنے کے بعد اس جانور میں ڈھل گئی۔ اسے MARMOT کہتے ہیں۔ یہ آج کل بھی اُن پہاڑوں پر پایا جاتا ہے۔

پارس کا پتھر

سید مشکور حسین یاد

پہلی بات جو عقلِ خالص کے بارے میں بتانے کی ہے وہ یہ ہے کہ عقلِ خالص کوئی خشک یا بنجر قسم کی چیز نہیں ہے زندگی کے سارے نور، سارے راگ رنگ، ساری مہکاریں، ساری نرمیاں، ساری ملائمتیں اور سارے ذائقے اس کے مرہونِ منت ہیں۔ آدمی عقلِ خالص سے مستفید ہونا سیکھ لے تو زندگی کی ساری تازگیاں، سارے خزانے اس کے قدموں میں آگرتے ہیں عقلِ خالص کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ اس کے سایے میں آکر موت ایک وقفے کی صورت تو اختیار کر سکتی ہے، ہلاکت کبھی نہیں بنتی۔ ویسے موت ہلاکت کی صورت اختیار کرتی ہی اس وقت ہے جب عقلِ خالص، خالص نہیں رہتی یعنی جب اس میں کوئی ملاوٹ آجاتی ہے عقلِ خالص کی دوسری بڑی خصوصیت جس کو میں یہاں دوسرا بڑا کمال کہوں گا یہ ہے کہ اس کا تعلق حقیقتِ عظمیٰ سے براہِ راست قائم ہوتا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے دوسری تمام حقیقتیں عقلِ خالص کی ایک طرح سے تابع ہو جاتی ہیں۔ تابع یوں کہ عقلِ خالص دوسری تمام چیزوں کو ان کے اپنے اصل مقام پر رکھتی ہے انہیں سر پر نہیں بٹھاتی — چیزیں اپنے اپنے مقام پر رہیں تو عقلِ خالص کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ دنیا میں ظلم برپا نہیں ہونے دیتی۔ ظلم اشیا کو ان کے اصل مقام سے ہٹا دینے ہی کو کہتے ہیں نا — اور ظاہر ہے جب ظلم نہیں ہونے پائے گا تو عدل کا شعور بھی تیز سے تیز تر ہوتا جائے گا۔ اس طرح ہم عقلِ خالص کی تعریف میں یہ بات بھی نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بدولت آدمی میں قیامِ عدل کی جرأت اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔

عقلِ خالص کی تعریف میں ایک نہایت قابلِ غور حدیث سننے میں آئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ "جب خدا نے عقل کو تخلیق کر لیا تو اس کو بولنے کی قوت عطا فرما کر اس سے کہا 'آگے آؤ' تو وہ آگے آگئی۔ پھر اس سے کہا 'پیچھے ہٹو' تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس پر باری تعالےٰ نے فرمایا اپنے عزت و جلال کی قسم میں نے تجھ سے زیادہ محبوب کوئی چیز پیدا نہیں کی" آج کے جدید ذہن کے لئے اس حدیث میں غور و فکر کا بہت سا سامان موجود ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ عقلِ خالص میں لچک بھی ہوتی ہے اور اپنے انداز کا ایک کٹرپن بھی۔ لیکن اس کی لچک اور کٹرپن مادہ پرستانہ نہیں ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ عقلِ خالص میں جو لچک پائی جاتی ہے وہ نہ تو تشکیک کی بنا پر ہوتی ہے نہ مادر پدر آزاد ہونے کے سبب سے اور نہ کسی بے اصولی کی وجہ سے۔ اس کی لچک کی بنیاد تمام تر علم و آگہی کے باعث ہوتی ہے اور علم و آگہی بھی وہ جو براہِ راست حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سے انسان تک پہنچتے ہیں۔ حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والا علم کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ یہ تھوڑا تو ہو سکتا ہے لیکن ناقص کبھی نہیں ہو سکتا — اسی لئے اس علم کے باعث جو یقین پیدا ہوتا ہے کم سمجھ لوگ اسے کٹرپن (RIGIDITY) سمجھ بیٹھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم عقلِ خالص کو لُب کے نام سے پکارا گیا ہے۔ لُب کی تعریف علما اور حکما نے کچھ اس طرح کی ہے کہ لب اس عقلِ خالص کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے انسان حقیقتِ عظمیٰ کا ادراک کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ادراک کو حاصل کرتے وقت انسان

کے سامنے مادی دنیا سے متعلق کوئی جذبہ، کوئی احساس، کوئی خواہش موجود نہیں ہوتی۔ وہ تو اس وقت اصل حقیقت کو جاننے اور معلوم کرنے کا تمنائی ہوتا ہے اور اس کی یہ تمنا عقلِ خالص کے ذریعہ بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ بڑی حد تک۔ میں نے اس لئے کہا ہے کہ عقلِ خالص کے ذریعے ہمیں وحدت کا جو ادراک اور شعور حاصل ہوتا ہے اس میں بلا کی وسعت ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ شعور بے شمار علوم کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔ عقلِ خالص کا سب سے بڑا کمال ہی یہ ہے کہ وہ چشم زدن میں انسان کو حقیقتِ عظمیٰ کے ادراک اور شعور سے مالا مال کر دیتی ہے ۔۔۔ عقلِ خالص میں یہ صلاحیت کیوں پائی جاتی ہے؟ ۔۔۔ اس لئے کہ عقلِ خالص تمام عقول کا نچوڑ ہوتی ہے۔ ساری عقلیں ایک طرف اور عقلوں کا یہ نچوڑ یعنی بقول قرآنِ حکیم لُب ایک طرف ۔۔۔ گویا عقلِ خالص یا لُب کے ذریعہ آپ تفصیل میں نہیں جاتے بلکہ آپ کو تمام علوم کا نچوڑ حاصل ہو جاتا ہے جس نچوڑ کو ہم بلا خوفِ تردید روحِ علم اور جانِ ادراک کہہ سکتے ہیں ۔۔۔ اس ضمن میں حیران کن بات یہ ہے کہ کسی شخص میں علم اور ادراک ہو یا نہ ہو لیکن ہر عام اور معمولی شخص میں یہ روحِ علم اور جانِ ادراک ضرور موجود ہوتی ہے۔ عقلِ خالص کے ساتھ ایک تماشا یہ بھی ہے کہ آپ جانِ علم کے اس جن کو کائنات کی بوتل میں بند نہیں کر سکتے۔ ویسے عقلِ خالص کائنات کی ہر چیز سے جھلکی پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ایسی کون سی شے ہے جس سے عقلِ خالص کے ہونے کا ثبوت فراہم نہ ہوتا ہو۔ کیا گھاس کا ایک تنکا اور کیا سات آسمان، سبھی عقلِ خالص سے توجہ اور التفاتِ خاص کے طلبگار ہیں۔ عقلِ خالص کی توجہ کے بغیر ان سب کی حیثیت صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ عقلِ خالص چونکہ کوئی بھید نہیں ہے اس لئے قدرت نے ہر شخص کو بڑی فراوانی کے ساتھ عقلِ خالص عنایت فرمائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عقلِ خالص چونکہ ایک بہت بڑا یا واحد سب سے بڑا راز ہے اس لئے قدرت نے اپنی انتہائی فیاضی کے باعث کسی شخص کو اس سے محروم نہیں رکھا۔ دیکھئے نا قدرت چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں میں تو کفایت شعاری سے کام لے سکتی ہے لیکن بڑی بڑی باتوں میں اس سے غیر معمولی طور پر فیاض ہوئے بغیر کیونکر رہا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی آپ جانتے ہیں اندازہ چھوٹی باتوں ہی کا لگایا جاتا ہے۔ بڑی باتوں کا تو اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ بے اندازہ ہونے کی وجہ ہی سے تو بڑی باتیں بڑی ہوا کرتی ہیں۔ خواہ وہ بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ معلوم ہو رہی ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقلِ خالص کو خالص کیسے رکھا جائے کیونکہ ذرا ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ خالص نہیں رہتی۔ ادھر انسان کا حال یہ ہے کہ اسے کسی چیز کو چھوئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز خالص نہیں لیکن چیز کو پرکھنا عقلِ خالص کا ذمہ ہے۔ آدمی عموماً عقلِ خالص کے بغیر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہے اس لئے اکثر اوقات مارا جاتا ہے۔ یعنی اشیاء عالم میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ گھٹیا قسم کی موت یا ہلاکت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی شے سے آگے نہ بڑھ سکے اور اسی میں الجھ کر رہ جائے۔ واضح رہے کہ شے کو سمجھنا اور شے میں الجھ کر رہ جانا بالکل دو مختلف عمل ہیں۔ بنی نوعِ آدم کے ساتھ عام طور پر ایک گھپلا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی ایک بڑی تعداد شے کے ساتھ الجھنے کو سمجھنا سمجھتی ہے اور سمجھنے کو الجھنا۔

اس الجھن اور غلط فہمی سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان عقلِ خالص کی اصل ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یہ کوشش اپنی جگہ قطعاً مشکل نہیں، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوشش اپنی جگہ بے حد آسان ہے کیونکہ عقلِ خالص ایک اقرار ہے، ایک اعلان ہے، ایک خبر ہے، جس کا جس قدر زیادہ یقین کے ساتھ اعتبار کیا جائے اسی قدر اعتبار کرنے والے شخص کی زندگی میں صحیح قسم کا وقار اور تحمل پیدا ہوتا ہے۔ یقینِ کامل کے باعث اس اقرار، اعلان اور خبر میں پارس کے

پتھر کی سی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جس کے ذرا سے چھو جانے سے کائنات کی ہر شے کا کندن بن جانا یقینی سمجھیے۔ لیکن آپ جانتے ہیں پارس کا پتھر تو ایک خیالی چیز ہے اور عقلِ خالص ایک ٹھوس حقیقت۔ گویا عقلِ خالص کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسی ٹھوس حقیقت موجود ہے جس میں پارس کے خیالی پتھر کی وہ تمام تاثیر قائم و دائم ہے جو کائنات کی ہر چیز کو کندن یعنی بامعنی بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اصل میں انسانی ذہن نے پارس کے خیالی پتھر کو بھی اسی لئے تخلیق کیا کہ وہ عقلِ خالص کو استعارے کے ذریعہ ٹھوس شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ عقل کا پتھروں کے ساتھ ایک خاص قسم کا رشتہ قائم ہے۔ قرآن پاک نے اس رشتہ کا ذکر نہایت دل نشیں انداز میں کیا ہے۔ سورۂ بقر کی ۷۴ ویں آیۂ مبارکہ میں بنی اسرائیل سے اس طرح خطاب ہوتا ہے "پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے وہ پتھر ہوں بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت کیونکہ بعض پتھروں میں سے تو چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی اُبلنے لگتا ہے اور بعض تو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اگر انسان عقلِ خالص کے اقرار سے بے بہرہ ہو جائے یعنی توحید پر اس کا ایمان نہ رہے تو اس کا دل پتھروں سے بھی زیادہ پتھر اور گیا گزرا ہو جاتا ہے کیونکہ پتھر تو پھر بھی کسی نہ کسی انداز میں توحید کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، آدمی تو اقرارِ توحید کی اس فطری صلاحیت یعنی عقلِ خالص کو فراموش کر کے جمادات کے درجے سے بھی کہیں نیچے چلا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت انسان اپنی انسانیت کے اصل مرتبہ کو حاصل کرنے کا آرزومند ہوتا ہے تو پھر اسے انہی پتھروں کے ساتھ ایک الگ نوعیت کا رشتہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ ویسے تو اس وقت بظاہر یہ پتھر پوری کائنات کے زور بازو کی نمائندگی کرنے پر تلے ہوتے ہیں یعنی خارجی قوتیں انسان کو اس کے اصل مرتبے پر آنے سے بڑی شدت کے ساتھ روکتی ہیں لیکن بباطن یہی مخالف قوتیں یعنی یہی پتھر انسان کے لئے حلالِ مشکلات ثابت ہوتے ہیں کیونکہ خارجی قوتوں کی مزاحمت انسان کو اس کی داخلی قوتوں کا صحیح اندازہ لگانے کے مواقع فراہم کرتی ہے ـــ غالب نے عقلِ خالص اور پتھروں کے اس کارآمد رشتہ کا ذکر اپنے اس مشہور شعر میں کیا ہے، جس میں اس صورتِ حال کا بیان ہے جب خارجی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے انسان کی عقلِ خالص دنیا والوں کی نظر میں جنون کی صورت اختیار کر لیتی ہے:

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

مگر مشکل یہ ہے کہ ہر اینٹ پتھر، موتی کا صدف تو ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تک نہیں جب تک انسان اپنے جنون یعنی عقلِ خالص کے ساتھ سودا نہیں کرتا۔ عقلِ خالص کے ساتھ سودا کر لیا جائے یعنی اس کے اقرارِ توحید کو صدقِ دل سے مان لیا جائے تو پھر اس عقلِ خالص میں پارس کے پتھر کی جملہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ گویا سارا مسئلہ پارس کے پتھر کے ساتھ سودا کرنے کا ہے۔ ورنہ جہاں تک پارس کے پتھر کا تعلق ہے وہ تو آپ کی عین دسترس میں ہے، آپ جب چاہیں اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔

نروان

عظمیٰ گیلانی

پچھلے ماہ مجھے کاروباری سلسلے میں مشرقِ بعید کا دورہ کرنا پڑا۔ جاپان، کوریا، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ میں بیشتر لوگ بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں اور مہاتما گوتم بدھ کی وہاں بہت پذیرائی ہے۔ عبادت گاہیں اور مندر بہت بڑے اور بے حد سجے سجائے ہیں جن میں جابجا گوتم بدھ کے مختلف اوقات کے بے شمار موڈ، دیو ہیکل بتوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں سے کئی تو خالص سونے کے ہیں۔ بدھ مت قدیم مذہب ہے اس لئے ان زیارت گاہوں کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ ان کے بارے میں اگر لکھنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ دنیا کے اس حصے میں مہاتما گوتم بدھ کا استقبال بالا دیکھ کر تاثر کی شکل میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھ پائی ہوں مجھے گوتم کی عظمت سے انکار نہیں ہے عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ ایک عظیم انسان ہونے کی حیثیت سے گوتم بدھ کی میرے دل میں بے حد عزت ہے۔ میں چاہتی تھی کہ گوتم کو اپنے دور کے دکھوں کے حوالے سے دیکھوں۔

عظمیٰ گیلانی

گوتم بدھ جی! آپ بہت بڑے انسان تھے۔ اتنے کہ رہتی دنیا تک آپ کی عظمت کے گن گائے جاتے رہیں گے۔ آپ کی بڑائی۔ آپ کی عظمت یہی تھی نا کہ لوگوں کے دکھ آپ سے برداشت نہیں ہوتے تھے۔ آپ کسی کو بیمار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دنیا کے دکھوں اور لوگوں کی مصیبتوں سے اداس ہو کر، دور افتادہ جنگلوں میں بیٹھ کر تپسیا کی تھی۔ آپ بڑے نصیبوں والے تھے گوتم بدھ جی! کہ اذیتوں سے ـــــ دکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے آپ ان سے دور چلے گئے ـــــ اور عظیم ہو گئے اور اوتار کہلائے!

میں جو آج کی انسان ہوں اور ان سب دکھوں، ان سب اذیتوں سمیت اسی دنیا میں رہے جا رہی ہوں، تو آپ سے میرا صرف یہ سوال ہے کہ میرے حصے کی عظمت کہاں ہے؟ ـــ مجھے گوتم ماننے والا کوئی کیوں نہیں ہے؟ میں بھی اپنے گھر کی شہزادی تھی ـــ میں نے بھی بہت سکھ دیکھے مگر اب اتنے سکھوں کے بعد اتنے بہت سے دکھ بھوگ رہی ہوں ـــ تو میری ولایت کہاں ہے؟ میں تو ایک ٹھکرایا ہوا انسان بن کے رہ گئی ہوں!

آپ بُرا مت مانیے گا مہاتما جی! میں اپنے طور پر اپنے آپ کو معمولی انسان نہیں سمجھتی ـــ آج آپ بڑے بڑے مندروں میں، اپنی دیو ہیکل جسامت کے ساتھ کہیں اونچے چبوتروں پر دراز نظر آتے ہیں ـــ تو کہیں لش لش کرتے سونے میں ڈھلے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں ـــ ہاتھ باندھے ـــ چہرے پر انکساری لئے ـــ موٹی غلافی آنکھیں موندے ـــــ! اگر آپ کی نیکی کام دکھائے تو ذرا اپنے ان بتوں میں تھوڑی سی روح ڈال کر آج کے انسان کو دیکھیے! ـــ ان انسانوں کو جو پھولوں کی ٹہنیاں، اگربتیاں اور موم کی شمعیں ہاتھوں میں لئے، آپ کے سامنے ہاتھوں کو جوڑے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کتنوں کو وہی دکھ ہیں، جن سے گھبرا کر آپ نے بن باس لیا تھا ـــ کیا ان کی آنے والی نسلیں بھی ان کو اسی طرح پوجیں گی جس طرح یہ آپ کو پوج رہے ہیں؟ کیونکہ آخر آج کا انسان بھی تو آنے والی نسلوں ہی کے لئے کشٹ کاٹ رہا ہے۔ دکھ بھوگ رہا ہے ـــــ لیکن یہ ولایت کسی کسی کا نصیب ہوتی ہے۔ اور آپ ان نصیبوں والوں میں سے ایک ہیں کہ جس عہد میں پیدا ہوئے اس وقت دکھوں اور مصیبتوں کے یہ معیار نہیں تھے جو آج ہیں ـــــ مہاتما جی! آج کے دکھ تو انسان کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں۔

آپ مجھے بتائیے ـــــ کہ اگر ایک بوسیدہ جھونپڑی میں آپ فاقہ زدہ جسم کے ساتھ، پیلی گدلی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر بجلی کی رفتار

سے زیادہ تیز اڑتے ہوئے جہاز میں لوگوں کو بیٹھا دیکھتے تو آپ کی کیا حالت ہوتی ۔۔؟ اگر بچے آسمانوں کو چھوتی ہوئی عمارتوں کے سائے تلے گندے کائی بھرے پانی میں ننگے دھڑنگے، پتلی ٹانگیں اور موٹے تنے ہوئے پیٹ لئے کھیل رہے ہوتے ۔۔۔ اور ان کی ناک میں سے رستے ہوئے پیلے گاڑھے مادے پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں ۔۔۔ اور پھر ایک خوش شکل بچہ صاف ستھرے کپڑوں میں، جوہڑ کے کنارے کھڑا، بڑی حیرت اور مسرت سے یہ نظارہ دیکھ رہا ہوتا ۔۔۔ اور اونچی عمارت سے ایک دھلی دھلائی عورت، ناک پر کپڑا دھرے اپنے اس بچے کو گھسیٹتی ہوئی، ٹھنڈی خوشبودار عمارت میں لے جاتی ۔۔۔ تو اس وقت آپ پر کیا گزرتی؟

کیا یہ دکھ آپ برداشت کر لیتے کہ آپ کی نسل ۔۔۔ انسانی نسل کی اہمیت اس دنیا میں گندی نالی کے کیڑے جتنی بھی نہیں؟ آپ کے بچوں کی خوراک ان عمارتوں کے بچے ہوئے کوڑے میں ہوتی؟ آپ کا بچہ بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتا؟ آپ کی بیوی آپ کا آٹھواں بچہ جنتے جنتے خوراک اور خون کی کمی کی وجہ سے بچے سمیت جان دے دیتی اور اس کی سوکھی لاش کے پاس سات کلبلاتے بچے ریں ریں کرکے رو رہے ہوتے؟ ۔۔۔ آپ کی جوان بیٹی کو آپ کا داماد مار مار کر ادھ موا کر دیتا کہ آپ نے اسے منہ مانگا جہیز نہیں دیا؟ ۔۔۔ ان سب باتوں کو بھی چھوڑیئے ۔۔۔ چلئے آپ شہزادے ہی ہوتے ۔۔۔ محلوں دو محلوں میں ہی رہ رہے ہوتے لیکن توجہ اور پیار اور محبت کو ترس رہے ہوتے؟ انسانوں سے پیار کی بھیک مانگ رہے ہوتے؟ اور لوگ آپ سے جان چھڑا کر بھاگ جاتے کہ ان کے پاس پیار دینے کا وقت نہیں ہے، یا پیار دینے میں ان کا کوئی فائدہ ۔۔۔ کوئی منافع نہیں ہے، اس وقت آپ اپنے محل میں اکیلے پن سے تڑپتے اور لوگ آپ کے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے؟ ۔۔۔ اس وقت ۔۔۔ مہاتما جی! ۔۔۔ کیا ہوتا ۔۔۔؟

مجھے دیکھئے ۔۔۔ میں ان سب دکھوں کے ساتھ زندہ ہوں ۔۔۔ یہ سب کچھ برداشت کر رہی ہوں پھر بھی اس دنیا میں رہے جا رہی ہوں۔ محبتوں کے لئے لوگوں کے آگے جھولی پھیلاتی ہوں ۔۔۔ اور لوگ پاگل کہہ کر مجھے پتھر مارتے ہیں۔ میرا جسم زخموں سے چور چور ہے تھکن سے میری آنکھوں کے گرد سیاہ خوفناک حلقے پڑ گئے ہیں ۔۔۔ آپ اس عہد میں ہوتے تو دیکھتے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھ رہا ہے ۔۔۔ میرے جذبات میرے لئے گالی بن گئے ہیں ۔۔۔ میں انسانوں سے پیار کے رشتے جوڑتی ہوں اور انسان ان رشتوں کو توڑ مروڑ کر پیروں تلے روند دیتے ہیں ۔۔۔ مہاتما جی! میرے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے۔ بتایئے میں کہاں جاؤں؟ ۔۔۔ میرے پاس تو کوئی جنگل بھی نہیں ہے ۔۔۔ ناگ دیوتا بھی نہیں ہے جو میرے سر پر اپنے پھن کی ڈھال پھیلا کر بیٹھ جائے ۔۔۔ بلکہ یہ ناگ تو میرے چاروں طرف پھن اٹھائے بیٹھے ہیں، جو مجھے خود بھی ڈستے ہیں اور اپنے سنپولیوں سے بھی ڈسواتے ہیں ۔۔۔ اور تو اور گوتم جی! میرے آنسو تک بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں! آپ کو تو پتہ نہیں لیکن آج کے دور میں کوئی کسی کے لئے نہیں روتا۔ مرجانے پر بھی نہیں ۔۔۔ میں رو رہی ہوں ۔۔۔ چیخ چیخ کر رو رہی ہوں، لیکن میری یہ فریاد کوئی نہیں سن رہا ہے ۔۔۔ آپ ہی بتایئے کہ اگر دل میں چبھن نہ ہو تڑپ نہ ہو تو کیا آنکھوں سے آنسو نکل سکتے ہیں؟

آپ کے دل میں بھی تڑپ تو تھی جو آپ محل محلے چھوڑ کر جنگل میں جا بسے تھے ۔۔۔ اور ولی اور اوتار کہلائے تھے ۔۔۔ میری تڑپ لوگوں تک کیوں نہیں پہنچ رہی ہے؟ میں کیوں بے سُرا ساز بنی بے ڈھنگی آوازیں نکال رہی ہوں؟

گوتم جی! بس ایک مہربانی کریں۔ میرے دور کے انسان میں اپنے دل کی تڑپ اور کسک ڈال دیں تاکہ چاہے میرے آنسوؤں، میری چیخوں، میری آہ و بکا کا یہ لوگ اثر نہ لیں ۔۔۔ لیکن انھیں محسوس تو کر لیں۔ میری چیخوں کے ساتھ آواز ملا کر ہنسیں تو نہیں ۔۔۔ گوتم جی! اگر آپ نے یہ نہ کیا تو میں چیخ چیخ کر دنیا کو بتا دوں گی کہ:

میں نے جی کر وہ دکھ بھوگے ۔۔۔ جن سے گوتم بھاگ گئے تھے!

اور رہتی دنیا تک میری یہ چیخیں آپ کی بزرگی پر طنز بنی، آپ کے آس پاس گھومتی اور گونجتی رہیں گی!

صبا اکبرآبادی

○

پوچھیں ترے ظلم کا سبب ہم
اتنے تو نہیں ہیں بے ادب ہم

الزام نہیں ہے فصلِ گل پر
خود اپنے جنوں کا ہیں سبب ہم

مافوقِ حدودِ جستجو تم
آوارۂ منزلِ طلب ہم

ساحل پہ سوائے خاک کیا تھا
غرقاب ہُوئے ہیں تشنہ لب ہم

کرتے ہیں تلاشِ آدمیت
دنیا میں ہیں آدمی عجب ہم

فرصت ہو تو آکے دیکھ جاؤ
مدّت سے پڑے ہیں جاں بلب ہم

کب زخم لگائے تھے کسی نے
میزان لگا رہے ہیں اب ہم

باہر سے ہیں مومنِ سراپا
اندر سے تمام بولہب ہم

ہر شاخ پہ گل کھلے ہُوئے تھے
گلشن سے صباؔ چلے تھے جب ہم

محشر بدایونی



اِک موجِ رنگ اُفق کی کرنوں سے مِل رہی ہے
یہ پھول کھل رہا ہے یا صُبح کھل رہی ہے

ہمسائے میں بھی ہو گی ایسی نہ وضعداری
گھر بیٹھے ہی برابر تنہائی مل رہی ہے

گلیوں میں کیسی رونق اور کیا یہ حال اپنا
سارے ہی دن طبیعت کچھ مضمحل رہی ہے

کچھ اور شہرِ جاں کے اندیشے بڑھ گئے ہیں
اَب وہ ہوائے مقتل جب معتدل رہی ہے

ہاں شہرۂ سلاسل کارِ خطا ہی ٹھہرا
کارِ خطا میں دُنیا کیا کیا مُخل رہی ہے

ہے خشک و تن بُریدہ اور صَرف یہ شجر کا
اک چوب جل رہی ہے اِک چوب پھل رہی ہے

تو بند کر نہ آنکھیں ان کھڑکیوں کی صورت
دیکھ آئنہ نہیں، اب دیوار ہل رہی ہے

شورِ جرس سے ہو گا کیا دل زدوں کو خطرہ
دل آشنا ہمیشہ آوازِ دل رہی ہے



گھر سے ہمیں جانے کی ضرورت نہیں اب کچھ
باہر کی ہوا آ کے بتا جاتی ہے سب کچھ

کیا تیز ہے یہ موسمِ بارانِ سخن بھی
لب ریزیِ دل کچھ ہے، نواخیزیِ لب کچھ

کیا دامِ فسوں زندہ چراغوں کے لیے تھے
اندازۂ شب ہم کو ہوا آخرِ شب کچھ

عام اتنا رہا شُہرۂ زر شور سرا میں
کام آئی نہیں نرمیِ تہذیب و نسب کچھ

چُپ ہیں کہ اک آشوب ملامت میں گھرے ہیں
آئے تھے سُبک لہجے لیے خیرِ طلب کچھ

اک شخص سے پیمان بہت سوچ کے باندھا
پھر ہم نے تراشا نہیں رنجش کا سبب کچھ

اے ذی ہنراں، تیز رواں، عصرِ مُریداں
ہم لوگ دُعا گو ہیں، ہمارا بھی اَدب کچھ

ضیا جالندھری



تری نگہ سے اُسے بھی گماں ہُوا کہ میں ہوں
وگرنہ دل تو مرا مانتا نہ تھا کہ میں ہوں

عجیب لمحہ وُہ دیدارِ حُسنِ یار کا تھا
اُس ایک پل کی تجلّی میں یہ کھُلا کہ میں ہوں

نہ جانے بے خبری کے وہ کس مقام پہ تھا
نظر اُٹھاتا تو ہر گُل پکارتا کہ میں ہوں

ترے جمال کی کچھ روشنی سی پڑتی ہے
بتا رہا ہے مجھے رنگِ آئنہ کہ میں ہوں

جسے بُھلا کے یہ دل مطمئن تھا مدّت سے
کل اس کے ذکر پہ اک عہدِ بول اُٹھا کہ میں ہُوں

پرِ زمانہ تو پروازِ نُور سے بھی ہے تیز
کہاں ہے کون تھا جس نے ابھی کہا کہ میں ہوں

کہاں پہ سرحدِ نابود و بُود ملتی ہے
ثبوت ہو کہ نہ ہو، اعتبار کیا کہ میں ہوں

حیات خود ہے دہانِ نہنگِ لا — یعنی
جو ہے عدم کا مسافر ہے میں چلا کہ میں ہوں

نہ رفتگاں ہیں نہ اب یادِ رفتگاں باقی
میں کیا ہوں جز رمِ یک موجۂ فنا کہ میں ہوں

مجھ ایسے ذرّوں کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہے
بگولے اِن سے اُٹھے تو پتہ چلا کہ میں ہوں

کھُلا پڑا ہے سرِ راہ بے حس و حرکت
جو ہاتھ کل تک اُٹھا چیختا رہا کہ میں ہوں

ابھی طریقِ تحمّل نہیں مزاجوں میں
ابھی قہقہوں میں ہنگامہ ہے بپا کہ میں ہوں

کہیں کہیں ابھی توقیرِ لفظ باقی ہے
سخن سنائی دیا حرفِ درد کا کہ میں ہوں

عجیب عالم ہُو تھا ضیا جب آخرِ شب
کسی کو دل نے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ میں ہوں

عبدالعزیز خالد



ہوں کیوں نہ منکشف اسرار پست و بالا کے

جمے ہیں پاؤں زمیں پر، سر آسماں کو چھوئے

نہ گھیر لیتی اگر ہم کو اُلف لیلۂ عشق،

زبورِ عقل کو ہم بھی ورق ورق پڑھتے

جو سرنوشت میں ہے اس کو ہو کے رہنا ہے

تو کس بھروسے پہ انسان جدّ و جہد کرے

اب آسماں سے صحیفے نہیں اُترتے مگر

کھُلا ہُوا ہے درِ اجتہاد سب کے لیے

زباں عطا کرے شعر ان کی بے زبانی کو

جو اپنے کرب کا اظہار کر نہیں سکتے

بہار و بہجت و عزّ و وقار اس پہ نثار

زباں سے، مال سے، جاں سے جو ظالموں سے لڑے

ہے آنسوؤں میں شفا کیسی، کیا خبر اس کو

بہائے مکر سے جو جھوٹ موٹ کے ٹسوے

سکونِ قلب سے خُوباں نے کر دیا محروم

خدا کے کتنے ہی بندوں کو اپنے جلووں سے

ہے بسکہ کام ہم ایسوں کا بھی مسیحائی

ہم آسمان پہ زندہ اُٹھائے جائیں گے

قتیل شفائی



یارو، کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بد دعا کہ اُسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

سُنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی! خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں

کاغذ کی ہے جو ناؤ تو دریا ہے آگ کا
اب کیوں کسی بھنور کے بھلا ناز اُٹھاؤں میں

اِک شب بھی وصل کی نہ مِرا ساتھ دے سکی
عہدِ فراق! آ کہ تجھے آزماؤں میں

بدنام میرے قتل سے تنہا تُو ہی نہ ہو
لا، اپنی مہر بھی سرِ محضر لگاؤں میں

اُترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اُس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اُسے قتیلؔ گلے سے لگاؤں میں



یہ غزل نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ "فنون" میں پیش کر رہا ہوں جو پہلی کوشش سے مختلف ہے۔ (قتیل)

شرمندہ انھیں اور بھی، اے میرے خدا کر
دستار جنھیں دی ہے انھیں سر بھی عطا کر

لُوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اُسی شخص سے پھر ہاتھ ملا کر

ڈر ہے کہ نہ لے جائے وہ ہم کو بھی چُرا کر
ہم لائے ہیں گھر میں جسے مہمان بنا کر

اِک موج دبے پاؤں تعاقب میں چلی آئی
ہم خوش تھے بہت، ریت کی دیوار بنا کر

ہم چاہیں کہ مل جائیں ہمیں ڈھیر سے موتی
سیڑھی کسی پُرہول سمندر میں لگا کر

درکار اُجالا ہے مگر سہمے ہوئے ہیں
کر دے نہ اندھیرا کوئی بارود جلا کر

لے اُس نے ترا کاسۂ جاں توڑ ہی ڈالا
جا کوچۂ قاتل میں قتیلؔ اور صدا کر

محب عارف



دلبری اُس رُخِ دل رُبا کی، خال و خد سے عبارت نہیں ہے
محوِ نظارۂ خال و خد کو یہ سمجھنے کی مہلت نہیں ہے

دل سے ہوتی تو ہے راہ دل کو فاصلہ ہے مگر راہ خود بھی
ایک ہو جائیں ہم آپ مل کر، عشق کی ایسی قسمت نہیں ہے

جس کو اپنی نظر جانتا ہوں اُس کے جلووں کا ہے اک کرشمہ
وہ نظر ہی نہیں جس کی ہستی اُس کی مرہونِ منت نہیں ہے

یہ بلائیں جو پیشِ نظر ہیں، یہ تو بے شک فریبِ نظر ہیں
لیکن ان سے جو طاری ہے دل پر کیا یہ ڈر بھی حقیقت نہیں ہے

بزم ہے بزم ہستی نہ ہوگی وہم زادوں کی بستی ہی ہوگی
ہیں یہاں آپ کس سوچ میں گُم، یہ کوئی کنجِ عزلت نہیں ہے

غم ہے جس عہدِ ماضی کا سب کو، اُٹھ کے آجائیں ڈھانچے جو اُس کے
بڑھ کے اُن کو گلے سے لگائے، یہ کسی میں بھی ہمت نہیں ہے

شمع پر جان دینا پتنگو! تم نے سیکھا ہے کس مدرسے میں
شمع پر جان دینا پتنگو! زندگی کی ضرورت نہیں ہے

حال اب مجھ میں کیا رہ گیا ہے مرثیہ ہوں بجھی روشنی کا
دیکھنے مجھ کو آنا کسی کا تعزیت ہے، عیادت نہیں ہے

میں محبؔ ایک شعلہ تھا یعنی ہوتے رہنے کا اک مشغلہ تھا
ہوتے ہوتے وہ شے ہو گیا ہوں جسمیں ہونے کی طاقت نہیں ہے



ڈوبنا خود چاہتا ہوں، میں اب ایسا بھی نہیں
کیا کروں لیکن جو ہاتھ آیا ہے، تنکا بھی نہیں

وضع کرتا ہوں حقیقت وہم کی تنظیم سے
میں بس اک ناظم، مجھے کچھ اور آتا بھی نہیں

اُس کا ایما ہے کہ صورت اُس کی دیکھے جاؤں میں
شوقِ بے حد کے لیے کافی یہ ایما بھی نہیں

جانتا بھی ہے مرا سورج کرامت دھوپ کی
اور سائے کی طلب سے باز آتا بھی نہیں

آگیا ہوں تنگ بھی لایعنیوں سے خواب کی
خواب سے بیدار ہو جانا گوارا بھی نہیں

مجھ میں اب کیا رہ گیا ہے میرے ماضی کے سوا
ویسے ماضی کے سوا میں کچھ کبھی تھا بھی نہیں

حملہ آور ہیں اُفق: سب مجھ پہ یعنی اب تو میں
دائرہ جس سے رہے قائم وہ نقطہ بھی نہیں

اپنے مٹنے کا بگولے کو نہیں غم، ہے یہ غم
ریگِ صحرا میں ہُوا کم ایک ذرہ بھی نہیں

میں فقط بے مایگی کا ایک پردہ ہوں محبؔ
عقل کہتی ہے رہے گا اب یہ پردہ بھی نہیں

احمد ظفر



سوچتے رہنا وہ کیا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا
اک اچنبھا سا ہوا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

رات کے جنگل میں کیوں محسوس ہوتا تھا مجھے
جلتا بجھتا اک دِیا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

رقص کرنے چند وحشی تھے الاؤ کے قریب
ایک نقارہ بجا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

بہتے پانی میں کوئی چہرہ دکھائی دے گیا
چاند بھی جس پر جھکا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

اُس طرف دریا کے کوئی نازنیں روتی رہی
اِس طرف کوئی ہنسا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

پائلیں بجتی تھیں لیکن کوئی رقاصہ نہ تھی
نغمہ گر کوئی ہُوا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

چوڑیوں کے ٹوٹنے کی اک صدا پیہم اُدھر
سر اِدھر تن سے جدا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

ریزہ ریزہ ہو رہا تھا ایک شیشے کا محل
شور سا ہوتے سنا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

دُور تک ملتے تھے قدموں کے نشاں اس دشت میں
قافلہ کوئی رکا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

رات بھر مسلا گیا تھا کتنے پھولوں کو یہاں
خوشبوؤں کا رت جگا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

دوستی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جہاں
آشنا نا آشنا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

تم وہی احمد ظفر ہو جس کے چرچے تھے بہت
بعد میں اک عکس سا تھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا

جمیل ملک

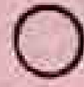


یہ حادثہ مرے خوں سے رقم بھی ہونا تھا
کہ تیرے بعد مرا سر قلم بھی ہونا تھا
میں ہم سفر تھا ترا، تجھ سے تیز تر نکلا
کہ راہبر ترا نقشِ قدم بھی ہونا تھا
مری زمین ہے تو، تیرا آسمان ہوں میں
یہ اتصالِ وجود و عدم بھی ہونا تھا
ترا وجود شبستانِ عالم موجود
ذرا رکا ہوں کہ یوں تازہ دم بھی ہونا تھا
تجھے ہم پروئے ہوئے آرزو کے رشتے میں
یہ جستجو کا نوشتہ بہم بھی ہونا تھا
نگاہِ لطف غضب ہے نگاہِ قہر کے بعد
میں جی رہا تھا کہ آخر کرم بھی ہونا تھا
بھلا ہوا بھی کبھی ایک رُخ یہ چلتی ہے
کبھی تو طرۂ دستار خم بھی ہونا تھا
مری رگوں ہی میں پلتی رہی ہے یہ بارود
کہ ریزہ ریزہ کبھی کوہِ غم بھی ہونا تھا
اُسی نے لُوٹ لیا جس پہ اعتماد کیا
ستم جمیل برنگِ کرم بھی ہونا تھا



مثالِ سنگِ نشاں رہگزر میں رہتا ہوں
وہ پا بگِل ہوں کہ سب کی نظر میں رہتا ہوں
کوئی نہیں ہے مرا حال پُوچھنے والا
میں اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتا ہوں
کبھی ہوں دردِ زلیخا کبھی ہوں یوسفِ جاں
تمہارے دل میں کبھی اپنے سر میں رہتا ہوں
کبھی ہوں سیپ کا موتی، کبھی ہوں قطرۂ خوں
درونِ بحر کبھی چشمِ تر میں رہتا ہوں
بھنور کی آنکھ میں ہے بحرِ خوں کی پہنائی
گہر بدست ہوں خوف و خطر میں رہتا ہوں
سحر کے بعد ہے پھر اور اک سحر کی تلاش
تمام رات تلاشِ سحر میں رہتا ہوں
یہ برگ و بار، یہ پھل پھول میرے نقش و نگار
میں خونِ تازہ کی صورت شجر میں رہتا ہوں
مرا ٹھکانہ یہاں بھی نہیں، وہاں بھی نہیں
وجود ہو کہ عدم، میں سفر میں رہتا ہوں
جمیل فن سے تعلق ہے جاں کا یوں جیسے
ہُنر ہے مجھ میں رواں، میں ہُنر میں رہتا ہوں

گوہر ہوشیارپوری



ہم سب ایک ڈگر کے راہی
کون اوامر، کون نواہی

اس کے ہاتھ میں ہاتھ ہمارا
فاصلے باہم لامتناہی

چاند وہی اک تارا تارا
باقی اپنی کور نگاہی

پیار میں اپنا دعویٰ کیا تھا
ہم نے تو اک بات نباہی

شاہ کب اس اقبال کو پہنچے
شاہی صرف دِلوں کی شاہی

ہر الزام ہمارے سر پر
اے اپنی ناکردہ گناہی!

سنگ اور شعر میں رشتہ گوہرؔ
ہم نے داد بھی کس سے چاہی



مانگنے کی ادا تو آتی ہو
مانگ کر پھر حیا تو آتی ہو

خود نہیں وہ تو اُن کے خواب سہی
کوئی ٹھنڈی ہوا تو آتی ہو

عشق میں ہر کمی سہی، لیکن
شرطِ صبر و رضا تو آتی ہو

زندگی اس قدر ہے اس غم میں
اہلِ غم کو قضا تو آتی ہو

اِتنا گُم کر دیا محبت نے
دل کی اپنی صدا تو آتی ہو

ایسی ارزاں ہوئی وفا کہ یہاں
اب کسی کو وفا تو آتی ہو

مانگتے اُن سے اور کیا گوہرؔ
بات اُن کے سوا تو آتی ہو

گوھر ھوشیارپوری



دریاؤں کے خواب تکنے والو
اتنا بھی نہ تشنگی کو پالو

اُمید کی اپنی صُبحِ گل ہے
یہ پھُول جہاں کہیں کِھلا لو

سو راہ میں راہ چلنے والے
ماتھے پہ شکن تو اب نہ ڈالو

یہ رات کا آخری پہر ہے
کچھ اور دِیے کی لَو بڑھا لو

نیکی کی کوئی گھڑی نہیں ہے
جس پَل بھی کما سکو، کما لو

درویش یہاں سے جا رہے ہیں
جاتے ہوئے شخص کی دُعا لو

یہ حُسنِ خیال ہے تو گوہر
تُم یار ہو جب گلے لگا لو



درد کے پھُول کھلاتے رہنا
یارو! آتے جاتے رہنا

پیار کے اپنے سُر ہوتے ہیں
اپنے سُروں میں گاتے رہنا

صبر کا پتھر چُوم ہی لیتے
کب تک سر سہلاتے رہنا

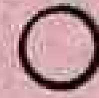
اُس کے دھیان کا دیپ جلا کے
راتوں کو چمکاتے رہنا

اُس کا کھیل شریک نہ کوئی
اُس کی راس رچاتے رہنا

مَولا! اُس کا نام سلامت
اُس کے خواب دکھاتے رہنا

لے اب چور پکڑ لے گوہر
فال بھی پھر کھلواتے رہنا

شہزاد احمد



جس نے مجھے بینائی دی ہے
آنکھ کا نور وہی مٹی ہے
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں
نیچے اک سوکھی ٹہنی ہے
دل تک ہم کیسے پہنچیں گے
یہ دیوار بہت اونچی ہے
آنکھوں کے اندر مت جھانکو
ان میں بلا کی تاریکی ہے
اک منظر میں دیکھ رہا ہوں
اور اک آنکھ سے اوجھل بھی ہے
دریا بھی سوکھے رہتے ہیں
بارش بھی ہوتی رہتی ہے
کوئی نکلتا ہی نہیں گھر سے
اور ہوا چلتی رہتی ہے
پلکوں سے آگے نہیں دیکھا
کہنے کو دنیا دیکھی ہے
ویسے تو اک پل نہیں کٹتا
پل میں عمر گزر جاتی ہے
ہم تو فقط ہیں دیکھنے والے
دل ہی فقیر ہے، دل ہی غنی ہے
سورج ہے شہزاد سروں پر
لیکن رات ابھی باقی ہے



کبھی اپنا ہی ہوا ہے نہ ہمارا تو ہے
دور ہوتا ہوا دریا کا کنارا تو ہے

دشت میں راہ سے بھٹکا ہوا راہی میں ہوں
جو ابھی تک نہیں نکلا وہ ستارا تو ہے

کیوں نہ اے دل، تجھے گرتی ہوئی دیوار کہوں
بے سہارا ہوں کہ اب میرا سہارا تو ہے

یہ الگ بات کہ ہم تیری رضا سے ڈوبے
ڈوبتے وقت جسے ہم نے پکارا، تو ہے

پہلے بھی تیرے سوا کوئی نہیں تھا موجود
اب مری راہ کی دیوار دوبارہ تو ہے

ہم ہیں پتوں پہ لرزتی ہوئی شبنم کی طرح
جو بدل ہی نہیں سکتا وہ نظارہ تو ہے

کھل کے اے دوست کبھی کھیل نہیں پائے ہم
اور جو ایک بھی بازی نہیں ہارا، تو ہے!

راسخ عرفانی



کھنڈریں دفن ہوئی ہیں عمارتیں کیا کیا
لکھی ہیں کتبۂ دل پر عبارتیں کیا کیا

حصارِ برف میں رہنا کبھی سرابوں میں
سفر کے شوق نے سونپی سفارتیں کیا کیا

تلاشِ لفظ میں عمروں کی کاوشوں کا ثمر
اندھیرے غار میں کھوئیں بصارتیں کیا کیا

کہیں بدن کے ہیں سودے کہیں ضمیروں کے
ہوئی ہیں شہر میں اب کے تجارتیں کیا کیا

سویرے آنکھ کھلی تو نظر میں کچھ بھی نہ تھا
خیال و خواب میں پائیں بشارتیں کیا کیا

دیارِ زر سے متاعِ انا بچا لائے
نظر نظر میں بھری تھیں حقارتیں کیا کیا

تنِ شکستہ کی تعمیر کے لیے راسخ
عمل میں لائی گئی ہیں مہارتیں کیا کیا



آس حسنِ گمان سے ٹوٹی
شاخ پھل کے نشان سے ٹوٹی

مل گئی خاک ہو کے مٹی میں
اینٹ جو بھی مکان سے ٹوٹی

عرضِ احوال ناشناسوں سے
رگ انا کی زبان سے ٹوٹی

جس پہ دار و مدارِ کشتی تھا
ڈور وہ بادبان سے ٹوٹی

مسئلے دوستی کے حل نہ ہوئے
گفتگو درمیان سے ٹوٹی

دستِ دشمن سے تیر کیا چھوٹا
ایک بجلی کمان سے چھوٹی

باب کرنوں کے کھل گئے راسخ
سدِّ ظلمت اذان سے ٹوٹی

محسن احسان



ذہن اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہیں ہم
اپنی ہی ذات سے اب برسرِ پیکار ہیں ہم

اتنی افراطِ زرِ حرص و ہوس کی ہے کہ بس
جنسِ بے مایہ کی صورت سرِ بازار ہیں ہم

لہلہاتے ہیں ابھی سبزۂ نورس کی طرح
اک ذرا تیز ہوا آئی تو ہموار ہیں ہم

ہم کسے دشمنِ محراب حرم ٹھہرائیں
خود ہی جو شہرِ تقدس وہ گنہگار ہیں ہم

خندہ زن پہلے تھے ہر خشتِ مکاں پر لیکن
اب تو خود لگتا ہے، گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم

ثبت ہونٹوں پہ ہے اپنے ازلی سناٹا
یوں تو ہر حرفِ صداقت کے علمدار ہیں ہم

ہم سے رکھنا ہے تعلق تو ذرا سوچ کے رکھ
جتنے آسان ہیں ہم، اتنے ہی دشوار ہیں ہم

صدفِ حرف، معانی سے ہے خالی محسن
سرِ دربارِ سخن پھر بھی گہر بار ہیں ہم



خلوص ہو تو دعا میں اثر بھی آتا ہے
شجر ہرا ہو تو اس میں ثمر بھی آتا ہے

مری سماعت و بینائی چھیننے والے
میں سن بھی سکتا ہوں، مجھ کو نظر بھی آتا ہے

تمہیں چراغ بجھانے کا زعم ہے لیکن
ہمیں طلوعِ سحر کا ہنر بھی آتا ہے

کلیسا و حرم و دیر، محترم لیکن
انھیں کی رہ میں کہیں میرا گھر بھی آتا ہے

عجیب طنز سے سب شہر مجھ سے پوچھتا ہے
بتاؤ کیا کوئی کارِ ہنر بھی آتا ہے

فلک نشیں سہی میرا خدا مگر محسن
کبھی کبھی وہ زمیں پر اتر بھی آتا ہے

محسن احسان

○

نہ کسی یار سے ناراض نہ اغیار سے ہم
شہر میں پھرتے ہیں بے یار و مددگار سے ہم

ہو کوئی دستِ غنی، رہتے ہیں کشکول بدست
اتنے مانوس ہوئے درہم و دینار سے ہم

نہ لبِ بام ستارہ، نہ سرِ راہ چراغ
کتنے شرمندہ ہیں گھر کے در و دیوار سے ہم

تو گرفتارِ محبت کو یہ معلوم نہیں
کیوں پلٹ آئے ہیں چپ کوچۂ دلدار سے ہم

دل میں تو ہیں تمنا کے بھی سوز حسم مگر
مطمئن ہو گئے اک حرفِ لبِ یار سے ہم

ہم نے پائی ہے عجب طرفہ طبیعت محسنؔ
بارہا الجھے ہیں خود اپنے طرفدار سے ہم

○

کوئی بھی نام نہ تھا لب پہ، تیرے نام کے بعد
چراغِ آئینہ روشن ہوا نہ شام کے بعد

محبتوں کے سفر میں تھکن نہیں ہوتی
یہ کیا کہ بیٹھ گئے صرف چند گام کے بعد

چراغِ انجمنِ شوق جل سکا نہ کبھی
ترے قیام سے پہلے، ترے قیام کے بعد

ہوئی تمام پرندوں کی مجلس آرائی
خموش ہو گئے دیوار و بام، شام کے بعد

جو پشت و روئے ورق پر تھا پڑھ لیا محسنؔ
کہ ناگزیر ہے ہر حرف ناتمام کے بعد

مظفر حنفی



کیا غم کہ قدر بے ہُنروں میں نہیں رہی
گنتی مری تماشہ گروں میں نہیں رہی

اب مسئلہ ہے ہم سفروں کی شناخت کا
پچھلے سفر کی دُھول سروں میں نہیں رہی

تاراسی وہ زمین ، یہ قاتل سیاہ رات
پرواز کی سکت بھی پروں میں نہیں رہی

نرگس عبث اُداس ہے بے نُور آنکھ پر
میری طرح وہ دیدہ وروں میں نہیں رہی

اپنائیت کا لمس ، رفاقت کا ذائقہ
پہلی سی ایک بات گھروں میں نہیں رہی

کانٹے ہی کھینچ دیتی تھی منزل کی آرزو
اب وہ بھی میرے ہم سفروں میں نہیں رہی

چلتی تھی یاد اُس کی مظفرؔ ہمارے ساتھ
اک چاندنی تھی رہگزروں میں نہیں رہی



اُونچے محلوں میں بیٹھا ڈر میرا ہے
پتھّر تکیہ ، مٹی بستر میرا ہے

ڈیرہ ہے دُنیا بھر کے آسیبوں کا
میں بے چارا سمجھا تھا ، گھر میرا ہے

کس سے مانگوں اپنے زخموں کا تاوان
کیا بتلاؤں ، بے شک خنجر میرا ہے

خطرے میں ہے گردن سرافرازوں کی
ان سرافرازوں میں اک سر میرا ہے

وہ مُورکھ سمجھا ہے میں گھاٹے میں ہوں
ساحل اُس کا اور سمندر میرا ہے

معصوموں کی گنتی کرنے نکلا ہوں
اپنے اُوپر پہلا پتّھر میرا ہے

جس کی جیسی سیرت ، ویسا ہی مفہوم
اک آئینہ ، شعر مظفرؔ میرا ہے

(دہلی)

انور شعور



جو سینہ سپر ہو جاتے ہیں
وہ مر کے امر ہو جاتے ہیں
گم اکثر لوگ، کہیں تجھ میں
اے راہگزر ہو جاتے ہیں
آنسو تو اندھیری راتوں میں
خورشید و قمر ہو جاتے ہیں
دُنیا میں جدھر چلتی ہے ہَوا
سب لوگ اُدھر ہو جاتے ہیں
اسبابِ سفر کی کیا پروا
اسبابِ سفر ہو جاتے ہیں
ظالم نہیں ہوتے شانت کبھی
مظلوم مگر ہو جاتے ہیں
لگتی ہے آگ تو جیسے کیا
قلعے بھی کھنڈر ہو جاتے ہیں
سینے سے جُدا، دو ایک نہیں
سب لختِ جگر ہو جاتے ہیں
کافی ہے، غزل میں شعر اچھے
دو چار اگر ہو جاتے ہیں
زنداں میں ہوا کیا آتی ہے
داخلد کے در ہو جاتے ہیں
یہ سب موجود شعور اپنے
معدوم کدھر ہو جاتے ہیں!



تنہائی سے گھر سجاؤں گا میں
صحرا میں چمن کھلاؤں گا میں
بن جائے گا ہار موتیوں کا
آنسو بھی اگر بہاؤں گا میں
دیکھو، مرا انتظار کرنا
اِک روز ضرور آؤں گا میں
گھر لوٹ کے اور کیا کروں گا
اپنے کو ذرا سُلاؤں گا میں
آزاد رکھو کہ بند کر دو
بُلبل ہوں تو گیت گاؤں گا میں
محفل میں وہ سامنے ہُوا تو
آنکھوں سے غزل سناؤں گا میں
خود سے بھی چُھپا رہا ہوں جو کُچھ
دُنیا کو بھلا بتلاؤں گا میں!
شمشاد بڑھائے جائے قامت
نیچے نہ اُتر کے آؤں گا میں
چُھپ کے نہیں مر کے دیکھ لے وہ
اندر سے نکال لاؤں گا میں
لوگو! نہ سُنو مری کہانی
بچوں کی طرح رُلاؤں گا میں
آؤ جو کبھی شعور کے گھر
انور سے تمھیں ملاؤں گا میں

سیّد مُنیر



مجھے تو میری وفا کے مآل نے روکا
تجھے نہ جانے ترے کس خیال نے روکا

بھٹک رہی تھی گلوں، عارضوں، فضاؤں پر
مری نظر کو ترے خدّ و خال نے روکا

تصوّرات میں تیری جھلک سے آنکھ کھلی
ترے خیال کو تیرے جمال نے روکا

سخاوتوں سے تری، وقت تھم بھی جاتا ہے
شبِ وصال کو شمعِ وصال نے روکا

مجھے خبر ہے، وطن اُس مقام پر ہوگا
جہاں سفر کو مرے ماہ و سال نے روکا

طلوعِ صبح مقرر سہی، پہ یوں بھی ہُوا
کبھی سحر کو شبِ بے مثال نے روکا

وفورِ شوق کے جذبات اور ریاضتِ فکر
مبالغے کو ہنر کے خیال نے روکا

منیؔر صحنِ چمن پر یہ کس کا پہرا ہے
شمیمِ گل کو نسیمِ شمال نے روکا



استعاروں میں معمّات کا حل ہے پیارے
لفظ سے شعر بنانا بھی عمل ہے پیارے

شام آواز کے رنگوں میں گھلی جاتی ہے
تیرا ہنسنا کسی نغمے کا بدل ہے پیارے

ہے اشارات و کنایات میں دُنیائے نجات
سر نکالے ہوئے پانی سے کنول ہے پیارے

سر چھپانے کو مکاں تک نہیں ملتا جن کو
اُن کے دل میں تری یادوں کا محل ہے پیارے

تیرے قبضے میں مرا شہر ہے اور وقت مرا
میری زد میں ترا ذرّہ ہے نہ پل ہے پیارے

صرف ہیئت سے نہیں صنفِ سخن کی پہچان
بات کی درد شناسی میں غزل ہے پیارے

وقت، وعدوں کی اُمیدوں کی علامت ہے منیؔر
اس بیاباں میں کوئی آج نہ کل ہے پیارے

رشید قیصرانی



سرمئی خواہشیں ، چمپئی خواہشیں
تجھ سے وابستہ میری سبھی خواہشیں

میں تھا کوتہ قدم ، پیچھے پیچھے چلا
آگے آگے چلیں بھاگتی خواہشیں

برف سوچوں کا بھی پیرہن جل گیا!
مجھ پہ جب آگریں برق سی خواہشیں

سچ تو یہ ہے کہ اب اپنے سائے سے بھی
خوف کھاتی ہیں ، راتوں جلی خواہشیں

اے سحر زادگانِ اُفق ! کیا ہوئیں
وہ مری چاندنی چاندنی خواہشیں

من کے معبد میں سب کو اماں مل گئی
جو بھی آئیں بُری یا بھلی خواہشیں

آنچ والا کبھی تو کوئی آئے گا
جل اُٹھیں گی کبھی تو بجھی خواہشیں



وہ ٹھٹھرتا ملے ، چاہے جلتا ملے
دُھوپ سائیں، مجھے میرا سایہ ملے

یہ ستارہ صفت اور وہ سورج نُما
یار مجھ سے تو اب کوئی مجھ سا ملے

کتنے قلزم ملے، سب کے سب منجمد
کوئی دریا ملے اور بہتا ملے

روشنائی بھی اب خشک ہونے لگی
ممتحن سے کہو، مجھ کو پرچہ ملے

صاف شفّاف چشموں کا پانی مجھے
جب بھی نزدیک جاؤں تو گدلا ملے

ہے ملاقات اب قریۂ اشک میں
ہم کہاں سے ملے اور کہاں جا ملے

ظفر اقبال



مُنکر ہے وہ تو اُس کے سوا اور کون ہے
اُس کا ہی کام ہے یہ، بھلا اور کون ہے

ماہِ مُبیں تو ایک رگوں میں رواں بھی تھا
بامِ خیال پر یہ نیا اور کون ہے

تُو ہی بتا کہ آئنۂ خوں میں رات دن
تیرے بغیر عکس نُما اور کون ہے

مُمکن نہیں ہے تجھ سے تو اتنی شکست و ریخت
اِس دل میں، تیرے ساختہ بتا اور کون ہے

ہے کون مجھ سے بڑھ کے توجہ کا مستحق
خود ہی بتاؤ، مجھ سے بُرا اور کون ہے

شک سا رہا ہمیشہ کہ ہے اور بھی کوئی
لیکن یہ عُمر بھر نہ کھُلا، اور کون ہے

سیلِ سفر میں شام و سحر کون ہے شریک
یعنی یہ ہمرکاب ہوا اور کون ہے

کھُل کر کبھی تو سامنے بھی آئے گا کہ وہ
کیسا ہے، کس طرف کا ہے، کیا اور کون ہے

اپنا ہی میرا شور و شغب تھا جب اس قدر
مجھ میں ظفرؔ یہ نغمہ سرا اور کون ہے

حسن عابدی



نئی رُتوں میں یہ رنگِ بہار کیسا ہے
لہو کا رنگ سرِ شاخسار کیسا ہے

سفر تمام ہوا، راستے خموش ہوئے
تو یہ غبار سرِ رہگزار کیسا ہے

وصال و ہجر کے موسم گزر چکے ہیں تو پھر
یہ انتظار پسِ انتظار کیسا ہے

اُجڑ چکا ہے وہ قریہ، بکھر چکے ہیں وہ لوگ
تو یہ ہجوم سرِ کوئے یار کیسا ہے

دیے بجھا کے مجھے نیند سے جگا دینا
ہوائے شب! یہ تجھے اختیار کیسا ہے

یہ دَورِ قحطِ اَلَم ہے، کسی سے پُوچھے کون
کہ بے دلی میں ترا روزگار کیسا ہے

دلِ کشودہ و دامن کشادہ سب کے لیے
یہ شہر میری طرح بے حصار کیسا ہے

ڈاکٹر حنیف فوق

○

ہماری بات سے محفل میں اضطراب بھی ہے
ہماری ذات سے کچھ اُن کو اجتناب بھی ہے

لرز رہی ہے چراغِ سرِ خیال کی لَو
ہوائے شام کی زد میں نشاطِ خواب بھی ہے

یہ دل کی آگ کا بجھتا ہوا شرر تو نہیں
کہ گرد بھی ہے، ہوا بھی ہے، عکسِ آب بھی ہے

نہ دسترس میں وہ جلوہ، نہ جستجو کو دوام
ملا ہے لمحۂ خواہش کہ بے حساب بھی ہے

چُنا ہے صرصر و بادِ سموم نے جو ہدف
وہ گُل ہوائے بہاراں کا انتخاب بھی ہے

عجب چراغ ہے دانش، جلائے دامنِ دل
عجب ہے ضو کی بشارت بھی ہے، عذاب بھی ہے

خموشی گونجتی ہے سب سماعتوں میں کبھی
جمودِ ظلمتِ شب صبحِ انقلاب بھی ہے

اسی سے فوقؔ ہے تحریرِ تہہ بہ تہہ کی ترنگ
وہ روشنی کہ پسِ پردۂ سحاب بھی ہے

افضل پرویز

○

کھڑکیاں کھولے رکھو تازہ ہوا آنے دو
عطر چھڑکاتی ہوئی بادِ صبا آنے دو

وہی پٹ کھولو جو کھُلتا ہے چمن کی جانب
اس طرف سے اگر آتی ہے قضا، آنے دو

رات ہوتے ہی دمک اٹھیں گے ہاتھوں کے گلاب
اپنے جوبن پہ ذرا رنگِ حنا آنے دو

دیکھنا کیسے اُچھلتے ہیں مئے سُرخ کے جام
زُلف بکھراتی ہُوئی اُودی گھٹا آنے دو

ہوگا سیراب، سرِ آب ہر اک خار سراب
یہاں مجنوں سا کوئی آبلہ پا آنے دو

محتسب! شامتِ اعمال تجھے یاں لائے
ہاں مگر رنگ پہ محفل کو ذرا آنے دو

علامہ طالب جوہری



میں نے خطابت کیا اپنائی، بزمِ نگاراں دُور ہوئی
نام تو پہلے سے مشہور تھا، صورت بھی مشہور ہوئی

بستی بستی گھوم رہا ہوں اب بھی وہی درخواست لیے
وہ درخواست جو ہر دفتر میں یکساں نامنظور ہوئی

کشتی کے سوراخ پہ جس دن ایک پیمبر چونکا تھا
اُس دن سے کشتی کی حفاظت موجوں کا دستور ہوئی

عطر فروشوں کے کوچے میں ایک شناسا خوشبو نے
میرا دامن تھام لیا تھا، اتنی دیر ضرور ہوئی

ملکِ سبا میں ایک پرندہ قاصد بن کر آیا تھا
لفظ بدل کر وہی کہانی کہاں کہاں مذکور ہوئی

اس نے جب بچپن سے نکل کر بامِ شباب پہ پاؤں دھرا
کانچ کی گڑیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے چکنا چور ہوئی

طالب صاحب! آپ کے لہجے کا دھیما پن کہتا ہے
پچھلے برس جو چوٹ لگی تھی، آج وہ جزوِ شعور ہوئی



تم نے بھی شاید دیکھے ہوں ایسے بھولے بھالے لوگ
ناسمجھی میں اپنے آپ کو زخمی کرنے والے لوگ

وقت کی مکڑی ہر چہرے پر جالے بُنتی جائے گی
کس خانے سے صاف کریں گے اس مکڑی کے جالے کو

شہر نے ہم پر سنگ زنی کی، ہم نے سمجھا پھول لگے
پتھر سے کیا ڈر کر ہٹتے آگ پہ چلنے والے لوگ

نیزہ گری کی صنعت پر یہ وقت بھی آنے والا تھا
اپنے سینے چھید رہے تھے، نیزہ بنانے والے لوگ

ہستی کے گرداب میں بچھڑے دوست بھی ٹکرا جاتے ہیں
اَن دیکھے رستوں پہ ملے ہیں کتنے دیکھے بھالے لوگ

سچ کے زخمی جسم پہ کتنے پھاہے ہیں افسانوں کے
کتنے پردوں سے ڈھکتے ہیں اپنی خرد کے چھالے لوگ

طالب کس وحشی دُنیا میں ڈھونڈتے ہو انسانوں کو
اب وہ سانچے ٹوٹ چکے ہیں جن سانچوں نے ڈھالے لوگ

علامہ طالب جوہری



جن کو سچائی کی خاطر رسن و دار ملے
دَور بدلا تو وہی لوگ گنہ گار ملے

عشق ہر دَور کے انساں کا سماجی حق ہے
اُس میں جرأت ہے تو ہم سے سرِ بازار ملے

اُس کے ماتھے پہ اگر ہو نہ حیا کا آنچل
اُس کے اقرار میں کیوں لرزشِ انکار ملے

ڈھونڈنا چاہے تو اس شہر کے ہر کوچے میں
ہمتِ خضر کو گرتی ہوئی دیوار ملے

فصلِ گرما کی وہ شب، وہ ترے آنگن کا سکوت
چاندنی میں بھی تری نیند کے آثار ملے

لوگ اس طرح سے ملتے ہیں سرِ کوچۂ رزق
بڑھ کے تلوار سے جیسے کوئی تلوار ملے

ہم ہی کترا گئے پندارِ انا سے طالب
یوں تو ملنے کو وہ خلوت میں کئی بار ملے



یوں شب وداعِ دوست، آئی اور گزر گئی
دشمنی کی ہر روش دوستی کے سر گئی

جنگلوں کی رات تھی، اور میں سفر میں تھا
بھیڑیوں کے غول تھے، جس طرف نظر گئی

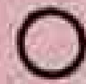
زندگی کے روز و شب، فاختہ مزاج ہیں
اِک منڈیر سے اُڑی، اک منڈیر پر گئی

وقت اور روشنی ساتھ ساتھ آئے تھے
وقت تو گزر گیا، روشنی ٹھہر گئی

اِک شکستہ ناؤ پر، نہر کے بہاؤ پر
وہ چلی تھی ڈوبنے، پھر بھی پار اُتر گئی

طالب آسمان پر اک ستارہ چونک اُٹھا
جو اُمید زندہ تھی، آج وہ بھی مر گئی

نقوی احمد پوری



مری آنکھوں پہ کس کے ہاتھ ہیں، یہ جان جاؤں گا
میں اُس کی سُونگھ کر خوشبو، اُسے پہچان جاؤں گا

وہ جھونکا اپنی بانہیں جب مری گردن میں ڈالے گا
تو جو بھی بات منوالے گا مجھ سے، مان جاؤں گا

کسی کی یاد برقی رو جو دوڑائے گی جذبوں میں
سمندر پار کر جاؤں گا، صحرا چھان جاؤں گا

کسی پنچھی کو طوفانی ہوا اُڑنے نہیں دیتی
مگر تم دیکھنا، میں "تا حدِ امکان" جاؤں گا

جہاں مصنوعی چہرے ہیں، جہاں گونگی زبانیں ہیں
میں اُس بستی کو دے کر بولتا انسان جاؤں گا

مداوا اس طرح کر جاؤں گا پاؤں کے چھالوں کا
بس کوئی سائباں "بنتی فضا میں" تان جاؤں گا



کب تک میٹھے لفظوں کا رس گھولے گا
اندر کا بہروپ تو آخر بولے گا

سُورج پر چاہے بادل کا پہرا ہو
دھوپ کا پنچھی اپنے پَر تو کھولے گا

پَر ٹوٹیں تو پنچھی کب اُڑ سکتا ہے
میرا ہاتھ جھٹکتے ہی تُو ڈولے گا

ہم یہ خوابوں میں بھی سوچ نہ سکتے تھے
وہ ایسے اکھڑے لہجے میں بولے گا

کب تک وہ زنجیر کرے گا جذبوں کو
آخر ہونٹوں کے دروازے کھولے گا

حزیں لدھیانوی



اترنے والی دکھوں کی برات سے پہلے
چراغ بانٹ دو بستی میں رات سے پہلے

یونہی ملے گا نہ آبِ حیات کا چشمہ
گزرنا ہوگا، لہو کی فرات سے پہلے

بشر جو آج ہے تہذیب و ارتقا کا امیں
فقط درندہ تھا، عرفانِ ذات سے پہلے

ہمی نے موت کی تردید میں زباں کھولی
ہمی نے پیار کیا ہے حیات سے پہلے

وہاں تو بات بھی کرنا، جہاد کرنا ہے
جہاں پہ ہونٹ سیئے جائیں بات سے پہلے

نئی حیات حزیںؔ فن کو دے گیا غالبؔ
اگرچہ مر گیا تھا وہ وفات سے پہلے

راحت ملک



گھری ہوئی ہے حقیقت کئی وکیلوں میں
کہ ڈوب جاتا ہے سچ، ساختہ دلیلوں میں

کسی غریب پہ برقِ ستم نہیں ٹوٹی
تو ایک لاش کا کیوں تذکرہ ہے چیلوں میں

وہی زمیں، مہ و انجم وہی، وہی افلاک
ہنوز قید ہوں میں وقت کی فصیلوں میں

حیات مثلِ تحرک، ممات مثلِ جمود
یہ امتیاز ہے دریاؤں اور جھیلوں میں

جسے بھی دیکھو وہی دوسروں سے افضل ہے
ہنوز نفرتِ افکار ہے قبیلوں میں

یہاں تو ہوتے ہیں وہ راہبر غریبوں کے
رہیں جو اطلس و کمخواب میں شنیلوں میں

جو بے شعور ہیں راحتؔ وہی سکون میں ہیں
الجھ گیا ہے مرا ذہن کم وسیلوں میں

ایوب صابر



عجیب کرب میں ہوں، ہمسفر نہیں رکھتا
مکان دو ہیں مگر کوئی گھر نہیں رکھتا

یہ اور بات کہ دستک نہ دی کسی نے بھی
یہ دل تو ایسا نہیں ہے جو در نہیں رکھتا

دریچے کھول کے بیٹھا تو ہوں مگر موسم
ہوائے تازہ کا رُخ ہی اِدھر نہیں رکھتا

میں عمر کاٹ رہا ہوں اِک ایسے جنگل میں
کوئی پرندہ جہاں بال و پَر نہیں رکھتا

عیوب اپنے جو گننے لگوں تو تھک جاؤں
وہ بے ہُنر ہوں کہ کوئی ہُنر نہیں رکھتا

جو گرد و پیش میں ہے سب مری نگاہ میں ہے
پر اپنے بارے میں کوئی خبر نہیں رکھتا

گزر گئی ہے جو۔ اُس پہ تو سوچتا ہوں بہت
گزر رہی ہے جو۔ اُس پر نظر نہیں رکھتا

خوشی ہو کیسے میسّر اندھیر نگری میں
اُداس کیوں نہ رہوں جب سحر نہیں رکھتا

سفرِ حیات کا جاری تو ہے مگر صابرؔ
غریبِ شہر ہوں، زادِ سفر نہیں رکھتا



کسی کے دل میں ہمارا خیال ہے کہ نہیں
کوئی ہمارا بھی پُرسانِ حال ہے کہ نہیں

کبھی ملے تھے مگر پھر بچھڑ گئے تھے ہم
بچھڑ کے ملنے کا بھی احتمال ہے کہ نہیں

گلاب ہو کہ دھنک ہو کہ چاندنی ہو تم
تمھارے حُسن کی کوئی مثال ہے کہ نہیں

میں زخم زخم سہی، پھر بھی کھلتا رہتا ہوں
مری نمو میں مرا بھی کمال ہے کہ نہیں

کسی بھی دل پہ ترا حکم چل نہیں سکتا
امیرِ شہر! یہ تیرا زوال ہے کہ نہیں

اُداس اب بھی ہوں، پہلے اُداس تھا جیسے
وہی چلَن ترا، اے ماہ و سال! ہے کہ نہیں

عجیب تیر تھا، پیوست ہو گیا دل میں
یہ تیر کھا کے بھی صابرؔ نڈھال ہے کہ نہیں

عبداللہ جاوید



تُو ہی تُو تھا جسے جانا میں تھا
ہائے کس جال میں اُلجھا میں تھا

ڈوبنے پر مجھے معلوم ہُوا
جس میں ڈوبا، وہی دریا میں تھا

ہر بھرا شہر تھا مجھ سے آباد
ہر بھرے شہر میں تنہا میں تھا

ایک وہ وقت کہ محفل تھا میں
ایک یہ وقت اکیلا میں تھا

رات بھر تیرے لیے جاگا کون؟
پیر پھیلائے جو سویا میں تھا

کوچۂ دل میں نمی سی کیوں ہے؟
اوس ٹپکی تھی کہ رویا میں تھا

اک اِسی بات پہ بخشش کر دے
تو حقیقت، تیرا سایا میں تھا

جب مری خاک تھی زندہ جاویدؔ
روپ میں، رنگ میں، کیا کیا میں تھا



وہ بھی آ جائے گا، دروازہ کشادہ رکھیں
کان آہٹ پہ، نظر جانبِ جادہ رکھیں

مذہبِ عشق میں ہے کُفر سے بڑھ کر یہ گناہ
اُس سے ملنے کے سوا، کوئی ارادہ رکھیں

ورقِ دل پہ لکھیں اہلِ ہوس اُس کا نام
ہم تو اپنی ہی طرح جی کو بھی سادہ رکھیں

وہ جو ہے بزم میں، سب کچھ ہے میسّر جاویدؔ
اب رکھیں مرے آگے، کہ وہ بادہ رکھیں

آصف ثاقب



بارش بھی فن کار بڑی ہے کیسی لکیریں کھینچی ہیں
میرے گھر کے اندر باہر تصویریں تجریدی ہیں

غم کی گھڑیاں گھٹتی کب ہیں دھاگا دھاگا بٹتی ہیں
دل کے اندر بیٹھ کے پہروں سپنے بُنتی رہتی ہیں

پڑھنے والا کوئی ہے جو اونچا اونچا پڑھتا جائے
میرے دل کے کاغذ پر جو تیری یادیں لکھتی ہیں

دریا کی ہر موج کے اوپر میرا اسم ممتاز ہُوا
چاروں طرف طوفان کی موجیں پرچم لے کر نکلی ہیں

کالی گھٹا کے چھینٹوں نے بھی کیا کچھ ہم سے پوچھا تھا
اس کی زلف کی لہریں کیا ہیں، اس کی آنکھیں کیسی ہیں

اپنے دامن میں سمیٹے جوشِ گریہ لے گیا
وہ سمندر تھا جو میرے دل کا دریا لے گیا

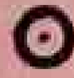
میرے زخموں کے سویرے زرد پھولوں کو ملے
اور شاہیں گھر کے ویرانے کا سبزہ لے گیا

رہنماؤں کا اُٹھائے کون احسانِ سفر
چل پڑے اُس سمت ہم، جس سمت رستہ لے گیا

سر کا سایہ لے گئی تھی بے لباسی پیڑ کی
اور قسمت کی لکیریں خشک پتا لے گیا

میرا دل رکھنے کو ثاقب مشکلوں میں ہنس دیا
صبر کے میداں میں بازی میرا بچہ لے گیا

آصف ثاقب



حصارِ ذات میں کیا کیا بلائیں ملتی ہیں
قطار باندھ کے ہم سے انائیں ملتی ہیں

ترا غرور مرا انکسار جیسے ہوں
کہیں تو جا کے یہ دو انتہائیں ملتی ہیں

سلامتی میں رہیں مرے گھر کے روزن سب
کہ فقر و فاقہ میں ٹھنڈی ہوائیں ملتی ہیں

تمھارے شہر میں پابندیاں ہیں ملنے پر
نقاب اوڑھ کے ہم سے وفائیں ملتی ہیں

گھروں کو آتے ہیں جب ایک دن کی رخصت پر
سڑک پہ آ کے یہاں سب کی مائیں آتی ہیں



آزار ہے کس کی کج ادائی
یہ کون ہے دردِ آشنائی

ہم دور شفق میں بس رہے تھے
جب ہاتھ میں ہاتھ تھا حنائی

بارش سے کبھی نہ دھل سکے گی
دیوار پہ پختہ ہے لکھائی

سب عمر ندامتوں میں گزری
اب موت نری ہے جگ ہنسائی

کمرے میں تو خواب تھے ہمارے
اور صحن میں چاندنی پرائی

اقبال کوثر



کہاں ہے تُو مگر مجھ کو کہاں آواز دیتی ہے
تو اب اے عمرِ رفتہ! رائیگاں آواز دیتی ہے

بھنور میں ڈوبتوں کے واسطے کوئی نہیں جاتا
فقط ساحل سے ہی رسمِ جہاں آواز دیتی ہے

خیالِ رفتگاں آئے تو ماضی کے جھروکے سے
مجھے کیا کیا شبیہِ دوستاں آواز دیتی ہے

وہ فارغ ہی کہاں اپنے جلوسِ جاہ و منصب سے
جنہیں راہوں میں خلقِ بے اماں آواز دیتی ہے

یہاں ہم سب گلی کے گمشدہ بچے کی صورت ہیں
جسے ہر گھر کے دروازے پہ ماں آواز دیتی ہے

فرائض مل کے ہی نبھتے ہیں کوثرؔ زندگانی کے
نمازِ با جماعت کو اذاں آواز دیتی ہے



اگرچہ مجھ کو بے طوق و رسن بستہ نہیں چھوڑا
کسی قیدی کو اُس نے اس قدر خستہ نہیں چھوڑا

ہر اک سے دوسرے کا ربط اُس نے توڑ ڈالا ہے
کسی کا دل کسی کے دل سے وابستہ نہیں چھوڑا

خود اپنے خواب چن آیا ہوں کچھ رنگین دھوکوں میں
کسی تتلی کی خاطر میں نے گلدستہ نہیں چھوڑا

سُنیں رُودادِ غم کس سے کہ آشوبِ تباہی نے
کوئی اک بھی گھرانا شہر میں بستا نہیں چھوڑا

کہیں کیا حال قبروں کا کہ اب کے اُس نے بستی میں
جنازے بھی گزرنے کا کوئی رستہ نہیں چھوڑا

کہاں پر اُس نے مجھ پہ تالیاں بجتی نہیں چاہیں
کہاں کس کس کو میرے حال پر ہنستا نہیں چھوڑا

خلیل رامپوری



میں نے تو اِک بات کہی تھی بات کو پھیلایا ہے کتنا
اب میں سمجھا ہوں دُنیا نے مجھ کو پہچانا ہے کتنا

جانے کس نے تھپیڑ مارا کالے بادل کے چہرے پر
میں نے دیکھا ہے بادل کو غصّے میں برسا ہے کتنا

لاٹھی پانی میں ڈالوں تو واپس آتی ہے پانی پر
دریا زور آور ہے کتنا، میرا سرمایہ ہے کتنا

کل میں نے کچھ چہرے دیکھے کیفے کے اک لان میں بیٹھے
کیا بتلاؤں مجھ کو اس کا چہرہ یاد آیا ہے کتنا

اس سے مل کر خوش ہوتا ہوں، پھر اس سوچ میں کھو جاتا ہوں
باہر سے اُجلا ہے کتنا، اندر سے کالا ہے کتنا

رامپوری جی! یہ مت پوچھو، دل میرا رونے لگتا ہے
کیا بولوں سوچا ہے کتنا اور اس کو پایا ہے کتنا

اعجاز رحمانی



دریا کو سمندر کی سمائی نہیں دیتا
کم ظرف کو اللہ بڑائی نہیں دیتا

کل تک تو اندھیرے سے شکایت تھی نظر کو
اب اِتنا اُجالا ہے، دکھائی نہیں دیتا

رہتا ہوں جہاں میں وہ فرشتوں کا نگر ہے
کوسوں کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا

بیدار ہُوا کیا مرا احساسِ سماعت
وہ شور ہے کچھ بھی تو سنائی نہیں دیتا

زنجیر کی جھنکار تو سب سُنتے ہیں لیکن
کوئی بھی اسیروں کو رہائی نہیں دیتا

ممکن نہیں انصاف کی زنجیر ہلانا
مہلت مجھے کشکولِ گدائی نہیں دیتا

ہر شخص کڑی دُھوپ کی کرتا ہے شکایت
سُورج کی مگر کوئی دہائی نہیں دیتا

ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں
منصف بھی مجھے اذنِ صفائی نہیں دیتا

اُلفت رسول



کیا گماں گاؤں کا سردار لیے پھرتا ہے — آج کل ہاتھ میں دستار لیے پھرتا ہے
شیخ ہو آیا ہے کعبے سے، چلو مان لیا — کون سی خوبیٔ کردار لیے پھرتا ہے
بات آپس کی تھی وہ، میں نے اگر کہہ بھی دی — اور اب تُو ہے کہ اخبار لیے پھرتا ہے
ہاتھ میں جوڑ چکا ، اپنی اَنا توڑ چکا — جانے کیا رنج مرا یار لیے پھرتا ہے
خود ہی تھک ہار کے مٹی پہ پٹخ دے اس کو — تو توقع کا جو انبار لیے پھرتا ہے
رو کے بیٹھی ہے اِدھر ہم کو شکستہ پائی — جلوۂ حُسن وہ اُس پار لیے پھرتا ہے
گھر مرے آئے گا وہ آپ منانے مجھ کو — کیسی خواہش دلِ خوددار لیے پھرتا ہے
زندگی بھر مجھے کچھ کرنے بھی دے گا کہ نہیں — ذہن اک اپنا ہی معیار لیے پھرتا ہے
ہے مسیحا، تو مسیحائی کہاں ہے تیری — کب سے شکوہ ترا بیمار لیے پھرتا ہے
کچھ سمجھ میں مری آنے ہی نہیں دیتا وہ — ایک اندازِ پُر اسرار لیے پھرتا ہے
جو ترے دل میں ہے، تھا پہلے سے اسکے دل میں — تُو ابھی خواہشِ اظہار لیے پھرتا ہے
مُنہ چڑاتی ہے مرا میری دیانت داری — ساری خوشیاں وہ غلط کار لیے پھرتا ہے
پُوچھتے کیا ہو، ہے کس شہر میں گھر اُلفت کا
ساتھ اپنے در و دیوار لیے پھرتا ہے

اُلفت رسول



نہ کوئی بھی جب دُوسرا رہ گیا
مرے ساتھ میرا خدا رہ گیا

اُٹھا کر بھی آنکھ اُس نے دیکھا نہیں
میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا

سماعت کے پلّے پڑا تھا وہی
جو اک حرف تھا اَن سُنا رہ گیا

محبت ہی اک رشتہ دُنیا میں تھا
مگر وہ بھی اب جھوٹ سا رہ گیا

سب آہستہ آہستہ آگے گئے
میں تیزی میں اپنی ، بِکھرا رہ گیا

کٹھن راستے پر لگا کر ہمیں
نجانے کہاں رہنما رہ گیا

کھلا یہ کہ در تھا کس اور کا
لگاتا میں جس پر صدا رہ گیا

کوئی لُوٹ کر لے گیا گھر کا گھر
کہ دروازہ دل کا کُھلا رہ گیا

خزاں ! اب ترا آخری وقت ہے
نہیں کوئی پتّہ ہرا رہ گیا

نہیں تیرے شہکار میں کوئی نقص
یہی نقص اس میں بڑا رہ گیا



پاگل ہے یہ چشمِ نم بھی
ایسا کہاں تھا کوئی غم بھی

دُنیا میں جس شے کو دیکھو
غیر اہم بھی ، اور اہم بھی

خیر ہو ، آج تو اس کا لہجہ
نرم سا ہے کچھ اور مدھم بھی

علم و دانش اپنی جگہ ہیں
جیب میں رکھنا دام و درم بھی

نہیں نہیں کی رٹ ہے زباں پر
اور سرِ تسلیم ہے خم بھی

لوگ اب آئے آگ بجھانے
ہو گیا جل کر گھر تو بھسم بھی

اسعد بدایونی



خوشی منائیں، دلِ نوحہ گر کے ہوتے ہوئے
سرائے میں کوئی رُکتا ہے گھر کے ہوتے ہوئے

دریچے' چاہئیں دو چار، چاہتوں کے بھی
مکاں، مکان نہیں بام و در کے ہوتے ہوئے

چمک بھی اٹھتا ہے اکثر کوئی ستارۂ بخت
نکل بھی جاتی ہے کشتی' بھنور کے ہوتے ہوئے

کوئی بشارتِ تازہ، کوئی حکایتِ نو
خبر کا قحط ہے اہلِ خبر کے ہوتے ہوئے

اُڑان بھرنے سے قاصر ہیں طائرانِ خیال
یہ ماندگی ہے عجب بال و پر کے ہوتے ہوئے

وہ بے گھری تھی مصیبت مگر عذاب نہ تھی
عجیب حال ہے اب دل کا، گھر کے ہوتے ہوئے

کئی گلاب ہیں توشے میں اور کئی جگنو
یہ ہم اداس ہیں رختِ سفر کے ہوتے ہوئے



یہ لوگ خواب بہت کربلا کے دیکھتے ہیں
مگر غنیم کو گھر دن جُھکا کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے برف رُتیں روشنی سے ڈرتی ہیں
سو اک چراغ کو ہم بھی جلا کے دیکھتے ہیں

انھیں کہو کہ کبھی جنگلوں کی سمت بھی آئیں
جو بستیوں میں کرشمے خدا کے دیکھتے ہیں

جنوں میں کوئی اضافہ نہیں ہے مدت سے
غبارِ جسم بھی اب کے اُڑا کے دیکھتے ہیں

یہ دل ہے ٹھہری ہوئی جھیل کی طرح کب سے
اب اس میں پھر کوئی پتھر گرا کے دیکھتے ہیں

پھر اک خیال کو زنجیر کر دیا ہم نے
پھر ایک نام کو دل سے مٹا کے دیکھتے ہیں

(علی گڑھ)

اختر امان

○

یہ دل کہتا ہے کوئی آ رہا ہے
نظر کہتی ہے وہ بہلا رہا ہے

ہر اک کے دل پہ کرتا ہے حکومت
وہ اپنی سلطنت پھیلا رہا ہے

کسی کی دسترس میں ہے مگر وہ
کبھی آ کر ہمیں ملتا رہا ہے

کبھی دیتا ہے دل کو زخم گہرے
کبھی لگتا ہے وہ سہلا رہا ہے

خبر اک اُس کے آنے کی سُنی تھی
دیا گھر رات بھر جلتا رہا ہے

کہیں گے لوگ میرے بعد سارے
وہ جیسا بھی رہا، اچھا رہا ہے

کہاں پر آ کے اختر رُک گئے ہو
چلو آؤ زمانہ جا رہا ہے

○

پہلے ہم عشق کیا کرتے تھے
ہاں کبھی ہم بھی جیا کرتے تھے

اپنے دامن کی کبھی فکر نہ کی
چاک اوروں کے سیا کرتے تھے

پہلے ہر حال میں خوش رہتے تھے
جانے کیا کام کیا کرتے تھے

چاہنے والے بہت تھے لیکن
ہم بس اک نام لیا کرتے تھے

کبھی آنسو تو کبھی مے اختر
جو میسّر تھا پیا کرتے تھے

○

زندگی کی تیز اتنی اب روانی ہو گئی
بات جو سوچی وہ کہنے تک پرانی ہو گئی

عام سی اک بات تھی اپنی محبت بھی مگر
یہ بھی جب لوگوں تلک پہنچی کہانی ہو گئی

خوف کی پرچھائیاں ہیں ہر در و دیوار پر
اپنے گھر پر جانے کس کی حکمرانی ہو گئی

زندگی کے بعد اختر زندگی اک وہم ہے
موت بھی جیسے فقط نقلِ مکانی ہو گئی

رُوحی کنجاہی



ادھوری سوچوں کا زاویہ بھی نہ چل سکے گا
زیادہ دیر اب یہ سلسلہ بھی نہ چل سکے گا

صدائیں اُٹھ اُٹھ کے دے رہا ہے غبارِ رہ بھی
زیادہ دُور اب یہ راستہ بھی نہ چل سکے گا

اسی طرح توڑتے رہے دم اگر ستارے
تو صبح تک شب کا قافلہ بھی نہ چل سکے گا

غمِ جہاں کا محاصرہ توڑنا پڑے گا
کسی سے ورنہ معاشقہ بھی نہ چل سکے گا

بھی ہوا اور دُھوپ ہے تو یہ دیکھ لینا
اب اپنے ساتھ اپنا نقشِ پا بھی نہ چل سکے گا

اگر یُونہی روز روز بدلیں گے لفظ معنی
کسی سے کوئی معاہدہ بھی نہ چل سکے گا

سفر ہی درپیش ہے کچھ ایسا کہ اب کے شاید
ہمارے ساتھ اپنا رہنما بھی نہ چل سکے گا

مداخلت ختم ہو نہ پائی اگر تو روحی
کسی سے اپنا مکالمہ بھی نہ چل سکے گا



بے بسی ایسی کہ جاں سے بھی گزر سکتا نہیں
بے دلی ایسی کہ کوئی کام کر سکتا نہیں

اپنی اِس بے چارگی پر رحم آتا ہے مجھے
قتل کا الزام قاتل پر بھی دھر سکتا نہیں

میرے خاکوں میں کہاں سے آئے گی میری جھلک
اپنی مرضی کے اگر میں رنگ بھر سکتا نہیں

فارمولا زندگی سے جان جاتی ہے مری
میں تو اِس معیار پر پُورا اُتر سکتا نہیں

مری اُفتادِ طبیعت ہی ہے مجبوری مری
میں اُصولوں پر کوئی سمجھوتا کر سکتا نہیں

میں شناور ہوں مگر اس سنگ بستہ جسم سے
ڈوبنے پر بھی کسی صورت اُبھر سکتا نہیں

مار ڈالے گی مجھے یکسانیت حالات کی
ورنہ روحی میں کبھی مر کر بھی مر سکتا نہیں

کاوش بٹ



تو اپنی چاہتوں کی اتنی ضَو دے
مرا ماحول خوشبوؤں میں ڈبو دے

فقط انسان اور انسانیت کی
محبت میری رگ رگ میں سمو دے

عطا کر ہر بشر کو دولتِ فکر
بشارت آگہی کی نو بہ نو دے

ملے فرصت تو پہلو میں بٹھا کر
مسلسل دوریوں کا مَیل دھو دے

دلوں کی کھیتیاں بنجر پڑی ہیں
تو ان میں قربتوں کے بیج بو دے

مسلسل آندھیوں کی زد میں رہ کر
جھکے تک بھی نہیں خوددار پودے



جفا کا منشور ہے ملامت، وفا کا دستور ہے بھلائی
محبتوں کے سفر پہ نکلا تو بات میری سمجھ میں آئی

شکستہ پا ہیں مگر وفاؤں کے راستوں پر رواں دواں ہیں
پھٹے پرانے لباس والوں نے اپنی منزل نہیں بھلائی

ہمارا آئندہ کا مؤرخ یہ سازشیں بھی رقم کرے گا
وہ جانتا ہے سکوں گھروندوں میں کس نے کیونکر نقب لگائی

رفاقتوں سے کنارہ کش ہو کے ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
یہ ہجر لمحے عذابِ جاں تھے، عذابِ جاں سے ملی رہائی

میں اس قبیلے سے منسلک ہوں کہ جس نے انسانیت کی خاطر
قدم قدم پر فریب کھائے، قدم قدم پر خوشی لٹائی

تری محبت میں ہر مصیبت، مسرتوں میں بدل رہی ہے
ترے کرم سے ہر ایک مشکل، ہر ایک غم سے نجات پائی

دل نواز دل



بدلتے موسموں کے ڈھنگ دیکھو
بہاروں میں خزاں کے رنگ دیکھو
دلوں کے آئنوں میں عکس دھڑکیں
مگر دستِ نظر میں سنگ دیکھو
مُندی رہتی ہے جب چشمِ حقیقت
خیال و خواب کے نیرنگ دیکھو
کبھی دیکھا تھا اس کو اک نظر سے
ہے اب تک دل کا عالم دنگ دیکھو
یہ کس نے امن کے سُر تال چھیڑے
جہاں بھر میں چھڑی ہے جنگ دیکھو
ہزاروں پھول گلشن میں کھلے ہیں
مگر ہر پھول ہے بے رنگ دیکھو
جو تم کو دیکھنی ہو دل کی دھڑکن
کبھی پٹتا ہُوا مردنگ دیکھو
بڑے مایوس بیٹھے ہو مرے دل
اُٹھو، دنیا ہمارے سنگ دیکھو



اب طور ہیں کچھ اور زمانے کی ہوا کے
ہوتے ہیں شب و روز بلاخیز دھماکے

اب آگ لگاتی ہے چمن زار میں شبنم
اور اس کو ہوا دیتے ہیں اب جھونکے صبا کے

روتا تھا زمانہ کبھی لوگوں کے غموں پر
خوش ہوتے ہیں اب لوگ زمانے کو رُلا کے

کب جائیں کہاں جائیں کدھر جائیں کہ ہم لوگ
بیٹھے ہیں سرِ راہ گھروندوں کو جلا کے

غیرت کے جنازے کو اُٹھا لائے ہیں گھر میں
جھپٹا ہے بڑا مال بہت لُوٹ مچا کے

اب سر پہ کفن باندھ کے دل گھر سے نکلنا
ہر موڑ پہ جب معرکے ہیں کرب و بلا کے

سیّد سجاد جلیل



ظلم کی تپتی دھوپ میں ہر اک شخص نڈھال
قریہ قریہ خوف ہے، نگر نگر بھونچال

رُت بدلی تو وقت کی ایسی ہوا چلی
کونپل کونپل ناگ ہیں، شجر شجر گھڑیال

مال منال کے شہر میں سب سوداگر ہیں
میں بنجارہ پیار کا اور میں ہی کنگال

چھیل چھبیلے نینوا اور دھیمی مُسکان
پیار کے بھوکے شخص کو دھوکے میں مت ڈال

اپنی جوت جگا گئے کیا غالبؔ کیا میرؔ
تو سجاد جلیل ہے، اپنی راہ نکال



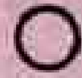
کوئی تخلیق کا لمحہ میرے خوابوں میں ہے
زندگی کربِ مسلسل کے عذابوں میں ہے

اِک طرف ذہن کہ آزاد فضا ڈھونڈتا ہے
اِک طرف دل ہے کہ خواہش کی طنابوں میں ہے

کام میرا ہے مگر درج کتابوں میں نہیں
نام تیرا ہے مگر میرے نصابوں میں ہے

اُس کا اثبات ہی اک سچ ہے زمانے میں جلیل
وہ سوالوں میں نہیں ہے، وہ جوابوں میں ہے

رخسانہ شمیم



[illegible] بکس اور بھیگا دوپٹہ دیکھتے

کتنی [illegible] گئیں اِک خط کا رستہ دیکھتے

[illegible] تھے آپ بیدردی سے جس کو منہدم

بھو[illegible] کر آتے کبھی اُس گھر کا ملبہ دیکھتے

ایک دن پھر کٹ گیا پھر شام کے سائے بڑھے

[illegible]س کی دہلیز پر بیٹھی ہوں رستہ دیکھتے

شہر میں میلہ لگا تھا وہ نظر آیا نہیں

تھک گئیں آنکھیں مری اِک اک کا چہرہ دیکھتے

تھا کسی کے ہاتھ میں خط اور تری تحریر میں

کاش! ہم زندہ نہ رہتے اور نوشتہ دیکھتے

کچھ پرانے خط ہیں بس اب میری خلوت کے رفیق

دن گزر جائیں گے تصویرِ گزشتہ دیکھتے



کھُلے گی آنکھ پر تعبیرِ خواب آہستہ آہستہ

کہ چاہت کے اُترتے ہیں عذاب آہستہ آہستہ

حقائق کی ہواؤں کے سُبک جھونکوں نے سرکائی

تری اُلفت کے چہرے سے نقاب آہستہ آہستہ

کہیں پر ہم نے خوابوں سے حقائق بھی تراشے ہیں

کہیں پر خواب میں دیکھا ہے خواب آہستہ آہستہ

بس جاں جیسے آگ جنگل کی اور آنکھوں میں

اُتر آئے ہیں یادوں کے سحاب آہستہ آہستہ

جو احساسات ہیں الفاظ کے پیکر میں ڈھل جائیں

تو بن جائے مکمل اِک کتاب آہستہ آہستہ

گزارو عمر ساری اپنی تنہائی کے زنداں میں

وفاؤں کا صلہ ہے احتساب آہستہ آہستہ

(میونخ، مغربی جرمنی)

خان محمد خلیل

○

دل جب ہارا ہُوا جواری ہو جائے
اک اک لمحہ عمر پہ بھاری ہو جائے

اس اُمید پہ سورج کی پُوجا کی ہے
ایک کرن تو کبھی ہماری ہو جائے

اب تو گھمنڈ ہے تیرے عہدِ پیماں کا
اور اگر تُو بھی انکاری ہو جائے

تجھ سے نہیں، میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں
جب اپنے سے بھی بیزاری ہو جائے

دل وہ ریاست ہے، دشمن کے نرغے میں
تنہا جس کی راجکماری ہو جائے

برگ و بار کے رب! تیرے دریاؤں سے
میرے نام کی نہر بھی جاری ہو جائے

○

بات کرنے کا سلیقہ وہ اگر دے دیتا
جسم کی آہنی دیوار کو در دے دیتا

اب تو اخبار سے ہی جس کا پتہ ملتا ہے
کاش وہ خود بھی کبھی اپنی خبر دے دیتا

چُپ کے صحرا میں نہ رہتا تو وہ سفاک مجھے
کالے پانی کے جزیرے کا سفر دے دیتا

میں ترے "لطف" بھی، یاروں کے "کرم" بھی لکھتا
کاتبِ وقت جو لکھنے کا ہُنر دے دیتا

اس کے لہجے میں رعونت کی جھلک تھی ورنہ
ہاتھ پر ہاتھ تو کیا، میں اُسے سر دے دیتا

اسلام عظمی



خاک بے شک بہت اُڑاتی ہیں — آندھیاں بارشیں بھی لاتی ہیں
شہر سے جنگلوں کو چلتے ہی — گیت کیا کیا ہوائیں گاتی ہیں
کچے موسم میں کچی نیندیں بھی — ایک دستک پہ ٹوٹ جاتی ہیں
بیتی راتیں کہ اُس کی باتیں ہوں — کس تسلسل سے یاد آتی ہیں
جب نہیں ہے بہار کا موسم — تتلیاں کس طرف کو جاتی ہیں
ایک جیسی ہیں بچیاں چڑیاں — تنکے چُنتی ہیں، گھر بناتی ہیں
اک نئی سلطنت کی چاہت میں — اپنا بچپن ہی بُھول جاتی ہیں
دل کی سادہ ہیں لڑکیاں کتنی — جھوٹ سُن کر بھی مسکراتی ہیں
رستہ رستہ وہ باتوں باتوں میں — کتنے سپنے بکھیر جاتی ہیں
دُور ہی دُور سے دکھا کر چھب — دھیرے دھیرے قریب آتی ہیں
خواب کے آتشیں جزیروں سے — کیسی خبریں ہوائیں لاتی ہیں
زندہ رکھتی ہیں کتنے سپنوں کو — وہ اُمیدیں جو ٹوٹ جاتی ہیں
ہجر زادوں میں وصل کی گھڑیاں — خوش نصیبوں کے ہاتھ آتی ہیں
تیری یادیں سکوتِ صحرا پر — اِک عجب کہکشاں بناتی ہیں
شام ہوتے ہی بستیاں دل کی — گھُپ اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں
ساتھ دیتا ہے تو مرا اکثر — ساتھ نیندیں جو چھوڑ جاتی ہیں
ہٹتی جاتی ہیں منزلیں پیچھے — حوصلے میرے آزماتی ہیں
شہر کا شہر جلنے لگتا ہے — نفرتیں آگ جب لگاتی ہیں

کیوں پرانی رفاقتیں عظمی
ساتھ پل بھر میں چھوڑ جاتی ہیں

(دوحہ۔قطر)

علی اکبر عباس



میں اپنے وقت میں اپنی ردا میں رہتا ہوں
اور اپنے خواب کی آب و ہوا میں رہتا ہوں

کبھی زمیں، کبھی سیر گاہِ ماہ و نجوم
کبھی میں عکسِ نظر آشنا میں رہتا ہوں

سماعتوں پہ اُترتا ہوں مثلِ صوتِ یقیں
دلوں کے واہمۂ برملا میں رہتا ہوں

میں اُڑتی گرد ہوں اہلِ ہنر کے تیشے کی
اور اہلِ درد کی بھی خاکِ پا میں رہتا ہوں

میں اِک فقیہِ خدامست برسرِ دُنیا
جمالِ یار کی حیرت سرا میں رہتا ہوں



جیسا دیکھنا چاہیں منظر لے آتے ہیں
گھر میں صحرا، صحرا میں گھر لے آتے ہیں

اب کوئی دشواری حائل ہو نہیں پاتی
ہر منزل کو اپنی رہ پر لے آتے ہیں

خاک پہن کر جاتے ہیں بازارِ جاں میں
اور مٹھی میں لعل و جواہر لے آتے ہیں

نظروں میں رکھتے ہیں بس معیارِ تمنّا
مل جائے تو دنیا دے کر لے آتے ہیں

بے قامت لوگوں کو ایک ہنر آتا ہے
قد آور کو اپنے برابر لے آتے ہیں

اُردو کے عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق



تُو جو ساتھ نہیں ہے میرے کیسے گزاروں گھر پہ راتیں
دن بھر کے غم دریاؤں سے بن جاتی ہیں سمندر راتیں

سُورج، چاند، ستارے بن کر چمکے ہیں دل آنگن میں سب
تیرے غموں کی رونقیوں سے دن ہیں شفیق، منوّر راتیں

ہر لمحہ، ہر ساعت، ہر پل، ہر لحظہ دل دہلا جائے
اب تو ہر دن خوف کا دن ہے، کٹتی ہیں اب ڈر ڈر راتیں

آئینے کے دونوں رُخ ہیں ایک ہی عکس دکھانے والے
تاریکی اُجیالے کھا گئی منظر اور پس منظر راتیں

تیرے پیار میں کیا جادُو ہے، تیرے بدن میں کیسا نشّہ ہے
وصل کی خوشبو پاگل رکھتے، یاد آتی ہیں دن بھر راتیں

تجھ کو کیا فارُوق بتاؤں مجھ کو بھی معلوم نہیں ہے
دن کس چوکھٹ پر گزرے ہے اور بیتیں کس در پہ راتیں



سر پر غم کی خاک سجائے، دامن کے صد چاک کیے
پھر تیری بستی میں ہیں ہم، کچھ جذبے بے باک لیے

وقت پرندہ کتنے موسم، کتنی صدیاں اُڑ آیا
اور ابھی تک ہم بیٹھے ہیں کچھ یادیں سفّاک لیے

لگتا ہے یہ بوجھ بھی اب ہم پر ہی گرنے والا ہے
کب سے تنہا گھوم رہے ہیں ہم سر پر افلاک لیے

جس کو بھی ہم دیکھیں اُس کی آنکھ سمندر ہے فارُوق
کس کو زخم دکھانے جائیں ہم آنکھیں نمناک لیے

(دوبئی)

ڈاکٹر زبیر فاروق



پس منظر ہی پس منظر تھا اور تھا منظر غائب
پیاس کا صحرا جاگ اُٹھا تو ہُوا سمندر غائب

سب کا اپنا اپنا رستہ، اپنی اپنی سوچ
جانے کون کہاں پر حاضر، کون کہاں پر غائب

یہیں کہیں محسوس ہوئے تھے رنگ، کرن، خوشبو
ایک جھلک دکھلا کر، جانے ہُوا وہ کیونکر غائب

کیا کیا سوچیں چھوڑ گئی ہے چھوٹی سی اک بات
لہروں کا اک جال بچھا کر ہُوا ہے کنکر غائب

کون تمہارا رستہ دیکھے شام ڈھلے فارُوق
دنوں دنوں تک ہو جاتے ہو تم تو اکثر غائب



دیکھ کر جسم کا سراغ جلا
میرے سائے سے بھی چراغ جلا

یاد کا دیپ چھوڑے جاتا ہوں
جب بھی تجھ کو ملے فراغ — جلا!

چاند کے بام سے اُترتے ہی
اک دریچے میں اک چراغ جلا

نفرتیں بھر گئی ہیں سوچوں میں
اس تعفّن سے ہر دماغ جلا

روشنی بانٹ شب گزیدوں میں
اب کے فارُوق دل کے داغ جلا

(دوبئی)

پروفیسر افضل علوی



ہر اک خوشی میں ہے شامل ملال تھوڑا سا
ہر آدمی ہے تبھی تو نڈھال تھوڑا سا

ہر ایک شاخِ ثمردار پر پڑیں پتھر
ہدف عدو کا ہے ہر باکمال تھوڑا سا

ہزاروں باتیں ہیں ایسی جو ہم کبھی نہ کریں
نظر میں رکھیں جو ان کا مآل تھوڑا سا

رخِ حیات کی چھب اور بھی نکھرتی ہے
جمالِ یار میں گر ہو جلال تھوڑا سا

عزیز تجھ کو جہاں ہیں بلند یارانے
وہاں ہمارا بھی رکھنا خیال تھوڑا سا

ہجومِ لالہ رُخاں میں جو ہو سکے علوی
دل و نظر کا سفینہ سنبھال تھوڑا سا

ظفر علی راجا



خوشبو و گل و بلبل و باغات اُجاڑے
جو شہر بھی پھیلے وہ مضافات اُجاڑے

فردوسِ نظر، وادیِ جاں، کُنجِ تصور
اِک عشق نے کتنے ہی مقامات اُجاڑے

خوش رنگ خیالوں کو حقائق نے کیا خواب
تعبیر نے خوابوں کے محلات اجاڑے

مٹی سے اُگائے گُل و گلزار ہزاروں
مٹی کے گھروندے بھی تو برسات اجاڑے

آباد اُن آنکھوں میں سہی شہرِ طلسمات
راجا کو تو وہ شہرِ طلسمات اُجاڑے

احمد ندیم قاسمی



جب بھی آنکھوں میں تری رخصت کا منظر آگیا
آفتابِ وقت نیزے کے برابر آگیا

دوستی کی جب دُہائی دی، تو شرق و غرب سے
ہاتھ میں پتھر لیے، یاروں کا لشکر آگیا

اس سفر میں، گو تمازت تو بہت تھی ہجر کی
میں تری یادوں کی چھاؤں سر پہ لے کر آگیا

گو زمین و آسماں مصروفِ گردش ہیں، مگر
جب بھی گردش کا سبب سوچا تو چکر آگیا

آدمی کو حشر کے منظر نظر آنے لگے
اس کے قبضے میں جب اک ذرّے کا جوہر آگیا

حُسنِ انساں، دفن ہو جانے سے مٹتا ہے کہاں
پھول بن کر خاک کے پردے سے باہر آگیا

اشک جب ٹپکے کسی بے کس کی آنکھوں سے ندیمؔ
یوں لگا — طوفان کی زد میں سمندر آگیا



تنگ آجاتے ہیں دریا جو کہستانوں میں
سانس لینے کو نکل جاتے ہیں میدانوں میں

خیر ہو دشت نوردانِ محبت کی — کہ اب
شہر بستے چلے جاتے ہیں بیابانوں میں

اب تو لے لیتا ہے باطن سے یہی کام جنوں
نظر آتے نہیں اب چاک، گریبانوں میں

مال چوری کا جو تقسیم کیا چوروں نے
نصف تو بٹ گیا بستی کے نگہبانوں میں

کون تاریخ کے اِس صدق کو جھٹلائے گا
خیر و شر دونوں مقیّد رہے زندانوں میں

جستجو کا کوئی انجام تو ظاہر ہو ندیمؔ
اِک مسلماں تو نظر آئے مسلمانوں میں

تبصرے

ڈاکٹر حنیف فوق، احمد فراز، احمد ہمدانی، حسن منظر،
محسن احسان، حمایت علی شاعر، امجد اسلام امجد،
ڈاکٹر آغا سہیل، راشد مفتی، عاصی کرنالی، صلاح الدین حیدر،
خالد اقبال یاسر، عرفان صدیقی، محمد نسیم سید،
مبین مرزا، اختر علی، رؤف امیر، ڈاکٹر محمد امین،
احمد ندیم قاسمی

دیدۂ تر (مجموعہ کلام)

قیمت: ۴۵ روپے

مصنف: : اختر لکھنوی

ناشر: بزمِ اربابِ سخن۔ دولت ہاؤس۔ ۲۶-سوناڈی اورنگی ٹاؤن کراچی ۴۳

کائنات کا مرکزی نقطہ سورج اور سیارے نہیں، انسان ہے۔ لیکن انسان کی خود اپنی اندرونی کائنات اور خود اس کے اپنے بنائے ہوئے معاشرے اور تاریخ کے بیرونی عوامل ہیں۔ جب تک اندرونی کائنات اور بیرونی عوامل میں کشش اور توازن کا رشتہ برقرار رہتا ہے زندگی مختلف سمتوں میں رواں دواں رہتی ہے۔ لیکن جب انسان کی انفرادی اور اجتماعی اکائیوں کی کائنات میں تصادم ہوتا ہے اور بیرونی عوامل کی کشش و توازن کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے تو پھر زلزلے اٹھتے اور شعلے بھڑکتے ہیں، طبعی کائنات ان کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ زندگی کے ارتقائی سفر میں بعض اوقات حالات اور ماحول سے تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پھر اس تصادم کے نتیجے میں شدائد کا تحمل یا جانوں کا زیاں دونوں بابرکت ٹھہرتے ہیں کہ ان سے نئی راہوں کا سراغ ملتا ہے یہی نہیں اس کا جشنِ جاں اور کاوشِ سرفروشی میں ہار اور جیت دونوں انسانیت کے مفہوم کو روشن کرتی ہیں۔ البتہ جب یہ تصادم اجتماعی بے بصری، بدانتظامی، لاتدبیری، عدم دانش اور غیر مثبت رویوں کا انجام ہوتا ہے، تو انسان خود اپنی تاریخ ارتقاء کے حضور ششدر رہ جاتا ہے۔ جیتنے والا جیت کر ہارتا ہے اور ہارنے والے کو رونے کے لیے مقاماتِ آہ و فغاں کی تلاش ہوتی ہے۔ زندگی تو خیر نفی سے بھی اثبات کی صورت تراش لیتی ہے لیکن کسی اجتماعی تاریخ کے اس ناروا تصادم کا نشانہ بن کر مٹنے والے ایسی زمین کا رزق بنتے ہیں کہ جس کی وسعتیں ان پر تنگ ہو گئی تھیں اور باقی رہ جانے والوں کے سینوں میں حزن و یاس کا وہ لاوا ابلتا ہے کہ خود انہیں جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ نہ مرنے والے کی دہائی ہے اور نہ بچنے والوں کی شنوائی۔ اختر لکھنوی نے ایسی ہی آہِ ناکشیدہ کو اظہار کی صورت بخشی ہے اور ان کا "دیدۂ تر" کشتگانِ ستم کا ماتم بھی لیے ہوئے ہے اور بچ جانے والوں کے غم کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔

کیا اس بے معنی قتل و غارت گری نے جس کا عکس "دیدۂ تر" میں ملتا ہے، اپنے زمانے کے خوف و دہشت کو مجسم کیا ہے یا اس مجموعی شعورِ رہنمائی کی صورتِ گم گشتگی ہے، جس نے بھٹک کر اپنی صدائے پا سے نہ صرف سوئے ہوئے عفریتوں کو جگایا بلکہ خود بھی آسیبی شکل اختیار کر لی۔ یہی مجموعی شعورِ رہنمائی جو ارتقاء کی راہوں میں زندگی کی نئی قوتوں کو بیدار کر سکتا تھا اہل کا حلیف

کیسے بن گیا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے لیے بار بار تلاش و تجسس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ان خونیں واقعات سے آنکھیں بند کر لینے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنی گردن چھپا لینے سے حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، اور جب حقیقتیں مسخ ہو جائیں تو آبِ حیات زہراب بن جاتا ہے اور نابینی کا قطرہ قطرہ زہر اجتماعی زندگی کے سارے چشموں کو زہریلا کر دیتا ہے۔ "دیدۂ تر" میں اختر لکھنوی نے ان خونیں واقعات کی یاد تازہ کر کے پھر ہمیں وہ لمحۂ فکر مہیا کیا ہے کہ جب ہم اس غم ناک تصادم کے اثرات و عواقب کا جائزہ لے کر اپنی سمتوں کا تعین کر سکتے ہیں۔ "دیدۂ تر" میں ہماری اجتماعی زندگی کا وہ سوالیہ نشان ملتا ہے کہ جس کے جواب کی تلاش ہماری ہیئت اجتماعی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس تاریخی بناد کے ایک طرف درد کی صلیب ہے اور دوسری طرف انسانی ترقی کی محراب۔ لیکن انسان کی ساری ترقی انفرادی اور اجتماعی سچائیوں کی مسلسل تلاش ہی سے عبارت ہے۔

غیر ملکی استبداد سے آزادی کی خواہش اور ایک ملک کے قیام کی کوشش نے ہماری بے سمتی کو سمت عطا کی اور منتشر ذروں کو متحد کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اجتماعی بہتری کے نصب العین کو فراموش کر کے عصبیتوں کو اس طرح ہوا دی گئی اور خواہشِ جاہ و منصب نے ہر سطح پر منافقت سے ساز باز کر کے ذہنوں کو ایسا پراگندہ کیا کہ شعارِ تہذیب خصائلِ تشدد سے بدل گیا۔ بیرونی دشمنوں کی مداخلت ہرگز وہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی تھی، اگر سماجی اکائیوں کی اندرونی صورتِ حال نظامِ کشش و توازن میں شورش برپا کر کے تشدد کی راہیں نہ ہموار کر دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی فطرت اور انسانی تاریخ میں تشدد کا ایک عنصر رہا ہے، لیکن جہاں اس نے بعض صورتوں میں اپنے ماحول کو سازگار بنانے میں مدد دی ہے، وہاں انسان کی مجموعی کوشش یہی رہی ہے کہ میلانِ تشدد کو پابندِ تعقل و شائستہ تہذیب بنا دیا جائے۔ لیکن جہاں تشدد کا منشور شقاوت ہو، وہاں تاریخ و تہذیب ہی نہیں، انسان خود اپنی نفی بھی کرنے لگتا ہے۔ اختر لکھنوی نے جس شقاوت کا مشاہدہ و تجربہ کیا ہے، وہ کسی بھی فرد کی زبان بند کرنے کے لیے کافی سہی، لیکن ان کے اندر کا فن کار اس مشاہدے و تجربے کو اپنی رگوں میں خون کی طرح رواں پاتا رہا اور بالآخر اسی نے "دیدۂ تر" کی صورت میں اظہار کی راہ نکالی ہے۔

سابق مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اردو کے تقریباً سب ہی لکھنے والوں نے اس اجتماعی فاجعہ کا کسی نہ کسی طرح اظہار کیا ہے انھوں نے شقاوت کو رگِ جاں تک پہنچتے بھی دیکھا ہے۔ اور اسی شقاوت کی تیرگی کے درمیان انسانیت کی روشنی بھی پائی ہے۔ اس دوسری ہجرت کا کرب بھی برداشت کیا ہے کہ جس کے لیے نظروں میں بشارت و آرزو کی شمعیں نہیں جل رہی تھیں بلکہ ٹوٹتے ہوئے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں کو زخمی کر رہی تھیں۔ ان لکھنے والوں نے اس مستحکم بنا کی شکست و ریخت دیکھی ہے کہ جس کی تعمیر میں کئی نسلوں نے اپنی جانیں کھپائی تھیں اور جس کے نہ ٹوٹنے کا یقین دلوں پر نقشِ محکم کی طرح ثبت تھا۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ جس حادثۂ جاں کاہ نے ان کے سارے وجود کو جراحت میں تبدیل کر دیا تھا، اس کی حیثیت بعض آسودگانِ ساحل کے لیے اخبار میں پڑھی ہوئی خبر سے زیادہ نہ تھی۔ اور بعض نے تو طوفان کے تھپیڑوں میں راحتِ ساحل ڈھونڈھ لی تھی۔ "دیدۂ تر" میں اختر لکھنوی نے اس المیہ کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے اور ساری غزلیں اسی ایک موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ان غزلوں کے اشعار میں ذاتی غم اور اجتماعی حزن اس طرح ہم رنگ ہو گئے ہیں کہ خود بخود ایک شعری آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ان غزلوں میں اجنبی بن جانے والے اپنوں کی شقاوت اور اپنے سمجھے جانے والوں کی سفاکانہ غیریت کی داستان منظوم ہوئی ہے۔ لیکن زیبِ داستان راہی خاک کی جنگلی ہے کہ جیسے حرزِ جاں بنائے رکھنے کی سزا میں سارے عذابوں کا نزول ہوا ہے۔ پھر جس مسلسل اور منظم طور پر اختر لکھنوی نے اس داستان کو چھیڑا ہے، اس سے اُن کی اس سانحۂ غم سے

وابستگی تو ظاہر ہوتی ہی ہے، لیکن اس وابستگی نے خود اس مجموعہ کو سوزش و تابش بخشی ہے۔ بیان کردہ سارے حادثاتِ غم کے باوجود سرزمین بنگلہ سے ترکِ تعلق میں بھی تعلق پنہاں ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر نے بزبانِ دری کہا تھا کہ "

"ہلاک می کنندم فرقتِ تو دانستم — دگر نہ رفتن ازیں شہری توانستم"

مشرقی پاکستان سے نکلنے والے اختر لکھنوی کی زبان میں کہتے ہیں کہ

"ہم ترکِ تعلق پہ بھی زندہ تو ہیں لیکن — لگتا ہے کہ دل میں کہیں کچھ ٹوٹ گیا ہے

اختر لکھنوی نے "دیدۂ تر" میں جن کوائف کی ترجمانی کی وہ نہایت درد انگیز ہیں اور جس غم کو اپنا موضوع بنایا ہے، وہ ہماری اب تک کی قومی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن حیرت ہے کہ اتنا بڑا المیہ قوم کے سر سے ایسا گزر جائے کہ قومی وجود کو اپنی اہمیت کے تناسب سے ہلانے، جھنجھوڑنے اور فکری زندگی میں لرزہ پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملک دو نیم ضرور ہوا لیکن قلب دو نیم نہیں ہوئے۔ پھر اس قومی المیہ کے نتیجے میں افراد پر جو کچھ بیتی اور بیت رہی ہے، اس کی ہوشربا خوں چکانی پتھروں کو پگھلا سکتی ہے، مگر بہت سے پتھر دل نہیں پگھلے۔ اختر لکھنوی نے شقاوت و غفلت کے منظر نامے کو ساتھ ساتھ پیش کیا ہے۔

دیکھے ہیں ان آنکھوں نے وہ منظر بھی کہ جن سے — آئینے تو کیا سنگ بھی محجوب ہوئے ہیں
جو قتل ہوئے ان سے زیادہ ہیں کہیں وہ — غفلت کی صلیبوں پہ جو مصلوب ہوئے ہیں

"دیدۂ تر" کے اشعار میں وحشت، موت، بے بسی، اسیری، دوسری ہجرت، غربت اور غیریت کے جو شاعرانہ نقوش پیش کیے گئے ہیں، ان کے پیچھے انفرادی اور اجتماعی تجربوں کی آگ محسوس ہوتی ہے کہ ان کا تعلق مجردات سے نہیں، مشخص و محسوس حقائق سے ہے۔ موت "دیدۂ تر" کے اشعار میں مابعد الطبیعیات، مجاز، طبعی انجام اور خواہشِ مرگ کی صورتوں میں نہیں بلکہ بے رحمانہ حالات کی پیدا کردہ وسیع، سفاک اور سرد حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح غفلت، بے خبری اور لاپروائی سے زیادہ اندوہناک اپنوں کی غیریت کا لگایا ہوا وہ زخم ہے جو انسانوں کے ایک بڑے گروہ کو کہیں خیمہ بستیوں میں مجبورِ فغاں کرتا ہے اور کہیں شہری آبادیوں میں فاقہ زدہ، بے گھر اور بے حال چھوڑتا ہے۔ کسی نہ کسی سطح پر اس دورِ ابتلا کے سب گرفتاروں نے عذاب دوزخ سہا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے سے گزرنے والوں نے جو درد کی لہر محسوس کی ہے، اس نے ایک نیا رشتۂ درد قائم کیا ہے۔ تخلیقی طور پر ان وابستگانِ رشتۂ درد میں صدیقی سالک، مسعود مفتی، افسر ماہ پوری، شاہین اور مقبول نقش ہی اختر لکھنوی کے ساتھ نہیں، ("دیدۂ تر" کے آغاز میں خود ان کی دی ہوئی طویل فہرست کے بیشتر ناموں کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد (جن کا نیا ناول "صدیوں کی زنجیر" ابھی منظرِ عام پر آیا ہے) کے ساتھ ساتھ چند اردو کے وہ لائقِ احترام لکھنے والے بھی شامل ہیں، جنہوں نے اگرچہ ان دردناک واقعات کے درمیان جینے اور مرنے کا کرب نہیں سہا، لیکن اسے ذہنی طور پر محسوس کیا اور اپنی بعض ادبی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ البتہ مجموعی قومی سطح پر جو ذہنی افلاس رہا ہے، اسی نے اس عقوبت سے دوچار کیا ہے۔ اختر لکھنوی کہتے ہیں

یہ اور بات کہ تدبیر ہم نے کوئی نہ کی — نہیں یہ بات کہ ہر بات بے گمان ہوئی

اس حزنیے کی وسعت پر نظر رکھتے ہوئے بڑی حد تک ادب کے ایوانوں میں جو سناٹا رہا ہے، وہ آج بھی ہماری بے حسی کا نوحہ خواں ہے۔ دراصل جب انسانوں سے منہ موڑ لیا جائے تو وہ آسیب یا سایہ بن جاتے ہیں اور جب سانحے سے نظریں پھیری

جائیں تو وہ مستقبل کی سراسیمگی اور سرافگندگی کا نشان بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ "دیدہ تر" اس اعتبار سے محض نشانِ ورد ہی نہیں، ایک شاعرانہ تنبیہہ بھی ہے۔

تاریکی کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، اسی تاریکی سے روشنی کی کرنیں بھی پھوٹتی ہیں۔ اگر درد محرومی، انتشار اور ناکامی کی بہتات، بہت سے افراد کی زبان بند کر دیتی ہے تو اس خاموشی کو توڑنے کے لیے کچھ لبوں سے فریاد کی صدا ضرور بلند ہونے لگتی ہے۔ شاعری دراصل اسی فریاد کی امانتدار ہے اور اسی لیے اس کے بولتے گاتے الفاظ کسی نہ کسی درجے میں اپنے دور کے احتجاج کو پیش کرتے ہیں۔ اختر لکھنوی کے "دیدۂ تر" میں فریاد کی لے تیز ہو کر کہیں کہرام میں تبدیل ہو گئی ہے اور کہیں حالات کے خلاف احتجاج نے غصہ وری کو راہ دی ہے لیکن ہر صورت میں اشعار کا واقعات سے ایسا تعلق قائم رہا ہے کہ ان کو مطابق حال کیفیات اور وثائق حالات کہا جا سکتا ہے۔

"دیدۂ تر" میں کچھ تو وہ اشعار ہیں کہ جن میں براہِ راست بیان کا طریقہ برتا گیا ہے اور واقعات کی سنگینی نے کسی صنعت یا سجاوٹ کی اجازت نہیں دی ہے مثلاً

اب بھی وہاں ڈھونڈو گے تو راہوں میں ملیں گے کچھ خون کے دھبے
انبوہ کی صورت میں جہاں قتل ہوا تھا، اپنوں نے کیا تھا

اس وقت کا بیان ہے باہر بیان سے
جب بات کر رہا تھا، دھواں آسماں سے

قسطوں میں مرا قتل تھا خلقت کو تماشہ
یہ واقعہ بھی شہر سے باہر نہ ہوا تھا

کچھ وہ اشعار ہیں جن میں واقعات کی گرفت موجود ہے، لیکن ان کی فوری دہشت کے بجائے فکر و تامل کے انداز سے بیان میں وسعت آ گئی ہے مثلاً

ہم خانہ بدوشوں سے پوچھے نہ پتہ کوئی
اک شہر میں دن گزرا، اک شہر میں رات آئی

یہ معجزہ نہیں ہے تو کیا اس کا نام ہے
وہ ہجرتوں کے بعد بھی تاب کلام ہے

جب بھی شام آئی ہے بیٹھ کر کہیں ہم لوگ
ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں

فرصتیں عہد اسیری میں میسر تھیں بہت
دیکھتے رہتے تھے دیوار کی، در کی صورت

جو چہرہ بدلنے میں بہت طاق رہے ہیں   اب ایسے ہی لوگوں سے مری ہم سفری ہے

زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ یوں تو نہ دو   خاک ہی خاک نظر آئے جہاں تک دیکھوں

بند کمروں میں ابھی فیصلے ہوتے ہیں تو ہوں   فیصلہ ایک سرِ راہ گزر بھی ہوگا

ان اشعار میں بیانیہ انداز اور جذباتی کیفیت دونوں کی آمیزش ہے لیکن حقیقت سے پیوستگی انہیں عام شعری انداز سے مختلف بنا دیتی ہے۔

"دیدۂ تر" میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو پوری طرح غزل کی روایت کا حصہ معلوم ہوتے ہوئے بھی، بیان کردہ اجتماعی سانحے کے تجربے سے گزرے بغیر نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ ان اشعار کی تاثیر کا دائرہ وسیع ہے، لیکن ان کی عمومی کاٹ میں وقت کی خصوصی قطع و برید شامل ہے۔ مثلاً

پوچھنے والے مری دہشت زدہ آنکھوں سے پوچھ
موت کے دیکھے ہیں کتنے روپ، کتنی صورتیں

کھینچ کر کھال یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے   بے خطا رسن و دار غنیمت جانو

جسم پر اپنے تو خیر اپنی انا کا تھا لباس   لوگ ایسے بھی تھے جو ہو کے برہنا ڈوبے

جب ایک محاورے کے مطابق ہومر بھی اونگھنے لگتا ہے تو اختر لکھنوی سے "دیدۂ تر" کے تمام اشعار میں ہمواری و یک معیاری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اس مجموعے میں شامل بعض اشعار پر گرفت کی جا سکتی ہے۔ بعض اشعار میں اردو غزل کی معروف آوازوں کی گونج ملتی ہے، لیکن ہر جگہ مخصوص صورتِ حال کی گرفت اتنی نمایاں ہے کہ اشعار میں ایک الگ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

تاریکی اور دیوانگی کی دن کی روشنی اور شعورِ انسانیت سے جو کشمکش جاری ہے، کوئی باشعور اس سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ اختر لکھنوی نے اپنی شاعری کی چیخ اور فریاد سے، خاموش رہنے والوں کی بدنصیبی کے اظہار کا کچھ حق ادا کر دیا ہے۔ "دیدۂ تر" میں آنکھوں میں خون اترنے کی دیوانگی اور آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے کی مظلومیت کا جو بیان ہوا ہے، اس سے اپنے وقت کے جبر و تشدد اور اختلال و برہمی کو زبان مل گئی ہے لیکن بعض اوقات تاثیر کی شدت اور منظر کی دہشت سے نظریں سامنے کے نظارے پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور سلسلۂ عوامل کو فراموش کر دیتی ہیں۔ بیان کی غیر تہہ داری بھی نظروں کی گرفتاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

انسانی تاریخ میں جہاں انبوہ اسیراں کی اذیت دہی اور تہذیبی یا نسلی گروہوں کے قتلِ عام سے لے کر بڑے پیمانے پر بے خانمانی اور آزارِ غریبت تک ایک سلسلۂ بد رفتاری ملتا ہے، وہاں ایثار و انسان دوستی کی روشنی بھی راہوں کو منور کرتی ہے کہ جس کی مثالیں ہر دورِ ابتلا کے اختلاف میں بھی اس طرح مل جاتی ہیں کہ انسانیت پر اعتماد باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر حادثے میں ایک آن کی دمک کے ساتھ کئی انوکھے

کی چمک مخفی ہوتی ہے۔ پھر ادب ظلم کے خلاف کش مکش کو جہاں ایک مخصوص صورتِ حال کے ساتھ پیش کرتا ہے، وہاں اس کا سلسلہ انسان کی عمومی جدوجہد سے بھی قائم کرتا اور ناگزیر شدت و تلخی کے باوجود بڑی وحدتِ انسانی کا ترجمان ہوتا ہے۔ کسی بڑے المیے کے بیان میں سطح بینی اور آسان کلیہ سازی کچھ کم خطرناک نہیں۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھتے ہوئے اس خطرے سے خبردار رہنا ضروری ہے۔

"دیدۂ تر" جس بڑے سانحہ کو پیش کرتا ہے، تاریخی اعتبار سے عملی اور فکری طور پر اس کے رونما ہونے کے جرم میں کسی نہ کسی حد تک ہم سب شریک ہیں۔ یہ وہ بدی ہے کہ جس کے داغ سے کسی کا دامن پاک نہیں اور ادب انسانی محبت کے ساتھ ساتھ غیر انسانی نفرت کی ذمہ داری قبول کیے بغیر زندگی کو زیادہ بہتر، زیادہ پُر امن اور زیادہ ترقی یافتہ بنانے کا پیغام نہیں دے سکتا۔

اختر لکھنوی کے اس شعری مجموعے میں وطن کی محبت ایک نمایاں محرک کی حیثیت رکھتی ہے جہاں اختر لکھنوی نے اس سرزمین کی محبت میں کھائے ہوئے ہزاروں زخموں کے باوجود وفا کے خاک نہ ہونے کا اعتماد پیدا کیا ہے۔ وہاں وہ اپنے دیدۂ تر سے مسلسل خون کے آنسو برسانے کے بعد اس دورِ تاریخ کے ظلم و شقاوت کی انسانی ذمہ داری کے احساس تک بھی پہنچے ہیں۔ "دیدۂ تر" کی آخری غزل جو بجائے "پینے" اور "چھلکانے" کی لفظیات سے شروع ہوتی ہے، "ہم نے کیا" کی ردیف میں تاریخ کے روا و ناروا کی ذمہ داری سمیٹ لیتی اور اپنے طنزیہ و رمزیہ انداز میں ایک نئے لہجے سے آشنا کرتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں

اپنے اندر کی رُت سے ہر لمحہ ہم سرشار رہے
باہر کے رنگ و موسم سے انکار کیا تو ہم نے کیا
تھا لہجہ جس کا ہم سے جدا اس کو صفِ اعدا کا جانا
پھر ایسے لوگوں کا جینا دشوار کیا تو ہم نے کیا
آشوب زدہ اس عہد میں بھی پچھلوں کی منفی باتوں کی
تجدید جو کی تو ہم نے کی، اظہار کیا تو ہم نے کیا
ہم نے اپنے سر کا طرّہ بے شل رکھا یکتا رکھا
شہروں شہروں ہر سر کو بے دستار کیا تو ہم نے کیا

یہ غزل دیدۂ تر کا اختتام سہی، لیکن آج بھی خود احتسابی کا سامان فراہم کرتی ہے اور اختر لکھنوی کے شاعرانہ شعور کی پختگی و رسیدگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ خیال کی نئی دنیائیں اور جذبہ و فکر کی نئی وسعتیں ان کی منتظر ہیں۔

(ڈاکٹر) حنیف فوق

بھید بھنور (مجموعۂ کلام)

مصنف: امین راحت چغتائی
قیمت: ۵، روپے
ناشر: امتزاج پبلی کیشنز نصیر الدین روڈ لاہور

امین راحت چغتائی، میرے ادبی رفیقوں اور ہمسفروں میں سے ہیں۔ یہ ہمسفر وہ ہیں جو آزادی کے بعد اپنے قلم، ننھی منی شمعوں کی طرح

لے کر نکلے۔ اس جرأت اور خواہش کے ساتھ کردہ لفظوں کے جگنوؤں سے زندگی کے گھنے اور تاریک جنگل میں کچھ روشنی کے ذرے بکھیر سکیں۔ لیکن آج چالیس برس بعد جب مڑ کر دیکھتا ہوں تو بہت سی شمعیں گُل ہو چکی ہیں اور کچھ ایسی سخت جان نکلیں کہ ان کا وجود مشعلوں میں بدل چکا ہے۔ دراصل یہ راستہ ہی بڑا کٹھن اور پیچیدہ تھا۔ کچھ دوستوں کا شوق بجھ گیا۔ کچھ رفیقوں میں مسلسل چلنے کی توانائی نہ تھی۔ کچھ زندگی کی ہلاکت آفریں ساعتوں سے خوفزدہ ہو کر خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ ہمنواؤں کی آوازیں، ہوا و حرص کے ملبوں میں دب گئیں۔ خود میرا یہ حال ہے کہ نہیں جانتا، ہوں بھی یا نہیں! بیدلؔ والی بات کرے

این حرص ہا کہ دامن بہ سد فن شکستہ اند — عرض کلاہ دادہ و گردن شکستہ اند

یوں بہت سے یار آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، مگر اسی پس منظر میں چلے جانے والے کچھ ایسے بھی تھے کہ جنھوں نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ امین راحت چغتائی بھی انہی میں سے ایک ہیں کہ ان کی کتاب "بھید بھنور" دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے انھوں نے سلیمانی ٹوپی اچانک اتار دی ہو۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ رہ گئیں۔ "یار! کہاں تھے تم، ہم تو تمہیں کب کے رو چکے تھے۔" یہ سچی بات ہے کہ میں نے امین راحت چغتائی کا مجموعہ پڑھا تو مجھے ایک ایسی مسرت حاصل ہوئی جو ہمیشہ جاندار شاعری پڑھنے سے ہوتی ہے۔ خاص طور پر اُن کی نظمیں، موضوع کے اعتبار سے نئی نئی اور تر و تازہ ہیں۔ جیّت اور حساسیّت کی آمیزش نے انہیں ایسی آنچ بخش دی ہے جو تازہ خون کی بشارت ہوتی ہے۔ بعض نظموں میں تو خون کی گردش اس طرح نظر آتی ہے کہ یہ سطریں نہ ہوں، لہو سے تھرکتی رگیں ہوں۔ خاص طور پر اچھوتی، چاندنی کی جھیل، ابرِ گراں، انگارے اور آنکھیں SENSUOUS نظمیں ہیں جن میں جنس کی آسودہ طلب تو ہے SEXUAL MORBIDITY نہیں ہے۔ اسی لطیف فرق کو قائم رکھنا شاعر کا قرینہ ہوتا ہے۔ ہمارے بیشتر شاعروں نے جنس کو جب بھی موضوع بنایا ہے تو اُن میں سے اکثر VULGARITY کے شکار ہو گئے ہیں یا پھر ایسی لاچارگی کا تاثر دیا ہے کہ اُن کی تخلیقات DREAMS OF THE IMPOTENT سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کے برعکس امین راحت چغتائی کی نظموں کا TEMPO دھیما، مسلسل اور آہنگ دار ہے۔ یہی وصف شاعری کو خوب صورت اور دل نشیں بناتا ہے۔ اُن کی نظم "خیر مقدم" میرے اس تجزیے کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ اس کا پہلا بند یوں ہے:

مہکتے پھولوں، چٹکتی کلیوں کی جلوہ گاہیں
ہجومِ انجم کے سائے میں کسمسا رہی ہیں
یہ آخرِ شب، صبا کے ہونٹوں کا شبنمی رس
کچھ ایسے اندازِ محرمانہ سے چھو گیا ہے
بہکتی کلیوں کی سبز چولی مسک گئی ہے

یہ تمہید استعاروں کی تہ داروں سے بُنی گئی ہے جس کے پس منظر میں محجوب خوابوں کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں۔ پھر یہ دو مصرعے CHANGE OVER TO REALITY کا وقفہ بن جاتے ہیں:

ضیائے صبح اپنی نرم گامی سے دل کی دھڑکن جگا رہی ہے
کہ آرزو کے جلو میں برسوں کے بعد تو آج آ رہی ہے

اور اس کے بعد:

سلگتی شب بھی خیال کے دائرے بناتی گزر گئی ہے
مگر ابھی تک میں سوچتا ہوں کہ کیسے اظہارِ سرخوشی ہو؟

یہ ٹھہراؤ، جذباتی جنوں کو TAME کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس سے حسیت کے باوجود، اظہار سطحیت کے جھاگ سے محفوظ رہتا ہے لیکن نظم کا آخری بند اسے اتنا خوبصورت موڑ دیتا ہے کہ نظم ایک المیہ آہنگ اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والے کو شاعر کی جنسی شائستگی کا ہمنوا بنا دیتی ہے۔

نہیں، نہیں!!
آخر آرزو کے جلو میں برسوں کے بعد تُو آج آ رہی ہے
فریب آلود مسکراہٹ سے جذبۂ سرخوشی کی تذلیل کیوں کروں میں
یہ چند آنسو، خموش لب، دل کی داستاں تجھ سے کہہ نہ دیں گے،

مجھے ابن راحت چغتائی کی بہت سی نظمیں بے حد پسند ہیں مگر اس نظم سے میں خاص طور پر محظوظ ہوا ہوں۔ مجھے ان کی نظم میراجی سے زیادہ ن۔م۔ راشد کی یاد میں لکھی ہوئی نظم راکھ پسند آئی ہے۔ اس نظم میں نہ صرف مرحوم شاعر کے فیصلے کی تائید کی گئی ہے بلکہ اس کے لیے جس قدر بھرپور استدلال کیا گیا ہے اُس سے "راکھ" کی قدر و قیمت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے:

راکھ، اثبات کی اِک نفی ہی سہی
پر نفی بھی تو اثبات کا راز ہے
جل بجھے بس وہی جس میں ہو روشنی کی تڑپ

اور نظم کا اختتامی بند، کس قدر حوصلہ مندی اور ظلمت کے خلاف صف آرا ہونے کی مقدس دعوت ہے:

جس فضا میں نہ سورج کی ہو روشنی
اُس کی تاریکیاں چیرنے کے لیے
اپنے شعلوں کے نیزے بھی لہرایئے

اب غزل کی طرف آیئے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ہمیشہ غزل انتہائی حساس صنفِ سخن لگتی ہے۔ یہ ایک خاص لگن کے ساتھ ایک خاص قرینہ بھی چاہتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ ظالم اپنے اختصار کے جادو سے پوری نظم کو کھا جاتی ہے اور اس کا ہر شعر ایک افسانے ایک نظم پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس مشکل سے وہ شاعر خاص طور پر دوچار ہوتے ہیں جو بیک وقت نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ میں سمجھتا ہوں ابن راحت چغتائی بھی ایسے شعری سانحوں سے گزرے ہوں گے مگر مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ اُن کی غزلیں اس اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ ان میں سے بیشتر کا مواد اُن کی نظموں کے رنگ اور آہنگ سے ملتا ہے۔ یعنی اُسی SENSUOUSNESS کی دھیمی دھیمی آنچ جس سے اُن کی نظمیں تابدار ہیں۔ یہ غزل جس کی ردیف "ہوا" ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی انسانی کردار ہے اور اُس کے قرائن وہی ہیں جو عاشق کے قرائن اُن کی نظموں میں ملتے ہیں۔

باغ میں کیا کیا نہ ہوں گی دیر تک سرگوشیاں   جب کسی شاخِ ثمر کو چھو کے آئے گی ہوا

یا

پھر نگینے سے بنتے چلے جائیں گے / اِک گھڑی اور ہے درد کی رات کی
پھر ملے تو وہی سانس کی حدّتیں / کیسی دیوار حائل تھی، حالات کی

میں کیا جواب میں کہتا گلی کے لوگوں سے / یہ آدھی رات کو سورج اِدھر کہاں نکلا
یہ چاندنی کے پہاڑوں کا، وادیوں کا سفر / نہ جانے کون کہاں گم ہوا، کہاں نکلا

رات کٹی تو ایک اچھوتی، بیتی بات کا دھیان کرے
پیراہن کی شکنیں دیکھے، دیکھے اور شرمائے بہت

یہ آخری شعر جو مَیں نے درج کیا ہے معلوم نہیں مجھے کیوں تاثر دیتا ہے کہ امین راحت چغتائی اپنے تجربوں سے زیادہ اپنے محبوب کے تجربوں کے اظہار سے رغبت رکھتے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں مگر میرا مزاج شاید مختلف ہے اور ہونا بھی چاہیئے کہ میں احمد فراز ہوں اور وہ امین راحت چغتائی۔ مَیں نے اسی تجربے کو اپنے طور پر یوں کہا تھا:

وہ ایک رات گزر بھی گئی، مگر اب تک / وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

خیر یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ تھی۔ امین راحت چغتائی کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرتے وقت احساس ہوا کہ اُن کے ہاں "آئینہ" کا استعمال بے حد اہمیت رکھتا ہے اور یہ علامت اُن کی ذات کے بے شمار خدوخال اجاگر کرتی ہے۔ آئینہ، ادراکِ ذات اور عرفانِ وجود کی عکاسی بھی کرتا ہے اور مشاہداتِ نگاہ کی ترجمانی بھی۔

کثرتِ جلوہ سے احوال نہ ابتر ہوتے / جانے کیوں آئینہ ہم بن گئے پتھر ہوتے

یہ "آئینگی" وہی ہے جسے غالب نے آشوبِ آگہی کہا ہے۔ خاص طور پر وہاں، جہاں اردگرد کے سب لوگ پتھر کے مصداق ہوں اُن میں نہ انسانی قدروں کا شعور ہو اور نہ ہی تہذیبی لطافتوں کا پاس۔ ایک بے حس اور بے درد ہجوم جو آئینہ کے ریزہ ریزہ ہونے کا یارا رکھتا ہے نہ حوصلہ، اور پھر سوائے اس کے کہ وہ لوگ ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیں، اُنھیں اپنا مصرف نظر نہیں آتا۔

جیسے میں نے کہا ہے لفظ "آئینہ" جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس میں مجھے مختلف شکلیں نظر آئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار کہ ان میں رنگ رنگ کی جذباتی تصویریں ہیں:

ہر گھڑی تجھ کو نگاہوں میں رکھوں / آئینہ اپنے مقابل نہ کروں

آئینہ ہوش سے ذرا دیکھیں / آئینے میں ہیں لوگ ہم جیسے

کوئی تو بات ہوئی ہے عجیب سی راحت / کہ آئینہ بھی نہ وہ چھوڑے، اور شرمائے

ہم سے ہر راز بصد شوق چھپا لے اپنا — آئینے سے ذرا چہرہ تو بچا لے اپنا

کیا میں پابند ہوں، کیوں دیکھنا پڑتا ہے وہی — آئینہ بن کے دکھاتا ہے جو منظر شیشہ

ایک اور بات جو امین راحت چغتائی کے کلام میں نمایاں ہے اور جس نے مجھے اس کے مطالعے میں اپنی طرف متوجہ کیا، یہ ہے کہ جہاں وہ قدیم اساتذہ سے وابستگی رکھتے ہیں وہاں انہوں نے اپنے عہد کے اندازِ بیان اور موضوعات سے بھی دلچسپی لی ہے۔ اس کا ثبوت نہ صرف اُن کی غزلوں کی زمینوں سے ملتا ہے جو انہوں نے قدیم اساتذہ سے ماخوذ کیں بلکہ کہیں کہیں لہجہ بھی وہی ہے۔ البتہ مضامین نئے اور اپنے ہیں۔ چند ایسی غزلوں کے مطلعے درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا دستِ صبا نے چاک زخم گُل رفو برسوں
رہی صیّاد کی پھر بھی چمن میں گفتگو برسوں

جو کسِ مے نے پکارا ہے، اُٹھو اور سنو — شیخ آئے ہیں سوئے میکدہ، لو اور سنو

خلوصِ مہر و محبت پہ جو ہوا، سو ہوا — تم اعترافِ جفا کیوں کرو، ہوا، سو ہوا

ذکر اپنا یوں ہوا، یاروں کے بیچ — گفتگو جیسے ہو تلواروں کے بیچ

اسی غزل میں گو زبان قدیم ہے مگر تجربے اور مشاہدے قطعی آج کے ہیں۔

چل پڑے کر علیمیں دوش پر — بات اگر کرنی ہے بازاروں کے بیچ
لوگ تب بیدار ہوتے ہیں یہاں — جب نقب لگتی ہے دیواروں کے بیچ

یا:

نئی سڑک کے کہیں درمیاں نہ آ جائے — ابھی ابھی جو تناور گھنا شجر دیکھا
تنے رہو یونہی اپنی امانتیں تھامے — جھکی جو شاخ تو اُس پر نہ پھر ثمر دیکھا

صدائیں ڈوب چکی ہیں کہیں پسِ دیوار — وہ خامشی ہے کہ بیرونِ در سنائی دے

بات بڑھ گئی ہے۔ مجھے تو یہ کہنا تھا کہ امین راحت چغتائی کے مجموعے پر کچھ لکھنے کی خواہش تھی مگر کیا کروں، کچھ تو عادتوں اور کچھ جھمیلوں نے لکھنے پڑھنے سے دور کر رکھا ہے۔

احمد فراز

کھویا ہوا آدمی (افسانے)

مصنف : سلطان جاوید نسیم
قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : بختیار اکیڈمی، اے ۴۹/۲ گلشن اقبال کراچی

کہا جاتا ہے کہ اگر زندگی کو زبان دے دی جائے تو وہ ناول یا کہانی کے انداز میں بات کرے گی گویا کہانی پن زندگی کی ایک ایسی باطنی حقیقت ہے جو ہمیشہ اس کے خمیر میں موجود رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انسان نے جب زندگی کی حقیقت کو کھوجنے کی کوششیں شروع کیں تو فلسفہ و سائنس کی نہیں بلکہ اساطیر اور دیومالا کی زبان اختیار کی۔ گویا انسان نے زندگی اور کائنات کو کہانیوں کے پیکر میں دیکھا اور کہانیوں ہی کی صورت میں ظاہر کیا۔ آج بھی انسان بچپن سے لے کر اپنی عمر کے آخری حصے تک کہانی سن کے جس قدر خوش ہوتا ہے۔ اتنی خوشی وہ کسی دوسرے اندازِ بیان میں نہیں پاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی، انسان اور زندگی دونوں کی ایک اندرونی ضرورت ہے۔ کہانی کی اس حقیقت سے ایک اچھا افسانہ نگار واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جب بھی کوئی افسانہ تخلیق کرتا ہے تو انسان، زندگی اور کائنات میں موجود کہانی پن سے اپنا تعلق منقطع نہیں کرتا۔ افسانے کی راہ میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا جب کہانی پچھڑ کے رہ گئی تھی۔ اسی راہ کے کچھ لوگ آج کل بھی افسانوی ادب سے کہانی کو خارج کرنے پر بہت زور دیتے ہیں جو بقول والٹن ایلن ناول یا افسانے کو ذبح کرنے کے مترادف ہے۔

سلطان جمیل ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو اپنے لکھنے کے ابتدائی زمانے سے اب تک کہانی کا دامن پوری مضبوطی سے تھامے رکھنے کے باوجود اپنے عہد کے شعور اور طرزِ احساس کے تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ "کھویا ہوا آدمی" کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنے افسانوں میں واقعات کو انکے زمانے کے مطابق سلسلہ وار ترتیب دیا ہے۔ اس کی کہانی میں پہلی چیز خارجی حالات و واقعات ہوتے ہیں جو زمانی تسلسل میں آگے بڑھتے ہیں۔ پھر وہ ان واقعات و حالات میں اپنے زمانے کی حسیت سے بھی آگاہی کا ثبوت دیتا ہے جس سے حالات و واقعات کی معروضیت پڑھنے والوں کے اپنے احساس اور جذبات میں ڈھلنے لگتی ہے۔ سلطان جمیل نسیم جس خوبی کے ساتھ معروضی واقعات و حالات کو عصری طرزِ احساس میں شامل کر کے کہانی کا تانا بانا بنتا ہے، اس طرح اس کے افسانے خارجی حقائق کو چشمِ باطن سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے افسانے "کھویا ہوا آدمی" کو ہی لیجئے (یہی سلطان جمیل نسیم کے مجموعے کا نام بھی ہے) اس افسانے میں نہ صرف عہدِ حاضر کی انسانی صورت حال کو افسانے میں ڈھالا ہے بلکہ افسانہ نگاری کے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار مائیکل جوزف، جدید افسانہ نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

"—— تم لکھنے والے —— جو داخلی اور خارجی گھٹن کے زیر اثر لکھنے کا دعویٰ کرتے ہو —— فکر کی اور تحریک آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے تمہارے قلم کی سیاہی خشک ہونے لگتی ہے۔ تم بہت بڑے ڈکٹیٹر ہوتے ہو۔ اپنے کرداروں کو ان کی مرضی سے حرکت تک نہیں کرنے دیتے ہو۔ جن دقیانوسی افکار و نظریات کا بوجھ تم نے اپنے ذہن پر سوار کر رکھا ہے وہی اپنے کرداروں پر لاد دینا چاہتے ہو۔ اس کائنات میں جہاں وقت کا قافلہ رواں دواں ہے تم منہ پھیر کے بیٹھ جاتے ہو اور ساتھ ہی اپنے کرداروں کو بھی دبوچ کر بٹھا لیتے ہو —— پھر جب وہ تمہاری کہانیوں میں نظر آتے ہیں تو عجیب مسخرے لگتے ہیں ——"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان جمیل نسیم کے نزدیک کرداروں کو اصل زندگی سے افسانے میں آنا چاہیئے نہ کہ افسانہ نگار مروجہ افکار و نظریات کے تانے بانے بُن کر خیالی کرداروں کا مجمع اکٹھا کر دے۔

سلطان جمیل نسیم کے کردار حقیقی زندگی سے ہی کہانی میں آتے ہیں لیکن وہ انہیں من و عن پیش نہیں کر دیتا بلکہ ان حقیقی کرداروں کے باطن کا کھوج لگاتا ہے کیونکہ کھوج لگانا ہی افسانہ نگاری ہے۔ افسانہ نگار کا مقصد زندگی کو پیش کرنا نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں کو دریافت کرنا ہے۔ جہاں تک زندگی اور اس کی رنگا رنگ سرگرمیاں ہیں وہ سب ہمارے سامنے ہیں اور ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی طرح زندگی کے افسانے کا کردار بھی ہے۔ چنانچہ زندگی جیسی نظر آتی ہے اُسے بعینہٖ پیش کر دینا حقیقتِ معلومہ کو بیان کر دینے کے مترادف ہے جو سراسر ایک غیر تخلیقی عمل ہے۔ زندگی بالخصوص معاشرتی زندگی کے باطن کو منکشف کرنا ہی زندگی کو دریافت کرنا ہے اور افسانہ نگار اپنے تجربے، اپنے علم اور اپنے مشاہدے کی صلاحیتوں کے ساتھ اپنے تخیل کو بروئے کار لاتے ہوئے یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم بھی اسی فریضے کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ کسی افسانے کو حقیقی معنی میں افسانہ قرار دینے کے سلسلے میں ہم سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی کہانی کی نوعیت کیا ہے۔ آیا پہلے سے کچھ واقعات اور کرداروں کو سامنے رکھ کر ایک پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے جس سے کہانی بنی ہے اور اس کی مطابقت میں افسانہ تیار ہوا ہے یا پھر کچھ کرداروں اور واقعات یا کردار اور واقعہ کی حقیقت منکشف ہو کر کہانی کا روپ اختیار کر گئی ہے اور آخر کار افسانے کی صورت نکھر کر سامنے آ گئی۔ سلطان جمیل نسیم کے ہاں موخرالذکر صورت کار فرما نظر آتی ہے اور ان کی اس خوبی کی جانب احمد ندیم قاسمی نے بھی توجہ دلائی ہے۔

"سلطان جمیل نسیم کے افسانے اردو افسانہ نگاری کی اُس عظیم روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا آغاز منشی پریم چند سے ہوا ___ یہی وہ روایت ہے جو دنیا بھر میں فکشن کے غیر فانی شاہکاروں کی صورت میں محفوظ ہے اور آئندہ بھی سچے اور کھرے افسانے اور ناول کی عمارت اس روایت کی بنیاد پر اٹھائی جائے گی ___ افسانے میں تجریدیت کا تجربہ ایک تیز جھونکا تھا جو اس روایت کو مسخ کیے بغیر گزر گیا۔ میرے اس دعوے کا روشن ثبوت سلطان جمیل نسیم کی یہ کہانیاں ہیں جو "کھویا ہوا آدمی" میں یکجا کر دی گئی ہیں ___"

جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ زندگی کے انکشافات ہی زندگی کی دریافت کا وسیلہ بنتے ہیں اور زندگی کی دریافت کا عمل تجرید کے ذریعے ممکن نہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ جدیدیت اور اپنے زمانے کی نمائندگی کرنے کے باوجود سلطان جمیل نسیم نے اُس تجریدیت سے خود کو الگ رکھا ہے جو کرداروں کو مسخ کر کے اُن کی اور اُن کے زمانے کی پہچان کھو دیتی ہے بلکہ انہوں نے کرداروں کے نقش و نگار اتنے روشن لفظوں سے ابھارے ہیں کہ ان کرداروں کے بطن سے علامتیں اُبھر کے کہانی میں ایسا وصف پیدا کر دیتی ہیں جو پڑھنے والوں کی توجہ کو پہلے فقرے سے آخری سطر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور کہانی اپنے سفر کی تکمیل کسی نہ کسی انکشاف سے کرتی ہے۔ یہاں ہم اپنی بات کی دلیل میں سلطان جمیل نسیم کی کئی کہانیوں کے نام لے سکتے ہیں۔ جیسے "علاج"، "عذاب"، "آسیب"، "بے چہرہ آوازیں"، "خالی ہاتھ" ___ "گھر کا راستہ" اور "کھویا ہوا آدمی" ___ ان کے مجموعے کا پہلا افسانہ "گھر کا راستہ" ہے۔ اس افسانے کا ابتدائی فقرہ ہی بتا رہا ہے کہ واقعات کے ساتھ کرداروں کے حقیقت پسندانہ بیان نے زندگی کے اُس رخ کو موضوع بنایا ہے جہاں معاشرے کا کوئی پہلو ہمارے سامنے کھل کر آ جائے گا۔

"گھر کا راستہ" کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

"بات عجیب سی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔"

اسی طرح افسانہ "کھویا ہوا آدمی" کا آغاز ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اس افسانے میں "کنواں" اور "رسی" کی علامتیں ہماری جستجو کو مہمیز کرتی ہیں اور ہم اُن علامتوں کی معنویت دریافت کی خواہش میں کہانی کو زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں۔ اس دوران ہمیں کہانی کا ایک کردار مائیکل موجودہ عالمی صورتحال کا نمائندہ نظر آتا ہے۔ مائیکل جوزف اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو اپنی ظاہری صورت، لباس اور رویے سے ایک ہپی نظر آتا ہے لیکن دنیا

سے بیزار اور سماجی اقدار سے بے تعلق یہ کردار عصرِ حاضر کے شعور سے عاری نہیں ہے بلکہ ایک بڑی حد تک اس کا رویہ اس کے عصری شعور ہی کی ایک علامت ہے ـــــ وہ کہتا ہے

"ـــــ مجھے بھی تم اپنے مفروضوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہو، حالانکہ میرے بارے میں یہ بھی نہیں جانتے کہ میں شہریت کے اعتبار سے امریکی اور نسلاً یہودی ہوں ـــ کالوں سے ـــــ غیر یہودیوں سے نفرت میری گھٹی میں پڑی ہے ـــ ویت نامیوں سے نفرت کے کیپسول ہوش سنبھالتے ہی مجھے کھانے پڑے ہیں ـــــ اور یہ تمام کراہتیں مجھ میں رچ بس کر میرے وجود کا حصہ بن گئی ہیں ـــــ"

آگے چل کر یہی کردار اس حقیقت کے اعتراف کی منزل سے گزرتا ہے۔

"سنو ـــ میں نے ایک کالے کو پستول سے داغا ہے اور ایک کا سر پھاڑا ہے۔ میرا بس چلے تو اپنی ریاست سے یہ سیاہ داغ ہمیشہ کے لیے دھو ڈالوں۔ میں نے ایک فلسطینی کے چھرا گھونپا ہے اور اپنی نسل پر نازاں کئی جرمن لڑکیوں کی کوکھ میں یہودیت کا بیج بویا ہے ـــــ ویت نام ـــــ شدید نفرت ہے۔ مجھے اس نام سے ـــــ اس ملک کی جنگ نے مجھے بہت دکھ دیئے ہیں اور یہی دکھ میرے خون میں نفرت اور انتقام کی صورت گردش کر رہے ہیں ـــــ کیسی عجیب بات ہے میں نے جتنے ویت نامی مارے اتنی ہی ویت نامی لڑکیوں کے ساتھ شب بسری کی ـــــ"

مائیکل کا یہ بیان عصری انسانی صورتِ حال کی حقیقی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ہمارے اخلاق کے وہ مُصلح جو ہر وقت خیر و شر کے فرسودہ فلسفے بیان کر کے ہمیں خیر کی طرف راغب کرنے کی ریاکاری میں مصروف رہتے ہیں انہیں کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ انسان کے اصل دکھوں کی طرف بھی دیکھ سکیں ـــــ ہماری آج کی دنیا جو آزادی، مساوات اور انسانیت کے نعرے لگاتے نہیں تھکتی۔ ہر لمحہ نسل و رنگ کے تعصب، قومیتوں کے امتیاز اور معاشی استحصال کے منصوبوں کی صورت جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتی نظر آتی ہے۔ قول و فعل کا یہ تضاد ہمارے عہد میں اپنے عروج کو پہنچ گیا ہے جس کے نتیجے میں انسان، انسانیت سے محروم ہو گیا ہے۔ "کھویا ہوا آدمی" کے مائیکل جوزف کا یہ بیان ہمارے دل میں اترتا ہے تو سمجھ میں آتا ہے کہ افسانے کے آغاز میں "کنواں" اُس پستی کی علامت ہے جس میں گر کر حقیقی انسان غائب ہو گیا ہے اور "رسّی" وہ تسلسلِ زمانہ (TIME-CONT INUITY) ہے جو زندگی اور تاریخ کی حقیقت ہے۔ ہر تغیرِ جہاں کا سراغ اسی تسلسلِ زمانہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانے میں بھی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے تسلسلِ زمانہ ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔

ہم نے مثال کے طور پر تفصیل کے ساتھ ایک ہی افسانے (کھویا ہوا آدمی) کا ذکر کیا ہے اور اسی میں سے اقتباس پیش کیے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان جمیل نسیم نے تمام افسانوں میں زندگی کے تضادات اور حالات و واقعات کی سنگینی کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

یہاں ہم ایک اور افسانے "بے چہرہ آوازیں" کا حوالہ بھی دیں گے۔ اس افسانے میں معاشرتی قدروں کے زوال کو موضوع بنایا ہے اور یہ وہ اقدار ہیں جو اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود ایک زمانے تک ہمارے معاشرے کا بڑا حصہ تھیں اور آج بھی کسی حد تک موجود ہیں کیونکہ زوال پذیر معاشرتی قدروں کو اپنے مفاد کے لیے سہارا بنانے والے تو ہر عہد میں موجود رہتے ہیں۔ "بے چہرہ آوازیں" پڑھتے ہوئے ایک تحیر آمیز عبرت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس افسانے میں سلطان جمیل نسیم نے ان اقدار کے زوال پر نوحہ خوانی نہیں کی ہے بلکہ معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بین السطور ایک نئے معاشرے اور صحت مند اقدار کے احیاء کی جانب اشارے بھی کیے ہیں جہاں طبقاتی استحصال کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اسی

طرح ایک اور افسانہ "آسیب" ہے جس میں ایک شخص مادی آسائشوں کے حصول کی خاطر زندگی کی مثبت اخلاقی اور معاشرتی اقدار سے روگردانی کرتا ہے لیکن اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب مادی آسودگی اس کو ایک آسیب کی مانند اپنے اثر میں لے لیتی ہے اور اس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق غصب کرنا سکون و اطمینان سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے اور اس کے برعکس معاشرتی حقوق کی ادائیگی طمانیت قلب کا باعث ہوتی ہے۔ سلطان جمیل نسیم کا ایک افسانہ "زہر" بھی اسی مجموعے میں شامل ہے۔ اس افسانے میں رشوت کے سرطان کو جو معاشرے میں پھیلتا جا رہا ہے موضوع بنایا گیا ہے۔ "زہر" میں بھی سلطان جمیل نسیم نے ایک حقیقی لکھنے والے کی طرح ایسا تاثر ابھارا ہے جو پڑھنے والوں میں برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

سلطان جمیل نسیم کے مذکورہ بالا تمام افسانوں میں علامتیں حقیقت کے شانہ بشانہ چلتی ہیں اور تجرید اور گنجلک پن کا وہ احساس جسے احمد ندیم قاسمی نے آندھی کا تیز جھکڑ کہا ہے ان افسانوں کو چھو کر نہیں گزرا ہے۔ ہم علامتی اور بیانیہ کی تقسیم کے قائل نہیں لیکن تجریدیت اور محض خیالی و رومانی تحریروں اور ان کے مقابل سماجی حقیقت نگاری میں ضرور فرق کر سکتے ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کو حقیقت نگاروں کے دبستان سے وابستہ سمجھتے ہیں کیونکہ اس نے تجریدیت سے گریز کرتے ہوئے حقائق زندگی کو علامتوں کے ذریعے لکھا ہے۔ اور علامتوں کو بھی مقصد نہیں بلکہ اظہار کا ایک ذریعہ سمجھا ہے۔ وہ علامت کی بنیاد پر کہانی نہیں اٹھاتا بلکہ قصے کے تقاضوں کے مطابق اور کہانی کے عمومی منصوبے کے تحت کرداروں کے باطن سے علامتیں از خود ابھر کر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں بیانیہ، علامتوں سے دست و گریباں نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ سلطان جمیل نسیم تو صرف افسانہ لکھتا ہے اور باقی بحثیں اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہے جو افسانہ لکھنے کے تو اہل نہیں لیکن افسانہ نگار کہلانے کا شوق رکھتے ہیں۔

احمد ہمدانی

زیرِ سطح (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف : قیوم راہی
قیمت : چالیس روپے
ناشر : یونائیٹڈ بک کارپوریشن، فرسٹ فلور لوب منزل، اردو بازار کراچی

"زیرِ سطح" قیوم راہی کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ قیوم راہی عمر کے لحاظ سے نہ سہی انداز فکر اور اُفتادِ طبع کے اعتبار سے یقیناً نوجوان نسل کے عمدہ ادیبوں میں سے ہیں۔ اُن کا نہ تھکنے والا قلم، اُن کی نہ تھکنے والی آنکھوں کی طرح اس خطۂ ارض کے ہر گوشے اور ہر کونے کو اپنے احاطے میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کی سچائی کو پوری طرح جانچا بھی جا سکتا ہے کیونکہ استعاروں اور اشاروں کی جگہ بیانیہ انداز میں لکھتے ہیں جو مصنف کی کہانی کی ضروریات سے ناواقفیت کو چھپانے کے لیے غیر موزوں طریقہ اظہار ہے۔ بیانیہ انداز میں موجودہ دور کا قلم کار نہ صرف یہ کہ اپنے کرداروں کا سراپا اور اُن کے ذہن کی دنیا کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ خود کو بھی قاری کی نظروں سے نہیں بچا سکتا۔

وہ دورِ حاضر کے ادیب ہیں اور جس کرب، بے حسی، پشیمانی اور بے طاقتی سے موجودہ دور کا سوچنے پر مجبور انسان دوچار ہے، وہی کرب، بے چینی، پشیمانی اور بے طاقتی ان کے افسانوں کے اجزا بنتے ہیں۔ اُسی انسان ہی کے خاکوں سے ان کے افسانے مرتب ہیں۔

قیوم راہی کا تعلق ۱۹۵۰ء سے پہلے اُس علاقے سے تھا جو اب بھارت کا حصہ ہے۔ اُس علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہونے کی تلخی کو انہوں نے اپنے موجودہ دیس کی زیست کی تلخیوں میں ضم کر دیا ہے اور خود لاہور، کراچی، کوئٹہ کی دنیا سے ان کا تعلق اتنا پختہ ہے کہ وہ ان ہی شہروں

اور گلیوں کو بطور پس منظر استعمال کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اپنے ماحول میں گھٹن محسوس کرنے والے افراد ان کی توجہ کا مرکز بار بار بنتے ہیں۔ وہ انہیں بے مزہ دن گزارتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ان کے کڑھنے کو اپنے افسانوں میں منتقل کر دیتے ہیں اور لگتا ہے یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینے کے بعد ایک سگریٹ بھر سستا کر انہی یا اُن جیسے کرداروں کی ذہنی دنیا کو زیرِ سطح دیکھنے کے لیے پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

موجودہ دور کا مزاحمت نہ کرنے والا انسان جو بہت کم ادیبوں کے لیے جاذبِ نظر ہے ہمیشہ اُن کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔ اور اگر کبھی وہ احتجاج کرتا بھی ہے تو بہت مدھم لَے میں۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جائزے سے مطمئن نہیں ہیں اور دوبارہ زیرِ سطح جھانکنے پر خود کو آمادہ کر لیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ عمل درست ہے۔ کوئی بھی فرد کسی ادیب کے لیے اپنے ذہنی جالوں اور جذبات کے ٹھیکروں کا اسٹال سجا کے سڑک کے کنارے نہیں بیٹھا رہتا ہے کہ وہ پاس سے گزرتا ہوا سب کچھ ایک ہی بار لے جائے۔ دماغ کے نہاں خانے خود کو آہستہ آہستہ کھولتے ہیں اور وہ بھی اس ادیب پر جو نہ صرف نگاہِ باریک بیں رکھتا ہو بلکہ جراحت بھی پھول کی پنکھڑی سے کر سکے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے۔ قیوم راہی اپنی دُھن کے پکے اور محنت سے کبھی نہ اکتانے والے افسانہ نگار ہیں۔ اردو ادب کی ان سے توقعات ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں —— نہ ہی اس تبصرہ نگار کی۔

حسن منظر

خواب در خواب (شاعری)

قیمت: ۵۰ روپے

مصنّف: خاطر غزنوی ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

خواب دیکھنا شاعروں کا حق رہا ہے اور ان کی تعبیر میں اپنی عمریں گنوانا ان کا معمول۔ علامہ اقبال نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور پھر اس کی تعبیر کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دی تھیں۔ ن م راشد نے کہا تھا۔ "خواب لے لو خواب" صبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا "خواب لے لو خواب"

اور احمد فراز نے کہا۔ "میں" اپنے خواب کیوں بیچوں"۔ خواب سب کو عزیز ہوتے ہیں کہ ان سے ہی زندگی کا حسن اور اس کی بقا وابستہ ہے کسی نے کہا ہے کہ "اونچے درجے کا مسافر آرام سے گہری نیند سوتا ہے اور نچلے درجے کا مسافر سونے کی بدعادت میں مبتلا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی بھی خواب نہیں دیکھتا۔ خواب تو صرف درمیانے درجے کے آدمی کے لیے مختص ہے"۔ اور خاطر غزنوی درمیانے درجے کا وہ مسافر ہے۔ جس نے ادب اور فنون کی ریل گاڑی کو ایک ایسے طاقت ور انجن کی طرح کھینچا ہے جس کے پیچھے اتنے ڈبے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو یہ گاڑی ایک قدم چلنے کا نام نہ لیتی۔ شاعری، افسانہ نگاری، تحقیق، تنقید، تبصرہ نگاری، ڈرامانگاری، ناولٹ نگاری، ترجمہ، فوٹوگرافی، مجسمہ سازی، تصویر کشی، کالم نگاری —— اسی طرح رسائل کی ادارت، انجمن سازی اور انجمن بازی اور اُن کی سیکرٹری شپ کے ڈبّے بھی مال گاڑی کے ایک دو ڈبوں کی طرح سامانِ فن کی اس ٹرین میں لگے رہے۔ لیکن ان سب ڈبوں میں دو ڈبے پوری استقامت سے ساتھ دیتے رہے۔ ایک شاعری کا اور دوسرا فوٹوگرافی کا۔ بدقسمتی سے خاطر غزنوی کی توجہ اتنے بہت سے فنون میں سے کسی ایک فن پر پوری طرح نہ جم سکی جس کی وجہ سے وہ اتنے خانوں میں بٹ گیا ہے کہ اسے خود کو پہچان

مشکل ہوگیا ہیں تو سمجھتا ہوں کہ میرے اور میرے بعض دوسرے ہم عصروں کے حق میں یہ اچھا ہوا۔ ورنہ خاطر اپنی ذہانت و محنت کی وجہ سے ہم سب کو اتنا پیچھے چھوڑ جاتا کہ ہم اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکتے۔

"خواب در خواب" خاطر غزنوی کے نصف صدی پر پھیلے ہوئے دیکھے اور ان دیکھے ہوئے خوابوں کی وہ جھلکیاں ہیں جن کے بارے میں خود اس نے کہا:

وہ خواب سو گیا پھر بے قرار پلکوں میں　　ابھی ابھی جو مجسم تھا اک حقیقت تھا

اور ہماری اور آپ کی بے قرار پلکوں میں سوئے ہوئے ان خوابوں کی تعبیر اُسے یوں نظر آئی:

وہ آئینے جو جلا کھو چکے ہیں، ہم تم ہیں　　بقیضِ رشتۂ تعبیر خوابِ مستقل

خاطر غزنوی کے اس مجموعۂ کلام میں غزلیں بھی ہیں، نظمیں بھی، گیت بھی اور طویل و مختصر نظمیں بھی ——— اور ان میں خاطر کی شدید حیثیت پوری طرح نمایاں ہے اور اس کی بھرپور شعری صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔ خاطر نہ کسی قدیم روایت سے بیزار نظر آتا ہے اور نہ جدیدیت کا شائق دکھائی دیتا ہے اس نے اردو کے کلاسیکی ادبی شعری ورثے سے بھی استفادہ کیا ہے اور جدید عصری تقاضوں سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ اس لیے وہ ان دونوں کے بین بین چلنے والا سفرِ شوق کا وہ راہی ہے جو اپنی منزل پر پہنچ کر تھکن کی بجائے تروتازگی محسوس کرتا ہے۔

خاطر غزنوی کے فکر و احساس اور جذبہ و خیال کی سچائی اس کے اپنے تجربے کی کوکھ سے پھوٹتی ہے اور تجربے کی کوکھ سے پھوٹنے والی سچائی اس شجر سایہ دار کی طرح ہوتی ہے جو زندگی کی تمام دھوپوں اور بارشوں کی زد میں رہ کر ایک خوشگوار اور فرحت بخش سایہ مہیا کرتا ہے۔ نظم "تعارف" خاطر کی ساری زندگی کی تلخیوں، ترشیوں اور شیرینیوں کی آئینہ دار ہے۔ آج سے تقریباً تیس پینتیس برس پہلے کی لکھی ہوئی یہ نظم آج بھی خاطر غزنوی کی زندگی پر پوری طرح منطبق ہے۔ اس کی ساری شاعری حقیقتوں کو تسلیم کرنے کی شاعری ہے۔ وہ زندگی، سماج اور سماجی رشتوں کے تغیر کا قائل ہے۔ وہ انسان کے دکھوں، اس کی خوشیوں اور اس کے غموں کو خارجی حالات سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک نمو پذیر وحدت سمجھتا ہے ایک ایسی وحدت جس کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے مربوط ہیں، نہ صرف مربوط بلکہ ایک دوسرے کے بغیر ان کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا اس کے نزدیک شعری تخلیقات زندگی کے مختلف شعبوں سے اپنا مواد حاصل کرتی ہیں:

ہزار چاہوں نہ دیکھوں، یہ سب مگر دیکھوں　　یہ خون و رنگ کی بارش یہ سرنگوں جذبے

سارا عالم ہے دھواں میرے خیالوں کی طرح　　اک حقیقت وہم سے اُلجھی ہوئی ہے ہر طرف

اب کہاں زمینوں پر نقش میرے پاؤں کے　　اب تو جادۂ منزل ماہ و انجم و خور ہیں

خاطر غزنوی کی ساری شاعری میں زمین ذات اور کائنات کی ایک ایسی تثلیث بنتی ہے جو اُسے مختلف رشتوں سے اپنا ناتا استوار رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ زمان و مکان کی وسعتوں کو جزو بدن بنا کر بھی اپنے پاؤں اپنی زمین پر جمائے رکھنے کا خواہش مند ہے۔ کیونکہ اُسے اپنی تنگ دامانی کے علم کے باوجود ایک احساس تفاخر بھی ہے کہ وہ اپنے ماضی، اپنی اقدار اور اپنی روایات سے مکمل طور پر وابستگی رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

مَیں صحرا نشیں ہوں

مگر قریہ و شہر کے سارے آداب و اطوار تقدیس کا خوشہ چیں ہوں

کہ میری زمیں کشتِ یاقوت و لعل و زر بے بہا کے تصرف کی نسل یقیں ہے

کہ میری شکن در شکن ہل چلائی زمیں

مگر اقبال و روحی و درازی کی روشن جبیں ہے

خاطر غزنوی اپنی تاریخ کے مختلف کرداروں اور حوالوں کو استعاروں کے طور پر بھی اپناتا ہے اور ان کے توسط سے اپنے عہد کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ "الف لیلیٰ کی آخری رات"، 'مینا بازار'، 'سامنی کو نسل'، 'پابیوں کی کہانی' اور 'انخلا' ایسی ہی چند نظمیں ہیں جن میں خاطر کا تاریخی شعور، اپنے مسائل کے پس منظر میں بولتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے بے حد ذاتی دکھ درد اور جذبات و تجربات کو بھی عمومیت عطا کر کے اجتماعی انسانی تجربات و جذبات سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس کی نظموں کا مرکزی کردار گوشت پوست کا جیتا جاگتا سوچنے اور محسوس کرنے والا ایسا انسان ہے جو مخالف اور متضاد عناصر سے واقفیت رکھتا ہے اور ردّ و قبول کے تمام عمل سے گزر کر کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظم "ایک کالی لڑکی" صفات و تشبیہات کی فراوانی سے مالا مال ہے اور یہ نظم خاطر غزنوی کے اسلوب کی پہچان ہے۔ اس میں اس نے ملبوس، شعر، موسم، پھول، بہار، مجسمہ سازی اور موسیقی کی خصوصیات اور صفات کو استعمال کر کے ایک ایسی تصویر بنائی ہے جو محض سطح کی شادابی کا اظہار نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی ذہن کی تازگی، معصومیت اور لطافت سے ہے۔ پوری نظم معنوی تلازمات اور صفات و تشبیہات کی ظاہری چمک دمک میں ڈوبی ہونے کے باوجود اسلوب کے انوکھے پن کی بڑی دلکش مثال ہے اور میری رائے میں خاطر کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

نظم "کمپیوٹر" اور "دھڑکنوں کے رشتے" میں خاطر نے آج کی میکانکی زندگی کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہ کرب دیگر شعراء کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر جس شدت سے خاطر کے ہاں موجود ہے وہ اس سپاٹ اور اکہرے پن سے بالاتر ہے جو خاطر کے دوسرے ہم عصروں کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ خاطر کی ان نظموں میں زندگی سے محبت اور انسان کی عظمت پورے عروج پر نظر آتی ہے۔

خاطر نے اپنی غزلوں میں ستم ہائے زمانہ اور رنج ہائے روزگار کو اپنے عہد کی معنویت بخشی ہے۔ میرے نزدیک شاعری، اظہار کی اس تہذیب کا نام ہے جو شعور، جمالیاتی ذوق، معاشرتی اقدار اور زبان کو سلیقے کے ساتھ برتنے سے عبارت ہے اور خاطر کی شاعری میں یہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں:

ہمارے چہرے پہ اڑتی ہے ماہ و سال کی گرد ۔۔۔ ہمارے بالوں پہ موسم ہے برف باری کا

شہر میں پھر جو بھی چہرہ تھا مجھے اپنا لگا ۔۔۔ غم دل و جاں کا سمٹ کر میرا چہرہ بن گیا

برف میں تراشے ہیں بت حسیں خداؤں کے ۔۔۔ پپائیوں پہ کھینچی ہیں مہ وشوں کی تصویریں

تو نے تو میرے اُجالوں کو فقط سائے دیئے ۔۔۔ میں تری راہوں میں سورج کی طرح روشن رہا

اس کے علاوہ 'خواب در خواب' میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں مشترکہ تجربہ اور مشترکہ احساس موجود ہے اور جو بیشتر شعر کا موضوع

محسن رہے ہیں۔ ایسے اشعار کو خاطر غزنوی کے بیان کی سادگی اور دل و دماغ کی جدت پسندی نے دوسروں سے مختلف اور پُرکشش بنا دیا ہے۔

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے — لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

تیرے بدن کی لَو میں کرشمہ نمو کا تھا — غنچے جو تیری سیج پہ جاگے، سنور گئے

کیا بھروسہ ہے ترے لطف و کرم کا اے دوست — جس طرح سایۂ دیوار ہُوا یا نہ ہُوا

خبر نہیں مجھے کس سمت لے کے اُڑ جائے
بہت دنوں سے مرے سر میں ہے ہوائے صبا

صبح رات کا غازہ، شام، دن کا جنازہ — یوں ازل سے پیتا ہوں رنگ دھوپ چھاؤں کے

اک جہانگیر خموشی کی رجز خوانی ہے — ہو گیا کیا یہ مرے گھر کا سماں راتوں رات

کچھ ان دنوں ہیں بہت مجھ پہ مہرباں وہ بھی
کہ جن کے خوں میں ہے تاثیر نیشِ عقرب کی

"خواب در خواب" کے اشعار میں آپ کو ایسی غنائیت ملے گی جو قلب کو تسکین اور روح کو فرحت بخشتی ہے۔ وہ درد بھی سانس لیتا ہوا دکھائی دے گا جو دل کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے، اپنے عہد کا وہ شعور بھی جس میں پوری روایت اور تاریخ دھڑکتی ہے، اور سلسلۂ روز و شب کا وہ کرب بھی جو حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتا ہے اور فرد کی جستجو اور نئے امکانات کی تابانیوں کا مژدہ سناتا ہے۔

محسن احسان

مہران نقش (ادبی مضامین متعلقہ سندھ)

قیمت: پچاس روپے

مصنف: ڈاکٹر نثار احمد شاہدی — ناشر: مکتبہ اشاعت اردو۔ ایف ۶۷، بی ایڈنٹی کالونی ملیر ایسٹ کراچی

سندھ کے تاریخ و ادب پر ان اہل قلم نے بھی بہت کام کیا ہے جو قیام پاکستان کے بعد یہاں آباد ہوئے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، قاضی احمد میاں جونا گڑھی کے علاوہ ڈاکٹر نعیم نقوی، آفاق صدیقی، الیاس عشقی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر نثار احمد شاہدی اور راقم الحروف کے ساتھ کتنے ہی ایسے ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے سندھی کے تخلیقی ادب کے تراجم کیے اور سندھی شاعری اور افسانے کو اردو حلقے سے روشناس

کر لیا۔ خود سندھی کے بعض لکھنے والوں نے سندھ کے بارے میں اردو میں لکھا اور اپنی ثقافت، تاریخ، ادب اور زبان کی خصوصیات دور دور تک پہنچائیں۔ یہ سلسلہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے سے جاری ہے۔

سندھی ادب کی تاریخ کے بارے میں تازہ ترین جو کتاب شائع ہوئی ہے وہ مہران نقش ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر وفا راشدی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو سالہا سال مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ کچھ مقالات ایسے بھی ہیں جو انہوں نے اس کتاب کی تاریخی ترتیب کے پیش نظر بعد میں لکھے اور انہیں اس قرینے سے مرتب کیا کہ "مہران نقش" سندھی ادب کی ایک تاریخی دستاویز بن گئی۔

ڈاکٹر وفا راشدی کئی کتابوں کے مؤلف اور مصنف ہیں۔ اس سے قبل انہوں نے "بنگال میں اردو"، "حیات وحشت"، "پیام نو"، "سہراب سے خالد ایک نیا آہنگ" اور "آہنگِ ظفر" جیسی کتابیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ تاریخ و ادب سے کتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لیے ان کا تحقیقی مقالہ "اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ" بھی ان کی اسی لگن کی نمائندگی کرتا ہے۔

ڈاکٹر وفا راشدی بنیادی طور پر ایک محقق اور شاعر ہیں اور اس ناتے سے انہوں نے شعر و ادب کا تحقیقی انداز میں مطالعہ کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ سندھی، بنگالی اور فارسی ادب بھی اُن کی توجہ کا مرکز ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ پاکستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے بارے میں بھی کوئی تحقیقی کام کر رہے ہوں۔ بالخصوص اردو کی علاقائی زبانوں سے ہم رشتگی اُن کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وفا راشدی نے کئی اہم مضامین لکھے ہیں۔

"مہران نقش" کے مطالعے سے یہ حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ پر ان کی نظر کتنی دُور رس ہے۔ در اصل ادب کا شعور تاریخ ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ تاریخ سے بے نیاز رہ کر ادب تخلیق تو کیا جا سکتا ہے مگر ادب و زبان کے ارتقاء سے آگاہی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور اس ارتقاء میں جو تہذیبی عوامل کارفرما رہتے ہیں وہ تاریخ کے مطالعے سے ہی روشن ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے کے دو زاویے ہیں۔ ایک وہ جو حکمرانوں کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے اور دوسرا زاویہ وہ ہے جو عوام اور اُن کی تہذیب کے پس منظر میں متعین ہوتا ہے اور عہد بہ عہد اُن کے خیالات، محسوسات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی زبان کا ادب ہو اُن میں یہ دو دھارے متوازی انداز میں بہتے نظر آئیں گے۔ اور بالآخر وہی دھارا آگے بڑھتا ہوا اور آگے بڑھ کر سمندر ہوتا نظر آئے گا جو عام زندگی کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہو گا۔ زندگی کی ہمہ گیر حقیقتیں اسی ادب میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور یہی حقیقتیں تاریخ کے مختلف ادوار کا تعین کرتی ہیں۔

"مہران نقش" میں اگرچہ ان حقائق کا تفصیلی مطالعہ نہیں ملتا اور اس مختصر کتاب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا، مگر ادوار کی تقسیم کے ساتھ جو ادب مطالعہ میں آتا ہے اس سے اُن نشیب و فراز کا اندازہ ہو جاتا ہے جن میں سے سندھ کی تاریخ گزرتی رہی ہے۔

ڈاکٹر وفا راشدی نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ سندھی ادب سے متعلق ہے۔ اس باب میں سندھی ادب کا تاریخی جائزہ، سندھی ادب اور قومی تشخص، شاہ لطیف کا کلام وحدت و اخوت کا پیغام شامل ہے۔ ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ایک نظر میں ہم نہ صرف سندھ کا قدیم تاریخ سے واقف ہو جاتے ہیں بلکہ ان شخصیتوں سے بھی جنہوں نے مختلف ادوار میں اپنے ادب کے ذریعے زندگی کی مختلف اقدار کی نمائندگی کی اور اپنا قومی تشخص متعین کیا۔

شاہ لطیف بلاشبہ سندھی شاعری میں ایک ایسا نام ہے جو صدیوں پر محیط ہے لیکن اس شخصیت کے ماضی، حال اور مستقبل کے عوامل اور امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وفا راشدی نے جن محرکات کی نشاندہی کی ہے وہ یقیناً توجہ طلب اور فکر انگیز ہے۔

دوسرا حصہ اردو ادب سے متعلق ہے۔ اس حصے میں اردو کے آغاز کے سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا نقطہ نظر پیش کیا گیا اور

سندھ میں اردو کے پہلے شاعر کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس باب میں ایسے منتخب شعرا پر بھی مضامین شامل ہیں، جو سندھی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ اس باب کے مطالعے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے سندھ میں کتنی مقبولیت حاصل کی، بلکہ سندھی شاعری پر اثرات اور سندھی کے اردو پر اثرات کا بھی ایک خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ یوں ایک عام قاری کے ذہن میں اردو اور سندھی کے دوش بدوش آگے بڑھنے کی وہ روش اُجاگر ہوتی ہے جو ماضی سے آج تک جاری ہے۔

تیسرے حصے میں سندھ میں فارسی زبان کے فروغ کا جائزہ لیا گیا ہے اور لعل شہباز قلندر، سچل سرمست، فقیر بیدل اور خواجہ حسن جان سرہندی کے فارسی کلام سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ اُن شخصیتوں پر مشتمل ہے جو اس سرزمین پر ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے اس سلسلے میں مخدوم محمد معین ٹھٹھوی، پیر رشد اللہ شاہ راشدی، خواجہ محمد حسن جان سرہندی اور مخدوم امیر احمد کے بارے میں اپنے مطالعے کے نقوش پیش کیے ہیں۔

"مہران نقوش" اس اعتبار سے ایک ایسی کتاب ہے جسے اردو میں سندھ کے حوالے سے ایک منفرد تصنیف کہا جاسکتا ہے اس میں تحقیقی مواد بھی ہے اور ایک مخصوص تنقیدی زاویہ بھی۔

حمایت علی شاعر

کاروانِ حرم (نعتیہ نظم)

مصنف : ع۔ س۔ مسلم
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : مقبول اکیڈمی۔ ۱۹۰ سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور

رسول اکرمؐ کی ذاتِ مبارک سے محبت یوں تو ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے مگر اس محبت کا صحیح معنوں میں حق ادا کرنے کی سعادت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اردو شاعری کی تین سو سالہ تاریخ میں شاید ہی کوئی مسلمان شاعر ایسا ہو جس نے اپنے کلام میں حضورؐ کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہ ذکر نعت، نعتیہ قصائد، مناجات، غزل، نعتیہ نظم، غرض قریب قریب ہر صنفِ سخن میں نور کی طرح جھلکا ہے۔ خواجہ میر درد، مولانا حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، امام رضا بریلوی، عبدالعزیز خالد، مظفر وارثی، حفیظ تائب اور خالد احمد کے ساتھ ساتھ اب ع۔ س۔ مسلم کا نام بھی اُن منتخب شعرا کی صف میں شامل ہو گیا ہے جنہوں نے نبی کریمؐ سے محبت کو اپنی شاعری کا اختصاصی موضوع بنایا اور اس میں اوجِ کمال حاصل کیا۔

"کاروانِ حرم"، "حمد و نعت" کے بعد مسلم صاحب کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں خالقِ کائنات اور رونقِ کائنات اُن کی فکر کا مرکز و محور ٹھہرے ہیں۔ لیکن اس کتاب کی جو خوبی اسے اس نوع کے مجموعوں میں ایک افضل اور منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ اس کی ہیئت ہے۔ "کاروانِ حرم" ایک طویل نظم ہے جو مثمن کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور جس میں شاعر نے سفرِ حج کے حوالے سے ایک بالکل منفرد نوعیت کا روحانی تجربہ بیان کیا ہے۔ بیان کا انداز ایسا دلکش اور انوکھا ہے کہ اس میں مثنوی اور قصیدے کے جملہ اوصاف بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اُن سے پہلے مولانا حالی نے مسدس کی ہیئت میں، خالد احمد نے مثنوی کے انداز میں، حفیظ جالندھری نے شاہنامے میں اور علامہ اقبال اور عبدالعزیز خالد نے اپنی طویل نظموں کے مختلف بندوں کی شکل میں حمد و نعت اور اسلامی تاریخ کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن مثمن مسلم کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ یہ نظم جو پوری کتاب

پر محیط ہے ایک ایسے سفرنامے کا رنگ اختیار کر گئی ہے جس میں شاعر کا جسم، دل اور دماغ تینوں بیک وقت سفر میں نظر آتے ہیں۔ تینوں کی منزل ایک مگر رستے الگ الگ ہیں۔ جسم زمینی دائروں میں گھومتا ہے تو دل آنسوؤں کے سمندر میں تنکے کی طرح بہتا دکھائی دیتا ہے، مگر ان دونوں سے زیادہ اہم کیفیت اس ذہن بیدار کی ہے جو اس کاروانِ حرم میں شامل تو ہے مگر وقت اور فاصلوں کا پابند نہیں۔ مسلم صاحب اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے تناظر میں جس وقت اپنے کارواں کے ساتھیوں اور اُن کے سامانِ سفر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں اندیشوں کا ایک سیلابِ عظیم کروٹیں لینے لگتا ہے وہ کبھی مڑ کے گردِ کارواں کی طرف دیکھتے ہیں جو صدیوں کے رائیگاں سفر کی داستان سُنا رہی ہے اور کبھی مستقبل میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے دھندلکوں میں اُن منزلوں کو ڈھونڈتے ہیں جن کی طرف جانے والے سارے رستے حال کے گردبادوں کا رزق بن چکے ہیں۔

”کاروانِ حرم“ دعا، فریاد اور مناجات سے آگے کی کوئی چیز ہے۔ پنجابی میں اس کیفیت کے اظہار کے لیے ہاڑا اور کُرلا دو لفظ ملتے ہیں اردو میں پتہ نہیں اسے کیا کہیں گے۔

مسلم صاحب اور اُن کی شاعری سے میرا باقاعدہ تعارف کوئی زیادہ پرانا نہیں ہے مگر ان چھ برسوں میں اُن کا جو کلام میری نظر سے گزرا ہے وہ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ”کاروانِ حرم“ کے مرتبے کو چھوتا نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کاروانِ حرم وہی سحر ہے جو بقولِ اقبال خون صد ہزار انجم کے نتیجے میں طلوع ہوئی ہے۔ بس مسلم دیارِ حرم میں پہنچتے ہیں تو اپنی کیفیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کھڑا تھا جہاں میں کھڑا رہ گیا   حیا سے زمیں میں گڑا رہ گیا

میرے نزدیک اردو شاعری میں ”حیا“ کا لفظ آج تک اس سے زیادہ خوبصورتی، ندرت اور معنی انگیزی کے ساتھ استعمال نہیں ہوا اس ایک لفظ کو برت کر مسلم صاحب نے دورِ حاضر کے مسلمان کو اس تمام ذہنی و فکری آشوب، بے عملی کی تاریخ اور مادی اور اُمت کے گروہ در گروہ رشتوں سمیت مجسم کر دیا ہے جس سے ہمارے حال کا منظر نامہ عبارت ہے۔

اس مختصر سے تبصرے میں اُن تمام بندوں کو درج کرنا، جو مجھے زیادہ پسند آئے ہیں ممکن نہیں کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا میں جہاں تہاں سے کچھ ایسے شعر پیش کرتا ہوں جو یقیناً اُردو کے دینی ادب میں ایک قیمتی اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں:

الٰہی تو صدقے میں اس خاک کے   دل پُر روشن و زندہ و پاک دے

کہیں ایک قطرہ ملے آپ کا   خدا سے بھی یہ دُکھ نہ دیکھا گیا

عجب پتھروں کو لگائے ہیں بھاگ   تُو چاہے تو پانی سے پیدا ہو آگ

خرد حیرتی ہے نظر دنگ ہے   تصوّر کی پہنائی بھی تنگ ہے

مرے دست و پا ہوں نہ میرے خلاف   الٰہی خطائیں مری کر معاف

ترے ہاتھ میں ہے رگ و جان و پے   نہ ثانی نہ ساجھی تری کوئی شے

ترا نام لیتے ہیں ہر رنگ میں   تُو ہی پھول میں ہے تُو ہی سنگ میں

سلیقہ مجھے ہے نہ فہم و وقوف   یقیں سے تو ہیں دعا کے حروف

الٰہی جو میں نے کیا بخش دے   مرا سب لیا اور دیا بخش دے

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان اشعار میں مسلم صاحب نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں شاعر کی مادری زبان یعنی

پنجابی کی خوشبو عطر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے میرا ایمان اس بات پر مزید پختہ ہوا ہے کہ شاعری کے لیے بہترین زبان کتابوں اور لغات سے نہیں بلکہ شاعر کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ مسلم صاحب نے اس نظم میں جو پنجابی الفاظ اور اظہار کے جو پیرائے استعمال کیے ہیں اُن سے اس میں ایک اور ہی طرح کی قوت اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے جس کے لیے وہ خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حمد و نعت کے مضامین کا یہ سفر جو "کاروانِ حرم" کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ اپنی ہیئت، سچائی، سادگی، درد مندی اور اثرآفرینی کی وجہ سے اُردو ادب کا ایک ایسا قیمتی اثاثہ بن گیا ہے جسے ہم بغیر کسی معذرت کے دنیا بھر کے اہلِ علم و دانش کے سامنے رکھ سکتے ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس تیز رفتار مگر وحشت خیز دور میں جبکہ انسان اپنے اندر سے اکیلا اور تنہا ہوتا جا رہا ہے، یہ کتاب ایک درد مند رفیق اور ہم راز کی طرح اُس کے ساتھ چلتی ہے اور اُسے ایک ایسے سفر کی ہم سفر بناتی ہے جہاں آنسوؤں کی دھند اور مناجات کے شور کے اُس پار عرفانِ خودی کی روشن منزل اُس کا انتظار کر رہی ہے۔

میں آخر میں "کاروانِ حرم" سے ایک دعائیہ بند پیش کرتے ہوئے رخصت چاہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ سب بھی اس دعا میں مسلم صاحب کے شریک اور ہم آواز ہوں گے:

سہارا سدا ہو تری آس کا ۔۔۔ مٹا دل سے نام و نشاں یاس کا
نشارہ ہو روشن مری راس کا ۔۔۔ بڑھا نور اب شمعِ احساس کا
بس اب مرد تقویٰ ہو پیاس کا ۔۔۔ رہے داغ شک کا نہ وسواس کا

بیابانِ حرماں کو کر مرغزار
دکھا مجھ کو لاتقنطوٗ کی بہار

امجد اسلام امجد

بکھر جانے کی رُت (شعری مجموعہ)

قیمت: ۵۰ روپے

مصنف: شہزاد احمد ۔۔۔ ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

"بکھر جانے کی رُت" شہزاد احمد کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ اُس کا پہلا مجموعہ "صدف" جو صرف غزلوں پر مشتمل تھا "اب سے تقریباً تیس برس قبل شائع ہوا تھا۔ یوں شہزاد احمد اردو شعراء کی اُس نسل سے تعلق رکھتا ہے جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد منظرِ عام پر آئی۔ شاید یہ ترقی پسند تحریک کی موضوعاتی نظموں کا ردِعمل تھا کہ اس نسل کے بیشتر شعراء نے اپنے اظہار کے لیے غزل کا سانچہ انتخاب کیا۔ ناصر کاظمی، ظفر اقبال، احمد فراز، احمد مشتاق، مصطفےٰ زیدی انجم رومانی، شہرت بخاری، شکیب جلالی، منیر نیازی، محسن احسان، اطہر نفیس اور بہت سے دوسروں کی طرح شہزاد احمد کے ابتدائی کلام میں بھی غزل، مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے نظم پر حاوی نظر آتی ہے۔ آگے چل کر ان میں سے کچھ لوگ نظم کے بھی اچھے شاعر ہوئے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ دور غزل کا ہی دور کہلائے گا۔

شہزاد کے ہم عصروں میں احمد فراز، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور ظفر اقبال نے اپنے بعد کی نسل کو فوری طور پر متاثر کیا لیکن ان میں سے ناصر کاظمی

کے استثنا سے قطع نظر کوئی بھی شاعر اپنے لہجے کے تسلسل کو برقرار نہ رکھ سکا۔ یوں چند ہی برسوں میں یہ شعرا اپنی اپنی بساط پر جالفزاد کھا کر چند مخصوص غزلوں اور مصرعوں کے نگوں میں پابند ہو کر رہ گئے۔ شہزاد احمد کا کمال یہ ہے کہ اس کے یہاں چونکے چھکے تو کم نظر آتے ہیں مگر اس کا سکور مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ اُس کے یہاں چکا چوند اور دھوم دھڑکا نہیں۔ اُس کی غزل کسی استاد کے بجائے ستار کی طرح ہے جو آہستہ آہستہ سننے والوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کرتا ہے اور پھر خود اُن کے اندر کہیں بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ اُس کی غزل میں اچھے شعروں کا تناسب اپنے بیشتر ہم عصروں سے زیادہ ہے۔ اُس کے ہم عصروں کے تازہ شعری مجموعوں کو "بکھر جانے کی رُت" کے ساتھ رکھ کر پڑھیے، مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

شہزاد احمد کی شاعری اُس کے علم اور مطالعے سے بھی بھرپور طور پر سیراب ہوئی ہے اور یہ وہ وصف ہے جو اُسے اپنے ہم عصروں سے واضح طور پر منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ اُس کی غزل میں اُس کے اِردگِرد کی کائنات سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے اور یوں آپ اُس کی غزل میں ایک حساس دل اور ایک بیدار ذہن کو ایک ساتھ منعکس پاتے ہیں۔

اس جنگ و تاز میں ٹوٹے ہیں ستارے کتنے
آسماں جیت سکا ہے نہ زمیں ہاری ہے

———

نئی رُت بھی گئے موسم کی صورت بے نمو گزری
نہ رخساروں پہ پھول آئے، نہ آنکھوں میں گھر آیا

———

گھبرا کے آسماں کی طرف دیکھتی تھی خلق
جیسے خدا زمین پہ موجود ہی نہ تھا

———

ہوا اٹھا نہ سکی بوجھ ابر کا شہزادؔ
زمیں کے اشک بھی آخر سمندروں نے پیئے

———

نگاہ دیسے تو بامِ فلک کو چھُو آئی
مَیں جس زمین پہ کھڑا تھا وہی نہ دیکھ سکا
ہوائیں رنگ بدلتی ہیں کس طرح شہزادؔ
درخت دیکھ چکے، آدمی نہ دیکھ سکا

———

نہ شب کٹی تھی، نہ گزرا تھا درد کا موسم
مگر دلوں میں پرندے سے چہچہائے تھے

———

اُس انجمن میں رات کی لَو اتنی تیز تھی
احساس بھی نہ ہم کو ہوا، کب جلے چراغ!
اب کیا بنے گا، مَیں تو عجب کشمکش میں ہوں
تیری طلب ہوا ہے، ترے راستے چراغ
لگتا ہے یوں کہ جیسے یہ صدیوں کی بات ہے
میری بھی ایک بزم تھی، میرے بھی تھے چراغ

———

جہاں پہ دنیا رکی ہوئی تھی، رکی ہوئی ہے
عجب سماں ہے، کہاں گئے روز و شب ہمارے

یوں ترکِ تعلق کی قسم کھائے ہوئے ہوں　　جیسے مرے سینے میں کسی اور دل ہے

اُس کو سب علم ہے شہزاد، وہ سب جانتا ہے
کس لیے ہاتھ اٹھاتے ہو! دُعا مانگتے ہو

یہ ان بہت سے اشعار میں سے چند شعر ہیں جو میں نے اس کتاب سے پہلی نظر میں انتخاب کیے ہیں۔ امیجری یعنی تمثال کاری اردو غزل کا سنگھار ہے۔ اساتذہ کے یہاں حسن کاری کا یہ انداز بڑے بڑے انوکھے ڈھنگ سے آیا ہے۔ مختلف حسیات کے آمیزے اور بظاہر مخالف خواص رکھنے والی چیزوں کے ملاپ سے ان ہنروروں نے عجیب عجیب تمثالیں تخلیق کی ہیں۔ جدید غزل میں جن شعراء کے یہاں غیر معمولی تمثال کاری نظر آتی ہے اُن میں شہزاد احمد ایک نمایاں نام ہے۔ اُس نے کیفیات کو (AUDIO - VISUAL) سمعی و بصری روپ میں کچھ ایسی مہارت سے پیش کیا ہے کہ بعض اوقات شعر اپنی تفہیم سے بھی پہلے محض تمثال کے حسن کی وجہ سے قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

لبِ اظہار تک آئی تھی تمنا اُس وقت　　جب مرے دل کی طرح ٹوٹ چکا تُو بھی

تلاش کرتے ہوئے انگلیاں جلا ڈالیں　　وہ تیرگی تھی کہ میں شمع بھی نہ دیکھ سکا

اے اہلِ بزم، صبح ابھی کتنی دور ہے　　دم توڑنے لگے ہیں مرے ساتھ کے چراغ

شبِ غربت کی ہوا تیز بہت ہے شہزاد　　اب ہمیں آنکھ کے اندر ہی دیا رکھنا ہے

بے ہنر ہاتھ چمکنے لگا سورج کی طرح　　آج ہم کس سے ملے، آج کسے چھو آئے

جو روشنی ہے دلوں میں، عطا تمہاری ہے　　چراغ تم سا نہیں، تم چراغ جیسے ہو

پسند مجھ کو نہ تھے ڈوبتے ہوئے تارے　　میں سو گیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا

آتے ہوئے تُو نے بھی نظر مجھ سے چُرائی　　جاتے ہوئے میں نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا

اس کتاب میں کل ملا کر ۲۲ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں سے آٹھ مختصر نظمیں ہیں۔ اگرچہ شہزاد کا اصل میدان غزل ہی ہے لیکن ایک نظم "ہم اور ہوا" ایسی ہے کہ اُس کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ جدید سائنسی دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے محبت اور اظہارِ محبت کے خدوخال میں بھی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب ہمہ وقتی اور افلاطونی محبت کے لیے فضا سازگار نہیں رہی۔ چنانچہ جسمانی رشتوں کی حقیقت

اور صداقت سے گریز نہ کر سکنے کے باعث لوگ کچھ چیزوں کو PRETEND کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو ایسی باتوں کا یقین دلاتے ہیں جن پر انہیں خود بھی یقین نہیں ہوتا۔ یہ نظم ایسی ہی ایک کیفیت کا بہت خوبصورت منظر نامہ ہے۔

"بکھر جانے کی رُت" اردو شاعری کے عمدہ سرمائے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے اور اس کا سب سے خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس کا شاعر تین دہائیوں کے سفر کے باوجود بھی تازہ دم اور نئے امکانات سے پُر نظر آتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

امجد اسلام امجد

سرائے میں شام (شاعری)

قیمت : ۳۰ روپے

مصنف : نشتر خانقاہی ناشر : نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

ہندوستان میں ہونے والی اردو شاعری کے بارے میں یہاں بیٹھ کر وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہاں اردو والوں کا ماحول اور اُن کے مسائل یہاں سے بہت مختلف اور الگ ہیں۔ ستر کروڑ آبادی کے ملک میں اردو نہ صرف اپنا نام اور تشخص کھو کر "ہندی" بن چکی ہے بلکہ اس کا رسم الخط بھی اب گور کنارے کھڑا ہے۔ ایسے میں وہاں جو لوگ اردو کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں اُن کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے۔

نشتر خانقاہی ہندوستان کے اردو شاعروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے شعور کی آنکھ کھلنے پر اپنے آپ کو ایک اقلیت کے روپ میں پایا۔ یہ بات اُن کی ذہنی نشوونما، رجحانات، میلانات اور فنی شعور کو سمجھنے کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کو جانے بغیر اُن کی شاعری کی تفہیم اور اس سے انصاف ممکن نہیں۔

ہندوستان کے اردو شاعر اس وقت دو واضح گروپوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو "مشاعرہ باز" ہے اور یہ مشاعرے اُن کی زندگی میں اظہارِ فن سے زیادہ ذریعۂ معاش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے اچھی صلاحیت رکھنے والے لوگ بھی شاعروں سے زیادہ سٹیج آرٹسٹ اور سیلز مین بن چکے ہیں۔ مشاعرہ لوٹنے اور مجمع کو محظوظ کرنے کے لیے وہ نہ صرف اپنی شاعری کو ماتمیوں کی سطح پر لے آئے ہیں بلکہ بقول سید ضمیر جعفری شعر کے ساتھ ساتھ پرچۂ ترکیب استعمال بھی دیتے ہیں۔

دوسرا گروہ تعداد میں بہت محدود اور مختصر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اردو کی عظیم شعری روایت کے سائے سائے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور جہاں تک ممکن ہے "عوامی" مقبولیت کی پروا کیے بغیر نئے تجربات میں بھی مصروف ہیں۔ میں نشتر خانقاہی کو اس دوسرے گروہ کا ایک اہم نمائندہ تصور کرتا ہوں اور میرے اس خیال کی بنیاد اُن کا تازہ ترین شعری مجموعہ "سرائے میں شام" ہے۔

جدید ہندوستانی اردو شعرا میں شہریار، بشیر بدر، شاذ تمکنت، اظہر عنایتی، امیر آغا قزلباش، مظفر حنفی، بلراج کومل، ندا فاضلی، راشد ممتاز اور باقر مہدی چند ایسے اہم نام ہیں جن کا کلام میری نظر سے گزرتا رہا ہے۔ نشتر خانقاہی ان میں شامل بھی ہیں اور ان سے الگ بھی۔ جہاں تک مشترک عناصر کا تعلق ہے اُن سے اردو ادب کے بیشتر قارئین آگاہ ہیں لہٰذا میں اپنی اس وقت کی گفتگو کو اُن پہلوؤں تک محدود رکھتا ہوں جو نشتر خانقاہی کو اپنے ہم عصر شعرا سے الگ اور ممتاز کرتے ہیں۔

نشتر خانقاہی کے یہاں اظہار میں ایک مخصوص انداز کی جدت طرازی پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی اُن کے موضوعات میں بھی ہے اور ہیئت اور

ٹیکنیک میں بھی۔ وہ غزلوں میں عجیب عجیب زمینیں، چونکا دینے والی ردیفیں اور استادانہ بطور استعمال کرتے ہیں۔ کہیں فارسیت کا بے پناہ غلبہ ہے تو کہیں ایک دم یگانہ جیسا اکھڑ پن اور اکھڑا اکھڑا انداز۔ ملاحظہ کیجیے:

۱۔ شب تمنا بکسی تُو قرار آفریں — تجھ پہ اے جانِ تنہا، ہزار آفریں
بے رُتے بیج مٹی میں بوتا ہوں میں — اے خدائے جہاں برگ و بار آفریں

۲۔ پوچھ خالی انگلیوں سے ہاتھ کی — بھیڑ میں کس دم ہوا غائب کوئی
شعر خوانی، شعر گوئی، کیا ضرور — زندگی کرنے کا سیکھوں ڈھب کوئی

بعض اوقات یہ فارسی زدگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ شعر کے معنی بھی اس گرداب میں ڈبکیاں کھانے لگتے ہیں:

گوشِ یک طفلکِ محرومِ اذاں، شعر مرا — نعمتِ حرف پہ کفرانِ معانی، تم بھی!

لیکن یہ کیفیت وقتی، ہنگامی اور جزوی ہے اور شاید اس کی نفسیاتی وجہ وہی "مشاعروں" کی براہِ راست اور سطحی شاعری سے گریز ہے، جس نے اُن کے اِرد گرد کے شعری منظر کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ نشتر کے یہاں جنس اور اس سے متعلق استعارے اور کنایے بڑی سہولت اور خوش اسلوبی سے استعمال ہوئے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی جنسی تلذذ کا رویہ غالب نظر نہیں آتا۔

نشتر خانقاہی نے غزل کو ایسے امکانات سے ہاجھک آشنا کیا ہے جنہیں ہمارے اکثر شاعر بھاری پتھروں کی طرح چوم کر چھوڑ دیتے ہیں جنس کے بارے میں اُن کا یہ جارحانہ رویہ اُن کے معاملاتِ عشق میں بھی نظر آتا ہے۔ اُن کی محبوبہ غزل کی روایتی عورت سے بہت مختلف ہے تیسری دنیا کے نیم صنعتی معاشروں کے سماجی تضادات میں گھری ہوئی عورت، جس کے پاس محبت کے لیے فالتو وقت نہیں ہے وہ اپنے مرد کو جنس تجارت کی طرح "جہاں ہے جیسا ہے" (AS IS WHERE IS) کی بنیاد پر قبول کرتی ہے۔ وہ ہیر اور صاحباں نہیں بننا چاہتی اور نہ ہی اپنے مرد کو کوئی آدرشی انسان دیکھتی ہے۔ یہ سچ کا حد تک حقیقت پسندانہ اندازِ نظر اردو غزل کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ آپ اصولی طور پر اس سے بے شک اختلاف کر لیں لیکن انصاف سے دیکھیے تو نشتر خانقاہی نے بڑی جرأت مندی سے اس نازک مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔

یہ سوال مت کرنا جبر ہے کہ حاجت ہے — تخلیہ میں کمرے کی کھڑکیاں کھلی رکھنا

یوں بھی تو ہم اکثر ملے، اپنا ادھورا پن لیے — اُس کی تڑپ اُس سے الگ، مجھ سے مرا جذبہ جدا

اُس کا چہرہ تمہاری فاقہ زدہ آنکھوں کا رزق — تشنگی میں دُور بہتی جھیل بھی اچھی لگی

آخری بار نمناک آنکھوں کو اپنی سُکھائے ہوئے
کیوں نہ اس سچ کو تسلیم کر لیں کہ ہم تم ریاکار تھے
برسوں برسوں رہتے ہوئے بھی گھر کے ایک احاطے میں
خواب کی عورت مجھ کو ملی اور اُس کو خیالی مرد ملا

فنی اعتبار سے ان شعروں میں آپ کہیں کہیں ڈھیلا پن محسوس کریں گے۔ اس کی وجہ مواد کی غرابت کے علاوہ بحروں کا انتخاب اور مختلف قسم کی ردیفیں اور قافیے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نشتر خانقاہی شعر کہنے کے بعد اُسے مانجھنے اور چمکانے پہ یقین نہیں رکھتے۔ یہ کام کچھ اور اہم شاعر بھی کرتے ہیں مگر یہ تلوار کی دھار پہ چلنے کا ہنر ہے جس سے جس قدر ہو سکے بچنا چاہیے۔

زندگی، وقت، معاشرتی استحصال اور احساسِ محرومی کے مختلف رنگوں کو نشتر خانقاہی نے بڑے تواتر سے اور عام طور پہ بڑی عمدگی سے استعمال کیا ہے اس حوالے سے اُن کی بعض مثالیں بہت انوکھی اور اچھوتی ہیں جو دماغ کو اُجالتی اور دل کو چھوتی ہیں۔

کیسے ممکن تجھ سے بچنا چاروں کھونٹ اے بہتی ہوا
صحرا صحرا سنگت تیری، رستہ رستہ ساتھ تیرا

مجھ کو پتھر کی طرح چھوڑ کے پاتال میں اب
زندگی! بن گئی بہتا ہوا دریا، تو بھی
زاویہ دھوپ کے ہمراہ بدلتا ہے ترا
زندگی! ہے کسی دیوار کا سایا، تو بھی

شام کے نعمت خانے میں کل صبح کی خاطر چھوڑا نہ کچھ
کل کا عالم کس نے دیکھا، کل کے لیے سامان نہ تھا
عزت جس کا نام ہے بھائی، وہ ہے نازک چیز بہت
بستی بستی گھوم کے گھر آ، ساتھ مگر مہمان نہ تھا

درد کے خوشے کھلتے پکتے ہاتھ مرے تھرانے لگے
فصل کو تیری آگ لگا دوں اے دل اب تو اجازت ہو

سر پہ سورج ہے مگر ڈھونڈ رہے ہیں اب بھی
ہم قیامت میں قیامت کی نشانی، صاحب!

اڑیں سنے کے ہوا میں، نہ بچی سکی اُسے دھوپ
ڈھلکے برگِ نوا پہ بکھر گیا، مرا غم

ناگواری کی چبھن اب نہیں کرتی بے تاب
گھُٹ ہوا جیسے وہ اک عمر کا غصہ مجھ میں

"سرائے میں شام" میں کچھ نظمیں اور مستزاد کی ہیئت میں کچھ نظم نما غزلیں بھی شامل ہیں۔ مگر موضوع کے اعتبار سے انہیں نشتر کی غزلوں کی ہی توسیع کہا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب جدید شعری رویوں کا ایک قابلِ قدر ارژنگ ہے جس میں روشن اور دھندلی ہر طرح کی تصویریں ہیں اور اگر ان میں سے بہتر رنگ چن لیے جائیں تو ایک منفرد اور انوکھا انتخاب ترتیب پا سکتا ہے۔

"سرائے میں شام" معاصر ہندوستانی شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے۔

امجد اسلام امجد

سفر آخر سفر ہے (افسانے)

قیمت : ۲۵ روپے

مصنف : طاہر اسلم گورا
ناشر : مکتبہ تمثیل۔ ۷ا ار اے وحدت روڈ لاہور

طاہر اسلم گورا نے اپنی ان کہانیوں کو جو اس مجموعے میں اکٹھا کی گئی ہیں، افسانے کہا ہے اور ان کے بارے میں اپنے چند خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور مجھے اس مشکل میں پھنسا دیا ہے کہ ایف سی کالج میں اپنے تعلیمی دور کے حوالے سے استاد مانا ہے۔ خیر یہ استادی اور شاگردی کا مسئلہ تو محض طاہر کی سعادت مندی ہے۔ اس لحاظ سے تو کام آسان بھی ہو جاتا ہے کہ خوبیوں کا ذکر کر کے پیٹھ ٹھونکیے، دو چار تحسینی کلمات کہہ کر شاباشی دیجیے اور دعا نے خیر پر اپنے معروضات کو تمام کیجیے کہ میاں سلامت رہو جیتے رہو۔ اللھم زد فزد۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ وغیرہ وغیرہ۔ بھیجے معاملہ ختم۔ ما بخیر و شما بسلامت۔

لیکن کچھ استاد ذرا صاف گو بھی ہوتے ہیں اور اپنی استادی کے پیڈسٹل سے نیچے نہیں اُترتے۔ بڑی بلندی سے پستی کی طرف دیکھتے ہیں اور بزعم خویش خود کو پیمبری کے درجے پر فائز سمجھتے ہیں۔ بحمد اللہ نہ تو میں خود کو استاد سمجھتا ہوں اور نہ میں کسی اونچے پیڈسٹل سے خطاب کرتا ہوں۔ میں اور طاہر ایک ہی سطح پر ایک ہی فری کوینسی پر ذرا لاؤڈ تھنکنگ کی صورت میں دوستانہ تبادلۂ خیالات کی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ صاف گوئی ضرور ہو گی، تلخ نوائی نہ ہو گی۔

طاہر نوجوان ہے لیکن اینڈ ولسنٹ نہیں۔ پھر بھی اس کا نقطۂ نظر رومانی ہے۔ رومان بُرا نہیں ہوتا اور نہ اسے شجر ممنوعہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن رومانی انداز نظر جس میں جذبہ، تخیل اور وجدان ہی سب کچھ ہوتا ہے، اگر افراط پسندی کی طرف چلے تو حقائق سے دور ہوتا ہوا ماورائیت کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ماورائیت کے پاؤں تلے زمین ہی نہیں ہوتی لہذا حقیقت سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو اس خمسہ کی مدد سے تخیل کی حسن آفرینی اور نوجوان کنوارے جذبات کی آمیزش سے احساس جمال کی رنگ آمیزی سونے پر سہاگہ۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس کیفیت میں جس قدر غلو کیا جائے مصنف بلندیوں میں پرواز کرتا رہتا ہے لیکن خیال پھر خیال ہے۔ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتا ہے اور ان رنگین غباروں کے پھٹتے ہی تیزی سے زمین کی پستیوں کی طرف فاری گرتا ہے اور مایوسی کے ایسے پر اس کا سفر منتج ہوتا ہے۔ میں خدانخواستہ طاہر کو ڈرا نہیں رہا ہوں بلکہ صرف جتا رہا ہوں کہ رومان کی افراط ہی تفریط کے عمل کے قریب واقع ہے اور رومان کی تمام عالمی تحریکوں کا بالآخر یہی انجام ہوا کہ مایوسی اور قنوطیت پر سفر تمام ہوا۔ میں یہ بھی اطمینان رکھتا ہوں کہ طاہر ابھی تک رومان کی افراط پسندی کا شکار نہیں، لیکن عمر اور تجربے میں تھوڑا سا سینیئر ہونے کے ناتے یہ بتانا اور جتانا ضروری ہے کہ جس راستے پر وہ چلا ہے اس کے قریب ہی بہت گہری کھائی موجود ہے۔ قدم احتیاط سے اٹھانا ہیں، پاؤں جما جما کر رکھنا ہیں اور استواری سے چلنا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ کہانیاں ہیں کیونکہ کہانی سے افسانے تراشنا تو ایسا ہے جیسے آپ پرکار سے ایک نقطہ قائم کر کے اس کے گرد دائرہ کھینچ دیں اور افسانہ اسی دائرے میں سفر کر کے اپنے مرکزی نقطے تک پہنچ جائے۔ افسانے کی یہ کرافٹ مین شپ منٹو، بیدی اور غلام عباس کو بخوبی آتی تھی

الا ماشاءاللہ۔ باقی ہمارے بیشتر افسانہ نگار اس دائرے کے اندر بہت ہی کم نظر آتے ہیں اس کے باہر اور اندر خطوط کو کراس کرتے ہوئے ادھر ادھر زیادہ بھٹکتے ہیں اور بسا اوقات تو وہ اچھے بھلے بنے بنائے افسانے کو کیڑی کاڑا کے عمل سے کہانی بنا ڈالتے ہیں۔ کہانی سے افسانہ بنانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور کبھی کبھار تو یہ ایسا ہی عمل ہے جیسے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانا کہ ذرا چوکا اور گیا۔ طاہر نے اس مجموعے میں افسانے کے نام پر کہانیاں ہی لکھی ہیں اور اس معاملے میں شرمانے یا گھبرانے یا پریشان ہو کر معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم میں سے بیشتر لوگ اسی طرح زگ زیگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ پھر طاہر کا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ رومانی انداز کے ساتھ ایک ایسا کردار لے کر آیا ہے جس میں تازگی بھی ہے تنوع بھی ہے اور دلکشی بھی۔ میری مراد منظر نگاری سے ہے جو بجائے خود ان کہانیوں میں ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ میں اسے عنصر کہنے کے بجائے کردار کہنے پر اس لیے اصرار کر رہا ہوں کہ طاہر کی کہانیوں میں اس عنصر کا ایک تشخص قائم ہوتا ہے اور اس تشخص کے پیچھے جاندار مشاہدہ ہے اور مشاہدے کو زندہ الفاظ کی زبان دے دینا ہی تخلیق کا کمال ہے۔ اگر تخلیق کا یہ شعلہ یا "سپارک" طاہر نے فروزاں رکھا تو یقین کیجیے کہ جس سفر کی ابتدا ہوئی ہے اس کی منزل کسی منارۂ نور کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ بس ایک ذرا عصری آگہی کی تھوڑی سی آنچ تیز ہو جائے تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

پاتال (شعری مجموعہ)

شاعر : صابر ظفر
قیمت : چالیس روپے
ناشر : مکتبہ دانیال۔ کراچی

بعض شاعر اپنی پہلی ہی تخلیق سے پڑھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیتے ہیں جو ان کے سفر سخن میں قدم بقدم شریک رہتا ہے اور ان کی نمو کے لمحے لمحے کو نظر میں رکھتا ہے۔ صابر ظفر ایک ایسا ہی شاعر ہے۔

"پاتال" اس کا تیسرا مجموعہ ہے گو اس کے پہلے اور دوسرے مجموعوں میں کافی زمانی فاصلہ تھا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے مجموعے میں یہ فاصلہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ تازہ مجموعہ قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس احساس کو مزید تقویت اس وقت ملتی ہے جب زیر نظر مجموعے میں اس کی ابتدائی غزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ کم و بیش یہی صورت اس کے دوسرے مجموعے میں بھی تھی۔ اس بات کو کتاب کی ضخامت بڑھانے کی کوشش کے سوا کیا کہا جائے میرے خیال میں صابر ظفر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہر حال، اس کا سب سے قابل قدر وصف یہ ہے کہ وہ تجربہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے تجربے عروضی بھی ہیں اور اسلوبی بھی۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تجربہ اپنے نتائج سے قطع نظر بذات خود قابل ستائش بات ہے۔ بنے بنائے راستے پر ہر کوئی چل سکتا ہے لیکن اپنی راہ آپ نکالنا یا کم سے کم اس کی کوشش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تانہ بخشند خدائے بخشندہ۔ صابر ظفر کے تجربوں کی افادیت کیا ہے، اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔ لیکن اب بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں ہے۔

"پاتال" میں ایسی غزلوں کی تعداد جن کے آہنگ کو نامانوس کہا جا سکتا ہے۔ صابر ظفر کے گزشتہ دونوں مجموعوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہ غزلیں اس کیفیت سے تہی نہیں جس کے بغیر شاعری شاعری نہیں بنتی۔ ناک بھوں تو ہر بات پر چڑھائی جا سکتی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص جو مروجہ سانچوں میں اچھی بھلی غزلیں لکھ کر داد وصول کر چکا ہے، نامانوس آہنگ برتنے کا خطرہ کیوں مول لے رہا ہے؟ شاید یہی وہ موڑ ہے جہاں

سے ایک ٹیڈیا کر اور ماسٹر کی راہیں الگ ہوتی ہیں۔

راشد مفتی

ہواؤں کے بھنور (غزلیات)

قیمت : ۳۰ روپے
ناشر : مکتبہ نورِ ادب ۔ ڈائمنڈ بلڈنگ چوک نیائیں گوجرانوالہ
مصنف : راسخ عرفانی

میں جن شعرا کا اُن کی ادبی عظمت کے سبب بے حد احترام کرتا ہوں، اُن میں راسخ عرفانی بھی ہیں۔ میں نے انہیں پہلی بار ماضی قریب میں دیکھا، لیکن انہیں مدتوں سے جانتا ہوں پہچانتا ہوں اور مانتا ہوں۔ اُن کے فن کی خوشبو سے میرا ذہن معطر اور شاداب رہتا ہے اور اُن کی تصانیف کے مطالعے سے میرے دیدہ و دل میں روشنی جذب ہوتی رہتی ہے۔ اُن کا کام بہت پھیلا ہوا، بہت متنوع اور بہت افادیت بخش ہے۔ ۳۰، ۴۰ تصانیف کے وسیلے سے انہوں نے بہت وقیع اور قابلِ قدر کام کیا ہے اور اہلِ ذوق اور اہلِ نظر اور اہلِ دل اُن کی گراں مایہ اور بلند پایہ تخلیقات سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

"ہواؤں کے بھنور" راسخ عرفانی کا مجموعۂ غزلیات ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ دورانِ مطالعہ جو کیفیت مجھ پر طاری رہی اور جو احساس مجھ میں نمو پاتا رہا وہ راسخ عرفانی کے یہاں 'تازگی' کا عمل ہے۔ اشعار میں ایسی بھرپور اور مسلسل تازگی جیسے میں بہار کے موسم میں صبح کے وقت کسی باغ کی سیر کر رہا ہوں، جہاں سبزے پر شبنم کے قطرے چمک رہے ہیں۔ جہاں کلیاں چٹک رہی ہیں۔ جہاں پھول مسکرا رہے ہیں، جہاں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، جہاں ہوا کی ہر موج، آبِ حیات چھلکا رہی ہے، اور جہاں اتنی سرسبزی، شادابی، رعنائی اور زیبائی ہے کہ ذہن و ذوق، حیات بخش فضاؤں میں سرمست ہو رہے ہیں۔ ایک سچے فن کار پر عمر کے گزرتے ہوئے ماہ و سال قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے اُس کی فکر جوان رہتی ہے اور وہ عمرِ رواں کے قدم بہ قدم تیز گامی کے ساتھ آگے کی جانب بڑھتا رہتا ہے۔ راسخ عرفانی کا سفرِ حیات ماشاء اللہ کب سے جاری ہے۔ وہ کتنے ہی قافلہ ہائے ادب کے ہم سفر رہے ہوں گے لیکن راہ گزارِ ادب پر آج جو قافلہ ہائے نو اور رہروانِ تازہ گرمِ سفر ہیں، راسخ عرفانی ان کی بھی رفاقت فرما رہے ہیں ـــــ نہایت دل گرمی، آتش قدمی اور برق رفتاری کے ساتھ! وہ آج کے دور میں آج کا شعر کہہ رہے ہیں اور اپنی شاعری میں عصری مقتضیات و مسائل کو سمو رہے ہیں۔ بڑے فن کار کی یہی ادائے خاص اور یہی عصری بصیرت اُس کی عظمتوں کے منار بلند کرتی ہے اُس کے نقشِ حیات کو تاریخ کی پیشانی پر ثبت کرتی ہے۔ چنانچہ مطالعے کے دوران میں یہ بات مجھ پر کشف ہوتی رہی ہے کہ راسخ عرفانی کے یہاں اسلوب کی تازگی، خیالات و افکار کی تازگی، موضوعات کی تازگی، الغرض فنی اور معنوی تازگی کا ایک چمن لہلہا رہا ہے اور اہلِ ذوق بقدرِ توفیق اُس کی سیر کر رہے ہیں۔ اور اس کی کیاریوں سے گلہائے تازہ چُن رہے ہیں۔

میں اس عقیدے کا آدمی ہوں کہ لفظ کلام کی کلید ہے۔ اسی کلید سے فن کے عجائب کدے کے تمام در کھلتے ہیں اور اسی سے گنجینۂ معانی تک رسائی ہوتی ہے۔ رموز و اسرار کی ساری مخفی دنیا اور سارے نادیدہ جہاں اسی سے منکشف ہوتے ہیں۔ یہی لفظ ہمارے سامنے معانی اور مفاہیم کی نئی نئی جہتیں لاتا اور نئی نئی پرتیں کھولتا ہے اور اسی لفظ سے ہم پر امکانات کے ارفع و اعلیٰ اُفق طلوع ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں بعض ستم ظریفوں نے 'تجربے' کی دیوانگی میں لفظ کو بے حرمت اور بے منزلت کر دیا ہے اور اس طرح کلیدِ معانی گم کر دی ہے۔ چنانچہ وادیٔ خیال کے

یہ گمشدہ مسافر ہر ظاہری و باطنی کشف و کیفیت سے محروم ہو گئے ہیں!

دوسرا المیہ ہوا کہ بعض "تجربہ فرماؤں" نے جدت کے شوق میں روایت کے تناور اور بار آور شجر پر کلہاڑا چلا دیا اور وہ اس شفیق اور مہربان شجر کے پھل، پھول، چھاؤں، رنگ، ذائقے اور ساری سخاوتوں سے، نیاضیوں سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے ہوا میں معلق تجربوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے بنیاد ہٹا کر عمارت کی چھت تعمیر کرنا چاہی اور راستہ میں، ہمت کر منزل پر پہنچنے کے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ نتیجہ یہ کہ بہت کچھ خلط ملط ہو گیا۔ اور خاصی افراتفری، بے ربطی اور انتشار کی صورت پیدا ہو گئی۔ تجربے کرنے چاہئیں، کرتے رہنے چاہئیں کہ یہ ذہنی صحت کی علامت اور جذبۂ تخلیق کا ثبوت ہے لیکن بزرگوں کے تمام تجربوں پر تخم نہیں رکھنا چاہیے۔ (ہر روایت اپنے عہد کے تجربوں کا ظہور ہوتی ہے) چنانچہ اچھے اور دور رس اور نتیجہ خیز عصری تجربے وہی ہوتے ہیں جو روایت کی بنیاد پر تعمیر ہوں۔ حسن روایت اور عطر روایت کا حصول و قبول کسی بھی عہد میں ہر ذہین و بصیر فن کار کی متاع گراں بہا ہوتی ہے اور نہ روایت بدوش اور جدت بدست، تخلیق کا سفر کرتا ہے۔

راغب عرفانی کے یہاں خلوص حرمت اور تجربے کی جلو میں روایت سے وابستگی ہر جگہ نظر آئی۔ اور ان دونوں "استحکامات" نے اُن کی غزلوں کو خوب صورت اور خوب سیرت بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں لہجے کی انفرادیت اور موضوعات کا تنوع اُن کی شاعری کے بنیادی تلازمے ہیں اور جو چیز اُن کے شعروں کو بقا عطا کرتی ہے وہ عصری مسائل کا شعور، عرفان اور ادراک ہے، اور یہ بات بھی کتنا خوش رسی ہے کہ جس جذبے یا احساس کا بھرپور ادراک اُن پر ہوتا ہے اُس کا اتنا ہی قوی ابلاغ اُن کے سامع یا قاری پر ہوتا ہے۔ ابلاغ کا یہ حسن جہاں اُن کی فنی ریاضت و خلوص کا آئینہ دار ہے وہیں اُن توفیقات الٰہیہ اور فیضان سماوی کا ثبوت بھی ہے، جو "تا نہ بخشند خدائے بخشندہ" کے مصداق اُن کی شاعری کو ذہنوں میں اتارتا اور دلوں میں جذب کرتا چلا جا رہا ہے

عاصی کرنالی

کلیرنس سیل (انشائیے)

مصنف: شہزاد قیصر

قیمت: ۴۰ روپے

ناشر: جہاں نما پبلیکیشنز۔ ۵ ایڈن روڈ، لاہور

شہزاد قیصر مابعد الطبیعیات کے سبزہ زاروں میں ابدیت کی تلاش میں سرگرداں ہوئے تھے لیکن اُن کا صوفیانہ اضطراب انہیں شاعری کی طرف اور روز مرہ کی ابتدائی زندگی کا ردِ عمل انشائیہ نگاری کی طرف لے آیا۔ "ابدیت کی تلاش" اُن کے مشرق و مغرب کے فلسفہ میں مابعد الطبیعیات اور وجودیت کے حوالے سے اس کی روایت کی جستجو کے ذیل میں ایک کاوش تھی۔ اس میں بارہ مضامین شامل تھے اور بنیادی حاصل یہ تھا کہ مشرق کی جدید مابعد الطبیعیات کی روایت سے گیان حاصل کیا جائے۔ تیسری دنیا میں استعماریت کی طویل غلامی کے عمل میں اثباتیت کو فروغ حاصل ہوا صنعتی معاشرے نے بھی اثباتیت کو فروغ دیا اور انسانی ذہن کو بھی سائیکٹری کی سائنسی اصطلاحوں کے ذریعے پرکھا گیا۔ شہزاد قیصر نے مغرب کی اثباتیت کے ردِ عمل میں صوفیانہ اور وجودی شعور کو ہمنوا بنایا۔ انہوں نے اثباتیت کے ردِ عمل میں جدلیاتی مادیت کے قوانین سے کسی طرف سروکار نہ رکھا۔ اپنے اسی سلسلۂ فکر و نظر کی وضاحت میں انہوں نے مزید مضامین لکھے اور علم کی جڑوں کو ٹٹولتے ربوبیت کے متعلق تین پہلو تلاش کر کے مضامین لکھے۔ یہ سارا سلسلہ انہیں عرفان اور گیان دھیان کی دنیا کی طرف لے جا رہا تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ اُن کے باطن کی نیکی انہیں

ترک دنیا پر ہی آمادہ نہ کر دے۔ جب کہ شہزاد قیصر ایک ذمہ دار سرکاری افسر بھی ہیں اور اُن کی روزمرہ کی مصروفیات اثباتی ہیں۔ ان اثباتی مصروفیات اور اُن کے صوفیانہ شعور نے اُن کی ذات میں جو دھمال پیدا کیا، اُس کا اظہار 'دُوجی اکھ' کی شاعری میں ہوا، جہاں وہ صوفیانہ دھمال کے ملنے زندگی کے کارزار میں معنی تلاش کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اثباتی زندگی کا ردِ عمل سماجی زندگی کی جدلیات کے نتیجے میں انشائیہ نگاری کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور انہوں نے فلسفے کی مابعد الطبیعیاتی سچائیوں اور ابدیت کی تلاش کے تقاضوں سے نکل کر اپنی روزمرہ زندگی کے بظاہر عام اور نظر انداز کر دیے جانے والے پہلوؤں پر نظر کی۔ معاشرے کو ایک حقیقت پسند فن کار کی آنکھ سے دیکھا اور اس زندگی میں جو بظاہر بھرپور بخیہ گیاں بکھری پڑی ہیں اُن کے ردِ عمل میں چھوٹی چھوٹی سچائیوں سے انشائیوں کے جہان آباد کا رُخ کیا اور اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے 'کلیرنس سیل' کے عنوان سے چودہ انشائیے لکھ ڈالے۔

ان انشائیوں کے موضوعات دراصل قاعدے اور قانون کی اثباتی زندگی کا ردِ عمل ہیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہیں۔ فلسفے کی طرح شہزاد قیصر کے انشائیے بھی اثباتی زندگی کے ردِ عمل میں لکھے گئے ہیں۔ 'ہم سفر' میں وہ ریل کے سفر میں 'ڈائننگ کار' کی مہیا کردہ سہولیات سے لطف لیتے ہیں 'گھر کی تلاش' میں ہیکٹ کی دوڑ اور جائیداد کی بدحواسیوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ "شریر بیگم اور سسرال" میں ازدواجی زندگی کی سنجیدہ اور اثباتی ذمہ داریوں سے وجودی مسرتیں اُڑائی گئی ہیں۔ 'چڑیا گھر کے باسی' سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'جانور' قید میں رہ کر تفریح مہیا کرتے ہیں؛ "کلیرنس سیل" میں کاروباری ضروریات اور گھریلو خواہشوں کے تصادم کا خاکہ ہے۔ "ماہر نفسیات" میں نفسیات کے ماہر کی اثباتی منطق سے دل لگی کی گئی ہے۔ 'زبان' میں زبان کے مسئلے کو جو تیسری دنیا کے دانشوروں کا اہم مسئلہ ہے، حوالہ بنایا گیا ہے۔ منجملہ دل کی بیماریوں کے عشق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ 'توہمات'، 'مہمان، میزبان اور ملازم'، 'وقت ناوقت' جیسے انشائیے ہماری زندگی کے میکانکی رویوں کے جوہڑ میں پتھر کی ضرب جیسا ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔

شہزاد قیصر کا اسلوبِ بیان بے تکلفانہ، شگفتہ اور دوستانہ ہے۔ اس میں وہ اثباتی سنجیدگی نہیں ملتی جس کی وجہ سے انشائیہ قبر سے نکلے مُردے کے مماثل بن جاتا ہے۔ وہ زندگی کی رواں لہروں سے کھیلنا جانتے ہیں۔

صلاح الدّین حیدر

ڈکھن کنبس دیاں والیاں (سرائیکی افسانے)

مصنفہ : مسرت کلانچوی

قیمت : ۴۵ روپے

ناشر : اکادمی سرائیکی ادب۔ بہاولپور

محترمہ مسرت کلانچوی کے افسانوں کے مجموعے 'ڈکھن کنبس دیاں والیاں' میں ہمیں سرائیکی دیس کے بسے ہوئے پسماندہ اور نو آبادیاتی جبر کے شکنجے میں جکڑے سادہ دل عوام کی زندگی کی مختلف النوع تصویریں ملتی ہیں۔ مسرت کلانچوی کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے پلاٹ گویا سادہ مٹی سے بنائے ہیں لیکن اُن میں ایسی اثر آفرینی ہے اور اتنی مشاہدے کی قوت ہے کہ بلاشبہ ان افسانوں کو نہ صرف سرائیکی ادب میں بلکہ عالمی ادب میں سرائیکی ادب کے حوالے سے 'مزاحمت' کی ایک جھلک قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسرت کلانچوی کے افسانوں کے کردار سادہ اور معصوم ہیں وہ عموماً ہمارے معاشرے کی اُس زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جسے "نچلا طبقہ"، 'دہقان' یا 'درجہ چہارم' کے ملازموں کا طبقہ قرار دیا جاتا ہے اور جنہیں

معاشرے کا بالائی ڈھانچہ اپنی بے شعوری کی وجہ سے پورے وطن کو استعماری منڈی کا ایندھن بناتے ہوئے روندتا گزرتا چلا جاتا ہے۔ محترمہ مسرت کلانچوی نے اس طبقے کے کرداروں کو منتخب کیا ہے، اور اُن کی سادہ اور روزمرہ زندگی سے بڑی مؤثر کہانیاں لکھی ہیں۔ مجھے صفدر میر کی اس بات سے اتفاق ہے کہ اردو ادب جہاں تکنیک کے تجربوں کے تنوع میں فی زمانہ زیادہ گم ہو رہا ہے وہاں علاقائی زبانوں کے ادب میں مزاحمت کی لہریں زیادہ نمایاں ہو کر اُبھری ہیں۔ "ڈکھن کنیں دیاں والیاں" میں افسانوں کی وضاحت کے لیے مناسب خاکے بھی بنائے گئے ہیں اور اس مجموعے میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔ دیباچے میں محترمہ مسرت کلانچوی نے زندگی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی بھی بھرپور وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں: "کوئی جذبہ سہی، کوئی خیال سہی، کوئی خوشی سہی، پر اِتھاں دے پھُل کن سیون والی سوئی دا درد تاں ضرور لکیا ہویا ہا۔" یہ گویا اس افسانوی مجموعے کا جواز ہے مسرت کلانچوی صاحبہ نے سوئی کے درد کو محسوس کیا ہے اور کانوں کی بالیوں سے جڑے اس درد کی قدروں کی تہہ تک اتر کر سراغ لگانے کی سعی کی ہے۔ مسرت کلانچوی کے افسانوں میں دکھ بھری زندگی کے منظرنامے ہیں۔ اور ان منظرناموں کے کرداروں کے حوالے سے مناظرِ فطرت اور دھرتی کی مختلف تصویریں ہیں۔ افسانہ 'ڈوجھا مسافر' میں اسماعیل نجیف، ناتواں سرائیکی خطے کے لوگوں کی زندگی کی علامت ہے۔ یہ ایک طالب علم کی کہانی ہے جس کے خواب پسماندگی اور جبر کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ افسانہ 'غلام دا غلام' ایک خوبصورت اور سادہ افسانہ ہے۔ اس میں ہم ملازمت کے پس پردہ غلامی کے عنکبوت میں جکڑے کرداروں سے ملتے ہیں۔ یہاں غلام پر غلام مسلط ہیں۔ نوآبادیاتی معاشرے کی قومی دولت باہر پہنچانے کے لیے صرف غلاموں کی کھیپ ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ افسانہ 'بختیں واگ والی' میں مہروایک سادہ لڑکی ہے جو نہیں جانتی کہ اُس کے خاوند کی فنکارانہ زندگی بےقدری کا شکار ہے۔ وہ اُس سے جھمکوں کی فرمائش کرتی ہے اور پھر اس خواہش کے پورا ہونے کے مرحلے پر اس خواہش کو قربان کر دیتی ہے۔ 'پنتالیہواں سال' میں ہم منظور بابا سے ملتے ہیں جو زنانہ کالج میں درجہ چہارم کا ملازم ہے اور ایک ملازمہ ہی سے شادی کرنے کے بعد مردانہ کالج میں تعینات ہونا چاہتا ہے۔ افسانہ 'کھوہ تے سمندر' میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہمارے فصل کاٹنے والے سات سمندر پار کے جبر کا ایندھن بنتے ہیں۔ عمر حیات ایک بچہ ہے اور کٹتی فصل کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ افسانہ 'نقاب دے اودھر' دیہاتی کلچر میں ریشما نامی سیاح کے حوالے سے پسماندگی کے اندر سامراجی جبر کے کلچر کی قدروں کے اندرونی تصادم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ 'انسان دا نشان' میں علامتی پیرائے میں انسانی جبلتوں کے جبر کے رویے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض محترمہ مسرت کلانچوی کے تمام افسانے ہمیں 'اِتّی انسان' صورتِ حال سے متصادم ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ ساری تصویریں ایک باشعور مصنفہ کے قلم سے ہیں۔ یہاں ہمیں شمالی حسیناؤں کی حویلیاں اور بے فکرے شہزادے اور نواب زادے نہیں ملتے، نہ محنت کشوں کی زندگی پر پلنے والے رومان ملتے ہیں۔ یہاں ہمیں سچے انسانوں کی دردبھری زندگی کے دلآویز مرقعے ملتے ہیں۔

صلاح الدین حیدر

نخلِ نوا (مجموعہ کلام)

مصنف: اشرف جاوید   قیمت: ۵۰ روپے

ناشر: بیاض۔ ۲۸ نسبت روڈ لاہور

"نخلِ نوا" جناب اشرف جاوید کی عہدِ حاضر کے آشوبِ حیات کی ترجمان غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے فلیپ میں جناب اختر حسین جعفری نے یہ بات بہت مناسب کہی ہے کہ افراد، اشیا، اقدار، تصویریں، خواب ایک فطری پیداواری عمل کے طور پر ابھرتے ہیں، لیکن ایک محدود سی ترمیم

میں یہ کرنا چاہوں گا کہ تصویریں اور خواب، پیداوار اور اشیا کی پیداوار کے مخصوص معیاروں کا عکس ہوتے ہیں۔ زندگی کتنی ہی کرب ناک اور تلخ کیوں نہ ہو، شاعر اپنے لہو سے پیچھے لوٹانے والی قدروں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اس عمل میں نت نئی تشبیہوں، تمثالوں اور محرکات کا ذخیرہ زندگی کے حقیقی رشتوں کو سنوارنے کے حوالے سامنے لاتا ہے۔ 'نخلِ نوا' کی شاعری ایک ایسا ہی عمل ہے اور خالد احمد نے بجا لکھا ہے۔ کہ اشرف جاوید کی 'نخلِ نوا' مجھے شہرت کی طرف سے اپنے نئے جنم کے اعلان کی طرح کم آہنگ مگر صد آثار لگی۔ 'نخلِ نوا' کی شاعری پاکستانی تہذیب میں جس روایت کی ترجمانی کرتی ہے اُس کی نشاندہی خالد احمد نے اپنے مضمون میں کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اشرف جاوید کی غزل کے ہر شعر میں ہمیں اپنی زندگی کے تضادات کی لہو رنگ تصاویر ملتی ہیں اور شاعر زندگی کو خوبصورت بنانے کے خواب بنتا چلا جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انسان پتھر کے ہو جائیں تو آنکھیں جاگتی اور لب سوتے ہیں۔ کہر پھولوں کو کفن پہنا جاتی ہے۔ پھر برف رتوں کا زہر کیوں بویا جاتا ہے؟ اور روشنیوں کے خوف سے نیچے روتے ہیں ــــ اشرف جاوید کی علامتوں کے ذخیرے میں توانائی اور نیا پن ہے۔ ٹپکتے زخموں کی گلکاریوں میں نظر کا قافلہ انجان وادیوں میں اترتا ہے۔ مہیب رات برسوں کا جسم نوچتی ہے۔ سمندر کا منجمد سینہ پگھلتا ہے۔ دیواروں میں چنوا دیئے جانے کے باوجود الفت کے گنہگار زندہ ہیں، یہاں حنوط یادیں، سراب منظر اور نظر نظر گئی رتوں کے عذاب ہیں۔ غزل میں علامتیں اور تشبیہیں توہم عصر زندگی کے سارے مناظر اور رنگوں کو بیان کر جاتی ہیں۔ البتہ ان کو قریب سے سمجھنے کے لیے ذوقِ نظر کی ضرورت ہے:

ہوا کی لوح پہ خوں سے ثبوت لکھتا رہا، گلاب اگلتا پرندہ اگرچہ گھائل تھا

یہ کس کی موت ہوئی ہے درونِ صحنِ بدن؟ کہ سانس سانس میں ماتم گساریاں پھیلیں

زمیں کی پیاس بجھائیں گی شاید اب کے برس فرازِ کوہ پہ یخ بستہ ندیاں پھیلیں

غرض اشرف جاوید کی غزل کے ہر شعر میں غزل کی روایت کے موافق ایک جہانِ معنی ملتا ہے۔ جو سماجی طلسم کدوں کے بھید کھولتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا لفظ آہنگ کی اثر آفرینی سے بذاتِ خود ایک طلسمات میں لے جاتا ہے اور یہی عمدہ شاعری کا کمال ہے۔

صلاح الدین حیدر

گمشدہ کلمات (افسانے)

قیمت : ۳۰ روپے

مصنف : مرزا حامد بیگ   ناشر : خالدین، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۷، لاہور

بعض جائز یا کم جائز حوالوں سے اختلاف کے باوجود اکثر ناقدین انتظار حسین کی اس خوبی کے ضرور معترف ہیں کہ وہ اردو افسانے میں غیر مقلدانہ روایت کا بانی ہے۔ اس اعتبار سے مرزا حامد بیگ بھی بلاشبہ اسی غیر مقلدانہ روایت کا تسلسل ہے اور کہیں کہیں اسلوب کی ہلکی سی مماثلت سے قطع نظر اس کے افسانوں کا مزاج یکسر مختلف ہے۔ اس کی ایک سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ، انتظار حسین کی طرح ہجرت کے آشوب سے نہیں گزرا اس لیے اس کے ہاں اپنی جنم بھومی کی طرف طبعی مراجعت کے امکانات معدوم ہو جانے کے بعد تصوراتی مراجعت یا ناسٹلجیا کا رجحان کس طرح پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کے اجداد نے مغل لشکروں کے ہمراہ پانی پت اور دکن کی جانب کوچ کرنے کی بجائے اتفاقاً یا قصداً خطۂ پوٹھوہار ہی میں پڑاؤ کر لیا

تھا اور اب وہ تاریخی اور تہذیبی شعور کی عینک سے گزرے ہوئے زمانے کو دیکھتا ہے۔ اس وجہ سے بھی کہ شاید اس کے نزدیک وہ شام جو مغلوں کے زوال سے شروع ہوئی زمانہ حال تک پھیلتی چلی گئی ہے اور تحریک پاکستان کا مختصر وقفہ اس طویل شام کے اندھیرے میں ذرا سی دیر کے لیے چمک جانے والی روشنی کی ایک تیز لکیر سے زیادہ نہیں تھا۔ اس نسبت سے اس کے افسانوں کی کتاب کا عنوان "گمشدہ کلمات" سرورق کا ڈیزائن اور دارا شکوہ کے نام انتساب بے حد بلیغ اشارے ہیں اور ان کی روشنی میں اس کے افسانوں کی تفہیم کرنے والوں کا کام بہت حد تک آسان ہو جاتا ہے۔

یوں بھی وہ قاری کی ذہنی صلاحیت کا امتحان لینے کا قائل نظر نہیں آتا۔ اس پر مغرب سے درآمد شدہ مبہم علامتوں کا رعب نہیں کہ تمتمار جبر اور حبس کے ماحول میں گزرنے سے محفوظ رہنے کا اتنا آسان اور بنا بنایا نسخہ استعمال نہیں کرتا، بلکہ اپنی ارضی ثقافت اور تہذیبی تاریخ سے پھوٹنے والی علامتوں اور استعاروں سے لمحۂ موجود کی گتھیاں کھولتا ہے۔

آج کل ہماری غیر تحریر شدہ لوک ثقافت کو تحقیق کے بندھے ٹکے میکانکی اصولوں کے تحت کتابوں میں اس خیال سے محفوظ کیا جا رہا ہے کہ کہیں ہماری ثقافت بیرونی ثقافتوں کی چومکھی یلغار کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے اور ایسا نہ ہو کہ ہماری آنے والی نسلوں کو تہذیب کے مسخ شدہ آئینے میں اپنا چہرہ پہچاننے میں دشواری ہو۔ ادھر تخلیقی سطح پر یہی لوک ثقافت مرزا حامد بیگ کے ہاں غیر محسوس طور پر منعکس ہو رہی ہے

یہ بات ایسی حیران کن نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے ادب اور فنون لطیفہ میں کسی باقاعدہ اعلان نامے پر مخصوص لوگوں کے دستخط کے بغیر ایک ایسی ادبی تحریک فطری طور پر پھل پھول رہی ہے جو ہمارے اجتماعی شعور کی عکاس ہے، بالکل اسی طرح جیسے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہمارے صوفی شعرا اور سیاسی مفکرین برصغیر کے دور افتادہ گوشوں میں ایک دوسرے سے کسی رابطے کے بغیر ایک جیسے افکار اور نظریات کو تخلیقی اور فکری سطح پر اجاگر کرنے پر مصروف تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سرحد میں رحمان بابا، پنجاب میں بلھے شاہ اور وسط ہند میں شاہ ولی اللہ کے عہد اور انداز فکر میں اس قدر یکسانیت ہو۔ اسی طرح آج بھی کراچی سے لے کر پشاور تک فنون لطیفہ اور ادب کی مختلف اصناف کے اسلوب میں لوک تہذیبی ایمائیت کا رنگ لیے بغیر درآنا بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ لوک ثقافت کے تحفظ کا جو عمل ہم سے شناسائی حاصل کرنے کی متمنی قوموں کی خاطر اور ایماء پہ انجام دیا جا رہا ہے۔ ہمارے لیے فی الحال شاید اس میں کوئی براہ راست دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہمیں اس لوک ثقافت کی تدریس کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ ہم ان لکھی ہوئی رسومات، کہاوتوں، داستانوں، ملبوسات اور عادات کو پڑھ کر نہیں سیکھتے بلکہ معاشرہ ہمیں غیر شعوری طور پر ان کی تعلیم دیتا رہتا ہے اور ہم انہیں عام زندگی میں برتنے لگتے ہیں۔ ماضی کی تمام جمع شدہ میراث کے حامل اس معاشرے میں پرورش پانے کے باعث فن کار کی شخصیت پر اس معاشرے کی گویا مہر لگ جاتی ہے اور نتیجۃً اس شخصیت کا اظہار جن اصناف سخن میں ہوتا ہے ان پر بھی اسی معاشرے کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔

توہمات، سینہ بہ سینہ روایات، خانہ ساز صدری نسخے، رسومات، کتب، فن تعمیر، ملبوسات، ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اس طرح رچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہمیں ایک ان پڑھ شخص کو بھی، جو ضروری نہیں کہ جاہل بھی ہو، یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے نقالوں کی رات کے سانگی چھوکرے کون ہیں۔ وہ ریشمی کپڑے پہن کر رقص کرتے ہوئے ٹھمکا کس طرح لگاتے ہیں۔ انہیں دہلیں کیوں، کیسے اور کس لیے دی جاتی ہیں۔ تماشے میں چمڑے کے پٹاخے کیسے بجتے ہیں۔ بیاری کسے کہتے ہیں۔ دو سوتی کا کیا مطلب ہے ایک یادگار محفوظ کے بازی گروں کا کھینچا ہوا کٹرا کیا ہوتا ہے اور یہ بازی گر ایک جیسے تماشے دکھا کر خلقت کو حیران چھوڑ کر آخر کہاں غائب ہو

جاتے ہیں، اور پھر ان تماشوں کے بین بین چلنے والی نسل در نسل خاندانی اور ذاتی دشمنیوں کا رنگ گیا ہوتا ہے۔ مرزا حامد بیگ اپنے مرزا مغل ہونے پر نازاں نہیں بلکہ زمینی رشتوں کی اونچ نیچ سے نالاں ہے لیکن ایک سچے فن کار کی طرح جو اپنے جذبات پر لیبل لگوانا گوارا نہیں کرتے۔

وہ "گمشدہ کلمات" میں اپنے اجداد کے ہاتھوں کیکوں پر ڈھایا جانے والا ایک ایک ظلم گنواتا ہے۔ اس نیکے کی زبان سے جو سر را ہے کانٹوں کے ساتھ پھوٹ پڑا تھا، ماں کے پیروں تلے حویلی کے راستے میں پڑنے والی شورہ زمین جس کی جنم گاہ تھی جیسے گھٹی میں شہد کی بجائے شورہ ملا تھا۔ مگر اب وقت کروٹ لے رہا ہے۔ معاشرتی توازن متزلزل ہو رہا ہے۔ معاشرہ سانپ کی طرح کینچلی اتار رہا ہے اور وہی نیکہ مرزا مغل بہادر کی جانب ٹانگیں سیدھی کر سکتا ہے۔ وہ نیکہ جس کے کان اس سے پہلے طویلوں، اصطبلوں اور پلٹنوں کے سپاہیوں کی چھاؤنی سے آنے والی لے تک جانب سے بند تھے۔

لیکن یہ طبقاتی آویزش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مرزا مغل بہادر کے دل میں عہد رفتہ کو آواز دینے کی خواہش اب بھی انگڑائی لیتی ہے۔ وہ ناچ گھر کو پھر سے آباد کرنے کے لیے مضطرب ہے۔ وہ عیش باغ کی گمنام راہداریوں میں پھر سے کسی کو گم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ شکوہ رفتہ کی یادیں کیکوں کی زبان سے وہی پرانے کلمات سن کر پھر سے تازہ کرتا ہے لیکن اب مجبور و مقہور زبانیں گستاخ ہو چلی ہیں۔ ادھر طاقت کا نشہ ابھی پوری طرح نہیں اترا۔ ادھر رعیت ابھی مکمل طور پر باحوصلہ نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے اس کی رعیت کے سانس ایک بار پھر سوکھنے لگتے ہیں۔ یہ سارا نقشہ ایک جبوری معاشرے کا ہے جس کی متحجر اقدار، ادارے اور روایات، تازہ کاری کو آسانی سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے لیکن اندرونی شکست و ریخت کے باعث ان کی قوتِ مزاحمت اتنی شدید بھی نہیں ہوئی۔ مرزا حامد بیگ معاشرتی ارتقاء کے اسی نازک مرحلے کا عکاس ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ آخر وہ مغل اداروں کو ہماری یادداشت میں پھر سے کیوں تازہ کرنا چاہتا ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ ان فرسودہ اداروں کی مزاحمت زیادہ طول پکڑ گئی ہے۔ انگریزی دور نے بھی ان کے صرف نام بدلے ہیں کام نہیں۔ ورنہ "مغل سرائے" کے پائیں باغ میں گھومنے والے بھیڑیئے اور گیدڑ اصلی کس طرح نکلتے۔

یہاں تک کہ "دل کے موسم" افسانہ بھی جو انسان کے اپنی جبلی تقاضوں کے خلاف کشمکش پر مبنی ہے اور جس کے مطابق انسان کو آخر کار ان تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی بنتی ہے۔ ہمیں آگرہ میں مغل امراء کے لیے تعمیر کی جانے والی حویلیوں میں سے ان دو متصل حویلیوں کی یاد دلاتا ہے۔ جن میں صوبیدار اور طوائفیں رہتی تھیں مگر درمیان میں سہولت کے لیے دروازہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں اسی معاشرتی پس منظر کے باعث پیش منظر میں ماضی اور حال اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کے درمیان خط فاصل قائم کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ وہ ماضی اور حال کا رشتہ کہیں کہیں سے توڑتا ہے لیکن اس کی تکنیک میں ایسا وصف ہے کہ وہ ماضی کا نقش ابھارتے ہوئے حال کی طرف واپسی کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ حال کے وقوعے سے ماضی کے ماحول میں سفر کرتے ہوئے وہ زبان و بیان اور تصویر کشی کی صلاحیت کو بیک وقت بروئے کار لا کر توازن برقرار رکھتا ہے اور انجام کے قریب پہنچتے پہنچتے ماضی کی حدیں توڑ کر پھر سے حال میں داخل ہوتا ہے اور قاری کو ایک لمحے کے لیے دنگ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ محض فیشن کے طور پر چونکانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس سے قاری کی فکری صلاحیتوں کو مہمیز کرتا ہے۔ وہ ادب میں ادراک کی اہمیت سے واقف ہے اور چیخوف کی طرح اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ فن کار جس چیز کو بیان کرے، وہ حس کے جس دائرے سے تعلق رکھتی ہے، قاری کے اسی دائرے کو یوں متاثر کرے کہ وہ اشیاء کو سونگھ سکے، چکھ سکے، دیکھ سکے اور چھو سکے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اس لیے کامیاب ہے کہ اس کا اسلوب اس کی اپنی شخصیت ہی کی گونج ہے۔ وہ شخصیت جو

ابھی بدلتے ہوئے معاشرے اور خطۂ ارض کی پروردہ ہے اور اس کے عقائد، روایات اور تعصبات کو پیش کرتی ہے۔

خالد اقبال یاسر

پتھریلے چہرے (افسانے)
مصنفہ: شمع خالد
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: قرطاس۔ پوسٹ بکس ۲۵۔ فیصل آباد

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کہانی بیان کرنے کا فن بنیادی طور پر صنفِ نازک کا فن ہے ـــــ اس میں واقعات کی بُنت، انسانی جذبوں کی ماہرانہ تصویر کشی، احساس کی شدت، الفاظ کے انتخاب اور اسلوب کے بہاؤ کے حوالے سے جتنے بھی پہلو ہیں، ان سے خواتین ہی انصاف کر سکتی ہیں ہمارے ہاں صدیوں سے کہانی سنانے کا منصب دادی اماں یا نانی اماں کو ہی حاصل رہا ہے۔ شاید اس معاشرتی روایت کی روح میں لاشعوری طور پہ یہ احساس موجود ہو کہ کہانی کے پیراہنِ رنگین پر موتی کاری کا فن صنفِ نازک کے جذبہ و احساس اور دستِ ہنرمند کا تقاضا کرتا ہے ـــــ ممکن ہے میری اس دلیل میں کوئی وزن نہ ہو لیکن اردو ناول اور افسانے کا غیر جانبدارانہ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اس حقیقت کو ٹھوس بنیاد فراہم کرے گا کہ خواتین زندگی کی زیادہ جامع، زیادہ بھرپور اور زیادہ سچی نمائندگی کرتی ہیں ـــــ شمع خالد کے افسانوں نے میرے اس نظریے کو نئی توانائی بخشی ہے۔

مَیں نے محسوس کیا ہے کہ شمع کی نظر میں وہ بھرپور رچاؤ ہے جو حقائق کو معروضی سطح پر ہی نہیں دیکھتا بلکہ اُن کے باطن کو کھنگالتا اور بہت دور کسی گمنام سے گوشے میں دبی خواہشوں کو اس طرح تلاش کرتا ہے کہ حیرت اور چونکا دینے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس 'چونکاہٹ'، یا 'حیرت' کو آپ 'ہیجان' کے روایتی تصور کی طرف نہ لے جایئے۔ جب میں شمع خالد کے ہاں تعجب یا چونکاہٹ کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مطلب ہرگز ہیجان خیزی نہیں ہے۔ ہاں آپ اسے مصنفہ کی اس خواہش کا ایک انداز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ کہانی کو ایسے موڑ پر لے جا کر ختم کریں جہاں قاری کی فکر کو ارتعاش سا محسوس ہو ـــــ یوں ٹھہری ہوئی جھیل میں کنکر پھینک کر وہ لہر در لہر، دائرہ در دائرہ پھیلتی موجوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں جو کہانی کے اختتام پر قاری کے ذہن میں پھوٹتی ہیں ـــــ ! اپنی کہانی "ہونی" میں انہوں نے جس انہونی کو "ہونی" کا روپ دیا ہے وہ شاید آخری پیراگراف تک قاری کے ذہن میں نہیں آتا۔ تجسس کی اس کیفیت کے باعث شمع کی کہانیاں خاصی مضبوط گرفت رکھتی ہیں ـــــ لیکن یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ چونکا دینے والے یہ انجام قطعی طور پر مصنوعی نہیں لگتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کہانی کا انجام صرف یہی ہو سکتا تھا

شمع ایک جری خاتون ہے۔ میں نے جری کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیونکہ جن حقیقتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی اہلِ قلم آنکھیں پھیر لیتے ہیں اُن کے وجود کو تسلیم کرنے کے باوجود انہیں اپنی بارگاہِ تخلیق میں اذنِ باریابی نہیں دیتے، شمع ایسی حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی اور پوری جرأت سے اُن کا اظہار کرتی ہے۔ ہمارے ادب میں یہ روایت نئی تو نہیں ـــــ لیکن ایسی ضرور ہے جسے زندہ رکھنے کے لیے ہر عہد میں کسی آبلہ پا کو وادیٔ پُرخار میں آنا پڑتا ہے ـــــ شمع نے پوری حوصلہ مندی کے ساتھ اس روایت کی آبیاری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ انسانی جذبوں اور اُن کی پیچ در پیچ گرہوں سے نہ صرف شناسا ہے بلکہ اُن کی شدت اور انسانی رویّوں پر مرتب ہونے والے اثرات سے بھی کماحقہ آگاہ ہے وہ منافقت کی اس روش کے خلاف بھرپور احتجاج کرتی ہے جو معاشرے کے متعفن انباروں کو ہٹانے کے بجائے اُن پر ٹاٹ اور دریاں ڈال

دیتی ہے۔ ریچ کے اس اظہار کی مثالیں شمع کی کہانیوں میں جا بجا ملتی ہیں۔

"پتھریلے چہرے" کی اکثر کہانیاں کرداروں کی ذہنی یا نفسیاتی کشمکش کے گرد گھومتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شمع کی کہانیاں خارجی واقعات کے بہاؤ سے کم کم اور انسان کے داخلی فکری اقتضا دریا تضادات سے زیادہ پھوٹتی ہیں۔ اس تکنیکی خصوصیت کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اعتبار سے بھی شمع نے کچھ نئی جہتیں نکالی ہیں۔ مجھے اس مجموعے کی آخری کہانی نے بہت متاثر کیا۔ یہ کہانی مشرقی سماج کی پروردہ اس عورت کی کہانی ہے جو اپنی خواہشات کی پوٹلی بغل میں دبائے نارسائی کے شبستوں پر بھٹکتی، کبھی اس ٹرین، کبھی اُس ٹرین میں سوار ہوتی، ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اپنے جذبوں کے انتشار کے باعث بُری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے لیکن بھٹے پہ چلی جاتی ہے کہ جینا' اس کی نہ سہی، اُس کے آس پاس والوں کی ضرورت ہے۔ "اپنا جہنم" کی روشنی بھی کچھ ایسی کیفیت کی شکار ہے جو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنی سوچ کی تراش خراش کرتی۔ اپنی شخصیت کے ٹکڑے کرتی اور پھر بھی محرومی کے ڈنک کھاتی ہے۔

شمع خالد کے افسانے اس زندگی کا عکس ہیں جو ہمارے گلی کوچوں، ہمارے گھروں، چوباروں، ہمارے گاؤں اور ہمارے شہروں میں نظر آتی ہے۔ میں انہیں ایسے زندہ مناظر کا نام دینا چاہتا ہوں جو آنکھوں کی وساطت سے لوحِ ذہن پر نقش ہوتے، سوچ میں ہلچل پیدا کرتے اور دل پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ شمع نے کسی جگہ بھی جدت کی رو میں بہنے کے شوق میں ادب کی زندہ اور توانا روایتوں سے انحراف نہیں کیا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے ہمارے ہاں افسانوں میں جدیدیت کے ایسے بانجھ رویے نے راہ پالی ہے جسے علامت یا تمثیلی انداز کہا جاتا ہے۔ اس جدت پرستی نے تفہیم کے دریچوں پر قفل ڈالے اور یوں ابلاغ کے سوتے خشک ہو گئے۔ بے معنی علامات کے تانے بانے میں کہانی، بھرے میلے میں کھو جانے والے بچے کی طرح کسی گوشے میں سہمی دبکی رہتی ہے۔ جدت کے کمپلیکس میں مبتلا ذہنوں نے اپنے اسلوب کی انفرادیت کی جوت جگانے کے بجائے اس اسلوب کو اس لیے اپنایا کہ وہ روایت پرست نہ کہلائیں ـــــ لیکن شمع خالد ـــــ کہ جری خاتون ہے ـــــ یہاں بھی جری نکلی ـــــ اس نے بے لگام جدت کی رو میں بہنے سے انکار کر دیا۔ روایت کے تقدس کا پرچم اٹھایا اور اپنی منفرد فکر، اپنے نکھرے ستھرے اسلوب اور جدید فکری مسائل سے گہرے شعور کے ساتھ موضوعات کا ایسا تنوع پیش کیا جو اس پر قدامت پرستی کا لیبل نہیں لگنے دیتا۔ شمع خالد کی کہانیوں میں بڑی سادگی، بے تکلفی، اپنائیت اور بے ساختگی ہے۔ اس کے ہاں سنگلاخ حقیقتوں کے ساتھ ساتھ جو رومانی لہجہ ملتا ہے وہ اکتوبر کی چاندنی کی طرح خنک، شفاف اور دل میں گھر کر جانے والا ہے۔ میں اس دلکش و رنگین اسلوب کی کئی مثالیں دے سکتا ہوں لیکن بات لمبی ہو جائے گی ـــــ اردو میں 'افسانوی ادب' کا سرمایہ خاصا وسیع بھی ہے اور وقیع بھی ـــــ اس کے باوجود "پتھریلے چہرے" کو ایک اچھا، قابلِ قدر، بامعنی اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

عرفان صدیقی

نمودِ سحر

مصنف: میر ظفر سیّد

قیمت: ۳۰ روپے

ناشر: پوئنگ سروسز نزد گرین لینڈ ریسٹورنٹ۔ دی مال۔ بہاولپور

"اللہ کا گنبد" اور "شہرِ بہشت" جیسی کتابوں کے خالق میر ظفر سیّد اب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی یہ دونوں کتب پڑھنے سے

تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ان میں اختلاف کے پہلو موجود ہیں، مگر مصنف کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں ——— میر صاحب کی تازہ تصنیف "نمودِ سحر" منظرِ عام پر آچکی ہے۔ اس کتاب کا انتساب خان عبدالولی خان اور بے نظیر بھٹو کے نام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں ہستیاں ملک کے سیاسی اُفق پر اپنے اپنے پرچم تلے متضاد نظریات کے باوجود تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور مصنف کو ان کے جلو میں سحر کی کرن نظر آتی ہے۔ بہرحال میر صاحب کو جو کہنا تھا برملا کہہ دیا۔ اس پر تبصرہ اور تنقید اہلِ قلم کا حق ہے۔

اس کتاب کی تصنیف میں مصنف کی محنت اور جانفشانی اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں علماءِ ہند کے کردار اور ان کی جدوجہد پر جس چابک دستی سے مختصر پیرائے میں تذکرہ کیا ہے وہ آج کے نام نہاد سیاستدانوں اور اسلام پسندوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جنھوں نے جدوجہد آزادی میں چند قدم بھی نہیں اٹھائے وہی قوم کے سینے پر نوک سناں رکھ کر پاکستان کے طول و عرض پر حکمرانی کرتے رہے اور طوفان سے بے خبر "سب اچھا ہے" کی پیشین گوئی کا گداز تکیہ لگا کر کرسیِ ایوان پر محوِ نشاط رہے ہیں۔ مقالہ نگار کا مقصد انھی کو جھنجھوڑنا ہے۔ دراصل مقالہ نگار نے تحریکِ آزادی کے کئی کربناک پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کل بھی اس تاریخ کا حصہ تھے اور آج بھی اُسی طرح تازہ ہیں کیونکہ ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ کیا یہ مقامِ عبرت نہیں ؟

کانگریس کا وجود کیوں اور کیسے عمل میں آیا تھا، شاہ ولی اللہ اور تحریکِ آزادی کی تمہید، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید کا ہندوستان میں سیاسی کردار، سر سید کا نظریۂ قومیت اور اُن کا سیاسی کردار، جمال الدین افغانی کا ریاستوں کے وجود اور سر سید کے نظریات تبصرہ، جمعیت علمائے ہند، جمعیت علمائے اسلام، مسلم لیگ اور تقسیم سے قبل اُس کی کرشمہ سازیاں اس مقالہ کا حیرت انگیز حصہ ہیں۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم، قرآن کا نظریۂ قومیت، مولانا آزاد ——— اُن کا مذہبی اور سیاسی کردار اور نظریہ پاکستان پر اُن کا اعتراض ——— اس پر مستزاد یہ کہ نواب بہادر یار جنگ، سر علی امام، مولانا حسرت موہانی جیسی معتدد ہستیاں اُس وقت کی مسلم لیگ اور اس کی قیادت سے مطمئن نہ تھیں کیوں؟ یہ پڑھنے کی بات ہے۔

اردو دشمنی نے ہی بنگلہ دیش کو جنم دیا۔ اور اب زبانوں کے اس بڑھتے ہوئے عفریت کی جھنکار صاف سنائی دے رہی ہے کاش کوئی سننے جوگوشِ ہوش ہو۔ اس مقالہ میں اس کی نشاندہی موجود ہے۔ بھٹو صاحب نے بقیہ پاکستان کو اپنی کوتاہیوں کے باوجود صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کی۔ بھارت اور افغانستان سے تعلقات بہتر ہو رہے تھے مگر صنعت کار اور سرمایہ دار رکاوٹ بن گئے اور یہ کیوں نہ ہو کہ حکومت کی کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں انہیں کے ہاتھ میں ہیں۔

اسٹبلشمنٹ کے بل بوتے پر صحیح نظام اسلام یا نظام مصطفےٰ ہی اس ملک کی بقا اور سالمیت کا واحد سہارا ہے۔ یہ تمام تر اقتباسات اور اشارات "نمودِ سحر" کے طویل مقالے سے ماخوذ ہیں جو مصنف نے ایک جراٗتِ رندانہ کے ساتھ پاکستان کے حوالے سے تاریخی دستاویز کے طور پر پیش کر دیئے ہیں جو شاید اس سے قبل منظرِ عام پر نہ آئے ہوں۔ یہ باتیں محفلوں اور سرگوشیوں میں ہوتی ہیں انہیں قرطاس پر بکھیر دینا میر ظفر ہی کی ہمت ہے۔ اس طرح یہ ایک تاریخی مقالہ ہے جو علمائے ہند کے مسلمانوں میں اسلامی روح کو قائم رکھنے، ان کی اس سلسلہ میں جدوجہد مساعی اور ان کے مصائب کے دور تحریک الشیخ الہند مال جس نے تحریکِ آزادی کی شمع کو فروزاں کیا سے شروع ہو کر بھٹو کے بعد کے بحران اور مزید بحران پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ تاریخ کا عمل، اٹل اور بے بدل ہوتا ہے۔ اس کی گرفت ظالمانہ اور عبرتناک ہوتی ہے۔ تاریخی عوامل سے

سے چشم پوشی اور سرد مہری ہی قوموں کے انحطاط کا موجب بنتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا میر صاحب نے جو کہنا تھا بر ملا کہہ دیا۔ ممکن ہے بعض حلقوں کو ان سے اختلاف ہو اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ جب ہم نظریے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اُس کے نہ صرف مثبت پہلو بلکہ منفی پہلو پر بھی نظر رکھنی ہو گی۔ مجھے بھی بعض جگہ اختلاف ہے کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ پاکستان ناگزیر تھا اور اس عمل کو روکنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کے جشن کا سہرا مسلم لیگ کے سر رہا۔ مگر میر ظفر نے تاریخی نقطۂ نظر سے تجزیہ نگار اور تنقید کرنے والوں کے لیے ایک ایسی دستاویز مرتب کر دی ہے جو آگے چل کر تاریخی مواد کی درستی کا موجب بن سکے گی۔

محمد نسیم سید

شہر بہشت

مصنف: میر ظفر سید ناشر: آزاد محل چوک منڈیاں لاہور قیمت: ۳۰ روپے

"فریضہ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو علماء کے ساتھ خاص کر لینا اور پھر ان کے بھروسے پر [illegible] کو چھوڑ دینا ہماری سخت نادانی ہے۔"

یہ اقتباس تبلیغی نصاب کے ایک باب "مسلمانوں کی بستی" سے ماخوذ ہے جو کتاب کے حرفِ آغاز کا حصہ ہے اور جس کی بنیاد پر ہی میر ظفر سید نے دورِ جدید کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تبلیغی نصاب میں مناسب تبدیلیوں کا علم اُٹھا کر شہرِ بہشت کی طرف قدم بڑھایا ہے جو یقیناً ایک ایسا احسن اور بروقت اقدام ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔ کسی بھی تصنیف یا تالیف پر تبصرہ یا اس کا تعارف کراتے ہوئے یہ نہایت ضروری ہے کہ نہ صرف اس کا بالتفصیل مطالعہ کیا جائے بلکہ ہر حوالہ کا مشاہدہ بھی۔

لیکن اگر مصنف یا مؤلف صاحبِ فکر و نظر ہو اور اس کا خلوص بھی پیشِ نظر ہو تو اس کی کاوش پر بغیر کسی جھجک اور رکاوٹ کے اپنی رائے کا اظہار ایک خوش آئند فعل ہے۔ اور پھر میر ظفر سید ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کا عمیق مطالعہ، طویل مشاہدہ اور تحریری تجربہ ان کی تخلیقات میں صاف نظر آتا ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

زیرِ نظر کتاب "شہرِ بہشت" اپنی افادیت کے اعتبار سے یقیناً تبلیغی کورس میں ایک ایسا اضافہ ہے جو نہ صرف جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے بلکہ ایک کم پڑھے لکھے قاری کے لیے روشن راہیں دکھانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ فی الوقت ہمارے ہاں رائج تبلیغی نظام فرسودگی کا شکار نظر آتا ہے اس لیے اس کا مطالعہ اس کارِ خیر میں نوجوان نسل کے لیے دینی امور سے آگاہی اور راہنمائی کا موجب ہو گا۔ اصل میں وقت کی اہم ضرورت اس امر کی ہے کہ بگڑتے ہوئے معاشرے کی اصلاح کی جائے اور موجودہ نسل کو بے راہ روی سے روکا جائے نماز، روزہ، حج اور دیگر اخلاقی معاشی اور معاشرتی فرائض کی تبلیغ اس انداز سے کی جائے جو نہ صرف سادہ، جامع اور دلپذیر ہوں بلکہ ہر مسلمان دنیاوی اور اُخروی نجات کے لیے اس طرح بے تاب نظر آئے کہ دیکھنے والا انگشت بدنداں رہ جائے۔ میر صاحب موصوف نے ان تمام امور کو اپنی اس تصنیف میں بڑے خوبصورت انداز میں سمو دیا ہے کہ وہ ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور معاملات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دیگر اہم موضوعات کے ساتھ اجتہاد کے موضوع پر بحث نہایت سیر حاصل ہے جو تبلیغی جماعت کے معزز مبلغین اور طلباء کے لیے

انتہائی سود مند اضافہ ہے۔ میر صاحب موصوف نے شہرِ بہشت کا دُر کھول کر راہِ ہدایت دکھانے کی جو روش اختیار کی ہے وہ بے شبہ پاکیزہ اور پُرخلوص ہے۔

کتاب کا انتساب برصغیر کے مبلغ اول محمد الیاسؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حاجی امداد اللہ مکیؒ کے نام ہے جو اس کی اہمیت اور فضیلت پر دال ہے۔

محمد نسیم سید

ثبات (مجموعہ نظم و غزل)

قیمت : ۳۵ روپے

مصنف : ارشد ملتانی

ناشر : بزم ثقافت ۔ ملتان

'ثبات' ارشد ملتانی کی غزلوں اور نظموں کا ایک مرقع ہے۔ یہ ایک ایسے تخلیق کار کی کاوشوں کا ثمر ہے جو حساس دل کی فسوں خیزی، نگاہِ دروں بیں کی کارگزاری اور جذبوں کی سرشاری کے آب و رنگ سے ایسے فن پارے تخلیق کرتا ہے جن میں زندگی جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہے۔

ارشد ملتانی ماضی کی زندہ روایات سے مربوط ہو کر اپنے عہد کے اندازِ فکر کے لیے طرزِ اظہار کا ایک ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس میں معنویت کی تشکیل نہ صرف فرسودگی اور کہنگی سے پاک رہتی ہے بلکہ جدیدیت کے اس خبط سے بھی پاک رہتی ہے جو بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کارنامے کے سرانجام ہونے میں اس بات کا زیادہ دخل ہے کہ ارشد ملتانی نے اپنی بصیرت کے عمل سے اپنے عصر کی ذہنی اور زمینی صداقتوں کو قبول کر کے زندگی سے اٹوٹ رشتہ قائم کیا ہے۔ وہ نادیدہ جہانوں کی دریافت پر اپنے گرد و پیش کی دنیا کی بازیافت کو فوقیت دیتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انکشاف کا یہ عمل زیادہ دشوار ہے کیونکہ اس عمل میں مکمل سچائی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جو بجائے خود کشادہ دلی اور بلند ظرفی کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے لیے ضروری امر یہ بھی ہے کہ اس میں رشتوں اور رابطوں کی پہچان مثبت پہلو ہو ____ تاکہ آگہی کا یہ مکاشفہ پوری صورت میں دقوع پذیر ہو ____ 'ثبات' میں اعتراف و انحراف اور ردّ و قبول سے بیک وقت راحت اور رنج کی فضا پیدا ہوئی ہے جو ناآسودہ معاشرتی صورتِ حال کا عکس بھی دکھاتی ہے، اور زندہ دلی کے اس ثمر کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ارشد ملتانی کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ابتری کے تاریک حالات میں بھی امید کی ایک کرن اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں جو انہیں مایوس اور مردہ دل نہیں ہونے دیتی اور جو دیکھیے تو حقیقی زندگی کا تجربہ اسی عمل کا عکاس ہے

ہر دل میں نفرتوں کی تمنا ہے موجزن ہر دل اسیرِ پنجۂ دامِ شکست ہے

یہ زندگی ہے کہ اک کشمکش کا عالم ہے یہ روز و شب ہیں کہ بیم و رجا کی تصویریں

کب تلک ہونا ہے سنگین حقائق سے گریز گرتی دیواروں کو کب تک لوگ مستحکم کہیں

ارشد ملتانی کے فکری مطالعہ میں احساس کی ایک ایسی رو کا پتہ ملتا ہے جو زیریں ہے لیکن اُن کے مزاج پر براہِ راست اپنا اثر رکھتی ہے جس کا عمل یہ ہے کہ ارشد کے کلام میں بیان کی گنی و ھنگ اور آہنگ پیدا ہو گئے ہیں جو نہایت دلآویز ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لہجے میں ہم کلامی کا احساس

اجاگر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ارشد ملتانی کی شاعری زندہ شعری روایات کی آئینہ دار ہے (ڈاکٹر اے۔ بی اشرف کے لفظوں میں) اُن کی غزل کا انداز اُس شعری روایت سے مربوط ہے جس کی بنیاد زندگی اور فن کے باکمال اور خوبصورت امتزاج پر رکھی گئی ہے۔ اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں جن کیفیات کا عکس ملتا ہے وہ ہر ذی حس اور باشعور انسان کے فکر و عمل میں جاگزیں رہتی ہیں۔ اُن کی شاعری ایسے رجحانات کی علمبردار ہے جو حیات و کائنات کے وسیع موضوعات پر محیط ہیں۔ اسی حوالے سے اُن کی شاعری میں سماجی وابستگی اور معاشرتی ربط بہت واضح ہے۔ —— اصل میں ارشد ملتانی ایک مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک ہیں۔ عالی ظرفی، کشادہ دلی اور وضع داری اُن کی شخصیت کے وہ خواص ہیں جس کا اقرار ہر وہ شخص کرتا ہے جو ایک بار اُن سے مل لے اور کچھ وقت اُن کے ساتھ گزار لے۔

مقصد ہمیں معلوم ہے تخلیقِ بشر کا — رکھا ہے زمانے میں محبت کے سوا کیا

جانے کیوں لوگ روانہ ہیں خلا کی جانب — کس قدر چاند ہیں آغوشِ زمیں کی زینت

اپنے حالات کی گرتی ہوئی دیواروں میں — ہائے وہ لوگ جو دبتے ہی چلے جاتے ہیں

گھر کو بقدرِ ذوق سجایا ہوا تو ہے — کچھ آگہی کے زخم ہیں کچھ حسرتوں کے داغ

رونق عجیب شہر کی ویرانیوں میں ہے — چہروں پہ روشنی ہے مگر دل بجھے بجھے

دشتِ غم ہے، تری دیوار کا سایہ تو نہیں — بیٹھ جائیں گے جہاں جائیں گے دیوانے ترے

اِن اشعار میں اُن زندہ شعری روایات کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے جن سے ارشد ملتانی کے فن اور فکر نے ربط پیدا کیا ہے۔ ساتھ ہی اُن کی شخصیت کا پرتو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

"ثبات" میں کل پندرہ نظمیں شامل ہیں جو غزلوں کی نسبت ایک چوتھائی حصے سے بھی کم ہیں، لیکن معنویت کے اعتبار سے دیکھیں تو اس مختصر ترین حصے میں بھی وہ جواہر پارے موجود ہیں جو ضخیم ترین دواوین پر بھاری ہیں —— نظموں میں ارشد ملتانی کے مزاج میں ایک موہوم سی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جس کا سبب "وہ موضوعات ہیں جن کو انہوں نے نظم کیا ہے۔ یوں بھی غزل کا کمال اس کے رمز و اجمال میں پنہاں ہے مگر نظم کا حسن یہ ہے کہ اس میں بننے والا ہر امیج باطنی موضوع کو واضح کرے اور ہر مصرع نظم کی معنویت کی تشکیل میں اکائی کی حیثیت پائے۔

مبین مرزا

چمن (مجموعۂ کلام)

قیمت : ۴۰ روپے

مصنف : عاصی کرنالی

ناشر : مکتبہ اہلِ قلم ملتان

'چمن' عاصی کرنالی کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل اُن کے چار مجموعے "رگِ جاں" (نظم و غزل) "جشنِ خزاں" (نظم و غزل) "مدحت" (نعتیہ کلام) اور "نعتوں کے گلاب" (نعتیہ کلام) شائع ہو چکے ہیں —— 'چمن' نظم و غزل کا تیسرا مجموعہ ہے اس سے قبل 'جشنِ خزاں' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا اور یہ (چمن) ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں اٹھارہ برس کا وقفہ ہے۔ 'جشنِ خزاں' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ عاصی کرنالی کے مزاج کا وہ پرتو اپنے باطن میں پیدا کرنے کی سعی سے معنون ہے جو مظاہرِ فطرت سے عمومی زندگی کے استعارے لیتا ہے۔ موسم فطرت کا سب سے بلیغ استعارہ ہے لیکن خزاں اس استعارے کا ایک پہلو ہے۔ اس لیے 'جشنِ خزاں' میں فطرت سے اخذ کی مکمل صورت نہیں دکھاتا۔ اس کے برعکس 'چمن' ایک بھرپور اور جامع ترین استعارے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں موسموں کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے اور رنگ و بو کی جلوہ آفرینی بھی —— شاعری انسانی احساسات کے اظہار سے موسوم ہے اور ظاہر ہے کہ انسان فطرت کی فسوں کاری سے اثر قبول کرتا ہے لیکن شاعر کا کمال یہ ہونا چاہیئے کہ وہ جب اس اثر کی قبولیت کو شعری پیرائے میں ظاہر کرے تو اس میں اپنے احساس کی شدتوں کی آمیزش بھی کر ڈالے —— عاصی کرنالی نے جہاں بھی مظاہرِ فطرت سے کچھ اخذ کیا ہے پہلے اُسے خود میں جذب کیا اور پھر شعری قالب میں ڈھالا، اور اس طرح فن کی وہ صورت پیدا ہوئی جس میں فطرت کے اثر اور جذبوں کی شدت میں 'دوئی' قطعاً مٹ جاتی ہے

نظر ہوتی ہے رسوائے چمن جس پھول کی خاطر
وہی اک پھول دامانِ تمنا میں نہیں ہوتا

——

تیرے بدن سے پھول کی تخلیق کی گئی میری نظر کو بادِ صبا کر دیا گیا

——

نقشِ گُل ہوں ایک دن داغِ خزاں رہ جاؤں گا مٹ کے بھی مَیں اپنے ہونے کا نشاں رہ جاؤں گا

——

مَیں پھول کا درد کیوں نہ سمجھوں خوشبو کی زباں جانتا ہوں

عاصی کرنالی اپنے گرد و پیش میں ٹوٹتی پھوٹتی اقدار کو دیکھتے ہیں —— زندگی کی مختصر میعاد کو محسوس کرتے ہیں —— کارگاہِ حیات کی روز افزوں رنجشوں کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ اُن کی داخلی کیفیات ہیں لیکن وہ جب سوچتے ہیں تو اجتماعی صورت میں —— اور یوں اُن کی داخلیت اپنی خارجیت سے رابطہ پیدا کر لیتی ہے کہ جس سے فرد کا معاشرے سے اٹوٹ رشتہ ظاہر ہوتا ہے۔

نفس نفس میں حوادث کے جال پھیلے ہیں یہ اہتمامِ فنا، زندگی کہاں جائے

——

جستجوئے منزل میں زیست کی یہ حیرانی کیسی کیسی راہوں میں عمر بھر بھٹکتی ہے

یہاں ہنستے ہوئے چہروں کے پیچھے زہر نفرت ہے
مسافر جب تک اس بستی میں رہنا دل بڑا رکھنا

دل سب کے زخم زخم تھے چہرے لہو لہو — لکھا ہوا فصیل پہ تھا شہر بے مثال

حیات و کائنات کی ٹھوس حقیقتوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ عاصی کرنالی کی غزل میں سوز و گداز پیدا کرنے والے جذبوں کا عکس بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے لیکن جذبوں کی شدتوں کے باوصف وہ کسی بے اعتدالی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ بڑے دھیمے اور شیریں سُروں میں دل کے ان نازک سلسلوں کا ذکر چھیڑتے ہیں ـــــ ان کے ہاں جذبات و احساسات کی ساری گرمی موجود ہے مگر شائستگی اور شعور کے ساتھ:

ہزار چہروں میں ایسا بھی ایک چہرہ ہے — کہ آئینوں نے اسے بار بار دیکھا ہے

ہمارے گھر میں تو پھینکے گا پھول پتھر کا! — ترے نثار اسی انتظار میں ہم تھے

اک اجنبی مرا خطِ تقدیر بن گیا! — کس بات کی لکیر تھی کس ہات میں ملی

'چمن' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے حصے میں نظمیں ہیں۔ آغاز کی چند نظمیں قائدِ اعظم، علامہ اقبال، مسجد اقصیٰ، وطن اور بیت المقدس کے حوالے سے ہیں جن میں اسلاف اور اُن کی نشانیوں سے عاصی کرنالی کا جذبۂ عقیدت و محبت بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ 'پھر دائرے میں سفر' ـــــ 'شیشے کا محل' ـــــ 'کھری بات' ـــــ 'برف زاد' ـــــ 'قیدی' ـــــ 'آگ کا سرطان' اور 'فیصلہ' ایسی نظمیں ہیں جن میں عاصی نے نہ صرف یہ کہ جدید نظم کے پیرائے کو قبول کیا ہے اور نظم آزاد کا اسلوب اختیار کیا ہے بلکہ ان نظموں میں جو بنیادی خیال پیش کیا گیا ہے وہ بھی نئی نظم کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ گویا ان نظموں میں پیرایۂ اظہار اور نفسِ مضمون ہر دو میں عہدِ حاضر کی جدید نظم کا بھرپور تجربہ موجود ہے۔

مبین مرزا

نعتوں کے گلاب (نعتیہ کلام)

مصنف : عاصی کرنالی

قیمت : ۳۰ روپے

ناشر : کاروانِ ادب۔ ملتان صدر

نعت گوئی بیک وقت فکر کا مرحلہ بھی ہے اور فن کی بساط بھی ـــــ وہ اس لیے کہ نعت گوئی ایک بہت نازک مسئلہ ہے۔ شعری تخلیق کا یہ وہ موڑ ہے جہاں ہر لفظ کو برتنے کے لیے کمال احتیاط سے اُس کی معنوی پرتیں دیکھنا پڑتی ہیں ـــــ جذبوں کی شدت اور بے کرانی کے باوجود پیرایۂ اظہار میں اعتدال کا دامن ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ محبت کی جولانیوں کو کبھی عقیدت و احترام کی حدود سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی ـــــ غرض نعت گوئی جہاں فنی و تکنیکی پر اصرار کرتی ہے وہاں فکر و شعور کی بیداری کو بھی اولین تقاضا ٹھہراتی ہے۔

'نعتوں کے گلاب' عاصی کرنالی کا دوسرا نعتیہ مجموعہ کلام ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ انہوں نے 'نعت گوئی' کو ذات کا ایک ناقابلِ ردّ تقاضا سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اس لیے اُن کی نعت میں ایک طرح کا والہانہ پن اور وجد کی سی کیفیت کا احساس خاصا نمایاں ملتا ہے۔ اس والہانہ پن میں شعور کا وہ عمل بھی شامل ہے جو احترام کو ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور وجد کی سی کیفیت میں محبت کی سرشاری میں کوئی جسارت راہ نہیں پا سکتی۔ عاصی کرنالی نے نعت کے لیے غزل کا شگفتہ اور دلآویز اسلوب اختیار کیا ہے جس میں عقیدت کا اظہار بھی ہے اور عشق و محبت کا ذکر بھی جس میں عجز و انکسار کی کیفیت بھی شامل ہے اور والہانہ پن کی بے قراری بھی۔ اپنی کم مائیگی کا اقرار بھی ہے اور حضورؐ سے نسبت پر احساسِ تفاخر بھی:

کہہ کے خورشید جہاں تاب، کرن عرض کرو ۔۔۔ جان کر ماہِ شب افروز، ستارا مانگو

وہ چشمِ لطف جو انساں کی کارسازی ۔۔۔ وہ دستِ فیض جو آرائشِ بشر میں رہا

حسن کی صورت بھی جاتے ہیں ازل ہو کر بھی ۔۔۔ موج میں اپنی بڑھا جاتا ہے دریا تیرا

کیا تکلم تھا کہ جس سے بائی ذہنوں نے کشود ۔۔۔ کیا تبسم تھا کہ گویا روشنی کا در کھلا

اُن سے گر ربط نہ ہوتا تو گل ہستی کو ۔۔۔ کن عذابوں سے گزرنا تھا بشر ہونے تک

عاصی نے نعت گوئی کی روایات کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ اپنے جذبے کے رنگ اور اظہار کی لَے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تغزل کا سہارا لیا ہے جس نے ایک بے مثال اور دل نشیں معنویت کی تشکیل کی ہے۔

کسے خبر کہ مقامِ محمدیؐ کیا ہے ۔۔۔ یہ آئینوں کا جہان حیرتوں کی دنیا ہے

کبھی پڑی نہ کسی حسنِ رُو بہ رُو پہ نظر ۔۔۔ ترا خیال سدا خلوتِ نظر میں رہا

'نعتوں کے گلاب' میں بعض جگہ تکرار کا گمان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عاصی نے روح کی صداقتوں کے بعض جذبوں کو مختلف پیرایوں میں بیان کرنے کی سعی کی ہے ـــــ وہ بیان کے فن کو بھی آزماتے ہیں اور انہیں احساس ہوتا ہے کہ اس بات کو اگر اِس آہنگ میں کہا جائے تو شاید زیادہ حسنِ عجز پیدا ہو سکے۔

'نعتوں کے گلاب' میں یوں تو ہر نعت مکمل ہے لیکن ان تمام نعتوں میں ایک شئے مسلسل ایک ربط کا احساس پیدا کرتی ہے اور وہ عقیدت اور سرشاری کا وہ بنیادی جذبہ ہے جو ان نعتوں کی تخلیق کا سبب بنا۔ عاصی کرنالی نے نہایت سلیقہ مندی سے نعت گوئی کی ہے اور ظاہر ہے کہ عشق و جنوں میں جب شعور کی آمیزش ہو جاتی ہے تو اظہار کا قرینہ 'نعتوں کے گلاب' کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مبین مرزا

انتخاب (کتابی سلسلہ)

مرتب : تاب اسلم
پتہ : انتخاب پبلیکیشنز مرے کالج روڈ۔ سیالکوٹ

زندہ اور توانا ادب کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے باقاعدہ اور سنجیدہ ادبی رسائل و جرائد کی گنجائش بہر حال موجود رہتی ہے اور اگر ان رسائل و جرائد کا اجرا مضافات سے ہو تو یہ اقدام اور بھی مستحسن ٹھہرتا ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ شہر اقبال سے جو ہر عہد اور ہر دور میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، تاب اسلم کی ادارت میں ایک کتابی سلسلے کا اجرا کیا گیا ہے جس کی اٹھان اس کے روشن اور تابندہ مستقبل کی ضمانت ہے۔

اب تک اس سلسلے کے ایک سے زیادہ شمارے شائع ہو چکے ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر اس کا پہلا شمارہ ہے جو جدید ادب کی نمائندہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ادب کی تمام اصناف کو نمائندگی اور وہ بھی بھرپور نمائندگی دینے کی سعی کی گئی ہے۔ حصہ نثر میں ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر آسی ضیائی کا تحقیقی مقالہ " اردو نام کی معنویت " شامل کیا گیا ہے جو سوچ، اظہار، تحقیق اور جستجو کے نئے دروازے وا کرتا ہے اور علمی مباحث کو جنم دیتا ہے۔ " ادب اور فلسفہ " کے موضوع پر شہزاد منظر نے قلم اٹھایا ہے۔ حصہ نظم میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، وزیر آغا، انجم اسلام، محسن احسان، جمیل ملک، جعفر شیرازی، گوہر ہوشیار پوری، جاذب قریشی، قمر ہاشمی، خورشید رضوی، انور شعور، انور جمال، راسخ عرفانی کے اسمائے گرامی اس بات کے ضامن ہیں کہ " انتخاب " واقعی عصری ادب کا وقیع انتخاب ہے۔

میرزا ادیب کا ڈرامہ " راکھ میں پھول "، غلام الثقلین نقوی کا تخصیہ " سبز گنبد کے سائے میں "۔ آثر میرزا، بشریٰ رحمان، سلطان جمیل نسیم طاہر نقوی، کوکب جمیل، حذرا اصغر کے تازہ اور غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل اشاعت ہیں۔ کتابوں پر تبصرہ کے لیے بھی چند ایک صفحات مخصوص کیے گئے ہیں۔ یہ ایک معیاری ادبی کتابی سلسلہ ہے جو ادب کے ہر قاری کے پیش نظر رہنا چاہیے۔

اختر علی

نعرۂ جبریل (شاعری)

مصنف : یوسف جبریل
پبلشر : ادارہ تصانیف جبریل۔ نواب آباد واہ چھاؤنی
قیمت : دس روپے

" نعرۂ جبریل " پچاس بندوں پر مشتمل نظم ہے۔ اس میں کئی موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ نظم کی ابتدا میں مصنف فکر اقبال سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور اس وابستگی میں اس حد تک شدت ہے کہ جبریل اقبال کو اپنے ارمانوں اور امنگوں کا روشن ستارا قرار دیتے ہیں۔ " نعرۂ جبریل " کا ایک بڑا موضوع عصر حاضر کا نئے علوم و فنون اور ایٹمی ترقی پر فخر کے ساتھ رقص کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی اس تخلیق پر فلک طنز سے ہنس رہا ہے ؎

برق بے تاب ہے اس گھر کو جلانے کے لیے

وہ ایٹمی ترقی کا محرک مادہ پرستی کو قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں انسان نے انسان کو محکوم بنانے کے لیے یہ دام ہمرنگ زمین بچھایا ہے۔ بڑی طاقتیں چھوٹے ممالک کو ایک ترنوالے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں اور اپنی سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے اور جغرافیائی

حدوں کو وسعت دینے کے لیے ایٹم بم بنا رہی ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب جہان رنگ و بو خاک میں مل جائے گا۔
مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب مادہ پرستی ہے۔ منبر و محراب اس طوفان کی زد میں ہیں۔ یہ قحط الرجال کا دور ہے۔ اور جنون اور عشق، عقل کی قید میں ہیں۔ انسان نے مادی طور پر تو ترقی کی انتہائی حدوں کو چھو لیا ہے لیکن روحانیت کا فقدان ہے۔
'نعرۂ جبریل' کا جو تھا بڑا موضوع معاشی ناہمواری ہے۔ معاشی ناہمواری جو کہیں افسر اور ماتحت، کہیں صنعت کار اور مزدور، کہیں جاگیردار اور مزارع کی قبیح شکل میں موجود ہے۔ معاشی ناہمواری، جس نے ایک آدم کی آل کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیا ہے۔ مصنف نے کہا ہے کہ گندم کے ڈھیر تو پہاڑوں سے بھی بلند ہو رہے ہیں، اس کے باوجود بھوک اور افلاس نے ہر سو ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس ناانصافی پر کسان اپنے کھیت میں کھڑا روتا ہے اور مزدور کی حالت پر ہر منظر نم دیدہ ہو گیا ہے۔ وہ فیڈیں کہ ملوں کا بجٹ روز و شب بڑھتا چلا جا رہا ہے لیکن مزدور کی عمر گھٹتی چلی جا رہی ہے۔
نعرۂ جبریل میں مصنف نے علم کے حوالے سے ماضی اور حال کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ماضی کے اَن پڑھ بھی اہل درد اہلِ خرد، اہل شرم اور اہل شرف تھے۔ آج علم و دانش کی فراوانی ہے لیکن یہ علم تعقل و تفکر پیدا نہیں کرتا بلکہ نادان بناتا ہے۔ یہ علم انسان کو انسانیت کی ارفع منازل سے آشنا نہیں کرتا۔
'نعرۂ جبریل' میں دولت کو خدا اور ہر درد کی دوا مان لینے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے اور تہذیب کی شکست و ریخت پر اظہار افسوس بھی ہے۔
نظم میں مسدس کی ہیئت استعمال کی گئی ہے۔ نظم کا یہ تقاضا تھا اور مسدس ہونے کے ناتے اس میں یہ گنجائش بھی موجود تھی۔ لیکن اس نظم میں غزل کی سی ریزہ خیالی پائی جاتی ہے۔ اگر ایک ہی موضوع سے مطابقت رکھنے والے مختلف بندوں کو ایک ترتیب میں لایا جاتا تو خیالات کی تفہیم سہل ہو سکتی تھی۔ بعض مقامات پر تغزل کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔
اس مجموعے کی دوسری نظم "گلبانگ صدارت" ہے اور تیسری طویل نظم "نویدِ صبح" ہے۔

رؤف امیر

۱۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان

قیمت نمبر۱ : ۳۲ روپے

۲۔ مکاتیب ظفر علی خان

قیمت نمبر۲ : ۴۵ روپے

ناشر : ۱۔ ختم نبوت اکیڈمی، سرگودھا
۲۔ سنی پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

مرتب : زاہد منیر عامر

جب سرگودھا کے زاہد منیر عامر سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" نیز "مکاتیب ظفر علی خان" کی سی معیاری کتابیں مرتب کر کے تحقیق و تالیف کی دنیا میں اپنی محنت و کاوش کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ یہ نوجوان لڑکا سرگودھا کالج کا طالب علم ہے مگر ابھی سے دینیات اور سیاسیات اور ساتھ ہی ادبیات میں اتنا درک رکھتا ہے کہ متذکرہ کتابیں

مرتب کر کے اس نے اردو کے محققین کرام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم مجلس احرار کے ایک ہردلعزیز رہنما تھے اور اُن آتش نوا مقررین میں ان کا شمار ہوتا تھا جن کی تعداد، برصغیر پاکستان و ہند کے حوالے سے انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ مجلس احرار کا رجحان متحدہ برصغیر میں قوم پرستی کی طرف تھا اس لیے اس کے رہنما مسلم لیگ کے بجائے جمعیت علمائے ہند کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مگر جب پاکستان قائم ہوگیا تو احرار کے سب سے مقبول رہنما حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے اتنی جرأت اور صداقت سے پاکستان کے ساتھ محبت کا اعلان کیا کہ وہ لوگ جو قیام پاکستان کی مخالفت کرنے کے باوجود قیام پاکستان کے بعد اپنے منفی طرزِ عمل کی تاویلیں کرنے میں مصروف تھے۔ شاہ جی کی اس بےمثال اخلاقی جرأت پر دم بخود رہ گئے اور خود ان کی تاویل بازی کمزور پڑ گئی۔ زاہد منیر عامر نے اس ضمن میں واضح حقائق جمع کر دیئے ہیں اور ساتھ ہی شاہ جی کے حالات زندگی اور ان پر اب تک ہونے والے کام کا بھی عالمانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ہماری تاریخ آزادی کا ایک باب ہے۔

اسی طرح مولانا ظفر علی خان مرحوم و مغفور ہماری تاریخ آزادی کا ایک ولولہ بخش اور ناقابل فراموش کردار ہیں۔ وہ صرف سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے ادیب بھی تھے۔ مگر ہماری قوم میں احسان فراموشی کی روش بد قسمتی سے خاصی عام ہو رہی ہے اور مولانا بھی اسی روش کی زد میں آگئے رہے ہیں، مگر اب مختلف اداروں کی طرف سے مولانا کی حیات اور سیاسیات و علوم میں ان کے کارناموں کا اعتراف کتابوں کے ذریعے کیا جانے لگا ہے اور یہ بہت خوش آئندہ رجحان ہے۔

زاہد منیر عامر کو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خطوط جمع کرنے کا خیال آیا ہے۔ یہ مولانا کی سرگرمیوں کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کی طرف بڑے بڑوں کی توجہ نہیں گئی تھی، مگر اس برخوردار نے نہ جانے کیسے اور کہاں کہاں سے متعدد خطوط جمع کر کے ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب اتنے سلیقے سے مرتب کر دی ہے کہ اہل ادب کو اس نوجوان کی کاوشوں سے خوش بھی ہونا چاہیئے اور اس کا ممنون بھی۔ اللہ تعالیٰ برکت دے۔

احمد ندیم قاسمی

غزل نما (تذکرۂ شعراء)

مصنفہ : ادا جعفری

قیمت : ایک سو روپے

ناشر : انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

ادا جعفری اردو کی ایک مستند اور مقبول شاعرہ ہیں۔ ان کی نظم اور غزل گزشتہ نصف صدی سے اردو پڑھنے لکھنے والوں کے دلوں اور دماغوں میں گونج رہی ہے۔ ان کی شاعری کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مگر "غزل نما" ان سے قطعی طور پر ایک الگ تصنیف ہے۔ حیرت ہے وہ اتنی بھرپور شاعری کے بعد تحقیق کے میدان میں کیسے اتریں مگر بہرحال یہاں بھی اُن کی فنی انفرادیت کا ایک پہلو یوں نکلتا ہے کہ انہوں نے بعض قدیم غزل گو شعراء کو تذکروں اور مخطوطوں میں سے نکال کر انتہائی سلیقے اور خوش ذوقی کے ساتھ قارئین ادب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ "غزل نما" دراصل ایک تذکرہ نما تالیف ہے جس میں ۴۳ قدماء کے حالات زندگی، خصوصیات شاعری اور انتخاب اشعار کو ایسے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ یہ اختصار کئی تفاصیل پر بھاری ہے۔

بلاشبہ "غزل نما" میں قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، انعام اللہ خاں یقین، قائم چاند پوری، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، میر مہدی مجروح

اور نظام رامپوری کے سے نامور شعرا بھی شامل ہیں مگر ان کے علاوہ بیشتر زیادہ معروف نہیں ہیں۔ البتہ اب معروف ہو جائیں گے کہ ادا جعفری صاحبہ نے ان کے جن اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے، ان میں سے کئی قطعی طور پر غیر فانی اشعار ہیں ــــ اور یاد رہے کہ بعض شعرا اپنے ایک دو غیر فانی اشعار ہی کے دم سے زندہ ہیں اور اس کی مثالیں تاریخ ادب میں موجود ہیں۔

محترمہ ادا جعفری نے شعراء سے متعلق اپنی ان تحریروں کی اشاعت کا آغاز انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ "قومی زبان" میں کیا تھا۔ اب ان تحریروں کی افادیت کے پیش نظر انہیں کتاب کی صورت دے گئی ہے جو انجمن ترقی اردو کی دوسری کتابوں کے برعکس نہایت حسن ذوق سے شائع کی گئی ہے۔ کتابت عمدہ ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ طباعت عمدہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ پوری کتاب عمدہ ہے۔ امید ہے شعرائے قدیم کے بارے میں ادا صاحبہ کی اس کاوش کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

احمد ندیم قاسمی

سائنسی انقلاب ــــ یقین سے ایمان تک

قیمت: ۱۲۰ روپے

مصنف: شہزاد احمد ناشر: سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ شہزاد احمد فلسفے اور نفسیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور شاعری میں ــــ بطور خاص ــــ غزل میں ــــ انہیں ایک منفرد مرتبہ حاصل ہے، مگر ہم میں سے بہت کم اصحاب کو علم ہوگا کہ آج کل کے دوسرے شاعروں کے برعکس وہ بے حد وسیع المطالعہ ہیں اور ان کا مطالعہ صرف شاعری یا ادب یا نفسیات یا فلسفے تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے قدیم و جدید سائنس کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور اس ضمن میں ان کی ایک اپنی رائے ــــ ایک اپنا نقطہ نظر بھی ہے، یعنی انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے، اس کا خلاصہ پیش نہیں کر دیا، بلکہ مسائل پر غور کیا ہے، نتائج اخذ کیے ہیں اور یوں اپنی ایک رائے مرتب کی ہے جس سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس رائے کا کوئی عالمی پس منظر ہی نہیں ہے۔

حال ہی میں ان کی کتاب "سائنسی انقلاب ــــ یقین سے ایمان تک" شائع ہوئی ہے جس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جہاں سائنس اور فلسفے کے علما اس سے فیضیاب ہو سکتے ہیں وہیں ایک عام آدمی بھی اسے اتنی ہی دلچسپی سے پڑھے گا جیسے وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ اس نوع کے موضوعات پر اس سلیقے سے لکھنا کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ ابتدا ہی میں مصنف کی گرفت میں آ جائیں، بہت دشوار کام ہے مگر ساتھ ہی دشواری یہ بھی ہے کہ شہزاد احمد کا اسلوب نثر اور اسلوب دلیل و منطق اتنا بھرپور ہے کہ اس مصنف سے اکتا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قارئین "فنون" تو ان کے اسلوب سے بخوبی متعارف ہیں کہ ان کے قریب قریب اس نوعیت کے مضامین اسی رسالے کی زینت بن چکے ہیں۔

یہ تو طے ہے کہ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں یہ سائنسی دور ہے اور سائنس یا فلسفۂ سائنس کی مبادیات سے شناسا ہوئے بغیر ہم اپنے ہی دور کی خصوصیات سے نابلد رہتے ہیں۔ شہزاد احمد نے یہ مرحلہ آسان بنا دیا ہے اور جدید سائنس کا کچھ اس انداز سے تجزیاتی مطالعہ کیا ہے کہ انسانی معاشرے سے مربوط ہو کر اس کے ہمہ گیر اور بھرپور اثرات کی روشنی میں ہم اپنے مستقبل کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان سوالات کے جواب بھی ڈھونڈ سکتے ہیں جو ہمارے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ یا جو مصنف کے ذہن میں اٹھے ہیں۔ شہزاد احمد نے ان سوالوں کو تشنۂ جواب نہیں رہنے دیا اپنے علم اور بصیرت کے مطابق جواب بھی دیتے ہیں مگر اس کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہر دور کے چند اپنے سوالات ہوتے ہیں۔ پھر یہ اگلے دور کے سوالات تلے دب جاتے ہیں

اور اگلا دور پچھلے سوالات کا بوجھ اٹھائے جب ختم ہوتا ہے تو نئے سوالات ابھرتے ہیں۔ یوں انسان کی کرید اور کھوج کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ سوال اٹھانا بھی ایک فکری عمل ہے۔ کسی نے درست کہا تھا کہ اگر دو اشخاص ایک دوسرے پر اعتراض کیے بغیر اور ایک دوسرے سے سوالات پوچھے بغیر آپس میں متفق ہو جاتے ہیں تو یہ دونوں احمق ہیں۔

شہزاد احمد کی اس تصنیف کا بنیادی سوال یہ ہے (اور یہ سوال ہر دور میں اٹھایا گیا ہے اور کتنے ہی جوابوں کے باوجود یہ سوال بدستور انسانی فکر کا بنیادی سوال بنا ہوا ہے) کہ انسانی خواص اتنے بے شمار اور آپس میں اس قدر متضاد ہیں کہ انسان ان سب خواص کو اپنے اختیار میں کیسے رکھے اور ان تمام خواص کو ایک ایسی وحدت —— ایک ایسے نامیاتی کل میں کیسے یکجا کرے جو انسانی اعمال و افکار میں مرکزی کردار رکھتا ہو —— یعنی جو ہمہ جہت بھی ہو مگر ایک نقطے پر مرکوز بھی ہو۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے مصنف نے سائنس کے حوالے سے دینیات، نفسیات، حیاتیات اور علم و حکمت کے دوسرے شعبوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مختلف انسانی رویوں کو جانچا پرکھا ہے کہ کس طرح ہر رویہ (ہر دور کے اپنے سوالوں کی طرح) پچھلے رویے کو بدل ڈالنے کے بعد خود پرانا ہو جاتا ہے اور اس میں سے ایک نیا رویہ پھوٹتا ہے اور یہ عمل تواتر کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ کس طرح مذہبی واردات کے ذریعے کائنات اور انسان کے اسرار دریافت کرنے کی سعی ہوتی ہے —— تا آنکہ بحث جدید سائنس تک جا پہنچتی ہے جس سے یہ لغزش ہوئی ہے کہ اس کا منصب فطرت کو سمجھنے کی حد تک تھا، مگر اس نے فطرت کو تسخیر کرنا شروع کر دیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں تسخیر ہونے چلا ہے۔

اس وقت پورے کرۂ ارض اور اس پر بسنے والی نسلِ انسانی کا مستقبل خطرے میں ہے —— اور خطرہ بھی اتنا ہمہ گیر کہ اگر جدید سائنس کی کارفرمائیوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے تو کرۂ ارض اور بنی نوع انسان کی بقا بس ایک دن کی بات ہے۔ اس کے بعد ایک ابدی سناٹا ہے اور ظاہر ہے یہ صورتِ حال محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو انسانی اخلاقیات کا کوئی احترام نہیں رہا۔ انتہا یہ ہے کہ ایسے سائنسدان بھی اس دنیا میں موجود ہیں جو جنگ کو نسلِ انسانی کا لازمہ سمجھتے ہیں، اور جو ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم بنا کر صرف اس لیے بے چین ہیں کہ جیتی جاگتی آبادیوں پر ان کے تجربات کرنے کا وقت کب آئے گا؟ جبکہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے تجربات کو تو نصف صدی ہونے کو آ رہی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ جس انسانی آبادی پر ان بموں کا "تجربہ" ہو، ان میں یہ سائنس دان اور نام نہاد نظریہ ساز خود بھی موجود ہوں تاکہ تاریخ انہیں "موقعے کا گواہ" قرار دے سکے۔

شہزاد احمد نے واضح طور پر کہا ہے کہ سائنسی دریافتیں کرنے والوں کو اپنی ہی دریافتوں پر اختیار نہیں رہا۔ اس قیامت کو روکنے کا صرف ایک ذریعہ ہے —— اور وہ ذریعہ ہے جدید سائنس کو اخلاقیات کا پابند بنانے کا اور انسان کی تحریکِ فنا کی بجائے نسلِ انسانی کی پرامن حیاتیاتی بقا کے لیے شب و روز کام کرنے کا۔ بصورتِ دیگر ذرے کو توڑنے اور خود جوہر کو جکڑنے والے سائنسدان اس توانائی کے منفی امکانات دیکھ کر چاہے چیختے چلاتے پھریں کہ خدارا جوہری ہتھیاروں کی دوڑ ختم کرو اور ان ہتھیاروں کو سمندروں میں ڈبو دو، بغیر اخلاقی سیاست انسان کا قصہ ختم کیے بغیر نہیں رہے گی۔

اتنے بھرپور اور بھاری بھرکم مسائل سے آگاہ ہونے اور ان کی گہرائیوں سے شناسا ہونے کے لیے شہزاد احمد کی اس کتاب کا مطالعہ اس صدی کے ہر شخص کے لیے ناگزیر ہے۔

احمد ندیم قاسمی

جنگل رات (شاعری)

مصنف: خاقان خاور
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: ندیم پبلی کیشنز، کشمیری بازار۔ راولپنڈی

جدید اردو غزل میں خاقان خاور نے غزل کی جمالیات کے پورے احترام کے ساتھ، جس سلیقے، حسن اور مہارت سے، اردو عصر کے ساتھ ساتھ علاقائی مناظر و افکار کو سمویا ہے، وہ اس کا حصہ ہے۔ سرزمینِ گجرات کا یہ شاعر غزل کا بھرپور شاعر ہے، مگر حال ہی مختصر نظموں کا مجموعہ "جنگل رات" اہل نظر کو پیش کر کے اس نے اپنے کمالِ فن کا ایک اور رُخ دکھایا ہے اور یہ رخ بھی اس کی غزل کی طرح "کرشمہ دامنِ دل می کشد" کی ذیل میں آتا ہے۔ یہ مختصر بلکہ نہایت ہی مختصر نظموں کا مجموعہ ہے۔ مختصر ترین نظمیں لکھنے کا سلسلہ نیا نہیں ہے۔ اردو میں اس سے پہلے بھی ایک ایک مصرعے بلکہ آدھے آدھے مصرعے کی نظموں کے تجربے ہو چکے ہیں مگر خاقان خاور نے اپنی مختصر نظموں کی ایک ہیئت معین کر دی ہے۔ یہ تین تین مختصر مصرعوں کی نظمیں ہیں مگر یہ نہ حمایت علی شاعر کی "ثلاثیاں" ہیں اور نہ ان دوستوں کے "ہائی کو" ہیں جو جاپانی شاعری کی مقبول صنف "ہائی کو" اس صنف کے بنیادی مطالبات سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں اور صرف تین مصرعے لکھنے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ خاقان خاور نے اپنی نظموں کو "ہائی کو" قرار دینے کا تکلف نہیں برتا۔ انہوں نے تین تین مصرعوں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں مگر ان میں سے بیشتر، مفہوم و معانی کے معاملے میں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ اس اجمال پر کتنی ہی تفاصیل کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ غزل کے ایسے اشعار ہیں جو اپنی ذات میں مکمل ہوتے ہیں۔ اظہار میں اختصار اور سادگی سے کام لینا بہت جان جوکھوں کا کام ہے مگر شاید اس لیے کہ خاقان خاور نے غزل کہنے کی طویل مشق کر رکھی ہے، وہ اس مرحلے سے نہایت آسانی اور توازن کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ یہ نظمیں دراصل شاعر کے باطن کی تصویریں ہیں —— جذبہ و احساس سے چھلکتی ہوئی اور حسن و زیبائی سے دمکتی ہوئی۔ اردو شاعری میں خاقان خاور کا یہ اجتہاد فراخ دلانہ خیر مقدم کا مستحق ہے۔

احمد ندیم قاسمی

رجحانات (تنقیدی مقالات)

مصنف: ڈاکٹر طاہر تونسوی
قیمت: ۴۵ روپے
ناشر: مکتبہ عالیہ۔ ایبک روڈ، لاہور

تحقیق تنقید کو مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے اور تنقید تحقیق کو مدلل، مفید اور بصیرت افروز بناتی ہے۔ تنقید کے بغیر تحقیق محض گورکنی ہے۔ تحقیق کے بغیر تنقید تعصب کا شکار ہو جاتی ہے اور بعض اوقات فقرہ سازی اور جملہ بازی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے تحقیق و تنقید کا اتحاد ضروری ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تازہ ترین کتاب "رجحانات" میں تحقیق و تنقید میں ہم آہنگی نظر آتی ہے اس مجموعے میں شامل مضامین کو بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہوں۔ وسیع تر تقسیم میں پہلے چھ مضامین تحقیقی ہیں اور آخری سات مضامین تنقیدی۔ سرائیکی ادب میں اسلامی عناصر، پہلا مضمون ہے۔ سرائیکی مصنف کی مادری زبان ہے۔ جب مسلمانوں نے سندھ اور ملتان کو فتح کیا اور برصغیر اسلام سے متعارف ہوا، تو سب سے پہلے سندھی زبان کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان نے بھی عربی کے اثرات قبول کیے۔ اسلامی تہذیب نے ملتان کی معاشرت پر گہرا اثر ڈالا اور روزمرہ کے معمولات، لباس اور رہن سہن میں اسلامی رنگ آگیا۔ سرائیکی

زبان میں عربی الفاظ داخل ہوگئے اور آج تک مروج ہیں۔ بعض الفاظ تومن وعن قبول کر لیے گئے۔ لیکن بعض الفاظ کا تلفظ تبدیل ہوگیا اور اس میں مقامی لہجہ شامل ہوگیا۔ مثلاً فصل بھی پیاز وسل بن گیا۔ مصنف نے مختلف حوالوں اور اقتباسات سے سرائیکی شاعری اور نثر میں اسلامی اثرات تلاش کیے ہیں۔ یہ مضمون سرائیکی زبان سے ان کی محبت اور تحقیقی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرا مضمون "قومی ادب کے فروغ میں علاقائی زبان کا حصہ" پہلے مضمون کا تتمہ ہے۔ اس میں انہوں نے بر نظر یہ بیان کیا ہے کہ سرائیکی زبان و ادب بھی قومی ادب کا حصہ ہے اور علاقائی زبانوں کی ترقی بھی قومی ادب کے فروغ میں نمایاں ہے۔

تیسرا مضمون مسعود حسن رضوی ادیب کے ادبی معرکوں کے بارے میں ہے۔ طاہر تونسوی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا موضوع بھی "مسعود حسن رضوی ادیب" ہی تھا۔ بے خود موہانی مسعود حسن رضوی ادیب کے دوست تھے مگر انہوں نے مسعود حسن رضوی ادیب کے زبان و بیان پر اعتراضات کیے ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بتایا ہے کہ بے خود موہانی غلطی پر تھے۔ دوسرا معرکہ مسعود حسن رضوی ادیب اور نائب حسین نقوی کے درمیان ہوا۔ طاہر تونسوی کی رائے میں نائب نقوی کے اعتراضات ذاتی نوعیت کے ہیں اور علمی کم ہیں۔ غالبیات کے سلسلے میں کالیداس گپتا رضا کو بڑی شہرت حاصل ہوئی مگر طاہر تونسوی نے چکبست کے حوالے سے ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ نظم و نثر میں چکبست نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ مگر اردو کے ناقدین اور محققین نے انہیں فراموش کیے رکھا۔ طاہر تونسوی نے اس مضمون میں جہاں کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی کام پر روشنی ڈالی ہے، وہاں چکبست کے کام کی طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں گپتا کے مضامین کے مجموعے "سہو و سراغ" پر بھی مصنف نے اظہار خیال کیا ہے۔ گپتا کی اس کتاب کے تیسرے حصے "رفتار قلم" کو مصنف نے موضوع بحث بنایا ہے اور ان کے خیال میں یہ علمی و ادبی مضامین کالی داس گپتا رضا کی غیر معمولی قوت مشاہدہ، زبان و بیان پر گرفت اور اسلوب کی چاشنی و شیرینی کو ظاہر کرتے ہیں۔ پانچواں مضمون "ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید کے بارے میں ہے" جس میں ڈاکٹر سلیم اختر کو تنقید کے نفسیاتی دبستان کا سرخیل قرار دیا ہے۔ انہوں نے سلیم اختر کے تنقیدی مضامین کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ سلیم اختر کسی بھی فن پارے کے نفسیاتی مطالعے کو اہمیت دیتے ہیں اور تنقید میں انہوں نے نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کا وتیرہ اختیار کیا ہے۔ چھٹے مضمون "پاکستان میں طنز و مزاح کی صورت حال" میں طاہر تونسوی نے شاعری اور نثر دونوں میں طنز و مزاح کی اچھی مثالیں تلاش کی ہیں اور پاکستان میں طنز و مزاح کے گراف کو بہت اونچا قرار دیا ہے۔

بقیہ چھ مضامین کتابوں کے بارے میں ہیں جو تبصراتی اور تعارفی ہیں۔ پہلا مضمون سید ضمیر جعفری کی خاکہ نگاری کے بارے میں ہے جو ان کی کتاب "کتابی چہرے" کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مصنف کے اسلوب میں وہی چاشنی، شگفتگی اور مزاح نمایاں ہے جو ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسرا مضمون عطاء الحق قاسمی کی "عطایئے" کے بارے میں ہے۔ نقاد کی رائے میں "عطایئے" مزاح نگاری، طنز نگاری اور خاکہ نگاری کی ایک ایسی دستاویز ہے جس میں عہد موجود کے سارے منظر کئی حوالوں کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔ ان کے بعد تین مضامین افسانہ نگاروں کے بارے میں ہیں اور ایک مضمون ناول کے بارے میں ہے۔ طاہر تونسوی نے ان سب مضامین سے پہلے ایک مختصر سا مضمون نیا افسانہ اور قاری کے بارے میں بھی شامل کیا ہے جو ان مضامین کے لیے دیباچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے نئے افسانہ نگار سے گلہ کیا ہے کہ "اس نے زمینی رشتے توڑ دیئے ہیں اور خلائی رشتے قائم کر لیے ہیں۔" اور اس کا جواز ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

کتاب کا آخری مضمون "رحیم گل" کے ناول "جنت کی تلاش" کے بارے میں ہے۔ مصنف کے خیال میں رحیم گل "نہ تو کہیں انتظار حسین کے ناسٹلجیا کا شکار ہوا ہے اور نہ ہی عبداللہ حسین کے جنریشن گیپ کے جھگڑے میں پڑا ہے۔ اور نہ ہی اس نے قرۃ العین حیدر کی طرح مغربی کانونٹ ماحول میں اپنے آپ کو گھیرا ہے بلکہ اس نے اپنے لیے ایک ایسا ماحول اور ایک ایسی فضا تیار کی ہے جس میں اپنی دھرتی کی خوشبو رچی بسی ہے۔"

ہمارے یہاں تنقید مفرد مضامین پر مشتمل ہوتی ہے جو متفرق الموضوع ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ طاہر تونسوی نے وہی تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے جو بالعموم ہمارے یہاں مروّج ہے۔ مگر ان کا اسلوب سادہ اور بلیغ ہے اور بات بڑی وضاحت اور اعتماد کے ساتھ کی گئی ہے۔ طاہر تونسوی بسیار نویس ہیں مگر اپنے وسیع مطالعہ اور ادب کے موضوعات پر گہری نظر کے سبب ان کی تحریر پرکشش ہوتی ہے۔ جابر علی سید نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "طاہر تونسوی کی وسعتِ مطالعہ ان کے ذہنی عمق کی ضامن ہے۔" ان کی تنقید و تحقیق ان کی ذہنی وسعت کی نشاندہی کرتی ہے۔ عام طور پر طاہر تونسوی کے تنقیدی مضامین میں تخلیقی عنصر شامل ہوتا ہے مگر "رجحانات" میں تجزیے کا عنصر غالب ہے۔ انہیں موضوع اور اسلوب کے تجزیے پر گرفت حاصل ہے۔ چنانچہ "رجحانات" میں وہ تجزیہ نگار کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ان کا تجزیہ مدلل اور تحقیق پر مبنی ہے۔ وہ بامعنی حوالے اور اقتباس تلاش کرنے اور اسے موزوں جگہ پر استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں یوں "رجحانات" کے مضامین تنقید و تجزیہ اور تحقیق کی ایک اچھی مثال ہیں۔ اردو کے انتقادی ادب میں یہ قابلِ تحسین اضافہ ہے۔

(ڈاکٹر) محمد امین

جلیل عالی

○

ابھی فقط شوقِ ناؤ کے بادباں کھُلے ہیں
ابھی سمندر کے بھید عالیؔ کہاں کھُلے ہیں

پروں میں بے تابیاں ہیں پروازِ لامکاں کی
سروں پہ روزِ ازل سے سات آسماں کھُلے ہیں

کبھی یہ دل اک حصارِ بے در کی قید میں ہے
کبھی کئی سلسلے گراں تا گراں کھُلے ہیں

صدا کے کاسے میں کوئی حرفِ خبر نہ اُترا
ہوا کی ٹھوکر سے کتنے قفلِ گراں کھُلے ہیں

مٹیں تو کیسے مٹیں یہاں فاصلے دلوں کے
سخن سخن پرچمِ انا درمیاں کھُلے ہیں

نفس نفس عمر بھر کی سنگت کے بعد عالیؔ
کھُلا یہ آخر کہ خود سے بھی رائیگاں کھُلے ہیں

○

مسافتیں کب گماں میں تھیں سفر سے آگے
نکل گئے اپنی دُھن میں اُس کے نگر سے آگے

شجر سے اک عمر کی رفاقت کے سلسلے ہیں
نگاہ اب دیکھتی ہے برگ و ثمر سے آگے

یہ دل شب و روز اُس کی گلیوں میں گھومتا ہے
وہ شہر جو بس رہا ہے دشتِ نظر سے آگے

خجل خیالوں کی بھیڑ حیرت سے تک رہی ہے
گزر گیا رہروِ تمنا کدھر سے آگے

طلسمِ عکس و صدا سے نکلے تو دل نے جانا
یہ حرف کچھ کہہ رہے ہیں عرضِ ہنر سے آگے

نثار اُن ساعتوں پہ صدیوں کے سحر عالیؔ
بچے ہیں جن کے جلو میں شام و سحر سے آگے

ستار سید



خزاں کے زرد ہاتھوں میں ہوا تلوار جیسی ہے
فضا صحنِ چمن کی کوچۂ دلدار جیسی ہے

ہوئی ہے شام دشتِ ہجر میں، اب دیکھئے کیا ہو
ہمارے اور سحر کے بیچ، شب دیوار جیسی ہے

مہکتے موسموں میں رنگ ہیں کس کی شباہت کے
فلک کی آنکھ میں شوخی نگاہِ یار جیسی ہے

بدلتا ہے وہ اندازِ بیاں سے لفظ کے معنی
کرے اقرار تو طرزِ ادا انکار جیسی ہے

سفر ہے دھوپ کا اور راستے بے سائباں سیّد
کسی کی یاد ہم کو دامنِ اشجار جیسی ہے



زندگی چھین کے مرنے بھی نہیں دیتا تھا
وہ مجھے پار اترنے بھی نہیں دیتا تھا

مجھ کو رکھتا تھا ہواؤں کے اثر سے محفوظ
میری خوشبو کو بکھرنے بھی نہیں دیتا تھا

حوصلہ بھی نہیں دیتا تھا نئی منزل کا
عام رستے سے گزرنے بھی نہیں دیتا تھا

سامنے رکھتا تھا تدبیر نئے گھاؤ کی
سابقہ زخم کو بھرنے بھی نہیں دیتا تھا

مہرباں لوگ بھی آئے تھے بہت رستے میں
وہ کسی دل میں ٹھہرنے بھی نہیں دیتا تھا

یوسف حسن



اِک بے انت سمندر تیری منزل اے دریا
لیکن خاک اڑائیں تیرے ساحل اے دریا

ہم بھی پربت کاٹتے ہیں اور مٹی چاٹتے ہیں
ہم بھی تیرے کُنبے میں ہیں شامل اے دریا

سینوں اور زمینوں کو نہ اگر سیراب کریں
تیرا میرا ہونا ہے لاحاصل اے دریا

کب خیرات ملے گی تیرے خیر خزانوں سے
ہم اِک جیون جوہر کے ہیں سائل اے دریا

بے شک تو نے ہی بخشے ہیں سارے خواب، مگر
کون اپنی تعبیروں کا ہے قائل اے دریا

تیری لہر میں رہ کر بھی ہم اپنی لہر میں ہیں
مٹ جاتے ہیں اپنے آپ سے غافل اے دریا

کتنی عمروں سے میں تیرے ساتھ سفر میں ہوں
کھول اپنے اسرار کبھی تو اے دل، اے دریا



خوش خواب زندگی پسِ دیوار و در نہ کاٹ
کٹ کر جہاں سے اپنی طلب کا سفر نہ کاٹ

ہر شے میں رنگ دیکھ طلوع و غروب کے
اپنے کسی گمان میں شام و سحر نہ کاٹ

خود بھی تُو راکھ میں نہ کہیں راکھ ہو رہے
دم سادھ کر زوال کے ویراں پہر نہ کاٹ

ہر سایہ اک سوال ہے تیرے وجود پر
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے عذابِ سفر نہ کاٹ

اے آسماں، مری حدِ امکاں تو دیکھ لے
پرواز سے نہ روک ابھی بال و پَر نہ کاٹ

یوسفؔ بہار ہو کہ خزاں اپنے باغ میں
اِک آشیاں بھی جس پہ ملے وہ شجر نہ کاٹ

یوسف حسن



ساری گلیوں میں اندھیروں کی نظامت دیکھ کر
بجھ نہ جائیں خواب بھی شمعوں کی شامت دیکھ کر

زندگی کی اک رمق بھی جس کے ریشوں میں نہیں
کیا کریں اس پیڑ کی خالی قدامت دیکھ کر

کتنے چاؤ سے چلے تھے لوگ منزل کو مگر
رکھ دیا رختِ سفر رختِ اقامت دیکھ کر

زلزلہ زیرِ زمیں کروٹ بدل کر رہ گیا
شہر کے دیوار و در کی استقامت دیکھ کر

ہم نے کتنی کہکشائیں جگمگا لیں خاک میں
اپنے اندر اک ذرا سی لو سلامت دیکھ کر

یوسف اپنی ساری دانائی دھری رہ جائے گی
منزلت آئے گی گھر کا قد و قامت دیکھ کر



ہر نظر میں ہے اثاثہ اپنا
چاک در چاک ہے خیمہ اپنا

کوئی پرتو ہے نہ سایہ اس کا
جس کے ہونے سے ہے ہونا اپنا

کس کی لو راہِ سحر دیکھے گی
شام کی شام ہے شعلہ اپنا

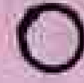
پلٹے جاتے ہیں کناروں سے بھی
اور دریا پہ بھی دعویٰ اپنا

چھوڑ بیٹھے ہیں فقیری لیکن
ابھی توڑا نہیں کاسہ اپنا

درِ خسرو پہ چلا ہے فرہاد
رہن رکھ آئے نہ تیشہ اپنا

کن گمانوں میں گھرے ہو یوسف
کبھی دیکھو تو سراپا اپنا

عدیم ہاشمی



دُکھ اِس کا نہیں ہے کہ ثمر کوئی نہیں ہے
افسوس تو یہ ہے کہ شجر کوئی نہیں ہے

اُس رات کی آغوش میں سُورج بھی کرے کیا
جس رات کی قسمت میں سحر کوئی نہیں ہے

انسان ہوں، ویران جزیرہ تو نہیں ہوں
میں کیسے اُدھر جاؤں جدھر کوئی نہیں ہے

پلکوں پہ سجیں آکے نگینے تو کہاں سے
جب دل کے صدف ہی میں گُہر کوئی نہیں ہے

تنہائی سمائی ہے کہ یکتائی ہے دل میں
جاتا ہوں اُسی سمت، جدھر کوئی نہیں ہے

کیوں ہاتھ میں پتھر لیے پھرتا ہے زمانہ
اس شہر میں شیشے کا تو گھر کوئی نہیں ہے

تنہا ہوں سرِ ساحلِ دریائے تمنّا
آیا ہوں اِدھر میں، تو اُدھر کوئی نہیں ہے

احساس فقط یہ ہے کہ دل ٹوٹ نہ جائے
ورنہ مجھے اس شخص کا ڈر کوئی نہیں ہے

یہ بات عدیمؔ اب کے عجب بات ہوئی ہے
کشتی بھی ہے، میں بھی ہوں، بھنور کوئی نہیں ہے



کیوں دل کی دُعاؤں میں اثر کوئی نہیں ہے
ایسا تو نہیں ہے کہ اُدھر کوئی نہیں ہے

کیوں رُوح کی پرواز دکھائی نہیں دیتی
یہ کیسا پرندہ ہے کہ پَر کوئی نہیں ہے

ساکن ہے، مسافر ہے، ہوا ہے کہ خدا ہے
رہتا ہے وہ ہر شہر میں، گھر کوئی نہیں ہے

طوفانِ بلا کوئی اُمڈنے کو ہے شاید
پھر آج سرِ راہگذر کوئی نہیں ہے

قدموں کا تحرّک ہی نہیں ضامنِ منزل
کیا پائے اگر سمتِ سفر کوئی نہیں ہے

تعداد جو دیکھوں تو ہزاروں ہی چھتیں ہیں
رہنے کے لیے شہر میں گھر کوئی نہیں ہے

پاگل ہے عدیمؔ اُس کے لیے سارا زمانہ
صورت کے سوا جس میں ہُنر کوئی نہیں ہے

عدیم ہاشمی

○

وہ آج گھر میں ہمارے کہاں سے آ نکلے
سحر کے وقت ستارے کہاں سے آ نکلے

یہ کس نے ہاتھ پریشانیوں میں تھام لیا
سمندروں میں کنارے کہاں سے آ نکلے

گروہِ سنگدلاں میں گھرا ہُوا تھا میں
یہ بیچ میں مرے پیارے کہاں سے آ نکلے

ضرورتوں میں نہ تھا کوئی پُوچھنے والا
عزیز آج ہمارے کہاں سے آ نکلے

جو بے کسی کا زمانہ تھا وہ تو بیت گیا
اچانک اتنے سہارے کہاں سے آ نکلے

یہاں تو برف تھی چشمے کو ڈھونڈتا تھا یہاں
دہکتی آگ کے دھارے کہاں سے آ نکلے

عدیمؔ بات محبت کی ہو رہی تھی ابھی
یہ دل پہ درد کے آرے کہاں سے آ نکلے

○

وہ رہا خاموش تو یہ طور بھی اچھا لگا
بات کی اُس نے تو وہ کچھ اور بھی اچھا لگا

اُس کے چہرے پر بہت سجتے تھے کالے بال بھی
اُس کے بالوں کا سنہری دَور بھی اچھا لگا

کامیابی کامیابی چار سُو، ہر چار سُو
نام اپنا صرف زیرِ غور بھی اچھا لگا

میں زمینِ پاک سے ہوں مجھکو امریکہ میں بھی
اک شکاگو ہی نہیں، لاہور بھی اچھا لگا

یہ تلوّن ہے کہ وسعت ہے محبت کی عدیمؔ
وہ لگا اچھا تو کوئی اور بھی اچھا لگا

آج آسانی ملی ہے مجھ کو تھوڑی سی عدیمؔ
آج وہ دُشواریوں کا دَور بھی اچھا لگا

(امریکہ)

نجیب احمد



خواہش کی چڑیا نے دل کا پنجرہ چھوڑ دیا
تیری گلی تک جانے والا رستہ چھوڑ دیا

دار کا موسم نُور کا جھرنا، کب یہ پُھوٹ بہے
اہلِ خبر نے بے خبروں سے ملنا چھوڑ دیا

پُھول تری خوشبو جیسے تھے، پُھول چُنے ہم نے
اور ہَوا کے رحم و کرم پہ پتّا چھوڑ دیا

سُوت کی انٹی جب یوسف کا مول نہ بن پائی
اِک بڑھیا کے دستِ ہُنر نے چرخا چھوڑ دیا

کب تک زنجیریں پہناتے دل کو سمجھاتے
وحشی کو صحراؤں میں آوارہ چھوڑ دیا

خود آگاہی ایک عذاب سے کم تو نہیں تھی نجیبؔ
تُو نے لکھنا، ہم نے خود کو پڑھنا چھوڑ دیا



عشاق عصرِ عشق میں وحشت نہ کر سکے
کم ظرف تھے سو تجھ سے محبت نہ کر سکے

آتش بہ جاں تو شہر کے دربان تھے مگر
اک بے چراغ گھر کی حفاظت نہ کر سکے

سچ بولنا طہارتِ لب کی دلیل ہے
ہم رُوسیہ دُکھوں کی وکالت نہ کر سکے

مسلک شناسِ گُل تھے اسیرانِ گُل نجیبؔ
سو آسماں کے ہاتھ پہ بیعت نہ کر سکے

نجیب احمد



نا دُخت بھی نہ تھی ، موج میں دریا بھی نہ تھا
لیکن اِس رات کے اُس پار وہ اُترا بھی نہ تھا

مجھ کو تو خیر ندامت تھی یہاں ، اور کوئی
میرے جینے کی دُعا مانگنے والا بھی نہ تھا

دُور تک پھیلی ہوئی دھوپ کی پگڈنڈی تھی
دشت میں سر پہ کوئی اَبر کا ٹکڑا بھی نہ تھا

جن پہ اک عمر چلا تھا ، اُنہی رستوں کی طرف
واپس آیا تو کہیں نقشِ کفِ پا بھی نہ تھا

اک فقط ترکِ تعلق کی بچی تھی صورت
...چھ اِس کے علاوہ کوئی رستہ بھی نہ تھا

کیا اُترتی کوئی تتلی کسی ٹہنی پہ نجیب
کاغذی پھول کا ، مہکار سے رشتہ بھی نہ تغا



بزم آرا تھی دھنک صبح کی تنویر کے ساتھ
درد اک رہ گیا دل میں ، تری تصویر کے ساتھ

یہ شبِ عمر جو اک خواب رواں میں گزری
کاش ہم کرتے بسر خواب کی تعبیر کے ساتھ

ہم کہ مسمار بھی ہو کر کہاں مسمار ہوئے
آج بھی زندہ ہیں اک خواہشِ تعمیر کے ساتھ

اور کچھ شغل اسیروں کو میسر نہ ہُوا
کھیلتے رہتے ہیں ہم حلقۂ زنجیر کے ساتھ

شہر کا شہر تو ہو سکتا ہے تاراج مگر
دل تو تسخیر نہ ہو پائیں گے شمشیر کے ساتھ

سفرِ شوق میں ہاتھوں کی لکیروں کا نجیب
ایک اُلجھاؤ گیا زلف گرہ گیر کے ساتھ

امجد اسلام امجد



جو اُتر کے زینۂ شام سے، تری چشمِ خوش میں سما گئے
وہی جلتے بجھتے چراغ سے مرے بام و در کو سجا گئے

یہ عجیب کھیل ہے عشق کا کہ یہ میں نے دیکھا ہے معجزہ
وہ جو لفظ میرے گماں میں تھے، وہ تری زبان پہ آ گئے

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں، مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں، جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

وہ چراغِ جاں، کبھی جس کی لَو نہ کسی ہَوا سے نگوں ہُوئی
تری بے وفائی کے وسوسے، اُسے چپکے چپکے بجھا گئے

وہ تھا چاند شامِ وصال کا، کہ تھا روپ تیرے جمال کا
مری روح سے مری آنکھ تک، کسی روشنی میں نہا گئے

یہ جو بندگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکری،
جنھیں زندگی نے اماں نہ دی تو ترے حضور میں آ گئے

تری بے رُخی کے دیار میں، مَیں ہوا کے ساتھ ہَوا ہُوا
ترے آئنے کی تلاش میں، مرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے وسوسوں کے فشار میں، ترا شہرِ رنگ اُجڑ گیا
مری خواہشوں کے غبار میں، مرے ماہ و سالِ وفا گئے

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
مرے دشتِ خواب میں دور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے

مری عمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
مرے پاس جتنے جواب تھے، تری اِک نگاہ میں آ گئے

امجد اسلام امجد



بھیڑ میں اک اجنبی کا سامنا اچھا لگا
سب سے چھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پھول سے کھلنے لگے
کہتے کہتے کچھ کسی کا سوچنا اچھا لگا

بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اُس کا ایک دم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچھا لگا

دل میں کتنے عہد باندھے تھے بُھلانے کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا "شکریہ" اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی، پیاری لگی
کم توجہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا

نیم شب کی خامشی میں بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجد میں بُرا کیسے کہوں
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا، اچھا لگا

ضمیر اظہر



زنجیر بپا موج کوئی ہو نہیں سکتی
سو جبر سے بھی سوچ روش کھو نہیں سکتی

تخلیق جو کرتا ہو شبِ تار میں تارے
اُمید بھسم اُس کی کبھی ہو نہیں سکتی

خونخوار درندوں کا ہنر چمکا ہے جب سے
بے خوف کہیں خلقِ خدا سو نہیں سکتی

خورشید سے، بادل سے، ہوا سے کوئی پوچھے
ہر ایک زمیں ایک سی کیوں ہو نہیں سکتی

کیا دیکھ لیا پھیل کے اس آنکھ نے اظہر
ماتم کے جھمیلوں میں یہ اب رو نہیں سکتی

پروین شاکر



شہ نشیں پر چاند اُترا ایک بھولی یاد کا
دل میں پرچم سا کھلا اک قریۂ برباد کا

شہر پر اس ساعتِ نامسعد کا سایہ ہے اب
جھٹپٹے کے وقت کیوں پتھر رکھا بنیاد کا

بستیوں کی گونج پُر اسرار سی ہونے لگی
جیسے سناٹا پکارے شہرِ ناآباد کا

ایک ان دیکھی خوشی رقصاں ہے برگ و بار میں
باغِ ہستی میں مرے، موسم ہے ابر و باد کا

میں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لیے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیّاد کا



شام بھی روشن ہے، کچھ جذبِ دروں کی ضو بھی ہے
ساتھ اس کے کوہ بر دیدارِ ماہِ نو بھی ہے

ایسا لگتا ہے کہ اس دنیا سے باہر بھی ہوں میں
میرے چہرے میں کسی کے خواب کا پرتو بھی ہے

باغ کا حصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اتنا نہیں ہے اور کچھ خودرو بھی ہے

سطحِ دریا بڑھ رہی ہے اور ہوائے تند بھی
آج کی شب ہی بہت نیچی دیئے کی لَو بھی ہے

پیرہن کی اک جھلک سے بن معطر ہو گیا
جیسے موجِ رنگ میں خوشبو کی کوئی رَو بھی ہے

پروین شاکر

○

اک ہنر تھا، کمال تھا، کیا تھا
مجھ میں تیرا جمال تھا، کیا تھا

تیرے چہرے کے بعد دیکھا تھا
آسماں پر ہلال تھا، کیا تھا

مجھ تک آیا تو مہرِ لطف و کرم!
تیرا وقتِ زوال تھا، کیا تھا

جس نے تہ سے مجھے اچھال دیا
ڈوبنے کا خیال تھا، کیا تھا

جس پہ دل سارے عہد بھول گیا
بھولنے کا سوال تھا، کیا تھا

برق نے مجھ کو کر دیا روشن
تیرا عکسِ جمال تھا، کیا تھا

رقص میں کائنات تھی ساری
دل کے اندر دھمال تھا، کیا تھا

ہاتھ میں مشعلیں تھیں پھولوں کی
سرِ ستاروں کا تھال تھا، کیا تھا

○

تمام عمر یہی اضطراب ہونا تھا
میانِ کشمکشِ چشم و خواب ہونا تھا

بڑی امید تھی کارِ جہاں میں دل سے مگر
اُسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا

صبا چلی ہے جس انداز سے گلستاں میں
کسی کو لالہ، کسی کو گلاب ہونا تھا

سفر کی رات مسافر کی میزبانی کو
کوئی ستارہ، کوئی ماہتاب ہونا تھا

بس اتنی عمر تھی اس سرزمینِ دل پہ مری
پھر اس کے بعد اسے وہم و خواب ہونا تھا

مقبول عامر



پھر وہی ہم ہیں وہی تیشۂ رسوائی ہے
دُودھ کی نہر تو پرویز کے کام آئی ہے

میرا مسلک ہی نہیں زخم دکھاتے پھرنا
جانتا ہوں کہ ترے پاس مسیحائی ہے

سانحہ پھر کوئی بستی میں ہوا ہے شاید
شام روتی ہوئی جنگل کی طرف آئی ہے

کچھ تو ہم مائل گریہ تھے بڑی مدّت سے
کچھ تری یاد بڑی دیر کے بعد آئی ہے

صبحدم دل کے دریچوں پہ یہ ہلکی دستک!
دیکھ تو بادِ صبا کس کی خبر لائی ہے

دُور اُڑتے ہیں سرِ آب پرندے عامرؔ
میری کشتی کسی ساحل کے قریب آئی ہے



بس ایک دُھن تھی اُسی دُھن میں شعر کہتے رہے
تمام عمر ترے غم کی رَو میں بہتے رہے

گھر آ گئے تو کوئی منتظر نہ تھا اُن کا
جو لوگ دربدری کے عذاب سہتے رہے

زمانے والے جسے سوچنے سے خائف تھے
وہ بات اہلِ جنوں محفلوں میں کہتے رہے

میں جتنی دیر ندی کے کنارے بیٹھا رہا
ردائے آب پہ تازہ گلاب بہتے رہے

خود اپنے آپ سے باتوں کے شوق میں عامرؔ
ہم ایک عمر گھنے جنگلوں میں رہتے رہے

شہزاد قمر



کہیں سے ٹوٹا ہُوا سلسلہ نہیں ملتا
مگر یہ کیا کہ کوئی راستہ نہیں ملتا

تلاش کرنے پہ مامور ہیں نئے آفاق
جنھیں خود اپنے بھی گھر کا پتہ نہیں ملتا

عجیب رُت ہے کہ آنکھیں ہیں، کوئی خواب نہیں
زباں کے ہوتے ہوئے ذائقہ نہیں ملتا

نشاط و کرب کے ہنگام اپنے اپنے ہیں
لہو کے رنگ سے رنگِ حنا نہیں ملتا

ہم ایسے اہلِ قلم سر نہیں جھکا سکتے
وگرنہ مسندِ شاہی سے کیا نہیں ملتا

مرے مزاج میں تندی ہے کن ہواؤں کی
میں کس دریچے سے اُلجھا ہوا نہیں ملتا

سمندروں میں بھی رہ کر بہت اکیلا ہوں
مرے کہے سے کسی کا کہا نہیں ملتا

کسی کا بھی کوئی چہرہ نہیں یہاں شہزاد
درونِ شہر کوئی آشنا نہیں ملتا



دیر ہو جائے گی پھر کس کو سنائی دو گے
دشت خود بول اُٹھے گا تو دُہائی دو گے

اب تو اِس پردۂ افلاک سے باہر آ جاؤ
ہم بھی ہو جائیں گے منکر تو دکھائی دو گے!

اب اسیرانِ قفس جیسے قفس میں بھی نہیں
اب کہاں ہو گی رہائی جو رہائی دو گے

شمعیں روشن ہیں تو کیا، عالمِ بے چہرگی میں
تم کوئی بھی ہو مگر کس کو سجھائی دو گے

ہم تو اظہار کے قائل تھے ہمیشہ کی طرح
کب توقع تھی کہ نالے کو رسائی دو گے

کیا خبر تھی، مری محنت کے صلے میں تم بھی
میرے ہاتھوں میں یہ کشکولِ گدائی دو گے

ہم تو اُس وصلِ مکرر پہ بھی خوش تھے شہزاد
جب یہ معلوم تھا، اِک اور جُدائی دو گے

صابر ظفر

○

وہ کیوں نہ روٹھتا، میں نے بھی تو خطا کی تھی
بہت خیال رکھا تھا، بہت وفا کی تھی

سُنا ہے اِن دنوں ہم رنگ ہیں بہار اور آگ
یہ آگ پھول ہو، میں نے بہت دعا کی تھی

نہیں تھا قُرب میں بھی کچھ مگر یہ دل مرا دل
مجھے نہ چھوڑ، بہت میں نے التجا کی تھی

سفر میں کشمکشِ مرگ و زیست کے دوران
نجانے کس نے مجھے زندگی عطا کی تھی

یہ ابتدا تھی کہ میں نے اسے پکارا تھا
وہ آگیا تھا ظفرؔ، اُس نے انتہا کی تھی

○

زندہ رہنے کا مجھے حوصلہ ہر آن سوا دیتا ہے
دم اُکھڑنے لگے میرا تو مجھے تازہ ہوا دیتا ہے

کوئی چاہے تو اُسے اور کوئی اس کی طرف جائے تو
اپنے ہر آبلہ پا کے لیے وہ چھاؤں بچھا دیتا ہے

میں کسی آگ میں جلنے کی تمنا میں بجھا رہتا ہوں
یہی بجھنا مجھے آخر کو بھڑکنا بھی سکھا دیتا ہے

بے یقینی کی یہ حد ہے کہ محبت بھی مجھے طنز لگے
مسکرا کر کبھی کوئی مجھے مل لے تو رُلا دیتا ہے

جو نہیں اہلِ ظفر وہ بھی سرِ بزم جمے بیٹھے ہیں
خود بناؤں نہ اگر اپنی جگہ، کون جگہ دیتا ہے

ارشد جاوید



گرچہ ہیں دیواریں خستہ پر سلامت در تو ہے
یہ یقیں کیا کم یقیں ہے، میرا اپنا گھر تو ہے

بے اماں ہوتا ہوں جب بھی، اوڑھ لیتا ہوں اُسے
میں تہی دامن سہی پر یاد کی چادر تو ہے

میں اُسے سمجھا نہیں سکتا مری الجھن ہے یہ
چاہتوں کا اک سمندر موجزن اندر تو ہے

اور کیا اعزاز ہوگا، اے حریفِ جان و دل!
میرے سامانِ سفر میں اس کا اک پتھر تو ہے

کس طرح تسلیم کر لوں میں شکستِ ذات کو
حوصلوں کا ساتھ میرے اک جری لشکر تو ہے



مذمت ہی نہیں کافی، ہمیں کچھ اور کرنا ہے
قبیلے والو! اب اس مسئلے پر غور کرنا ہے

ہمیں بیعت نہیں کرنی کسی دستِ ستم گر پر
ہمیں کرب و بلا کا تازہ پھر سے دور کرنا ہے

تھا ڈر جس کا وہ سیلابِ بلا اب گھر تک آپہنچا
ہمیں کچے مکانوں کا بھی حل فی الفور کرنا ہے

پڑاؤ اب نہیں ہوگا کہیں جاوید رستے میں
شریکِ قافلہ کو فیصلہ اس طور کرنا ہے

عباس تابش



چمکے گا شجر پہ نہ مرے گھر میں رہے گا
وہ چاند ہے اور چاند سمندر میں رہے گا

اب سانپ کے مانند مرے پیچھے پڑا ہے
شب کو بھی سایہ مرے پیکر میں رہے گا

خواہش کو خدا رزق بہم کرتا ہے دل میں
لگتا ہے یہ کیڑا اسی پتھر میں رہے گا

آئے ہیں تو سستا کے چلے جائیں گے پنچھی
وہ پیڑ اُسی طرح اُسی گھر میں رہے گا

تارے بھی تو محور سے نکل جاتے ہیں پیارے
آخر کوئی کب تک ترے چکّر میں رہے گا

یہ عشق بھی رہتا نہیں لگتا مجھے تابش
سر چڑھ کے جو بولے وہ کہاں سر میں رہے گا

مٹی میں کوئی رنگ ملایا نہیں کرتے
یہ لوگ نئی چیز بنایا نہیں کرتے

کیا دیکھتا جاتا ہوں مَیں افلاک کی جانب
پنچھی تو کبھی دھوپ میں سایہ نہیں کرتے

اک دربدری ہم کو بھی لاحق ہے مگر ہم
کونجوں کی طرح شور مچایا نہیں کرتے

گدھ بیٹھا ہے مٹی پہ ۔ وہاں سے کرو آغاز
نیچے سے عمارت کو گرایا نہیں کرتے

یہ لوگ بھی قامت میں صنوبر کی طرح ہیں
اُگتے ہیں جہاں سے وہاں سایہ نہیں کرتے

اس شہر کے ماحول کو کیا ہو گیا تابش
کچھ دن سے پرندے یہاں آیا نہیں کرتے

عباس تابش



یہ کون چشم کشا ہے مدار سے باہر
ستارے گرتے ہیں لیل و نہار سے باہر

ابھی تو ہم تری لب بستگی کی زد میں ہیں
ہٹے گا سنگ تو نکلیں گے غار سے باہر

غنیم ہے مرے اندر چھپا ہُوا لیکن
بنا رہا ہُوں مَیں خندق دیار سے باہر

بہت سی باتیں ہیں کہنے کی اور یہ ڈر بھی ہے
نکل نہ جاؤں کہیں اختصار سے باہر

جو میرے بعد چلے تھے، وہ بڑھ گئے آگے
یہ کس نے کر دیا مجھ کو قطار سے باہر

وہ جس طرف بھی گیا، وقت ساتھ ساتھ گیا
بہاؤ جاتا کہاں آبشار سے باہر

اُس کی کھال اُدھڑتی دکھائی دی تابش
یہاں تو جو بھی ہوا اختیار سے باہر



وہ بھولتا ہے نہ دل میں اُتارتا ہے مجھے
ہمیشہ مار محبت کی مارتا ہے مجھے

میں اُس کا لمحۂ موجود ہُوں مگر وہ شخص
فضول وقت سمجھ کر گزارتا ہے مجھے

بظاہر ایسا نہیں پیڑ اُس حویلی کا
ہوا چلے تو بہت پھول مارتا ہے مجھے

میں اُس کے ہاتھ سے جاتا ہوں مال و زر کی طرح
وہ روز قرض سمجھ کر اُتارتا ہے مجھے

ناصر سلطان کاظمی



یہ نہیں ہے کہ دل شکستہ نہیں
لب ابھی آشنائے نالہ نہیں

دائمی روگ ہے، جسے لگ جائے
عشق دو چار دن کا قصّہ نہیں

داغِ ماضی چراغِ فردا ہے
یادگارِ چراغِ کشتہ نہیں

کس طرح مان لوں کہ دل کی گھٹن
کسی طوفاں کا پیش خیمہ نہیں

کھائے ہیں اس قدر فریب کہ اب
اعتبارِ حواسِ خمسہ نہیں

یہ بھی اب کے بھری بہار میں دیکھ
باغ میں کوئی گل شگفتہ نہیں

اپنے دل میں پناہ لے ناصر
اس سے محفوظ کوئی قلعہ نہیں



کھینچا تھا کبھی غم جو ترے شہر میں ہم نے
جینے کی دوا پائی اُسی زہر میں، ہم نے

جانا یہ بالآخر کہ نبھانا نہیں ممکن
وہ عہد کیا ہو گا کسی لہر میں ہم نے

جو اِتنی کٹھن رات کی کاوش کا ثمر تھی
اُس صبح کو دیکھا نہیں دوپہر میں ہم نے

بے قدر ہوئی جاتی ہے احباب کی اُلفت
کیا دیکھ لیا، جانے، ترے قہر میں ہم نے

گھبرا گئے بس تم تو کنارے ہی پہ ناصر
ہاں تیرنا سیکھا تھا اسی نہر میں ہم نے

راشد مراد



دیکھنے میں لگتا ہے ماہتاب روشن ہے
اصل میں تو شب کو بھی آفتاب روشن ہے

چشمِ نم میں رقصاں ہے، تو تمھاری یادوں کی
یہ چراغ، میری جاں! زیرِ آب روشن ہے

راہ کے اندھیرے سے، ان کو خوف آئے کیوں
رہ نوردِ آنکھوں میں ایک خواب روشن ہے

جسم و جاں منوّر ہیں، میری رُوح میں راشد
نخلِ شوق پر جب تک اک گلاب روشن ہے



کتابِ حق ہے کہاں ہر کسی کے بستے میں
کوئی کوئی ہے جو لڑتا ہے اگلے رستے میں

کبھی کمان مرا ساتھ چھوڑ جاتی ہے
کبھی یہ تیر مرے، رہ گئے ہیں رستے میں

ہر ایک جنس ہے بازار میں گراں راشد
بس ایک میرا ہنر جا رہا ہے سستے میں

حامد یزدانی



شبِ آوارہ کو پابندِ سحر کرنا ہے
جی میں ٹھانی ہے کہ اک خواب کو سر کرنا ہے

سوزنِ درد سے کرنا ہے مجھے بخیہ گری
اور اِس طرح رفوُ زخمِ ہنر کرنا ہے

جا ہے جینے کی، نہ مرنے کا ٹھکانا کوئی
ملے تو اس عرصۂ محشر کو نگر کرنا ہے

اوس کی بُوند ہوں مَیں اور نہ تُو سُورج ہے
دُور تو دل سے ترے قُرب کا ڈر کرنا ہے

برگِ بے شاخ ہُوا، خاک کا حصّہ ٹھہرا
اب ہواؤں کو مرے ساتھ سفر کرنا ہے

عشق میں جان تو پہلے بھی گنوائی حامد
پھر بھی یہ جُرم مجھے بارِ دگر کرنا ہے

افتخار بخاری



اپنے اپنے خوابوں میں اپنی اپنی یادوں میں
قید ہو گئے ہیں ہم مختلف جزیروں میں

باتوں باتوں میں کوئی بات یاد آ جانا
اور پھر بھلا دینا بات باتوں باتوں میں

دل سے بھی ہیں وابستہ کچھ کہانیاں قصے
بات مشترک ہے یہ سب پرانے شہروں میں

جن کے ٹھنڈے سائے میں دوپہر گزاری تھی
رات ڈر سا لگتا ہے کیوں اُنہی درختوں میں

میرے خواب تھے جتنے حسن ہو گئے اس کا
سب علامتیں اُس کی آئیں میرے شعروں میں

دیر تک جگائے گی آج شب جو دیکھی ہے
ایک شکل اُس جیسی آتے جاتے لوگوں میں



نارسائی عمر بھر اپنے مقدّر میں رہی
دل وہ کشتی جو سرابوں کے سمندر میں رہی

ایک مدت تک وہاں محسوس میں ہوتا رہا
میں سفر میں تھا مگر خوشبو مری گھر میں رہی

اک گلِ حیرت کھلا مہتاب چھپ جانے کے بعد
ایک روشن سی مہک تا دیر منظر میں رہی

زندگی خوابِ ازل سے جاگنا کیسے ہُوا
کب تلک سوئی ہوئی مٹی کے بستر میں رہی

دھندلی یادوں کی سڑک اور سرد راتوں کی ہوا
ایک راحت سی مجھے اُس غم کی چادر میں رہی

افتخار بخاری



سرپہ تلاشِ رزق میں چیختی چیل کا سفر
دشت کی تیز دھوپ میں مردِ علیل کا سفر

ڈوب گیا وہ چاند بھی جس کو کیا تھا رہنما
تیرے مرے نصیب میں رات کی جھیل کا سفر

صبر و رضا کی راہ پر چلتے رہے ہیں ہم سدا
جیسے منیٰ کی سمت تھا ابنِ خلیل کا سفر

طائرِ دل بہت اُڑا تیرے حصارِ یاد میں
قیدِ قفس میں طے کیا سینکڑوں میل کا سفر

پھول مرے نصیب کا میری زمین سے کھلے
میں نہیں چاہتا کسی ارضِ جمیل کا سفر

احسان دانا



خوابیدہ منظروں کو جگانے سے فائدہ
لمحوں کی راکھ یونہی اُڑانے سے فائدہ

گلیاں تمام شہر کی تاریک ہیں تو پھر
آنگن میں اتنے دیپ جلانے سے فائدہ

کچے پھلوں کے ذائقے نذرِ ہوا ہوئے
سُونے گھروں میں پیڑ لگانے سے فائدہ

پانی کو کب پسند ہے معمار کا ہنر
دیوار بارشوں میں اُٹھانے سے فائدہ

یہ اپنی ذات میں بھی دفینے سے کم نہیں
برگد کا بوڑھا پیڑ گرانے سے فائدہ

اشرف جاوید



سارے چہرے ایک جیسے، سارے منظر ایک سے
کیا فضاؤں پر مسلّط ہیں سبھی ڈر ایک سے

دوستوں اور دشمنوں میں فرق ہو تو کس طرح
جس طرف سے بھی چلیں، لگتے ہیں پتھر ایک سے

رتجگوں نے خواب کیا خوابوں کی خواہش چاٹ لی
رات دن چبھنے لگے آنکھوں میں کنکر ایک سے

ہر مہک زنجیرِ پا ٹھہری سرِ صحنِ گلاب
ایک مدّت سے ہوا کے بھی ہیں تیور ایک سے

وہ دریچہ کیا بجھا، پہچان کی حس کھو گئی
کس جگہ دستک لکھیں، در ایک سے گھر ایک سے

درد نے وہ رنگ برسائے سرِ شاخِ انا
شامِ شہرِ غم کھلائے گی گلِ تر ایک سے

ڈھونڈتا رہتا ہوں چہروں میں پسِ چہرہ اُسے
دیکھتا رہتا ہوں آئینوں میں جوہر ایک سے



پسِ نگاہ خیالات تک رسائی دے
دیارِ شام، مجھے صبح آشنائی دے

سماعتوں کے دریچے کبھی کھلیں مجھ پر
میں گنگناتا ہوں جس کو، مجھے سنائی دے

طلسمِ یاد سے پتھرا چکا ہوں آنکھوں تک
عذابِ لمحۂ احساس سے رہائی دے

سرِ سنانِ انا ہوں، میں کس کا مجرم ہوں!
حدودِ حشر میں آکر مری صفائی دے

سفر تمام ہوا تو تھکن بھی ٹوٹ پڑی
پھر ایک دشتِ تمنائے نارسائی دے

ہر ایک آبلۂ پا چراغِ راہ بنے
لہو کو تابِ گلابِ سحر نمائی دے

سمیٹنا اُسے ممکن نہیں مگر اشرف
مجھے یہ کارِ قیامت ہی کیوں سجھائی دے

ناھید شاھد



زمیں تپتی ہوئی ہے، آسماں جلتا ہوا ہے
کئی موسم ہوئے منظر یونہی ٹھہرا ہوا ہے

ہوا پیغام بھی دیتی نہیں دریا کو جا کر
کوئی برسوں کا پیاسا راستہ بھٹکا ہوا ہے

سرِ مژگاں چھلکتے ہیں یہ کس موسم کے پیالے
کہ جن میں عمر بھر کا رتجگا رکھا ہوا ہے

کہو آنکھوں سے اپنی حسرتیں اب ترک کر دیں
کہ ان میں ڈوبنے والا کہیں کھویا ہوا ہے

قدم حرکت میں ہیں اور طے نہیں ہوتی مسافت
مرے پاؤں تلے اک دائرہ کھینچا ہوا ہے

جو باہر کھڑکیاں کھلتی ہیں اُن میں پھول رکھ دو
اب ان گلیوں کا سناٹا بہت گہرا ہوا ہے



مثالِ آبِ رواں ہر گماں کھُلا رکھا
زمین تنگ ہوئی آسماں کھُلا رکھا

کوئی تو آئے گا، اس دشت کو سجائے گا
اِس ایک آس پہ دِل کا مکاں کھُلا رکھا

مہک اُداس ہوئی، رنگ بے اماں ٹھہرے
کھُلی بہار نے دستِ خزاں کھُلا رکھا

دل و نگاہ کے در وا کیے مسافت کو
بدن سمیٹ لیا، رختِ جاں کھُلا رکھا

قطب نمانے بھی ٹالا، ہوا بھی مانع تھی
تمھاری سمت مگر بادباں کھُلا رکھا

تم آؤ گے تو انہی راستوں سے گزرو گے
سجا بنا کے درِ گلستاں کھُلا رکھا

ثمینہ راجہ



میں تمہارے عکس کی آرزو میں بس آئینہ ہی بنی رہی
کبھی تم نہ سامنے آسکے، کبھی مجھ پہ گرد پڑی رہی

وہ عجیب شام تھی، آج تک میرے دل میں اس کا ملال ہے
مری طرح جو تری منتظر، ترے راستے میں کھڑی رہی

کبھی وقتِ ہجر میں ہو گئی کبھی خوابِ وصل میں کھو گئی
میں فقیرِ عشق بنی رہی، میں اسیرِ یاد ہوئی رہی

لگی ایسی آگ کہ جنگلوں کو جلا دیا، مگر اس کی یاد
میرے نخلِ دل میں اُگی ہوئی یہی شاخ تھی جو ہری رہی

بڑی خامشی سے سرک کے پھر مرے دل کے گرد لپٹ گئی
وہ ردائے ابرِ سپید جو سرِ کوہسار تنی رہی

○

آدھی رات کو جاگ اُٹھنا اور چھت کو دیکھتے رہنا
وہ پہلو میں ہو تو اس کی یاد میں کھوئے رہنا
جب تھا لوگوں سے گھبرانا، تنہا رہنا، اور اب
تنہائی سے ڈرنا، خود سے باتیں کرتے رہنا
چاند کو مٹھی میں بھر لینے کی خواہش میں پھرنا
تاروں کی آوازیں سنتے شب بھر جاگتے رہنا
دل کتنا پاگل ہے، ایسے ہنگاموں میں چاہے
بیتے وقتوں کی یادوں کو گلے لگائے رہنا
ساحل کی اوقات سمجھنا، نفرت کرنا، پھر بھی
خوابوں کے بپھرے پُرشور سمندر جاگتے رہنا
کالی لمبی بیراگن راتوں سے دوستی اپنی
پھر بھی تیرے لیے مسافر! دیے جلائے رہنا
مایوسی کی ڈائن دل میں پنجے گاڑ چکی ہے
لاحاصل سا لگتا ہے اب خود کو سنبھالے رہنا

ثمینہ راجہ

○

لوگ کہتے ہیں کہ منزل کے ثمر اچھے ہیں
کوئی پوچھے کہ ترے آبلہ پا کیسے ہیں

آئنہ زاد بنے تھے کہ شکستہ ہوئے ہم
پوجنے والوں نے پتھر ہی یہاں پوجے ہیں

ایک صورت پہ لٹائی تھی متاعِ دل و جاں
کیا خبر تھی پسِ چہرہ کئی چہرے ہیں

کون پھر لفظ و پسِ لفظ کے بارے میں کہے
ہم تو آواز کی سرحد پہ کھڑے رہتے ہیں

ترے ہمراہ جہاں سے سفر آغاز کیا
پھر اُسی ہجر کی دہلیز پہ آ بیٹھے ہیں

○

کس طرح پھر بھلا پابند اُسے کر سکتی
میں ہواؤں کو تو مٹھی میں نہیں بھر سکتی

عین ممکن ہے کہ وہ لمس کہیں کھو جائے
میرے جذبات کی خوشبو تو نہیں مر سکتی

تم نے ہی کھیل بنایا ہے وفا کو ورنہ
ہم پہ دنیا کوئی الزام کہاں دھر سکتی

اب تو لے آؤ مرے واسطے ارژنگ کوئی
ایک نظارے سے یہ آنکھ نہیں بھر سکتی

سخت مجبوری ہے آوارہ نگاہی اس کی
اک محبت اُسے آسودہ نہیں کر سکتی

خالد اقبال یاسر



کچھ درد ہیں ایسے جو کسی سے نہیں کہتا
اب سے ہی نہیں ہیں تو کبھی سے نہیں کہتا

کیا ضد ہے پرانی کوئی مابین ہمارے
اک تجھ سے نہیں میں تو کبھی سے نہیں کہتا

جب سے مرے وجدان پہ اسرار کھلے ہیں
اچھا کہ برا کیا ہے، تبھی سے نہیں کہتا

ہے میری طبیعت کی بناوٹ ہی کچھ ایسی
ایسا نہ سمجھنا کہ تمہی سے نہیں کہتا

آتی ہے زباں پر گہے دانش کی کوئی بات
خاموش ہی رہتا ہوں، غبی سے نہیں کہتا

کچھ کہنے کی یاسر مجھے خواہش تو بہت ہے
شاید کسی اپنی ہی کمی سے نہیں کہتا



مستور ہے کیا پردۂ تحریر کے پیچھے
مانوس در و بست ہے تعبیر کے پیچھے

عرفان کی تحریم ہے دنیا سے مقدم
تقویٰ کو چھپاتا ہوں میں تقصیر کے پیچھے

اک نور کی حد بندی مرے چار طرف ہے
بیٹھا ہوں میں پھیلی ہوئی تنویر کے پیچھے

کچھ اس کی کشش تیز تھی، کچھ میری تمنا
پہنچی ہے نشانے پہ کماں تیر کے پیچھے

یہ خلعت و دینار یونہی تو نہیں آئے
یاسر مری تذلیل ہے توقیر کے پیچھے

جاوید انور



یہ خوابوں کا رستہ ہے، ڈر جاؤ گے تم
میرے ساتھ چلو گے تو مر جاؤ گے تم

کیا ہو، بس اک زخم ہو دل کے چہرے پر
وقت گزر جائے گا اور بھر جاؤ گے تم

یہ جو مٹی بالوں میں اور گالوں پر ہے
سونا بن جائے گی جب گھر جاؤ گے تم

رک جاؤ جاوید ابھی کچھ رک جاؤ
مت کھیلو یہ کھیل، سنو، ہر جاؤ گے تم

انجم ترازی



سب آنکھیں اندھی لگتی ہیں، ہر چہرہ بنجر لگتا ہے
گھر کے دروازے سے باہر میں کیا نکلوں، ڈر لگتا ہے

انساں پر پت جھڑ کا موسم آیا اور آ کر ٹھہر گیا
آنکھوں کو بھیانک خوابوں سا اس شہر کا منظر لگتا ہے

خواہش کی آتشبازی سے کچھ جلتے ہیں کچھ بجھتے ہیں
ذہنوں میں سوچیں ناچتی ہیں، یہ میلہ گھر گھر لگتا ہے

کچھ اس کی صورت ایسی ہے، کچھ میری نظر کا دھوکا بھی
دیکھوں تو شبنم کا قطرہ، سوچوں تو سمندر لگتا ہے

منوّر عزیز

○

پلٹ آیا ہوں اپنی سمت آخر دربدر ہو کر
میں اُس کی دُھن میں نکلا تھا ہوا کا ہمسفر ہو کر

یہ دریا پار کرنا ہے اسی کاغذ کی ناؤ میں
ازل سے ہوں بہاؤ میں ابد کا نقش گر ہو کر

ابھی کچھ خواب باقی ہیں، ابھی آنکھیں سلامت ہیں
ابھی یہ راکھ روشن ہے مرا زادِ سفر ہو کر

سوالوں کے سبھی پتھر عجب رستے سُجھاتے ہیں
مجھے اونچا اُڑاتے ہیں کچھ اندیشے ہُنر ہو کر

یہی پل ہے مرے ہونے نہ ہونے کی گواہی کا
میں دشمن کے مقابل آ گیا ہوں بے سپر ہو کر

○

سایۂ شاخ میں جس جگہ آشیاں تھا، مکیں ، نہ تھا
پھڑ پھڑاتا ہُوا پھر جدھر بھی گیا میں، وہیں سانپ تھا

رات دشتِ رفاقت میں جانے میں کس دھیان میں کھو گیا
چونک کر میں نے دیکھا تو پہلو نشیں تُو نہیں سانپ تھا

عمر بھر جو مرے ساتھ رہتا رہا وسوسوں کی طرح
اِس مکاں کے کسی گوشۂ عافیت میں کہیں سانپ تھا

یک بہ یک کس لیے آگ سی تن بدن میں دہکنے لگی
میرے پاؤں تلے خاک تھی یا کوئی آتشیں سانپ تھا

بچ نکلتا کہاں سحرِ تہذیب سے شہرِ تکذیب سے
آئینہ آئینہ لوگ تھے آستیں آستیں سانپ تھا

رابطہ کچھ بڑھا تو منوّر سب اسرار کھلنے لگے
اُس کی کایا نہیں آتما میں مگر بالیقیں سانپ تھا

سلطان سکون



جدا جدا تھے کبھی گھر سے گھر، نگر میں مرے
بہم تھا ربط دلوں میں مگر، نگر میں مرے

ہر ایک گھر سے صدا آتی تھی تلاوت کی
طلوع ہوتی تھی یوں ہر سحر، نگر میں مرے

کوئی بھی آنکھ بچا کر نہ یوں گزرتا تھا
یہ وقت ایسا نہ تھا تیز تر، نگر میں مرے

تمام عمر نبھاتا تھا اِس تعلق کو
جو ہوتا چند قدم ہمسفر، نگر میں مرے

کسی کی آنکھ میں آنسو کبھی اُمڈ آتے
تو ساتھ ہوتی تھی ہر چشم تر، نگر میں مرے

کسی پہ جب کوئی اُفتاد آن پڑتی تھی
تو جوڑ لیتے تھے سب دوش و سر، نگر میں مرے

کسی کے جبر و ستم کا کوئی شکار نہ تھا
نہ تھا کسی کو کسی کا خطر، نگر میں مرے

کوئی ضمیر کا سودا کبھی نہ کرتا تھا
نہیں تھی زر کی ہوس اس قدر، نگر میں مرے

وہی نگر ہے مگر الاماں، یہ بے مہری
کہ بھائی بھائی سے ہے بے خبر، نگر میں مرے

نہ جانے کھو سا گیا ہے کہاں ہمارا سکونؔ
کہیں سے لاؤ اسے ڈھونڈ کر، نگر میں مرے



کوئی طلب نہیں ہے کہ مال و منال دے
شاعر ہوں، مجھ کو شعر و سخن میں کمال دے

ایسی کوئی خوشی بھی نہ کر مرحمت مجھے
انسانیت کی حد سے جو باہر نکال دے

میری تو یہ خوشی ہے، مری بھی خوشی کا نصف
اک غم نصیب شخص کے دامن میں ڈال دے

انسانیت کا ظرفِ تہی مالا مال کر
انساں کی حرص و آز کو گنجِ زوال دے

یا تو مری بھی روشنیٔ طبع چھین لے
یا خلقِ شہر کو مرا حُسنِ خیال دے

پنہاں اسی میں عظمتِ انساں کا راز ہے
جو نفس کی طلب ہو اُسے کل پہ ٹال دے

اس کے سوا نہیں ہے طلب اور کچھ سکونؔ
دو ایک وقت لقمۂ اکلِ حلال دے

خاور اعجاز



چلو بھر پانی پیتے ہیں دریا باقی رہ جاتا ہے
عشق میں منزل پا لینے کا دعویٰ باقی رہ جاتا ہے

چاروں سمت سفر کرنے سے منزل آخر کھو جاتی ہے
اپنی ذات میں گم ہونے کا رستہ باقی رہ جاتا ہے

سب تصویریں مٹ جاتی ہیں انہونی کی اک بارش میں
صرف صداقت رکھنے والا چہرہ باقی رہ جاتا ہے

سر پر سایہ کرنے والے بادل بھی تو اُڑ جاتے ہیں
دھوپ سفر میں پاؤں تلے بس صحرا باقی رہ جاتا ہے

برسوں کی محنت سے بننے والے لوگ اُجڑ جاتے ہیں
اور زبانوں پر دو پل کا چرچا باقی رہ جاتا ہے



اُسے تو چاہیے رستہ کشادہ ہو جائے
ہوا کو کیا جو شجر بے لبادہ ہو جائے

یہ خوف رہنے لگا ہے محل سراؤں میں
جو سننے آئے تھے، اب کے مبادا ہو جائے

کبھی تو راہِ محبت میں اک قدم نہ اُٹھے
کبھی تمام سفر بے ارادہ ہو جائے

عجیب راہگزر ہے، رکیں تو سیلِ سیاہ
چلیں تو روشنی حد سے زیادہ ہو جائے

نہ جانے کب یہ ستاروں کے حرف اُڑ جائیں
اور آسماں کا ورق پھر سے سادہ ہو جائے

خاور اعجاز



مایوس ہونے دیتا نہیں کائنات سے
دل کا عجیب ربط ہے شہرِ ثبات سے

آفاق سے پرے کوئی دروازہ کھول دے
ایسا بھی اک سوال کریں اپنی ذات سے

ہے میرے ساحلوں کے بھی قرب و جوار میں
اِک پیاس جو چلی تھی کنارِ فرات سے

اس آس پر ہی طائرِ جاں اس کی زد میں ہے
وہ تیر بھی چلائے گا خود اپنے ہات سے

آباد کیسے ہوگا جہانِ ابد ترا،
دنیا اگر گزر نہ سکی پل صراط سے



کبھی کبھی وہ میرے دھیان میں کھُلتی ہے
کھڑکی جو اِک اور جہان میں کھُلتی ہے

آخری ہچکی حل ہے عمر معمّے کا
ایک گرہ سی اس دوران میں کھلتی ہے

سوتے رہتے ہیں ہم بات بگڑنے تک
آنکھ کہیں جا کر طوفان میں کھُلتی ہے

جذبوں پر اک دھند سی چھائی رہتی ہے
اصل حقیقت تو بحران میں کھُلتی ہے

ایک گلی ہے شہرِ یقیں میں ایسی جو
اَن دیکھے روشن امکان میں کھُلتی ہے

زمان کنجاہی



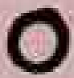
کوئی بھی آج مجھے سائباں نہیں ملتا
زمیں پہ رہتے ہوئے آسماں نہیں ملتا

مری حیات میں ہے اس طرح خوشی کی مثال
کہ جیسے دشت میں آبِ رواں نہیں ملتا

ہر ایک سمت جہاں چاہتوں کے پھول کھلیں
مجھے تو ایسا کوئی گلستاں نہیں ملتا

کبھی نصیب تھا ہم کو، جو آج سے پہلے
وہ قرب تیرے مرے درمیاں نہیں ملتا

چلو زمانؔ اب اپنی لحد کا کنج سہی
یہاں تو رہنے کی خاطر مکاں نہیں ملتا



دیکھ کر خوش کلام ہمسائے
اگلے وقتوں کے لوگ یاد آئے

وہ کڑی دھوپ ہے کہ پیڑوں کے
بازوؤں میں سما گئے سائے

ایک دن میری تلخ باتوں کو
عین ممکن ہے، تو بھی دُہرائے

میں تو اُس دوستی کا قائل ہوں
میرا دشمن بھی میرے گن گائے

اپنے اپنے چراغ گُل کر کے
لوگ سڑکوں پہ کیوں نکل آئے

سید یٰسین قدرت

○

رقم کوئی تو بنا بابِ ہجر کر جاؤں
"انا" کو دل کے ورق پر سجا کے مر جاؤں

یہ اور بات، نشیمن ہوا نہ باندھنے دے
میں بود و باش کو ورنہ شجر شجر جاؤں

ترے قریب سے اک موجِ برق کی مانند
تجھے خبر ہی نہ ہو اور میں گزر جاؤں

یہ آرزو ہے، ستاروں میں بدلے میرا وجود
پھر اس کے بعد تری مانگ میں سنور جاؤں

نہیں مجالِ ملاقات اس سے بارِ دگر
جو اس سے وعدۂ فردا کروں، مکر جاؤں

شمیم بن کے ہواؤں میں یوں گھلوں قدرتؔ
کہ اس کی سانس میں اور روح میں اتر جاؤں

○

میں لامحدود قدرت چاہتا ہوں
سمندر سے محبت چاہتا ہوں

ہر اک خواہش کی، اب تیرے علاوہ
سرے سے میں ہلاکت چاہتا ہوں

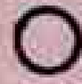
بجائے ہدیۂ فرماں روائی
میں سوغاتِ اطاعت چاہتا ہوں

کسی آزارِ دوری کے بجائے
میں قربت کی مسرت چاہتا ہوں

علاوہ اک درِ ذاتِ صمد کے
ہر اک در سے بغاوت چاہتا ہوں

میں خوابوں کے اندھیروں سے نکل کر
کوئی روشن حقیقت چاہتا ہوں

قیوم طاہر



کوئی نہ راستہ ملا ایسی گپھا تھی ذات بھی
اب تو یہ گرہیں کھولتے، دُکھنے لگے ہیں ہات بھی

کیسے عجیب ذائقے، گھلنے لگے ہیں رُوح میں
جیسے کہ جیت ہو گئی، جیسے ہوئی ہو مات بھی

اندھی ہوا کے بین تھے، سارے کواڑ بند تھے
بس یونہی رائیگاں گئی، میری دُعا سی بات بھی

کب سے فصیلِ درد کی ساری لَویں بجھی بجھی
کب کا اُجاڑ ہو چکا، شہرِ تعلقات بھی

دیکھا تو اپنی آنکھ پر گرد کے سائبان سے تھے
اُتری تھی اپنے گاؤں میں رنگوں کی اک برات بھی



اب تُو بلائے تیرگی! چاہے کہیں بھی وار کر
کب کے دیے بجھا دیے، تیز ہوا سے ہار کر

کس سے کہیں کہ کیا ہُوا، سُود و زیاں کے کھیل میں
کھول نہ بھید کی گرہ، خود کو نہ شرمسار کر

اب کے نہ جانے گیان کا کون سا راستہ ملے
برف سے کی ہے دوستی، آگ سے میں نے ہار کر

ایسا نہ ہو کہ سب بکیں، دُور کہیں پہ جا بسیں
اب کے لیے موجِ آب! تُو، کھیت بھی واگزار کر

ہم بھی عجیب لوگ ہیں! اتنی عجیب خواہشیں!!
ڈھونڈ رہے ہیں ذائقے، کچّے ثمر اُتار کر!!

قیوم طاہر



حویلیوں کی طرح تھا، مگر کھنڈر سا لگا
دنوں کے بعد ملا وہ تو مل کے ڈر سا لگا

وہی سراب، سُلگتی ہَوا، عتاب وہی
نیا سفر بھی پرانے کسی سفر سا لگا

نہ کوئی رنگ نہ منظر، نہ باس مٹی کی
تمھارے شہر کا موسم بھی اپنے گھر سا لگا

شبوں کے راز وہی، ڈوبتے چراغ وہی
کسی بھی پَل میں نہ دھوکا کوئی سحر سا لگا

کوئی نہیں تھا کڑی دُھوپ کی مسافت بھی
بس ایک آس کا پرتو، گھنے شجر سا لگا

طارق نعیم



مجھے لُوٹے گا، میرے گھر کی سب چیزیں جلا دے گا
پھر اُس کے بعد سارے شہر کی آنکھیں جلا دے گا

میں اپنی بازیابی پر ذرا بھی مُسکرایا تو
عَلَم دینے سے پہلے وہ مری باہیں جلا دے گا

وہ مجھ سے چھین لے گا امتیازِ روز و شب ایسے
مری صبحیں جلا دے گا، مری شامیں جلا دے گا

بنے گا وہ رکاوٹ یوں بھی سچے حرف لکھنے میں
قلم دے دے گا ہاتھوں میں، مگر پوریں جلا دے گا

وہ یوں الزام دے گا بے ثمر ہونے کا پیڑوں کو
کہ بور آنے سے پہلے ہی سبھی شاخیں جلا دے گا

وہ پہلے ہجرتیں پہنائے گا پیروں میں، لیکن پھر
کنوئیں کھودے گا راہوں میں، پنہ گاہیں جلا دے گا

سعدیہ روشن صدیقی



داستانِ پارینہ ذہن میں کھٹکتی تھی
ایک حرف مشکل تھا، میں جہاں اٹکتی تھی

میرے گھر سے باہر تو شہر بھر کی وسعت تھی
راستوں کی کثرت بھی در بدر بھٹکتی تھی

کیا عجیب وعدہ تھا، جھرجھری سی آتی ہے
کہہ لیا زباں سے جب، سر کو میں جھٹکتی تھی

اپنی نارسائی پر صبر اس طرح آیا
سانس سانس رکتی تھی، ہر قدم ٹھٹکتی تھی

نیند جب نہیں آئی، خواب کیسے آجاتا؛
اعتبار کرنے کو آنکھ میں جھپکتی تھی

مطمئن اور آسودہ دن کو جو نظر آئی
رات بھر وہی لڑکی درد سے بلکتی تھی

آئینے کو جب دیکھا، اپنی شکل کو دیکھا
دل پہ جو گزرتی تھی، وہ کہاں جھلکتی تھی

نہال جیسے تن کو تھا شوق سرفرازی کا
شاخ تھی کہ سولی تھی، جا بجا لچکتی تھی

چشم دید شاہد تھی، پھول کے بکھرنے کی
کیا سمجھ کے گلشن میں پھر کلی چٹکتی تھی

کیا دھنک اتر آئی اپنے گھر کے آنگن میں
الگنی پہ پھر کس کی اوڑھنی لٹکتی تھی

اک فریب کھایا تو سعدیہ ہوئی محتاط
اس کے بعد ہر اک کو چھانتی پھٹکتی تھی

(ابو ظبی)

سعدیہ روشن صدیقی



بظاہر تو ہمارے پر کٹے ہیں
مگر اپنی اُڑانوں پر ڈٹے ہیں

بس اک لمحے کو اس سے بات کی تھی
گلابوں سے مگر رستے اَٹے ہیں

کبھی تو زندہ و سالم تھے ہم بھی
اگر اب اتنے خانوں میں بٹے ہیں

کسی تنہا جزیرے کی نشانی
مرے اطراف میں جو جمگھٹے ہیں

یہ مصنوعی زمیں پہلے کہاں تھی
سمندر اپنی مٹی سے پٹے ہیں

مدار و زاویہ قائم نہیں ہے
ابھی تو اپنے محور سے ہٹے ہیں



ہم جو اس کی الفت میں منہ سے کچھ نہیں کہتے
بن گئے سمندر سے، اپنی جا پہ ہیں بہتے

خشک سرزمینوں پر بارشوں کا موسم ہے
درد کب نہیں اُٹھتا، اشک کب نہیں بہتے

زلفِ شب نما میں اب چاندنی جھلکتی ہے
چاند ہو کہ چہرہ ہو، ایک دن ہیں سب گہنے

اپنی پیاری پیاری ماں مجھ کو یاد آتی ہے
دیکھتی ہوں دنیا میں جب کسی کو دکھ سہتے

یہ سکون و آسائش اجنبی دیاروں میں
اپنے ملک میں پاتے! کاش ہم وہیں رہتے

دل کی بات کہنے کا ڈھب نہ سعدیہ آیا
یوں تو عمر گزری ہے نظم اور غزل کہتے

(ابوظہبی)

سعدیہ روشن صدیقی



ان کو دیکھا تو رخ تمتمایا بہت
شاخِ نازک تھا دل، کپکپایا بہت

بوند پہلی جو جلتے توے پہ گری
جسم کورا گھڑا، سنسنایا بہت

پسلیوں کا قفس بھی مناسب نہیں
اِک پرندہ وہاں پھڑپھڑایا بہت

جس کو سننے کے ہم کب روادار تھے
آج نغمہ وہی گنگنایا بہت

میری بیٹی بھی سادہ ہے میری طرح
اپنا ماضی مجھے یاد آیا بہت

خواب تھا کھو گیا، لہر تھا بہہ گیا
لہجہ کانوں میں وہ کھنکھنایا بہت

اب بتدریج عادی ہوئی سعدیہ
پہلے نس نس میں خوں تنتنایا بہت



طلب رسد کا بھی قانون کتنا سادہ ہے
اب آسماں کی طرح یہ زمیں کشادہ ہے

ملی ہے پاؤں کو راحت تو کیا ارادہ ہے؟
وہی ہے راہ، وہی پیڑ ایستادہ ہے

یہ سلوٹوں سے بھرا ملگجا سہی لیکن،
ہر اک کے پاس فقط ایک ہی لبادہ ہے

تو کیا جہاں میں فقط ایک شخص ہے زندہ!
کہ بار بار اسی نام کا اِعادہ ہے

ادھوری سانس بھی لینے کا کچھ سبب تو نہیں
نہ انتظار، نہ اقرار اور نہ وعدہ ہے

ذرا سا نذر کیا خون سعدیہ تم نے
وگرنہ ماں کا تو حق اس سے بھی زیادہ ہے

(ابوظبی)

عابد ودود



ریزوں کی طرح بکھر رہا ہوں
اب خود کو تلاش کر رہا ہوں

سیمائے سحر کی جستجو میں
میں رات کا ہمسفر رہا ہوں

تاریخ کا ایک المیہ ہے
جس عہد سے میں گزر رہا ہوں

اب کوئی نہیں مخاطب اپنا
میں خود سے سوال کر رہا ہوں

عابد وہ کہاں ہیں اور کدھر ہیں
جن کے لیے در بدر رہا ہوں

(بریڈفورڈ)

ایوب پیام



ہے گرد و پیش عجب سلسلہ کئی دن سے
چراغ ڈھونڈ رہی ہے ہوا کئی دن سے

بدل رہی ہے نگاہوں کے ساتھ آخر کیوں
ہمارے شہر کی آب و ہوا کئی دن سے

غبارِ دشت ہی دے جائے بارشوں کی نوید
درخت مانگ رہے ہیں دعا کئی دن سے

نہ عذرِ غم کی شکایت، نہ ذکرِ خیر کی رسم
پڑا ہے شہر میں قحطِ وفا کئی دن سے

زوالِ گرمئ بازار دیکھنے کے لئے
ہے انتظار میں خلقِ خدا کئی دن سے

تونگری میں نمائش بہت ضروری ہے
وہ دے رہا ہے مجھے مشورہ کئی دن سے

وہ اپنی ذات میں گم ہو چکا تھا لیکن اب
لگا رہا ہے گلی میں صدا کئی دن سے

پیامؔ روزنِ دیوار و در پہ مت جانا
رکی ہوئی ہے مسلسل ہوا کئی دن سے

انجم یوسف زئی



بادل اُس کا جسم بناتے رہتے ہیں
دیوانے ہیں، خواب سجاتے رہتے ہیں

جانے کون انسان، کہاں تکلیف میں ہو
اَن دیکھے آلام ستاتے رہتے ہیں

گرنے والے پھل کی چیخ سُنیں کیسے
پتّے کتنا شور مچاتے رہتے ہیں

کون بتائے، ہجر کی رُت کیوں گڑ سی گئی
موسم تو سب آتے جاتے رہتے ہیں

فیصل محفوظ



سارے میدانوں میں دار لگا رکھے ہیں
ہم نے لاشوں کے بازار لگا رکھے ہیں

جانے کس نے پھانسی گھر کے چاروں جانب
مردہ آنکھوں کے انبار لگا رکھے ہیں

مجھ سے لوٹے مال پہ لوٹنے والوں نے اب
میرے بھائی پہرے دار لگا رکھے ہیں

تیرے چاہنے والوں نے اب تیرے جیسے
سارے شہروں میں دربار لگا رکھے ہیں

اِن انصاف پسندوں نے پھر کس کے ڈر سے
دروازوں پہ برقی تار لگا رکھے ہیں

(لندن)

فیصل محفوظ



شگفتہ پھول چہروں کی ادائیں چھین لیتے ہیں
یہ ظالم کس لیے بچوں سے مائیں چھین لیتے ہیں

ہماری عزتیں نیلام کر دیتے ہیں گلیوں میں
بھرے بازار میں سر سے ردائیں چھین لیتے ہیں

ہمارے شہر کے منصف شریکِ جرم رہ کے بھی
سزائیں بانٹ دیتے ہیں، جزائیں چھین لیتے ہیں

ہمیں شیشے کے گھر بنوا تو دیتے ہیں مگر ہم سے
کھلے موسم، تر و تازہ ہوائیں چھین لیتے ہیں



اک خوف سا طاری ہو جیسے
جینا بیماری ہو جیسے

مفلس کے گھر میں عید کا دن
صدیوں پر بھاری ہو جیسے

دن رات مشقت کرتے ہیں
پھر بھی بے کاری ہو جیسے

لگتا ہے فیصلؔ اب کے بھی
فاقوں کی باری ہو جیسے

جاوید احساس

○

بھٹک نہ جائیں کہیں قافلے نشاں رکھنا
بجھیں چراغ تو سورج کو درمیاں رکھنا

ہوا کے سامنے جلتے رہیں چراغِ سخن
میں مٹ بھی جاؤں تو یہ سلسلہ رواں رکھنا

کھڑے ہیں پاس ہی شب خون مارنے والے
تم اپنے ہاتھ میں ہر دم کڑی کماں رکھنا

زمیں پہ سینکڑوں صیاد پھرتے رہتے ہیں
بلند شاخ پہ احساس آشیاں رکھنا

○

حائل مسافتوں میں ذرا سی چٹان تھی
مجھ سے بریدہ پا کے لیے آسمان تھی

جس کی ہر ایک شاخ سے تازہ لہو گرا
خلقت اُسی درخت کے زیرِ امان تھی،

بولا کچھ اس طرح کہ مرے ہونٹ سل گئے
گونگے کے منہ میں آج یہ کس کی زبان تھی

اعجاز رضوی



خوابوں کے انبار اُٹھائے پھرتا ہوں
کاندھوں پر گھر بار اُٹھائے پھرتا ہوں

ایک پرندے کی خاطر میں صدیوں سے
شانوں پر اشجار اُٹھائے پھرتا ہوں

دل کی اندھی گلیوں اندھی سڑکوں پہ
کیوں تصویرِ یار اُٹھائے پھرتا ہوں

بچپن میں اک کاغذی کشتی کیا ڈوبی
میں اب تک پتوار اُٹھائے پھرتا ہوں

بے حس ہو کر جینا کتنا مشکل ہے
سینے میں دیوار اُٹھائے پھرتا ہوں

اس کے آنسو شبنم تھے اور میں اعجاز
ہاتھوں پر کہسار اُٹھائے پھرتا ہوں



کوئی ویرانہ تسخیر کیا جائے
کسی بہانے گھر تعمیر کیا جائے

بہتے آنسو ساری بات نہ کہہ جائیں
کسی دعا سے دُکھ زنجیر کیا جائے

یہاں ہوا بھی عکسوں کے بل چلتی ہے
شیش محل میں کیا تحریر کیا جائے

دیواروں پر کس نے خون سے لکھا ہے
میرے خواب کو اب تعبیر کیا جائے

شاید یونہی پل بھر کو آرام ملے
شہرِ انا میں خود کو فقیر کیا جائے

میرے سامنے آب و ہوا کا دریا ہے
اس پر کیسا پل تعمیر کیا جائے

روز بدل جانے کا دھڑکا رہتا ہے
حرفِ زباں کے ساتھ اسیر کیا جائے

رؤف امیر

○

نہیں کہ مہر و وفا کا امین تُو بھی نہیں
دِلا سکا مگر اس کا یقین تُو بھی نہیں

کچھ اِس میں میری نظر کا اثر بھی شامل ہے
مرے حبیب، مکمّل حسین تُو بھی نہیں

مقام اور ہے کوئی جو میری منزل ہے
فلک وہ تُو بھی نہیں ہے، زمین تُو بھی نہیں

ستارے توڑنا میرے بھی بس سے باہر ہے
یہ سچّی بات ہے اور مہ جبین تُو بھی نہیں

کچھ اور لوگ بھی اِس میں قیام رکھتے ہیں
مکانِ دل کا اکیلا مکین تُو بھی نہیں

○

تیری تو اے امیؔر کوئی ذات بھی نہ تھی
اس عشق میں تو عزّتِ سادات بھی نہ تھی

رونا بھی آ ہی جاتا ہے انسان کو مگر
پہلے یہ بات شاملِ عادات بھی نہ تھی

تُو اُس گھڑی بھی میرے لیے اجنبی نہ تھا
جس وقت میری تجھ سے ملاقات بھی نہ تھی

کاجل بھی اُس کی آنکھ میں تھا، رنگ و نور بھی
وہ صبح کا سماں بھی نہ تھا رات بھی نہ تھی

کچھ آپ نے بھی اتنے مراسم نہیں بڑھائے
کچھ ہم غریب لوگوں کی اوقات بھی نہ تھی

رؤف امیر



جن کے قلب و ذہن پر ہے جھوٹ کی کائی بہت
"ناگوار اُن کو ہے آئینوں کی سچائی بہت"[1]

اب نئے انداز سے ہے شہریاروں کا سلوک
حل نہیں کوئی مگر خلقت کی شنوائی بہت

وہ عجب سفاک دشمن تھا کہ بڑھتا ہی گیا،
ورنہ ہم نے امن کی چادر تو لہرائی بہت

تیرگی میں کچھ نہیں کھلتا کسی بھی آنکھ پر
روشنی ہوگی تو تھوڑی سی بھی بینائی بہت

ہم اگر دل کو کھلا رکھیں محبت سے رہیں
پھر تو یہ چھوٹا سا آنگن بھی مرے بھائی بہت

[1] ناگوار اُس کو ہے آئینے کی سچائی بہت (اقبال کوثر)



کشیدہ گردن تھی، ٹیڑھا شملہ تھا، زین پر تھا
مگر ذرا دیر بعد سیدھا زمین پر تھا

گرانے والوں پہ اینٹ تک بھی نہیں گری تھی
مکان سارے کا سارا اپنے مکین پر تھا

گماں کی دیوار آسماں تک گئی ہوئی تھی
اور ایک بھاری سا قفل بابِ یقین پر تھا

مری صداقت مری امانت کو مانتا تھا
بضد مگر پھر بھی باپ دادا کے دین پر تھا

قاسم جلال



صدیوں کی تشنگی کا مداوا نہ کر سکے
بادل، علاجِ گرمئی صحرا نہ کر سکے

نام و نمود کی ہمیں خواہش تو تھی مگر
بے روح شہرتوں کی تمنّا نہ کر سکے

ملزم کا جھوٹ عدل کا معیار بن گیا
میرے ثبوت بھی مجھے سچّا نہ کر سکے

گو پُرکشش تھی، انجمنِ تاجرانِ فن
ہم آبروئے شعر کا سودا نہ کر سکے

اتنا نہ بخل کیجیے، کچھ مسکرائیے
وہ آفتاب کیا، جو اُجالا نہ کر سکے

بارش کے باوجود سُلگتا رہا مکاں
آنسو بھی دل کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے

اُٹھتا نہ مجھ سے بوجھ مسیحائی کا جلالؔ
اچھّا ہوا کہ وہ مجھے اچھا نہ کر سکے

کرامت بخاری



فکر سمندر گہرا پانی، پانی کے پاتال میں چُپ
لکھنے والے تُو نے لکھ دی میرے سب اعمال میں چُپ

سوچ سفر کا ساتھی سُورج قریہ قریہ گھومتا تھا
رات کی کالی چادر اوڑھے اُتری خواب خیال میں چُپ

یوں تو قطرہ قطرہ رونق رات گئے تک رہتی ہے
آوازوں کے شور میں لیکن ہوتی ہے چوپال میں چُپ

آنچ سِسکتی آوازوں کی ویرانی کی نذر ہوئی
ہم دُکھیارے، ہجر کے مارے رکھتے ہیں احوال میں چُپ

سب سے مشکل کام بخاریؔ ہے ہم سوچ کے ماروں کا
کیسے اپنے آپ کو رکھیں جیون کے ہر حال میں چُپ

عارف محمود



موسم کے دُکھ سہہ جاتے ہیں
پیڑ اکیلے رہ جاتے ہیں

دُرد سُہ دن میں رہ جاتے ہیں
آنسو باتیں کہہ جاتے ہیں

بعض اوقات فقیر نمانےؔ
بات پتے کی کہہ جاتے ہیں

آنکھیں جب تھک جاتی ہیں تو
خواب گھروندے ڈھہ جاتے ہیں

کچھ ہونٹوں پر کچھ باتوں کے
رنگ ادھورے رہ جاتے ہیں

خُود سے رُوٹھنے والے عارفؔ
پھُول اُدھورے رہ جاتے ہیں

ـہ عاجز



خود پہ ہی تہمت دھر جائیں گے
سر سے قرض اُتر جائیں گے

سُورج آنکھوں والے چہرے
آئینوں سے ڈر جائیں گے

پچھلے برس جو زخم ملے تھے
اب کے برس تو بھر جائیں گے

وہ تو صرف اک بات کہے گا
دل میں حرف اُتر جائیں گے

کس کو خبر تھی، ہم بھی عارفؔ
موت سے پہلے مر جائیں گے

شہزاد سلیم

○

بات اپنے ضمیر کی اچھی
ساری دنیا سے دشمنی اچھی

لاکھ صدیوں کی اس غلامی سے
ایک لمحے کی کافری اچھی

ایک سورج کی زندگی کے لیے
چاند تاروں کی خودکشی اچھی

نسلِ آدم کے اے خداوندو
اس زمیں پر برابری اچھی

جن میں تاریک دن پنپتے ہیں
ایسی صبحوں سے تیرگی اچھی

مجھ کو اپنی ضرورتوں کی قسم
اِک خدا کی ہے بندگی اچھی

○

موج در موج شور اُٹھا تھا
کوئی دریا ندی میں اُترا تھا

میری بستی کے لوگ بہرے تھے
اپنی چیخیں میں آپ سنتا تھا

اُس کی شاخوں پہ آہیں اُگتی تھیں
میرے دل کا شجر کچھ ایسا تھا

آپ کیوں یوں اُداس رہتے ہیں
یہ اُداسی تو میرا حصہ تھا

شب افق کی صلیب کھینچتی ہیں
کون سورج اُگا یا کرتا تھا

خالد سلیم



راہِ ہستی میں کہاں پاؤں کو ہم رکھتے ہیں
اک قدم روز سرِ دشتِ عدم رکھتے ہیں

اے مرے راہروِ دل ذرا آہستہ چل
وادیٔ عشق میں آہستہ قدم رکھتے ہیں

ٹھہر اے قافلۂ ہم نفساں! آہستہ
ساتھ چلنا ہو تو رفتار کو کم رکھتے ہیں

دل سے آنے لگی زنجیر چھنکنے کی صدا
قفسِ درد میں ہم لذّتِ رم رکھتے ہیں

خود کو رسوا نہ کرو، توڑ دو آئینوں کو
آئینے پھر بھی حقیقت کا بھرم رکھتے ہیں

اس کے سب جرم مرے نام سے منسوب ہوئے
یہ الگ بات کہ شہرت بڑی کم رکھتے ہیں



آسماں سے عذابوں کی اندھی ہوائیں اترنے لگیں
دل کے سنسان جنگل میں کتنی بلائیں اُترنے لگیں

دل کے پُر شور گہرے سمندر سے جو ابر بن کر اٹھیں
آنکھ کے شہر میں کرب کی وہ گھٹائیں اُترنے لگیں

دن کی ساری شکستہ اُڑانیں پروں میں سمیٹے ہوئے
چاندنی رات کی گود میں فاختائیں اُترنے لگیں

باپ غفلت کی چادر سے بالوں کی چاندی چھپانے لگا
بیٹیوں کے سروں سے حیا کی ردائیں اُترنے لگیں

روح کا کرب جب خوف کا اژدہا بن کے ڈسنے لگا
لوحِ تقدیر پر میری ماں کی دعائیں اُترنے لگیں

قمر رضا شہزاد



آخر اک روز قبول ہزیمت کر لے گا
دل پاگل ہے، اس ہاتھ پہ بیعت کر لے گا

اُسے شہرِ اَنا میں دو دن تو رہ لینے دو
وہ یہاں سے بھی اُکتا کر ہجرت کر لے گا

اِس جنگ کے بعد بڑا اعزاز اُسی کا ہے
جو خوب اکٹھا مالِ غنیمت کر لے گا

اک اُجرت عشق کا جھگڑا ہے طے ہو جاتے
پھر مجھ سا تن آسان بھی محنت کر لے گا

اُسے اتنا بھی نہ مناؤ ورنہ وہ شہزاد
ہر ایک سے رُوٹھنا اپنی عادت کر لے گا



ہمیشہ جیتنے والا کبھی تو ہارا بھی ہو
محبتوں میں کوئی فیصلہ ہمارا بھی ہو

میں اِس کنارے پہ بیٹھا ہوں اور سوچتا ہوں
مری گرفت میں دریا کا وہ کنارا بھی ہو

یہ شہر چھوڑنا مشکل تو ہے مگر سرِ دست
کسی کو میرا یہاں ٹھہرنا گوارا بھی ہو

مجھے قبول نہیں تہمتِ دُعا اور وہ
یہ چاہتا ہے کسی نے اُسے پکارا بھی ہو

میں آفتاب نہیں ہوں مگر کبھی شہزاد
مرے مدار میں اُس شخص کا ستارا بھی ہو

عطیہ بتول بانو



صحرا تھا وہ، یا پھر کوئی سمندر تھا
میری غزلوں، نظموں کا پس منظر تھا

میرے دکھ پر ٹوٹ گیا ہے انگوٹھی میں
میرا سچا ساتھی میرا پتھر تھا

آؤ پھر سے خواب بنیں، پھر رات ہوئی
تعبیروں کا دھڑکا تو بس دن بھر تھا

جی کرتا ہے، پھر سے اس کو عام کریں
جس قصے کا چرچا کچھ دن گھر گھر تھا

تو آیا تو رنگ اور خوشبو بکھرے تھے
اللہ جانے مارچ تھا یا اکتوبر تھا

اسماء راجا



کیا پریشاں زندگی ہے! کیا کریں!
رات بھر ٹہلا کریں، سوچا کریں!

عمر بھر ڈھونڈا کیے بس ایک پل
ایک پل وہ — جب اُسے دیکھا کریں

اور کچھ جو چاہتے تو مانگتے
اتنا چاہا تھا — اُسے چاہا کریں

اَن سنی باتیں کبھی سنتے رہیں
اَن دیکھے چہرے کبھی دیکھا کریں

اُلجھنیں تھیں اپنی پھیلائی ہوئی
آپ ہی سلجھاؤ کا چارا کریں

یہ تسلسل کے مسلسل دائرے
گھومتے ہی جائیں تو ہم کیا کریں

چاہیے ہم کو ہوا اور روشنی
در نہیں تو کوئی روزن وا کریں

مسعود اوکاڑوی



ہماری ذات کے دیوار و در سے خوف آتا ہے
وہ کہتا ہے اُسے اپنے ہی گھر سے خوف آتا ہے

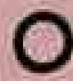
میں اپنے ہاتھ شاید اس لیے آنکھوں پہ رکھتا ہوں
مجھے اِس شہر کے ہر دیدہ ور سے خوف آتا ہے

پلٹ جاتے ہیں پتھر جسم و جاں کی سرحدیں چھو کر
اُنھیں شاید کسی لمبے سفر سے خوف آتا ہے

جڑوں سے ہی اُکھڑ جائے نہ اس منہ زور آندھی میں
پرندوں کو بھی اُس بوڑھے شجر سے خوف آتا ہے

اِسی بنیاد پر قائم ہے اب تک دوستی اپنی
اسے میرے، مجھے اُس کے اثر سے خوف آتا ہے

نکلنا چاہتا ہے توڑ کر دیوارِ جاں باہر
فشارِ خوں کو بھی اندر کے شر سے خوف آتا ہے



کنارے پر کھڑا ہوں اور دریا پار کرنا ہے
اور اس مقصد سے اک پکا گھڑا تیار کرنا ہے

تمھارے واسطے ممکن نہیں اس راہ پر چلنا
تمھیں کوئی منافع بخش کاروبار کرنا ہے

ارادہ ہی نہیں کرنا ابھی ترکِ تعلق کا
جو کرنا ہے تو بعد از کوششِ بسیار کرنا ہے

یہ کیسا خوف سا محسوس ہوتا ہے کئی دن سے
اچانک ہی مرے سائے نے مجھ پر وار کرنا ہے

نکلتا ہے کہاں اُس میں کوئی تعمیر کا پہلو
ترا مقصد دلوں کے درمیاں دیوار کرنا ہے

ڈھنڈورا پیٹنا ہے اُس کو اپنی نیک نامی کا
خبر چھوٹی سی ہے لیکن اُسے اخبار کرنا ہے

اختلافات

محمد کاظم، رشید ملک، جاوید انور، مصطفیٰ کریم
صوفی عبد الرشید، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، عارف محمود،
ارشاد متین، خیر الدین انصاری، سید نور محمد قادری،
رانا غلام شبیر، اسلم راجا، زید اللہ فہیم، نقوی احمد پوری،
لقمان ابو مریم

"فنون" کا نثری حصّہ

ایک زمانے میں "فنون" کا تقریباً ہر شمارہ سید علی عباس جلالپوری کی نگارشات سے مزین ہوتا تھا۔ لیکن اب گزشتہ کئی برسوں سے صورت حال یہ ہے کہ اس رسالے میں آنکھیں ان کی تحریر کو ڈھونڈتی ہی رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو (ان کی علالت، معذوری یا کچھ اور) یہ قارئین "فنون" کے لئے ایک ایسا نقصان ہے جسے میں سمجھتا ہوں آج کا کوئی بھی دوسرا لکھنے والا پورا نہیں کر سکتا۔ ان کے مضامین ان کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہوتے تھے، اور پڑھنے والے کو ان سے بڑی بصیرت دستیاب ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اردو نثر کے ایک شستہ اور منجھے ہوئے اسلوب سے بھی شاد کام ہوتا تھا۔ ان حالات میں یہ غنیمت لگتا ہے کہ اب کے انھوں نے کرم کیا اور "فنون" کے بعض مندرجات کے بارے میں، مختصراً ہی سہی، اظہار خیال فرمایا۔

ابو العلا معرّی والے مضمون کے بارے میں سید صاحب کا خیال ہے کہ یہ رواروی میں لکھا گیا ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل بجا تھا اگر میں نے یہ مقالہ اپنے اسی طرح کے دوسرے مقالوں کی طرح "فنون" کے لئے لکھا ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے تعارفی نوٹ میں بتایا یہ مقالہ دراصل کچھ لوگوں کے سامنے پڑھا جانا تھا، چنانچہ مجھے اس کی طوالت اور اس کے اسلوب کے بارے میں یہ احتیاط ملحوظ رکھنی تھی کہ یہ سننے والوں کے لئے بوجھل اور اکتا دینے والا نہ ہو۔ مضمون کا معرّی والا حصہ جو میں نے پہلے لکھا تھا، قدرے طویل تھا۔ لیکن تقریباً ایک روز پہلے اسے گھر پر پڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یہ سامعین کے لئے صبر آزما ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے کاٹ چھانٹ کر آدھا کر دیا۔ اس احتیاط کے باوجود پورا مقالہ پڑھنے میں ایک گھنٹہ بیس منٹ لگ گئے۔ اور لوگوں نے اسے جس صبر اور توجہ کے ساتھ سنا اس سے لگتا ہے کہ میری وہ ساری احتیاطیں بے جواز نہیں تھیں۔ معرّی پر جو مضمون مجھے "فنون" کے لئے لکھنا ہے وہ زیادہ مفصل ہوگا اور امید ہے کہ موضوع کے بہت سے پہلوؤں کے ساتھ انصاف کرے گا۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ معرّی کی فکر کا جائزہ مجھے زمانۂ ماقبل اسلام کے عربوں کی بے دینی اور بنو امیہ کے زمانے میں اس بے دینی کے احیا کے حوالے سے لینا چاہیئے تھا۔ ان کی یہ تجویز میں ضرور پیش نظر رکھوں گا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں معرّی کی فکر کا تعلق بے دینی کے ان قدیم رویّوں سے زیادہ آزاد خیالی کے اس رویّے سے بنتا ہے جو عربوں کے ہاں پہلے یونانی فکر و فلسفہ کے زیر اثر اور پھر عباسی حکومت کے بڑے مراکز میں مختلف تہذیبوں کے اختلاط اور ان کے تعامل کے نتیجے میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ معرّی کو بے دین کہنے میں مجھے بہت تامّل ہوتا ہے، اس لئے کہ جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جس نے آنحضرتؐ کی مدح میں اشعار بھی کہے ہوں، اور جس نے اپنی عمر کا طویل حصہ اللہ کی تسبیح و حمد میں گزارا ہو، اسے بے دین کہنے کے لئے، میں سمجھتا ہوں، انسان کے پاس کافی وجوہات ہونی چاہئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس زندگی اور انسانی سرشت کے بارے میں اس کے خیالات اسلامی

تعلیمات سے میل نہیں کھاتے، اور مذاہب و ادیان کی رسمی اور ظاہری صورتوں پر اس نے اتنی کڑی تنقید کی ہے کہ بعض لوگ اس سے یہ سمجھے کہ وہ نفس مذہب کے خلاف تھا۔ پھر وہ قنوطیت اور ترک دنیا کا مبلغ ہے، جبکہ اسلام میں ان دونوں رویوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان حالات میں کیا اسے بے دین کہنا اور بے دینی کی اُن قدیم تحریکوں سے متاثر سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا یا اسے ایک ایسا مسلمان قرار دینا جو بعض باتوں میں آزاد خیال (FREE THINKER) اور ایمان و وجدان کے مقابلے میں عقل و خرد کو زیادہ اہمیت دینے والا، یا آج کل کی اصطلاح میں RATIONALIST تھا؟ یہ سوال بہرصورت غور طلب ہے، اور معری کی زندگی اور افکار کا پورا جائزہ لینے کے بعد ہی اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ رہی سید صاحب کی یہ بات کہ اپنے مضمون کے آخر میں مَیں نے "بے چارے معری کو جنت میں لے جانے کی کوشش کی ہے" تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں طبعاً کچھ نرم دل واقع ہوا ہوں، اور مجھے اس لئے یہ تصور وحشتناک ہے کہ اس زمین پر چلنے والی اتنی ساری مخلوق خدا ایک معین یا غیر معین عرصے کے لئے جہنم کا ایندھن بنے گی۔ اس لئے جب میں کسی انسان کی زندگی اور کردار کا جائزہ لیتا ہوں تو اس طبیعت کے باعث یہ توقع کرنے لگتا ہوں کہ اس شخص کے کردار کے اچھے پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے خدا تعالیٰ (جو ہم انسانوں سے کہیں زیادہ رؤف اور رحیم ہے) اُسے بخش دے گا اور اس کا انجام نیک ہوگا۔ پھر معری کے معاملے میں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ایک شخص بے حد ذہین اور حساس ہوتے ہوئے اس دنیا کی زندگی کے اسی برس بے بصری کے گھپ اندھیرے میں گزار دیتا ہے، تو کیا اس کی یہی محرومی اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ دوسری زندگی میں کسی اور وجہ سے نہیں تو تلافی مافات ہی کے طور پر اسے کچھ بہتر حالات میسر ہوں!

عربوں کے ہاں ڈرامے کی روایت کیوں قائم نہیں ہو سکی؟ اس سوال پر گفتگو کرتے ہوئے رشید ملک صاحب نے کسی پچھلے شمارے میں لکھا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامی روایات میں اساطیر یا صنمیات نہیں ہیں، اور جہاں یہ نہ ہوں وہاں ڈرامے اور تمثیل کا فن رواج نہیں پا سکتا۔ مجھے ان کی یہ رائے بہت صائب لگی اور میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے بات کو ذرا اور آگے بڑھایا۔ ملک صاحب کے اُس بیان کے ایک حصے پر سید علی عباس صاحب کو بجا طور پر اعتراض ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ دونوں حضرات (یعنی رشید ملک صاحب اور میں) بابلیوں، اشوریوں، فنیقیوں کی صنمیات کا ذکر تک نہیں کرتے، حالانکہ ان کے یہاں دیوتاؤں بعل، مردوخ، مولک، اتیس اور دیوی عشتار کے اساطیر موجود تھے جو سامی روایات کا حصہ تھے"۔ سید صاحب کی بات بالکل درست ہے اور اس معاملے میں پہلے رشید ملک صاحب سے اور پھر مجھ سے یقیناً بھول ہوئی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ملک صاحب جب سامی روایات کا ذکر کر رہے تھے تو اُن کے ذہن میں ان روایات کی وہ خاص (جنوب مغربی) شاخ تھی جس میں تین بڑے مذاہب: یہودیت، نصرانیت اور اسلام پروان چڑھے۔ سامی روایات کی یہ ایک بہت بڑی اور اہم شاخ ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج جب SEMITISM کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے ایسے خیالات، اور تہذیبی نمونے (IDEALS) مراد لئے جاتے ہیں جن کا تعلق لازماً یہودیت سے ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ سامی روایات میں اشوری، بابلی اور فنیقی شاخیں بھی اتنی ہی اہم اور پُرمایہ تھیں، جن کے اساطیر اور صنمیات میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی چہل پہل دکھائی دیتی ہے، اور اس کے ساتھ جنات اور انسانی ہیروؤں کی بھی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ ان دیومالائی سورماؤں اور دیوی دیوتاؤں کے بارے میں ہم زیادہ نہ بھی جانتے ہوں، ان میں سے کچھ نام تو ہم نے سُن ہی رکھے ہیں، اور ان کی کہانیاں اور واقعات بھی شاید ہماری نظر سے گزرے ہوں۔ ایک نام مثلاً گل گامش ہے جو اشوری، بابلی اساطیر کا مشہور ترین ہیرو اور بابلی ادب کی شاہکار ایک رزمیہ نظم کا موضوع ہے۔ اس نظم کے

مطابق ایک جنگ میں فتح پانے کے بعد گل گامش نے جب اپنے جسم سے خون دھو کر صاف کیا، بال سنوارے اور لباس فاخرہ زیب تن کر کے تاج اپنے سر پر رکھا تو دیوی عشتار اسے دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئی اور اسے دعوت دی کہ آؤ اور مجھے اپنی زوجیت میں لے لو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو:

میں تمہارے لئے سونے اور لاجورد کا ایک رتھ تیار کروں گی
اور جب تم چندن کی خوشبو میں بسے ہمارے محل میں داخل ہو گے
تو وہ جو تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، آگے بڑھ کر تمہارے قدم چومیں گے

اسی طرح ایک دوسرا نام ایڈونس ہے، جس کا تعلق ویسے تو یونانی دیو مالا سے ہے۔ لیکن اپنے کردار میں وہ فنیقی ہی سمجھا جاتا ہے اور اس کا نام بھی سامی زبان کے ایک لفظ ADON سے مشتق ہے جس کے معنی تھے "میرا مالک، میرا آقا"، اور اس کی موت کا تہوار جو فصل کٹنے کے بعد منایا جاتا تھا، فنیقی تہواروں میں سب سے خوبصورت اور پُر رونق سمجھا جاتا تھا۔ ایڈونس حسن و شباب کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ جس پر بیک وقت دو دیویاں: افرودیتہ اور پرسی فون دل و جان سے فدا تھیں۔ انگریزی کے مشہور رومانی شاعر شیلی کے سامنے یہ دیومالائی کردار تھا جب اس نے ایڈونس کے عنوان سے اپنے ہم عصر شاعر کیٹس کی جواں موت پر ایک نظم لکھی جو انگریزی زبان کے چند بہترین مرثیوں میں شمار ہوتی ہے!

تو رشید ملک صاحب کو کہنا در اصل یہ تھا کہ عربوں کا تعلق چونکہ سامی روایت کی اُس شاخ سے تھا جس آسمانی کتابیں تو تھیں اور رسول اور انبیاء بھی تھے، لیکن اساطیر اور صنمیات نہیں تھیں، اس لئے ان میں ڈرامے کی روایت قائم نہ ہو سکی۔ لیکن بات کی دھن میں ان کو یہ خیال نہ رہا اور انھوں نے سامی روایت کے ایک جزو کا حکم اس کے کل پر لگا دیا، جو صحیح نہیں تھا —— ہم دونوں کو سید علی عباس صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس فروگذاشت کی طرف ہماری توجہ مبذول کی!

"فنون" میں اب کے افسانوں کا شعبہ بہت آباد اور بارونق دکھائی دیتا ہے۔ اکثر افسانے دلچسپ اور اپنے اندر موضوع اور اسلوب کی رنگارنگی لئے ہوئے ہیں، یوں تو اس شمارے کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی بات مل جائے گی تاہم ان میں سے بعض افسانے ایسے ہیں جن کا میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا۔ رام لعل کا "بکھیڑا" ایک ایسی کرداری کہانی ہے جس میں ایک اچھے سفرنامے اور ایک اچھے افسانے کی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ رام لعل کے اسلوب افسانہ نگاری کی خاص بات ان کا رسیلا پن ہے جو ان کے اس افسانے میں موجود ہے۔ حسن منظر کی "او پروائی" اگرچہ ایک پامال موضوع پر ہے لیکن اس کے دو کرداروں کا مشاہدہ جس انداز سے کیا گیا ہے اس میں بڑی سچائی اور کھرا پن ہے۔ یہ اُس خاص طبقے کی کہانی ہے جسے ہم اپنے معاشرتی وجود کا ایک حصہ سمجھنے پر تیار نہیں ہیں۔ جبر و استحصال یوں تو ہمارے ہاں ہر سطح پر موجود ہے لیکن اس طبقے میں اس کی صورت اور بھی گھناؤنی شکل میں سامنے آتی ہے جہاں ایک عورت کی زندگی کے روزمرہ معاملات او پروائے کی طرح کوئی "او پروائی" طے کرتی ہے۔ اس سے اگلی کہانی "شکایت" میں رفعت مرتضیٰ نے ایک بے حد نازک موضوع پر اپنے افسانے کا تانا بانا بُنا ہے جو نفسیات انسانی کی ایک خاص الجھن ELECTRA COMPLEX کی طرح کوئی چیز لگتی ہے۔ الیکٹرا الجھن میں ایک بیٹی اپنے باپ سے اس طرح مانوس ہوتی ہے کہ صنف مخالف میں وہی اس کا آئیڈیل بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بیٹی اور اس کی ماں کے درمیان شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کہانی کے آخری حصے میں کچھ ایسی ایمائیت سے کام لیا گیا ہے کہ کم از کم میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصل بات صحیح طرح سے سمجھ پایا ہوں۔ یہ ایمائیت شاید موضوع کی نزاکت کا تقاضا تھی۔

اس شمارے کی سب سے اچھی کہانی میرے نزدیک "قبر" ہے جو پڑھنے والے پر ایک گہرا اور انمٹ اثر چھوڑتی ہے۔ غلام محمد "فنون" کے پرانے لکھنے والے ہیں، اور اُس دیس کے (جو ایک زمانے میں پاکستان کا ایک حصہ تھا) دبے ہوئے، اور مجبور و بے بس طبقے کی زندگی کی عکاسی جس طرح سے وہ کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس دفعہ "فنون" میں دو علامتی کہانیاں ہیں اور دونوں ہی اچھی اور سلیقے سے لکھی ہوئی ہیں طارق محمود کی "مخبر"، اور اسد محمد خاں کی "بُرجِ خموشاں" یہ دونوں سمجھ میں آنے والی کہانیاں ہیں اور ان کے بارے میں مزید کچھ کہنا قارئین کی ذہانت کے بارے میں شک کرنے کے مترادف ہوگا۔ خورشید رضوی بنیادی طور پر شاعر ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ تبصرہ نگاری بھی کرتے ہیں اور عربی زبان میں ٹھوس تحقیقی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ اب کے انھوں نے افسانہ نگاری کے سمندر میں قدم رکھا ہے، اور پہلی ہی جست میں گہرے پانی میں چلے گئے ہیں۔ ان کی کہانی "سائن بورڈ" انسانی رشتوں کی ایک ایسی نازک اور اندرونی صورت کے بارے میں ہے جس پر بربنائے مصلحت ہمیں کوئی نہ کوئی سائن بورڈ لگائے رکھنا پڑتا ہے لیکن یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ خورشید رضوی نے اس کہانی میں جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ بڑے اچھے طریقے سے کہہ دیا ہے، اور اپنا سر پانی سے اونچا ہی رکھا ہے۔ ان کا پیرایۂ اظہار بھی دلچسپ اور خوبصورت ہے، اور میرے اس نظریے کی تائید میں ایک اور ثبوت کہ اچھے شاعر اکثر حالات میں اچھی نثر لکھنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں تین افسانے ایسے ہیں جن کی مشترک خصوصیت ان کے لکھنے والوں کی اختصار پسندی اور ان کے جملوں کی دھاردار کیفیت ہے۔ ضیا بٹ کا "عذرا" ان کے دوسرے افسانوں کی طرح ان کے خاص LACONIC سٹائل میں ہے جس میں بات اگرچہ تھوڑے لفظوں میں کی جاتی ہے لیکن وہ جا کر دل میں ترازو ہو جاتی ہے۔ اس طرز میں دوسرے دو افسانے ڈاکٹر طارق عزیز کا "شیشے پر کراس" اور عبدالوحید کا "آخری سطر" ہے۔ "شیشے پر کراس" ہمارے معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور بے چارگی پر بڑی جاندار تحریر ہے اور اس کے بعض فقروں میں منٹو کے فقروں کی طرح کی بے باکی اور کٹیلا پن ہے۔

افسانوں کے علاوہ اس شمارے کی نثری تخلیقات میں مسعود مفتی کا رپورتاژ "ہم نفس" گہرے احساس کے ساتھ لکھی ہوئی ایک اعلیٰ پائے کی تحریر ہے۔ بہت دلچسپ، معلومات افزا اور اپنے اندر شروع سے آخر تک دردمندی کی ایک زیریں لہر لئے ہوئے۔ اس لئے کہ اس میں اپنے اُس دیس کا تذکرہ بھی ہے جو اب اپنا دیس نہیں رہا، اور مشرقی پاکستان مسعود مفتی کا OBSESSION ہے۔ میں "ہم نفس" کو "فنون" کے اس شمارے کی خاص چیز کہوں گا جو ایک سے زیادہ بار پڑھی جا سکتی ہے۔ دوسری دو تحریریں جن سے قاری بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے "راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات کے تاثرات" (لطیف الزماں خاں)، اور "ریٹائرمنٹ" (ڈاکٹر محمد اجمل) ہیں۔ "راجندر سنگھ بیدی" سے یاد آیا کہ گذشتہ سے پچھلے شمارے میں آپ نے "ساحر لدھیانوی کی کہانی" کی ایک قسط شائع کی تھی جو اس شاعر کے بارے میں بہت کچھ بتاتی تھی۔ اس کی دوسری قسط کیا ہوئی۔ امید ہے وہ اگلے شمارے میں ضرور دی جائے گی۔ طارق محمود کے ناول "اللہ میگھ دے" پر امجد اسلام امجد نے جو تبصرہ کیا ہے۔ میں اس سے حرف بہ حرف متفق ہوں۔ مشرقی پاکستان کے آخری زمانے کی صورت حال کے بارے میں یہ بہت اچھا اور سچا ناول ہے، اور پڑھنے والے کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے بہت سا مواد دیتا ہے، لیکن اس میں شروع سے آخر تک رموز اوقاف (PUNCTUATION) کے ساتھ جو آزادی برتی گئی ہے، اور جگہ جگہ زبان و محاورے کے معاملے میں جو بے احتیاطی روا رکھی گئی ہے، وہ پڑھنے والے کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ ناول کو آخر تک پڑھتا چلا جاتا ہے تو یہ اس لئے کہ کہانی بہت فطری انداز میں، اور حقیقت سے قریب رہ کر لکھی گئی ہے۔ امجد اسلام امجد کو اپنے تبصرے میں ناول کے اس پہلو کا ذکر ضرور کرنا چاہیئے تھا کہ ایک اچھے اور مکمل تبصرے کی خصوصیت یہی ہوتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر طارق محمود اپنے اس ناول کے دوسرے ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کر دیں۔

محمد کاظم (لاہور)

اساطیر کا مسئلہ

محترم سید علی عباس جلالپوری کی "فنون" میں واپسی بڑی خوش آیند ہے۔ دیدۂ و دل فرشِ راہ۔ ان کی آمد سے "فنون" کے بہرۂ اختلافات کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ خداوند تعالیٰ ان کی توانائیاں بحال رکھے اور ہمیں، جو ان کے خوشہ چین ہیں، ان سے استفادے کا موقع دے۔

جلالپوری صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ کلدانیوں، آشوریوں، فونیقیوں، بابلیوں اور مصریوں کی اپنی اپنی صنمیات تھیں۔ ان میں سے کلدانیوں اور مصریوں کی اساطیر نے تو روم اور یونان کی اساطیر کو بہت متاثر بھی کیا ہے۔ اس سے تو کسی کافر ہی کو انکار ہو سکتا ہے اس موضوع پر کسی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اور نہ مجھے اس بات کا یارا ہے۔ البتہ چند وضاحتیں بہت ضروری ہیں:-

اساطیر اور صنمیات میں، خواہ بال برابر سہی لیکن فرق ضرور ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ دو مختلف لیکن باہم پیوست موضوعات ہیں تو شاید حقیقت سے بعید نہیں۔ جزیرۃ العرب کی صنمیات پر ابن کلبی کی کتاب "الاصنام" کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے لیکن وہ اساطیر کی کتاب نہیں۔ اس پر مستزاد وہ اساطیر ہیں جن کا ذکر جناب جلالپوری صاحب نے فرمایا ہے لیکن موضوعِ بحث یہ نہیں تھا کہ ان اقوام میں اساطیر ہیں کہ نہیں۔ اصل مسئلہ تو وہ ہے جس کی طرف جبرا نے اشارہ کیا کہ یورپی زبانوں میں نقطۂ عروج کا تصور پایا جاتا ہے لیکن عربی زبان میں اس تصور کا فقدان ہے۔ چنانچہ ڈراما یونان میں پیدا ہوا، وہیں پھلا پھولا اور دیگر یورپی زبانوں میں نفوذ کر گیا لیکن عربی زبان میں پیدا نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ جب سارا یونانی علم عربی زبان میں منتقل ہو گیا تو بھی عرب اور عربی دانوں نے یونانی ڈرامے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ڈرامے کی اصطلاحات یعنی ٹریجڈی، کامیڈی وغیرہ کے عربی تراجم مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ مثلاً ابن رشد ایکٹر کا ترجمہ "منافق" کرتا ہے۔ راقم کا مطالعہ محدود ہے۔ اس لئے قیاس دوڑا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ جو نکتہ ہاتھ آیا وہ قارئینِ "فنون" کی نذر کر دیا۔ اب جب کہ ان موضوعات کا مطالعہ شروع کیا تو اپنے حق میں شہادت بھی دستیاب ہو گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مذہب، فلسفہ، تاریخ، سائنس، ادبِ عالیہ اور تمام فنون کی جڑیں اساطیر ہی میں ہیں۔ ڈرامے کے بارے میں ایک محقق کی رائے درج ہے:-

> Myth is one of the principal roots of drama. Even in the very "literary," refined tragedies of classical Greece this is clear, not only because of the many mythological subjects treated and the setting of the performances (organized by the city-state at the festival of Dionysus) but especially because of playwrights', such as Aeschylus', mythlike presentation of events and facts, which may be interpreted in various ways like myth, "at once moral, religious, and purely human," and relating to the community as a whole. The citizens made up the chorus, the crucial part of early Greek tragedy. Theodor Gaster, an American historian of religion, has shown in detail that in the ancient Near East the interrelationship of myth and ritual created drama. Elsewhere, dramatic presentations (as in Japanese No plays and the Javanese wayang) are similarly rooted in myth. Western distinctions between "religious" and "entertaining" have a very limited value here. E.B. 12 p.799

اساطیر کے باقی علوم خصوصاً بصری اور سمعی فنون سے تعلق کے لئے علاوہ دیگر کتب کے کیسرر کی "دی فلاسفی آف سمبالک فارم" جلد دوم جس کا ذیلی عنوان "میتھیکل تھاٹ" ہے، دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے ص ۱۷ × اور ص ۳۰ پر فٹ نوٹ نمبر ۲ بڑے دلچسپ اور فوری عقدہ کشائی کے لئے سود مند

ہیں. ویسے اساطیر کے وسیع مطالعے اور دیگر علوم و فنون سے ان کے تعلق کے بارے میں یہ کتاب ناگزیر ہے۔

رگ وید کی طرح سامی روایت میں عہد نامۂ عتیق اساطیر کا سب سے بڑا خزانہ ہے. لیکن ان مذاہب نے جو سامی روایت کی پیداوار ہیں، ان اساطیر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا. یہاں تک کہ یہودی جو اس صحیفے کے حامل تھے صرفِ نظر کرتے رہے. مذکورہ محقق کی رائے اس بارے میں درج ہے،

The relation of myth to the sacred texts of the great religions naturally depends on the character of the religion in question. The Old Testament contains much mythological material, yet the religion of Israel was in many respects critical of myths in the same manner in which it rejected any representation of God in natural forms. Similar antimythological tendencies exist in the religions that have their roots in Israel. The New Testament of Christianity in some instances derogates myths by describing them as "godless" and "silly." Islam's emphasis on the transcendence of God, attested in the Qur'an, is strongly antimythological. Many scholars have pointed out, however, that all these antimythological tendencies are correlated to mythological motifs, especially motifs concerning the end of time (eschatology). In other traditions with sacred scriptures, such as Hinduism and Buddhism, opposition to myths is not dominant. E.B. 12, p.798

اساطیر سازی انسانی فطرت میں پیوست ہے. یہ ایک خاص شعور ہے جو ہمارے تجرباتی شعور سے مختلف ہے. اس کی مختلف جہات ہیں. اور یہ آج بھی اساطیر سازی میں سرگرمِ عمل ہے. ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری بنائی ہوئی اساطیر ہمیں خود نظر نہیں آتیں. البتہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں ہزاروں سال بعد ان کا کھوج آسانی سے لگا سکیں گی۔

محمود شبستری کی "گلشنِ راز" کا سراغ جناب شریف کنجاہی صاحب نے لگایا اور اس پر اقبالؒ کے حوالے سے سیر حاصل تبصرہ کیا. کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اسے قارئینِ "فنون" کے لئے "فنون" میں ہی سلسلہ وار چھپوا دیں. اقبال شناسی کی طرف یہ ایک مثبت قدم ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل کی "ریٹائرمنٹ" بہت دلچسپ ہے. انسانی زندگی میں یہ ایک ناگزیر مرحلہ ہے. اور اس کے تاثرات کو ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی سے اپنی گرفت میں لیا ہے. انسانی شعور کے بارے میں خیالات میرے لئے بصیرت افروز تھے اور میں نے انھیں استعمال بھی کیا ہے جس کے لئے میں جناب ڈاکٹر محمد اجمل اور ادارۂ "فنون" کا ممنون ہوں. یہ اعلان پیشگی ہے اور بروقتِ اشاعت اس کا اعادہ بھی کر دیا جائے گا۔ رشید ملک (لاہور)

گذشتہ شمارے کا حصۂ نظم

اردو نظم جس کی کہانی نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی سے ہوتی ہوئی اقبال، اختر شیرانی، جوش اور حفیظ تک پہنچی اور راشد، میرا جی، فیض، ندیم اور مجید امجد کے لہجے اپنے دامن میں لئے جس پیش منظر کا پس منظر بنی وہ تازہ "فنون" کے حصۂ نظم میں پوری توانائی سے جگمگا رہا ہے. اختر حسین جعفری سے لے کر حسین عابد تک ایک پورا عہد ——— بھرپور آوازوں کی ایک گونج ——— اور ہر آواز اپنا الگ لب و لہجہ لئے ہوئے. اگرچہ کچھ بہت باریک بین قسم کے حضرات کسی بھی نظم میں کسی فیض یا ندیم یا راشد کی ملاوٹ ڈھونڈ سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ کس آفتاب اقبال شمیم میں کتنے فیصد شمیم کتنے فیصد اقبال اور کتنے فیصد آفتاب بذاتِ خود ہے. لیکن مجھے فی الحال اس قسم کے حساب کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں اور مجھے تو ویسے بھی سارا بڑا ادب، بیان سے لے کر طرزِ بیان تک پہلو مارتا ہوا نظر آتا ہے ——— حافظ، غالب، ایلیٹ، اختر حسین جعفری ——— مجھے تو سب ایک دوسرے کے رشتے دار لگے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات "تازہ فنون" کے حصۂ نظم کی کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے جس نظم کی بات کروں گا وہ خالد احمد کی نظم ہے "لحد تیار ہے"۔ یہ نظم خود پر بہت کچھ لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ لکھواتی ہے اور پھر کٹواتی ہے۔ اتنی سچی اور اتنی خوبصورت نظم کے لئے اتنے سچے اور اتنے خوبصورت لفظ ہی نہیں مل رہے۔ کیا کروں؟ دو تین لائنیں اس نظم کی بہرحال ضرور نقل کروں گا (جی تو پوری نظم نقل کرنے کو چاہ رہا ہے!)

لحد تیار ہے، بیٹوں کی آنکھیں خشک ہیں، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ آئے ہیں
کسی سوچا، جنازے کون تنہا رے کے قبرستان پہنچا ہے

سچے کھرے جذبے، سوندھے سوندھے لفظ اور جذبوں کو رنگ پہناتا ہوا آہنگ اب خالد احمد کی شاعری کی پہچان بن چکے ہیں اور یہ نظم تو اپنی رسائی میں انتہائی کمال کی نظم ہے۔ جسے پڑھ کر کم از کم مجھے تو آنکھوں پر پپوٹوں کے بند باندھنا پڑے۔

"آئینہ خانہ" سے اب تک جبر کا ایک خاص ماحول اختر حسین جعفری کی نظم کے اجتماعی مزاج کا بنیادی جزو بنتا ہے۔ ایک موسم جس میں عیسیٰ سولی سے اترے تو اپنی خبر اپنے الہام سے شرمندہ ہوتا ہے اور جہاں پرندوں کو آبِ وضو نہیں ملتا۔ "دستہ دستہ ابر اترے گا" کے بنیادی کردار راون اور سیتا ہیں یعنی مظلوم، مظلوم تر ہو گیا ہے کہ صنفِ نازک بھی ہے (FEMINISTS سے معذرت کے ساتھ!) جعفری صاحب کے ہاں "آئینہ خانہ" کے بعد کی نظموں میں ہیئت کی ایک خاص تبدیلی کے ساتھ جو چیز اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ جبر کی اس تاریک فضا میں امید کا وہ ستارہ ہے جو "ناشپاتی کا پیڑ مجھ کو بلا رہا ہے"، "جل تھل گھاس سے پیر بہوٹی نکلے گی" اور "نعرہ ہائے ہیا ہو ہیا" بن کر چمکتا ہے۔ "سخن درماندہ ہے" کا چوتھا کینٹو اگلے کینٹوز کے انتظار کی آگ کو اور تیز کرتا ہے۔

ضیا جالندھری کی نظم "مادام" کی تین لائنیں دہرانے کی اجازت چاہوں گا:

اُسے گفتگو کا سلیقہ بھی ہے، شعورِ لذتِ لفظ بھی
وہ بیان و لہجہ کی چاشنی
کہ دل و نظر ہمہ اشتیاق، سماعتیں ہمہ تشنگی!

احسان اکبر کی نظم "کوئی وابی پور کماوکی" کو روایتی پنجابی لہجہ اور آہنگ ایک اضافی حسن عطا کرتا ہے۔ اقبال کوثر اپنی نسل کے، اپنا مخصوص اور خوبصورت لہجہ رکھنے والے چند ایک شعرا میں سے ایک ہیں۔ دھیما دھیما، میٹھا میٹھا اور درویشانہ سا "چلو اچھے ہیں ہم" اقبال کوثر کی بہت ساری اچھی نظموں میں ایک اور بہت اچھی نظم ہے۔ شاہین مفتی کی دونوں نظمیں بے یقینی کے ساحل پر کھڑے عہدِ حاضر کے آدھے آدمی (یا آدھی لڑکی) کی نظمیں ہیں جس کا دکھ آدھی آنکھ اور آدھا سپنا ہے۔ جس کی جبیں سجدہ گاہِ وقت میں سنگِ در ہو گئی مگر ہونٹوں پر حرفِ دعا نہیں۔

"میری نظم اور میرے درمیان ایک اور نظم" ایوب خاور کی ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ ایوب خاور بلاشبہ اپنی نسل کے ایک دو اہم ترین اور ذہین ترین شعرا میں سے ایک ہیں اور وہ ایک مختصر عرصے میں اپنا ایک الگ اور مخصوص انداز بنا چکے ہیں۔ انھیں ان کی شعری لغت اور ہیئت باقی نظم نگاروں سے جدا کرتی ہے بخصوصاً ان کے ہاں CONTINUOUS LINE جذبے کو جو بہاؤ عطا کرتی ہے وہ یقیناً کسی اور کی نظموں میں نہیں ملتا۔ صبحِ زرد کی بے ترتیبی سے خالی شام تک اور شام سے صبحِ زرد تک درد کے پتھروں سے سر ٹکراتی ان کی یہ نظم بھی ایک ندی کا سا بہاؤ رکھتی ہے اور یہ میرے عہد کے اس حساس ذہن کی کہانی ہے جو دفتر جانے، سارے ضروری اور ادھورے کام مکمل کرنے کی خواہش کو ناشتہ دان میں بھر کر گھر سے باہر قدم رکھتے ہی خود کہیں اور نکل جاتا ہے، راہ کہیں اور رہ جاتی ہے۔

ناہید قاسمی کی نظموں کی خصوصیت معصومیت اور حیرت بھرا وہ لہجہ ہے جو انھیں شاعرات میں ایک علیحدہ مقام عطا کرتا ہے۔"نرمی" اور "جواب" اسی لہجے کی بہت کامیاب اور خوبصورت نظمیں ہیں۔"کونے والے" ایک بڑے پس منظر اور ایک بڑے دکھ کی نظم ہے لیکن اسی شیتل لہجے میں۔ دیکھیں:

'ہم بھی ایک اکیلی آہ کا بجھا دیا ترے پاؤں میں رکھ کر لوٹ آئے'
'اب تیرا سوئی بھی اپنی نازک پوروں سے کانٹے چنتا جاتا ہے'

بنجمن مولائسس کی ماں کے نام"کے بعد" استغفار" اور" مرے درد آشنا لمحو" منصورہ احمد کی دو بہت پیاری نظمیں ہیں۔ یہ دونوں نظمیں روایات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک تنہا ذات کا نہیں پورے معاشرے کا دکھ ہے جس میں تتلیوں کی صدا جھینگر کا گیت بن جاتی ہے۔ اور جہاں گلے لگ کر رونے کے لئے درد آشنا لمحوں سے بہتر آشنا میسر نہیں آتا۔

"بات شناسائی کی" کے عنوان سے درج راشد مراد کی نظمیں اس عہد و پیمان اور اس وصل و ہجر کی سرگوشیاں ہیں جس کے چھوٹے چھوٹے سچ اور چھوٹے چھوٹے جھوٹ کبھی کبھی تو زندگی کا سب سے بڑا سچ لگتے ہیں اور خصوصاً یہ نظمیں پڑھ کر۔

حسین عابد وہ خوش نصیب نوجوان ہے جس کی پہلی ہی نظم نے محمد کاظم کے سے ادب کے نباض کو نہ صرف اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ "اختلافات" کو اُن کے ایک خوبصورت خط سے بھی نو[illegible]۔ اس دفعہ بھی حسین عابد کی "کافی" وہی جادوئی قسم کا اثر لئے ہوئے ہے۔ جذبے میں گندھی ہوئی [illegible] ایک سچی نظم۔

"نمائش گاہ" میں آپ نے اتنا بڑا اور سفاک سچ جس خوبصورت انداز میں سجایا ہے یہ یقیناً آپ ہی کا کمال ہے۔"یقین نہیں آتا" صرف ایک بہت پیارے دوست کی موت پر، صرف ایک آدمی کے جذبات نہیں، ایک بڑی اور بھرپور نظم ہے۔

وہ جو برسوں پہلے ایک انسان ادھر سے گزرا تھا
وہ میرا دوست تھا
جو اب برسوں بعد ادھر سے کچھ یوں گزرے گا
جیسے وہ پہلی بار ادھر سے گزرا ہے

اتنی آسانی سے اور اتنے سادہ لفظوں میں اتنی خوبصورت بات کہہ جانے کا ڈھنگ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ ادا جعفری، عزیز حامد مدنی، رحمان فراز، امجد اسلام امجد، قاسم نقوی، عباس تابش، افتخار بخاری، علی اصغر عباس، اعجاز رضوی، غافر شہزاد اور قمر رضا شہزاد کی نظمیں بھی اپنا ذکر کرنا مانگتی ہیں۔ لیکن یہ قرض کل کے نام کر کے میرا ہاتھ اب قلم چھوڑ کر آرام کرنا مانگتا ہے۔ سو خدا حافظ!

جاوید انور (لاہور)

افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش

"......اردو افسانے میں فلسفہ، یہ سب تو ہو چکا اب ذرا واقعہ بیان ہو جائے" (افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش، شمس الرحمن فاروقی، فنون، نومبر، دسمبر ۸۶ء) محترم نقاد نے بیان واقعہ کو اردو افسانے کا نیا پن لکھا ہے۔ یعنی ایسے واقعہ کا بیان جس میں کردار نہ ہو۔ یہ غیر ممکن ہے کہ کسی افسانے میں کردار نہ ہو۔ اب تک اردو میں شیر، لومڑی، مچھلی، مرغی، گھوڑے پر افسانے نہیں لکھے گئے اس لئے جو بھی افسانہ قاری نے

پڑھا ہے یا پڑھے گا اس میں اسے انسان ہی کا کردار نظر آئے گا۔

اس لئے شمس الرحمٰن فاروقی کے استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو نئے اردو افسانے میں واقعات کے ساتھ کردار ضرور ہوں گے لیکن ان کی اہمیت کوئی خاص نہیں ہوگی۔ یہ تو کوئی نیا نکتہ نہیں۔ افسانے میں یا تو واقعات کی اہمیت ہوتی ہے یا کرداروں کی۔ اور کبھی کبھی دونوں ہی اہم ہوتے ہیں۔

میں بصد احترام عرض کرنا چاہوں گا کہ بیان واقعہ کو اردو افسانے کا نیا مزاج کہنا سراسر غلط ہے۔ اردو کے چند معرکۃ الآرا افسانوں میں صرف واقعات ہی ہیں۔ مثال کے طور پر "سرخ مکان" (مسعود شاہد)، "آنندی" (غلام عباس)، "کاش میں لڑکا ہوتی" (سنتوکھ سنگھ سیکھوں)، "پھول دو" (منٹو)، "ان داتا" (کرشن چندر)، "گرم کوٹ" (بیدی)، "لحاف" (عصمت چغتائی)، "ٹیبل لینڈ" (خدیجہ مستور مرحومہ یا ہاجرہ مسرور۔ نیا دور فسادات نمبر)۔ ان سارے افسانوں کی عمر چار دہائیوں سے اوپر ہے۔ اس کے باوجود بیان واقعہ کو اردو افسانے کا نیا پن کہا جائے تو اسے میں زیادتی کہوں گا۔ اور یہ بھی بڑی زیادتی ہوگی اگر نقاد حضرات ان افسانوں میں کرداروں کے خارجی اور داخلی حالات کی جستجو کریں اور انہیں اپنی جانب سے گھڑ کر ان افسانوں کے اعلیٰ صفات میں شامل کریں —— ان افسانوں کے نام محض ان مخصوص واقعات کی وجہ سے مجھے یاد ہیں جن کے بغیر ان افسانوں کا لکھنا محال تھا۔ ان افسانوں کو پڑھے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو چکا ہے ورنہ عین ممکن تھا کہ میں وہ سات نکتے جنہیں شمس الرحمٰن فاروقی نے واقعاتی افسانے کے لئے بھی جزویات تسلیم کیا ہے" ان تمام افسانوں میں گنا دیتا۔

پریم چند کا جس تضحیکی انداز میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ذکر کیا ہے وہ نامناسب ہے اور معیاری مضمون کو زیب نہیں دیتا۔ پریم چند کے افسانوں میں بھی واقعاتی نوعیت کے افسانے مل جائیں گے۔ ایک افسانہ میں خاص طور پر قابل ذکر سمجھتا ہوں۔ افسوس مجھے اس افسانہ کا عنوان یاد نہیں۔ افسانہ کا خلاصہ یوں ہے کہ ایک غریب دادی اپنے یتیم پوتے کو عیدگاہ جاتے وقت چند پیسے دیتی ہے تاکہ وہ اپنے لئے مٹھائی یا کوئی کھلونا عیدگاہ میں خرید لے۔ بچہ نماز کے بعد کھلونے اور مٹھائیاں ضرور للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن دادی کے دیئے ہوئے پیسوں سے توے پر روٹیاں پلٹنے کے لئے ایک چمٹی خرید کر گھر واپس آجاتا ہے۔ غریب دادی بڑے ارمان سے پوچھتی ہے کہ کیا خریدا؟ جب بچہ چمٹی پیش کرتا ہے تو دادی خفا ہو جاتی ہے اور اس کی نادانی کی وجہ پوچھتی ہے۔ بچہ بڑی معصومیت سے جواب دیتا ہے "دادی اماں روٹیاں پکاتے وقت تمہاری انگلیاں جو جل جاتی ہیں۔"

ایک بچے کی معصوم محبت کا دردمندانہ اظہار اس سے بہتر شاید ہی اردو افسانے میں دوبارہ نظر آیا ہو۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" کے ایک حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ یہاں بیدی نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی عرض کردوں کہ اچھے افسانے میں مؤثر واقعات یا کردار کا تاثر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ مصنف نظر نہیں آتا۔ قاری کی حس پر واقعات اور کردار چھا جاتے ہیں اور وہ انہی کی بابت سوچتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بدیعیات کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کردوں۔ افسانے کے سلسلے میں جدید بدیعیات (RHETORICS) کا اطلاق اس طرح ہوگا —— افسانہ نگار کو ایسے طریقے استعمال کرتا ہے جس کے ذریعہ قاری کا فکری نظام مزید وسیع اور مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں فکری نظام سے میری مراد وہ مخصوص تاثرات ہیں جو افسانے کے مخصوص واقعات کی بابت یا کرداروں کی بابت قاری کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سنجیدہ قاری اگر منٹو کے کسی افسانے کو پڑھنا شروع کرے تو اسے افسانے میں کسی سنجیدہ موضوع کی توقع ہوگی۔ قاری کے ذہن میں شرافت کا تصور بھی ہوگا اور یہ بھی یقین ہوگا

کہ شرافت اور نیکی کسی ایک شخص یا طبقہ کی میراث نہیں ہوتی۔ اور جب یہ قاری "موذیل" پڑھے گا تو شرافت کی بابت اس کا یقین اور بھی مستحکم ہو چکا ہوگا

جب بدیعیات کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ بدیعیات یا اسلوب وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے مصنف اپنے افسانے سے قاری کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ اس میں پلاٹ کا منطقی ارتقا، تشبیہ، استعارے، علامتیں، مکالمے، نیم مکمل جملے، غیر مرئی ہستی کو انسانی خوبی دینا، فلیش بیک، منظر اور پس منظر، مبالغہ سب ہی کچھ آ جاتا ہے۔

بدیعیات دراصل طرزِ تقریر کا علم ہے۔ بدقسمتی سے تقریر میں، اصرار کے جزو کو جو اہمیت حاصل ہے اسے مختصر افسانے میں بھی جذب کر لیا گیا اور وہ اب بھی معیاری رسالوں کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ مختصر یا طویل افسانے بلکہ ناول بھی تکرار یا اصرار کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بلکہ مختصر افسانے میں بہت سارے پہلو محض ہلکے سے اشارہ سے واضح کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر اہم بات تو کہی نہیں جاتی مثال کے طور پر منٹو کا افسانہ ڈرپوک ـــــ ندیم کا پرمیشر سنگھ۔

اگر واقعاتی افسانے کو نیا نہیں کہا جائے گا تو پھر افسانے میں جدید کیا ہے؟ اس کا آسان جواب وہی ہے جسے احمد ندیم قاسمی نے "فنون" کے غزل نمبر میں غزل کی بابت لکھا ہے۔ یعنی نئی فکر، نیا اسلوب، نیا طرزِ بیان۔ ہر ملک اور ہر معاشرے کی فکر مختلف ہوتی ہے اور اس فکر کو اسی ملک اور معاشرے کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ جب ہی وہ فکر نئی نظر آئے گی۔

اسی طرح نئے اسلوب کا تعلق قاری کی فرصت اور طلب سے ہے۔ جس وقت قاری کا طبقہ وسیع ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کی طلب بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ ایک مخصوص اندازِ بیان سے تھک جاتا ہے۔ اس کی طلب کے پیشِ نظر مصنف نئے تجربے کرتا ہے نیز اس مصنف کے پاس وہ ذرائع بھی ہوتے ہیں جن کی مدد سے بغیر مالی نقصان برداشت کئے، مصنف اپنے قاری کے سامنے ایسی تخلیق کرتا ہے جسے جدید کہنے میں کسی کو کوئی عذر نہیں ہوگا۔ قاری کا طبقہ کیوں کثیر اور قلیل ہوتا ہے اس کی وجہ معاشرتی ہے اور میں اس بحث کا آغاز کرنا نہیں چاہتا۔

نیا طرزِ بیان کی واضح مثال شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون میں موجود ہے۔ قاری اگر بیدی اور انور خاں کے افسانوں سے لئے گئے حوالوں کا موازنہ کریں تو یہ بخوبی عیاں ہو جائے گا کہ انور خاں کا طرزِ بیان نیا اور جدید ہے۔ ان حوالوں میں کون بہتر ہے اس کا فیصلہ کرنا ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

مصطفیٰ کریم (انگلستان)

"منشورِ ہوا"

"فنون" کے تازہ شمارے میں محترم ڈاکٹر صابر آفاقی 'منشورِ ہوا' کی ترکیب پر معترض ہوتے ہیں۔ اس باب میں ان کا ارشاد ہے کہ یہ "صحیح ترکیب نہیں ہے۔ ہوا فارسی میں موسم اور خلا کو کہتے ہیں۔ ہماری ہوا کو وہ (فارسی والے) باد کہتے ہیں۔ عربی میں ہوا عشق کو کہتے ہیں۔ اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کے علاوہ اور کسی لفظ کی اضافت جائز نہیں ہے" ـــــ میں یہاں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ وہ درج ذیل اشعار پر غور فرما لیں۔

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی ۔ شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی (میر تقی میرؔ)

ہوئے صبح یک عالم گریباں چاکِ گل ہے ۔ دہانِ زخم پیدا کر اگر کھاتا ہے غم میرا (غالبؔ)

بلبل کو بھی نہیں ہے، دماغ صدائے گل — بگڑی ہے تیرے دور میں ایسی ہوائے گل (شیفتہ)

اُٹھ صبح ہوئی، مرغ چمن نغز سرا دیکھ — نورِ سحر و حسنِ گل و لطفِ ہوا دیکھ (شیفتہ)

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے (اقبال)

نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر (اقبال)

اس وقت میرے سامنے عربی لغت کی کوئی بڑی کتاب تو نہیں، البتہ فیروز اللغات (عربی اردو) موجود ہے، اس میں لفظ ہوا کے ذیل میں جو مختلف معنی بتائے گئے ہیں وہ سارے کے سارے میں یہاں نقل کرنے سے قاصر ہوں چند مقامات دیکھ لیجیے:

(۱) ہوی (ج) اہواء : دلی خواہش۔ محبت۔ فریفتگی۔ جو چیز چاہی جائے۔

(۲) ہوی (ص) ہُویّاً : (زخم کا) پھوڑا ہونا۔ (چیز کا) نیچے گرنا۔ (آدمی کا) مرنا۔ (عقاب کا) شکار وغیرہ پر جھپٹنا۔ (ہوا کا) چلنا — وغیرہ

(۳) ہواء (ج) اَہویۃ : ہوا۔ فضا۔ خلا۔ موسم۔ آب و ہوا۔ بزدل۔ خوف سے ڈرنے والے (دل)

(فیروز اللغات: عربی اردو: اشاعت ۱۹۶۱ء صفحہ ۸۰۶)

ڈاکٹر صاحب فارسی کے متخصص ہیں اور عمرِ گرانمایہ کا ایک حصہ ایران میں بسر کر چکے ہیں۔ فارسی میں شعر بھی کہتے ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ و محاورات کے بارے میں تحقیق بھی کی ہوگی اور اس نوع کے محاورات یقیناً ان کے ملاحظے سے گزرے ہوں گے۔

ہوا شدن، ہوا یافتن، ہوا پیمودن، ہوا خوردن، ہوا بیختن، ہوا گرفتن، ہوا در گرہ بستن۔

میں خیال کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب 'ہوا دار'، 'ہوا پیما'، اور 'ہوا سنج' کی حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے اور ان میں معنی کی جو سطحیں ہیں، ان پر بھی ان کی نظر ہوگی۔ ہوا خوری ہمارے محاورے میں عام ہے بلکہ معمولات میں شامل ہے۔ ہوا بمعنیٰ 'باد' کا موسم اور فضا سے تعلق ظاہر و باہر ہے۔

لفظ 'روزن' کے باب میں مجھے ڈاکٹر صاحب سے اتفاق ہے۔ غالب کہتے ہیں:

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

"فنون" کے شمارہ ۲۵ (نومبر، دسمبر ۱۹۸۶ء) میں محترمہ میمونہ وحید کا مقالہ "پطرس بطور دیباچہ نگار" پطرس کے کارنامۂ فن کے ایک پہلو کا معقول جائزہ ہے۔ اس میں ایک کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ پطرس نے ۱۹۳۵ء میں علامہ میر ولی اللہ مرحوم کے اردو مجموعۂ کلام "گلبانگ" کا دیباچہ تحریر کیا تھا جو ان کے اسلوبِ تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ محترمہ میمونہ وحید کے مقالے میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیباچہ مذکور کا حوالہ دیے بغیر پطرس کے بارے میں اس نوع کا کوئی بھی جائزہ مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صوفی عبدالرشید (ایبٹ آباد)

مسائلِ موسیقی

مسائلِ موسیقی پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب منیر احمد شیخ نے موسیقی کے بارے میں چند بنیادی سوالات اٹھائے ہیں۔ میں اس فن سے

پچھلے اٹھائیس سال سے عملی اور علمی طور پر وابستہ ہوں اور یہ سوالات میرے زیرِ غور رہے ہیں۔ ان سوالات میں سے اہم ترین سوال "پاکستان میں فنِ موسیقی کا زوال" ہے۔ میں نے اس زوال کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کے نتائج "فنون" کے توسط سے جناب منیر احمد شیخ اور "فنون" کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

موسیقی کے اس زوال کے ذمہ دار وہ افراد اور وہ ادارے ہیں جنھوں نے اس فن کی سرپرستی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ سب سے بڑا ادارہ ریڈیو پاکستان ہے۔ ریڈیو پاکستان نے موسیقی کو فروغ دینے کے بجائے ایک ایسا طریقِ کار اپنایا ہے جس سے یہ فن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد روبہ انحطاط ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کے سب سے پہلے ڈائرکٹر جناب زیڈ۔ اے۔ بخاری مرحوم تھے۔ انھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں کچھ نااہل فن کاروں کو ابھارنے کی کوشش کی اور کچھ مسلّمہ فن کاروں کو صیدِ زبوں بنایا۔ میں اُن نااہل حضرات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا جنھیں اس فن پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ البتہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اُستاد بڑے غلام علی خاں کو زیڈ۔ اے۔ بخاری صاحب کی وجہ سے یہ ملک چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑا۔ پاکستان میں آگرہ گھرانے کے واحد نمائندہ فن کار جن کو پہلے "آفتابِ موسیقی" بنایا گیا اور بعد ازاں ریڈیو پر دو گراموں تک سے محروم کر دیا گیا، گمنامی کی موت مر گئے۔ علاوہ ازیں مرحوم بخاری صاحب کی طرف سے موسیقی کو مسلمان کرنے کی کوششیں تھیں جن کے خلاف محترم رفیق غزنوی مرحوم نے صدائے احتجاج بلند کی مگر یہ سلسلہ جب چل نکلا تو بھی ریڈیو کے اربابِ حل و عقد اسی روش پر گامزن رہے۔ پھر ہر پروڈیوسر تمام مسلّمہ اساتذہ کے مقابلہ میں موسیقی کے علم و فن میں اپنے آپ کو افضل تر سمجھنے لگا اور حساس فن کاروں سے اچھوتوں کا سا سلوک کرنے کا رویہ اپنا لیا گیا۔ کسی کی دلآزاری میرا مقصد نہیں ہے ورنہ جملہ حکامِ متعلقہ کے اسمائے گرامی بھی پیش کیے جا سکتے تھے۔

پھر ایک ادارہ غالباً ۱۹۵۰ء کی دہائی میں "الحمرا" کے نام سے قائم ہوا جس کے کرتا دھرتا جناب فیض احمد فیض اور جناب سید امتیاز علی تاج مرحوم رہے۔ شعبۂ موسیقی سے فیروز نظامی، سراج احمد قریشی، استاد چھوٹے غلام علی خاں، استاد محمد شریف خاں وقتاً فوقتاً منسلک رہے۔ ان کی کارکردگی پر ایک عطائی طالب علم نے جن الفاظ میں تبصرہ کیا ہے وہ آپ ثروت علی کے تحریر کردہ مضمون میں، جو "رسالہ موسیقی" اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ایک اور اہم ادارہ ۱۹۶۴ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کے نام سے قائم ہوا۔ آغاز میں کچھ اچھے لوگوں کی خدمات اس کو چلانے کے لئے حاصل کی گئیں لیکن جلد ہی موسیقی کو موسیقی سے نابلد پروڈیوسروں کے سپرد کر دیا گیا۔ موسیقی کے حوالے سے حالات و واقعات یہاں بھی ریڈیو سے بدتر رونما ہونے لگے۔ اس ادارے کی کارکردگی سب کے سامنے ہے۔ اس پر مٹکنے والے گائیکوں اور گائیکاؤں کا قبضہ ہے۔ نتیجے کے طور پر طبلے کی بجائے گھڑے پر تین تال کا ٹھیکہ لگنے لگا۔ تانپورے کی بجائے کلارنٹ استعمال کرنے کا حکم نازل ہوا۔ سارنگی کی بجائے گٹار سنگت کے لئے استعمال ہونی شروع ہو گئی، مگر کوئی فن کار صدائے احتجاج بلند نہ کر سکا۔ وجہ ظاہر ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ کلاسیکی موسیقی کے پروگرام دو چار بڑے فن کاروں اور ان کے خاندانوں کے لئے مختص کر دیے گئے اور کسی دوسرے یا نئے فن کار کو موقع دینے سے گریز کیا جاتا رہا۔ اور نئے فن کاروں کو اس لئے پس پشت ڈالا گیا کہ ان کے پاس "تمغۂ حسن کارکردگی" نہیں تھا۔ یعنی پی۔ ٹی۔ وی نے بھی فن کار کش پالیسی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

ایک اور ادارہ "کلاسیکل میوزک ریسرچ سیل" کے نام سے حکومتِ وقت کے ثقافتی مشیر جناب فیض احمد فیض نے گلبرگ لاہور میں ۱۹۷۶ء میں قائم کیا۔ اس کا مقصد کلاسیکی موسیقی میں تحقیق تھا۔ اس ادارے کے کارپردازان بھی موسیقی سے عملی طور پر ناواقف اور علمی طور پر بھی پیدل تھے۔ اس سیل کو اگر محض لائبریری کا کام کرنا تھا تو متعلقہ کارکن اس کے بھی اہل نہیں تھے۔ ان کے پاس نہ تجربہ تھا نہ لائبریری سائنس کی

ڈگری تھی۔ علم تو بہت دور کی چیز ہے، انھیں تو کتابوں کے نام تک لکھنا نہیں آتے تھے۔ جو وعدے کتابوں کی طباعت کے کئے گئے تھے وہ پچھلے بارہ سال سے محروم ایفا ہیں۔ انھیں تین کتابیں شائع کرنے کا دعویٰ ہے۔ ایک تو دو چار سال بعد فیض صاحب کی حیات میں ہی ان کی سالانہ رپورٹ تھی جسے اب "کیٹلاگ" کا نام دے دیا گیا ہے، اور جو تصنیف کا ایک شاہکار اس صورت میں ہے کہ اس رپورٹ میں اندراج کی تعداد بڑھانے کے لئے کتاب کا نام دینے کے بجائے اس کے مندرجات لکھ کر "کیٹلاگ" کا پیٹ بھرا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر حضرت امیر خسروؒ پر طبع شدہ مضامین ہیں جو سلطان مقصود کے نام سے شائع ہوئے مگر ادارے نے اپنے کھاتے میں ڈال دیئے۔ پھر بڑہیتی کی کتاب "مسلمان اور برصغیر کی موسیقی" ہے جس کا وہ ستیاناس کیا گیا ہے کہ اس پر بے لاگ تبصرہ کیا جائے تو پوری ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ اس کے بعد مائیکروفلمیں تو حاصل کر لی گئیں مگر سوال یہ ہے کہ ان سے استفادے کا کتنے طالب علموں کو موقع فراہم کیا گیا ہے کیا موسیقاروں کی تصویریں اکٹھی کرتے اور ان کے شجرے مرتب کرنے کا نام ہی موسیقی پر تحقیق ہے۔ اگر ایسا ہے تو ادارے تو ایک طرف، راقم کئی ایسے حضرات کو جانتا ہے جو اکیلے ہی فرداً فرداً یہ کام کر چکے ہیں۔ ہماری حکومت کے تمام اداروں میں یہ ادارہ سب سے زیادہ نااہل اور بیکار ثابت ہوا ہے۔ اس پر لاکھوں روپے خرچ ہو چکے ہیں لیکن نتیجہ صفر ہے۔ یہ ادارہ ان لوگوں کے حوالے کرنا چاہیئے جن کی موسیقی کے ساتھ COMMITMENT ہے۔ بہرحال موسیقی کے نام پر محتاج خانہ قائم کرنے سے گریز لازمی ہے۔

کلاسیکل میوزک ریسرچ سیل میں جتنی کتابیں موجود ہیں، راقم اس سے کئی گنا کتابیں لوگوں کی نجی لائبریریوں میں دیکھ چکا ہے۔ کلاسیکل میوزک ریسرچ سیل والے حضرات اس سرمایہ پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں کہ کہیں کوئی آدمی فائدہ نہ اٹھالے۔ میوزک ریسرچ سیل پر جناب سعید ملک کا مضمون "کلاسیکل میوزک سیل کیوں فیل ہوا" مطبوعہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۸۷ء اس سیل کی کارکردگی پر ایک دل خراش تبصرہ ہے۔

آج ملک میں ادارے بیماریوں کی طرح پھیل رہے ہیں عملہ دھڑا دھڑ بھرتی کیا جا رہا ہے۔ اسامیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ فنڈز میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، مگر کلاسیکل موسیقی کی تباہی کا عمل جاری ہے۔ یہ فن اپنی موت پر نوحہ کناں ہے جب حکومت کے ادارے محتاج خانوں، متولیوں اور مجاوروں میں تبدیل ہو جائیں تو جناب منیر احمد شیخ کے اٹھائے ہوئے سوالات تشنۂ جواب ہی رہیں گے خدا ہمارے حال پر اور اس نوزائیدہ قوم پر اپنی رحمت فرمائے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں قوموں کے گناہوں کو معاف

بدر الزماں (لاہور)

"فنون" کا گذشتہ شمارہ

"فنون" کا تازہ شمارہ (نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء) نظر نواز ہوا۔ "فنون" کے محتویات و مشمولات کی تعریف کرنا ایک بے اثر سا معمول ہوگا اس لیے کہ بقول رومی:

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بہرحال دو ایک مقالات کے ضمن میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں:

اس دور میں جب ہمارے یہاں فارسی ادب سے دلچسپی بری طرح رو بہ زوال ہے، اس کی بات کرنا، اور اس سے متعلق کچھ لکھنا اس ادب سے انتہائی وابستگی کی دلیل ہے۔ اس حوالے سے جناب محمد ارشاد کا دم غنیمت ہے کہ جہاں وہ اپنے مقالات میں فارسی اشعار سے خاصا استفادہ کرتے ہیں وہاں خود اس ادب کے کسی نہ کسی پہلو کو بھی قارئین "فنون" سے متعارف کراتے رہتے ہیں، اپنے موجودہ مضمون

"دوا ہوئے تشنہ و رنمک زار" (قسط ۲) میں انھوں نے ایران کے بابی فرقے کی قرۃ العین جیسی پرجوش و ولولہ شاعرہ کا جو تعارف کرایا ہے وہ لائق اعتنا ہے۔ واقعی افسوس کی بات ہے کہ اس ممتاز شاعرہ کی گنتی کی چند نظمیں ہاتھ لگی ہیں ورنہ زیادہ کلام ملنے پر اس کے مقام و مرتبہ کا تعین کسی اور رنگ میں ہوتا۔ اس مضمون میں ارشاد صاحب نے اُس دور کے مشہور شاعر قاآنی (ق آ ن ی) کو ہر جگہ قانی (ق آ ن ی) یعنی ایک الف کم لکھا ہے جو غلط ہے۔

محترم ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے ریٹائرمنٹ کے سلسلے میں درپیش مسائل کو دلچسپ اور ایک طرح سے پر درد انداز میں پیش کرتے ہوئے اپنے خاص فلسفہ و نفسیات کے جو ٹچز (TOUCHES) دیئے ہیں ان سے مضمون کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے، فارسی اشعار کی چاشنی اس پر مستزاد۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر:

توچند در طلب یار در بدر گردی — بخود نگر کہ توئی مظہر ہمہ اسماء

برصغیر کے مشہور صوفی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت صحیح نہیں۔ ہرچند فارسی کا ایک دیوان ان سے منسوب ہے لیکن جیسا کہ حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے حضرت خواجہؒ نے شاعری نہیں کی اور مذکورہ دیوان، جس میں سے یہ شعر ماخوذ ہے خواجہؒ کا نہیں بلکہ اس میں شامل کلام مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی کا ہے جو مولانا جامیؒ کے ہمعصر اور اپنے دور کے مشہور واعظ، بہت بڑے فاضل اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف ہے "معارج النبوت"۔ مذکورہ کلام اسی کتاب میں مختلف مواقع پر آیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقالاتِ شیرانی مطبوعہ کتاب منزل ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۰۷ ببعد۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور بات عرض کر دوں کہ بہت سے حضرات نے، جن میں حضرت علامہ اقبالؒ بھی شامل ہیں، حضرت خواجہ معین الدینؒ کو سنجری (س ن ج ر ی) لکھا ہے سنجری اسی وقت ممکن ہے جب متعلقہ شخص کا کسی سنجر نامی بادشاہ یا حاکم وغیرہ سے تعلق ہو اور اس نسبت سے وہ سنجری کہلائے جیسے خاقانی کہ خاقان ..... کے دربار سے متعلق ہونے کی بنا پر اس نے اپنا تخلص خاقانی رکھ لیا۔ لفظِ زیر بحث دراصل سجزی (س ج ز ی) ہے سجستان کے باشندے کو سجزی کہا جاتا ہے، چونکہ حضرت خواجہ معین الدینؒ سجستان کے رہنے والے تھے اس لیے سجزی کہلائے، سنجری نہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں ایک جگہ (ص ۱۵ س ۶) یہ جملہ آیا ہے: "ابوالحسن کے جوتے ہمارا PERSONA ہیں"۔ راقم کو اس میں کچھ تعقید نظر آئی، غالباً ڈاکٹر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا PERSONA بھی گویا ابوالحسن کے جوتے ہیں۔

"انور مسعود کی قطع کلامی" کے آخری حصے میں شاہین مفتی نے انور مسعود کے قطعات کے فارسی عنوانات پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا ہے: "لیکن قطعات کو اوڑھائے گئے فارسی عنوانات نے کتاب میں جگہ جگہ ایسے سپیڈ بریکر زکھڑے کر دیئے ہیں جو خیال کو پنپنے اور پھیلنے نہیں دیتے"۔ الخ۔ راقم کا خیال تھا کہ شاہین صاحبہ فارسی سے الرجک ہیں کہ انھیں فارسی کے شگفتہ و شیریں عنوانات پسند نہیں اور سپیڈ بریکرز جیسے انگریزی الفاظ گوارا ہیں، لیکن مذکورہ جملے کے بعد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور پتا چلا کہ شاہین صاحبہ خود فارسی کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہیں اور مذکورہ عنوانات کو تنقید کا نشانہ بنانے کے باوجود وہ اس زبان سے پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ انور مسعود کی طرح فارسی سے محبت ان کے بھی دامنگیر ہے چنانچہ ان کی تحریر میں سے میں نے یہ فارسی چنی ہے: پیمانہ بردارِ خمستانِ عجم، شراب کہن، از سرِ نو زندہ کرنے ..... زبانِ یار من ترکی (مضمون میں یہ غلط چھپا ہے)، مصنوعی زور بیان، زبانِ غیر سے، شرحِ آرزو، اہلِ دانش و بینش، کمالِ فن، گوہر آبدار، نذر قارئین ..... وغیرہ

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی (لاہور)

قارئین "فنون" طویل غیر حاضریوں کے عادی تو ہو چکے ہیں لیکن شاید اس دفعہ تمام سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ پورے سال کے بعد "فنون" نظر نواز

ہوا لیکن فہرست کو دیکھتے ہی تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ پرانے شناسا نام بھی نظر آئے۔ سب سے پہلے انھی ہی کو پڑھا اور افسوس ہوا کہ انھوں نے اتنا طویل عرصہ ہمیں اپنی تخلیقات سے محروم کیوں رکھا اور خوشی ہوئی کہ ایک دفعہ پھر وہ بھرپور انداز میں "فنون" میں وارد ہوئے۔ خوش آمدید! — باقاعدگی کی توقع کے ساتھ۔

اتنا ضخیم اور اتنا اعلیٰ معیار! یقیناً میری طرح اور لوگ بھی پریشان ہوئے ہوں گے کہ کس حصے کا مطالعہ پہلے کیا جائے۔ ہر حصہ بھرپور اور توانا، سوائے "اختلافات" کے۔ اور میں اپنی گزارشات کا آغاز حصۂ اختلافات ہی سے کروں گا۔ ۱۰۶۷ صفحات کے "فنون" میں صرف اور صرف ۱۲ صفحات کے اختلافات! ایک زمانہ تھا کہ 'فنون' کا حصہ اختلافات سب سے دلچسپ اور بھرپور ہوتا تھا۔ لوگ 'فنون' کو حاصل کرتے ہی سب سے پہلے اختلافات پڑھتے تھے اور اعلیٰ معیار کی علمی بحثوں سے فیضیاب ہوتے تھے۔ ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی اختلافات کا مطالعہ میں نے پہلے کیا لیکن بہت مایوسی ہوئی۔ کاظم صاحب کا مضمون بھی نہیں تھا اور اختلافات سے بھی غیر حاضر تھے، رشید ملک صاحب بھی غیر حاضر — آصف ثاقب صاحب نے تو تبرکاً شرکت فرمائی۔ اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ اپنے ستارہ جبہ والے امتیاز صاحب جیسے باقاعدہ اختلافات نگار بھی غیر حاضر تھے۔ اللہ کرے ان کی صحت ٹھیک ہو اور آئندہ شمارے میں ضرور شریک ہوں مجھے یاد آتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک ہمارے تخلیق کار اختلافات لکھنا نہ صرف اپنا فرض سمجھتے تھے بلکہ ان کے لیے حصہ اختلافات میں جگہ پانا باعث فخر ہوتا تھا۔ باقی سب نام تو چھوڑیں۔ برادرم یوسف حسن اتنی باقاعدگی سے اختلافات لکھتے تھے کہ شاید اتنی باقاعدگی شاعری بھی نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی شمارے میں ان کے اختلافات شائع ہونے سے رہ جاتے تو اگلے شمارے میں وہ دونوں شماروں پر الگ الگ تاثرات لکھتے۔ وہ ایک زمانہ تھا۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ یوسف حسن کے اختلافات دیکھے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ افسوس یوسف حسن صد افسوس! خالد احمد "بین السطور" میں بہت سوال اٹھاتے ہیں لیکن اختلافات میں شرکت کرنا انھوں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔ جو گلہ شکوہ وہ "بین السطور" میں کرتے ہیں کیا وہی بات ان پر بھی لاگو نہیں ہوتی۔ صرف "بین السطور" لکھنے سے ان کی ذمہ داری ختم تو نہیں ہو جاتی۔ ویسے اس دفعہ انھوں نے "بین السطور" بھی نہیں لکھا —— بعض دفعہ کسی کی غیر حاضری بھی کتنی خوشگوار ہوتی ہے۔

"فنون" میں ہر دفعہ پاکستانی ادب کا بہترین انتخاب ہوتا ہے مگر اس دفعہ تو صورت حال بہت ہی خوشگوار ہے۔ ہر چیز اعلیٰ معیار کی۔ اتنی اعلیٰ تخلیقات میں چند ایک کی تخصیص کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے تاہم بہت اچھی اچھی چیزوں میں کچھ غیر معمولی طور پر دوسری چیزوں پر چھائی ہوتی ہیں اور ان کے سحر سے نکلنا مشکل ہوتا ہے مثلاً خالد احمد کی نظم "لحد تیار ہے" کتنی ہی دفعہ پڑھی بلکہ محسوس کی۔ اس سے بڑی نظم مجھے دوسرے صفحات پر نظر نہیں آئی۔ شاید جہاں براہِ راست جذبے INVOLVE ہوں وہاں لکھتے وقت کچھ غیبی قوت بھی کام کرتی ہے۔ خالد احمد کی اس نظم نے بہتوں کو رُلا دیا۔ ایک اور بھرپور جذبے کی نظم ذوالفقار فرخ کی "زرد زبور" ہے۔ "بیسویں صدی اور گلاب کی خوشبو" راشد مفتی کا ترجمہ کردہ مضمون میں نے دو تین دفعہ پڑھا۔ اگر مجھے کسی کو مشورہ دینے کا حق ہو تو میں کم از کم اپنے نوجوان شاعروں، ادیبوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ یہ مضمون ضرور پڑھیں۔ راشد مفتی صاحب اتنا اچھا ترجمہ اور اتنے اچھے مضمون کے انتخاب پر مبارک کے مستحق ہیں۔

اور اگر مبارکباد ہی دینا ہے تو ایک اور شخصیت دلی مبارکباد کی مستحق ہے وہ محترم عبداللہ قریشی ہیں جنھوں نے جعفر طاہر مرحوم کا اتنا خوبصورت غنائیہ پڑھنے کا اعزاز ہمیں بخشا۔

افسانوں میں صرف دو افسانوں پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو ضیا بٹ صاحب کا "عذر رہا"۔ اس دفعہ انھوں نے قطعاً متاثر نہیں کیا۔ میں بٹ صاحب کی کہانیوں کا بڑا مداح ہوں اور بڑے شوق سے ان کی کہانی پڑھتا ہوں۔ ویسے تو کسی بھی تخلیق کار کی ہر تخلیق کا اعلیٰ معیار کا ہونا ضروری نہیں لیکن بٹ صاحب آج تک اس سے مستثنیٰ تھے۔ بٹ صاحب جب سے لکھ رہے ہیں۔ میں انھیں پڑھ رہا ہوں۔

یہ ان کی پہلی کمزور کہانی ہے جو مجھے پڑھنے کو ملی۔ خالد صدیقی کی کہانی "آمین" بھی گزشتہ کہانیوں کی طرح بہت اچھی تھی۔ خالد صدیقی ہمیشہ اپنی کہانی ایک عام سے موضوع پر (جس کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں اور اسے کوئی اہمیت دیئے بغیر گزر جاتے ہیں) بنیاد رکھتے ہیں اور اس عام موضوع کو اہم موضوع بنا دیتے ہیں۔ اس دفعہ مجھے احساس ہوا کہ وہ کہانی کو کسی حد تک بے جا طوالت دے گئے اگر یہ کہانی ذرا مختصر ہوتی تو اور بھی عمدہ کہانی بن سکتی تھی۔

غزل، نظم کا حصہ بھی حسب معمول بھرپور تھا۔ تازگی، خوشبو، ہنرکاری سے چھلکتا ہوا۔ کسی ایک تخلیق کا بطور خاص ذکر کرنا دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ البتہ ایک جگہ رکنا پڑا۔ محترم راسخ عرفانی صاحب کی دوسری غزل کے مطلع پر:

کوئی پہچان نہ لے شب ڈھلے آوازوں کو
ڈر کے کھڑکاتے ہیں لوگ اپنے بھی دروازوں کو

اس میں لفظ "کھڑکانا" انتہائی اجنبی اور نامانوس سا لگا۔ اردو شاعری میں علاقائی زبانوں کے لفظ استعمال کرنے کا تجربہ نیا نہیں ہے بلکہ اردو کا آغاز ہی علاقائی اور دیگر زبانوں کے باہمی اتصال سے ہوا۔ ہمارے جدید شعرائے کرام نے اپنی تخلیقات میں پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں اور اردو کا دامن ان نئے الفاظ سے بھرا ہے لیکن راسخ عرفانی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ جب اردو میں کھٹکھٹانا کا لفظ موجود ہے تو پنجابی کا "کھڑکانا" استعمال کرنے میں کون سی مصلحت ہے۔ حسین عابد کی کافی قابلِ داد ہے۔ [illegible] رہے وہ مسلسل لکھتے رہیں۔

اس دفعہ جس نثر پارے نے صحیح معنوں میں مجھے پریشان کیا وہ مزاح کے نام پر ڈاکٹر سلیمان عبداللہ کی تحریر "ادبی دوائیں" ہے۔ مزاح سمجھ کر ہی اسے پڑھنا شروع کیا مگر افسوس کہ مجھے مزاح کہیں محسوس نہ ہوا۔

اب میں اس امید کے ساتھ رخصت ہو رہا ہوں کہ اگلے شمارے میں کاظم صاحب کا مضمون اور ظہیر بابر اور روبینہ قزلباش کے افسانے پڑھنے کو ملیں گے اور محمد کاظم، یوسف حسن، خالد احمد، منصورہ احمد، امتیاز علی اور آصف ثاقب کے اختلافات بھی شامل ہوں گے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کے امریکہ کے دورے کے بعد امید تو ہو چلی ہے کہ شاید وہ "شوقِ آوارگی" کی مزید آوارگیاں بھی سنائیں گے۔ اجازت ہو تو یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "فنون" کے گذشتہ شماروں کے ٹائیٹل دیکھیں تو پتہ نہیں چلتا کہ تازہ شمارہ کونسا ہے۔ کئی دفعہ غلطی سے نومبر، دسمبر ۸۶ کے شمارے کو تازہ شمارہ سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیا!

عارف محمود (لاہور)

اس شمارے میں کئی مضامین نظم و نثر فکر انگیز اور نئے ادبی رجحانات کا پتہ دیتے ہیں۔ سرِ فہرست مسعود مفتی کا رپورتاژ "ہم نفس" ہے۔ قرۃ العین حیدر نے رپورتاژ کا جو بلند معیار قائم کیا تھا، اس کے بعد یوں نظر آتا تھا جیسے رپورتاژ کے اس معیار کو دوسرا کوئی نہ چھو سکے گا لیکن مسعود مفتی کے رسیلے اسلوب اور موضوع کو خوبصورت طریقے سے پھیلانے کے ہنر نے بہت متاثر کیا۔ افسانوں کا حصہ بھی خاصا جاندار اور نئے امکانات سے آراستہ فکشن کو سامنے لاتا ہے۔ اس سلسلے میں رام لعل کا "پکھیرو"، حسن منظر کا "اوپر والی"، رفعت مرتضیٰ کا "شکایت"، غلام محمد کا "قبر" اور علی تنہا کا "آدم بو" ایسے افسانے ہیں جو ایک نئی معنویت رکھتے ہیں۔ اعجاز احمد فاروقی کا افسانہ "ایک غیر مرئی الہ آباد" نہایت خوبصورت آغاز کے ساتھ قاری کو متوجہ کرتا ہے مگر اس افسانے کا آخری حصہ متاثر نہیں کر سکا۔ نئے لکھنے والوں طارق محمود، نیلوفر اقبال، اور زین العابدین کی کہانیاں بھی جاندار ہیں۔ اسد محمد خاں کی کہانی "برجِ خموشاں" اپنے اختصار میں اگرچہ پُرتاثیر ہے لیکن کہانی کے مواد کو جس طرح اسلوب کا حصہ بنایا گیا ہے اس سے یوں لگتا ہے جیسے افسانہ نویس بہت جلدی میں ہے۔ نثر کے زمرہ میں صلاح الدین حیدر کا انشائیہ "قصہ مہذب آدمی کا" بہت لطیف رنگ انشا لیے ہوئے ہے۔ مقالات کے شعبے میں ڈاکٹر مجید اجمل کی شمولیت خوش آئند ہے۔

ان کے منفرد نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والے تاثرات سے ان کی گہری فکر اور جاندار شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ محمد ارشاد کا قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں متعلق مضمون کی دوسری قسط بھی موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت جاندار ہے۔ شہزاد احمد کے "سائنس اور سائیکی" کو اگر حاصلِ غزل کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ شہزاد احمد کے فلسفیانہ مضامین نے سید علی عباس جلالپوری کی کمی کسی حد تک پوری کر دی ہے۔ ان کا شفاف اسلوب بے داغ نقطۂ نظر اور موضوع پر دسترس یقیناً ہمارے تنقیدی سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ہے۔ کلامِ فیض پر عزیز حامد مدنی کا مضمون بھی منفرد خصوصیت کا حامل ہے۔

نظموں میں اختر حسین جعفری کی "دستہ دستہ ابر اترے گا" اور "سخن در ماندہ ہے" (کینو نمبر ۴) نے تڑپا کے رکھ دیا۔ اختر حسین جعفری کا اسلوب اور خیال ایسی ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کا ہر لفظ خوشبو کی طرح ذہن کو تا دیر معطر رکھتا ہے۔ اس حصے میں ضیا جالندھری کی "مادام" بھی ایک تخلیقی شاہکار ہے۔ دیگر نظم گو شعراء میں ممتاز ملک، امجد اسلام امجد، ایوب خاور، ناہید قاسمی، منصورہ احمد اور عباس تابش کی نظموں کے فنی تیور اس بات کی ضمانت ہیں کہ نظم جدید پورے طمطراق کے ساتھ دورِ حاضر کے مسائل کو اپنے اندر سمونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

ذاتی طور پر میں "فنون" میں شائع شدہ غزلیات کے معیار سے بہت متاثر رہا ہوں اور یہ میری بے لاگ رائے ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں غزلوں کا انتخاب "فنون" سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔ اب کے شمارۂ خاص میں غزلیات بھی دل پر گہرے نقوش چھوڑ رہی ہیں۔ میری ایک تجویز ہے کہ کسی ایک شاعر کی بہ یک وقت دو سے زیادہ غزلیں شائع نہ کی جائیں تاکہ نئے لکھنے والوں کو زیادہ موقع ملے اور غزلوں کی تابانی بھی اسی طرح برقرار رہے۔ تازہ شمارے میں ایک طویل غیر حاضری کے بعد عدیم ہاشمی کی غزلیں پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ عدیم ہاشمی کا فنی سفر "فنون" میں انتہائی چمک دمک کے ساتھ شروع ہوا تھا اور وہ کے اس نیکھے غزل گو کا دوبارہ غزل کی طرف مائل ہونا خوشگوار حد تک قابلِ تحسین ہے۔ دیگر غزلیات میں عزیز حامد مدنی، شہزاد احمد، مظفر حنفی، امجد اسلام امجد، پروین شاکر، ایوب خاور، شہناز پروین سحر، عباس تابش اور غلام حسین ساجد کی تخلیقات مطلعِ شاعری پر نئی جگمگاہٹ بکھیر رہی ہیں۔ بہاولپور کے استاد شاعر جناب نقوی احمد پوری کی تینوں غزلیں نئی تخلیق کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کا لفظی اعجاز اور تخیل آفرینی آج بھی نہایت دل آویز ہے۔

ارشاد متین (بہاولپور)

"فنون" کا خاص نمبر ایک طویل عرصہ کے بعد منظرِ عام پر آیا، تاہم اس کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے سے "دیر آید درست آید" کے مقولے پر ایمان لے آنا پڑا۔ میں نے یہ نمبر الف سے یے کری تک پڑھا ہے۔ سبھی مضامین نظم و نثر پسند آئے تاہم چند ایک کا بطورِ خاص تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مشہور مصور صادقین پر امجد اسلام امجد کا مضمون پڑھ کر روحانی خوشی میسر آئی۔ عرب شیخ کے بارے میں بیان کردہ واقعہ اور کئی ایک دوسرے واقعات نے ایک بار پھر احساس دلا دیا کہ اس بستی میں رہ کر جہاں فن کاروں کی ایک کثیر تعداد دریوزہ گری کرتی دکھائی دیتی ہے، وہاں صادقین اور نور محمد چارلی ایسے فن کار بھی موجود رہے ہیں، جنھوں نے دولت مندوں کے قرب اور ان کی چاہتوں کو پرکاہ اتنی بھی اہمیت نہیں دی اور دولت کے ان پجاریوں کو بتا دیا کہ فن کار کا مقام اہلِ زر سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔

میں لطیف الزماں خاں کا مضمون "راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات کے تاثرات" پڑھ کر افسردہ ہو گیا۔ عجب ہے کہ یہی افسردگی انسان کو جینے کا عزم دیتی ہے اور پھر اس کی زیست میں رنگینیاں بھرتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے دکھ کی چتا میں جل کر امر بن جانے

کا ہنر سیکھا تھا اور اس بہانے زندگی کی راہوں کو گل بداماں بنا گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے عطا شاد کے کلام کا محاکمہ بڑی محنت سے کیا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی تکذیب بہ استدلال کی ہے جو کہتے ہیں کہ عطا شاد "کوئٹے کا شاعر" ہے (کوئٹے کا نہیں)۔ بلاشبہ عطا شاد کا لب ولہجہ، ڈکشن اور انداز بیان اسے جدید شاعر ثابت کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے عرش صدیقی کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے میر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ نرم رو نہیں بلکہ ان کے ہاں ماحول کے خلاف جارحیت موجود ہے۔ میرے لیے یہ ایک انکشاف ہے۔ اشرف صاحب کو اس پر کھل کر لکھنا چاہیے تاکہ حیات میر کا ایک پوشیدہ پہلو نگاہوں کے سامنے آسکے۔

اور اب افسانوں کی بات ہو جائے۔ حسن منظر کے "ادیہ دالی" میں ایمائیت، اختصار، اعجاز اور تعطل کی کیفیت نے اسے ایک خوبصورت افسانہ بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے ابتدائی جملے کھٹکتے ہیں "جب جمعہ اتوار کو پڑتا تھا۔ یہ آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے" یاد رہے جمعہ چھٹی کا دن سابقہ حکمرانوں کے عہد میں قرار پایا تھا۔ موجودہ حکمرانوں نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء اقتدار سنبھالا تھا۔ نیز جن عورتوں کا افسانے میں ذکر ہے ان کا وجود ایوبی دور ہی میں ختم کر دیا گیا تھا۔ ملک امیر محمد خاں ان دنوں مغربی پاکستان کے گورنر ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے افسانہ نگار سے زمانے کے تعین کی غلطی ہو گئی ہے۔

"شکایت" رفعت مرتضیٰ کا افسانہ ہے جس میں عورت کے ان جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جسے صرف ایک عورت ہی جان سکتی ہے اور جن کی طرف کبھی کسی عورت نے اشارہ نہیں کیا۔ افسانے میں اول سے لے کر آخری سطر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس میں اشاریت نے جو سماں باندھا ہے وہ قابل داد ہے۔ قیوم راہی ایک عرصہ سے میدان افسانہ نگاری میں اپنی ہنر کاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ گزشتہ دہائی میں علامت نگاروں نے جو دھندا اڑائی تھی، اس میں شامل ہو کر قیوم راہی نے اپنے وجود کو گم کرنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی ڈگر پر استقامت کے ساتھ چلتے رہے "دہی کتھا" ان کی اس ثابت قدمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

غلام محمد کو "فنون" ہی نے ادبی دنیا میں متعارف کرایا تھا۔ انھوں نے کم لکھا لیکن جتنا لکھا وہ قابل مطالعہ ہے۔ ان کی تحریروں میں بنگلہ دیش کی دھرتی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ "قبر" علامتی افسانہ نہیں ہے لیکن اس میں علامت نگاری کی ساحری موجود ہے۔ یہ افسانہ آہستہ آہستہ اپنے کلائمکس کی طرف بڑھتا گیا ہے اور اپنے اختتام سے قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

ایک زمانے میں اردو ادب میں اسلامی ادب کا شور بلند ہوا تھا لیکن یہ شور کوئی کارنامہ دکھائے بغیر خود بخود مدھم پڑ کر ختم ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کا نعرہ لگانے والوں میں کسی کا بھی شعر و ادب سے کوئی خاص رشتہ نہ تھا اور نہ وہ ادبی مسائل کو سمجھ سکتے تھے تاہم مذہب کو ادب سے یکسر خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اعجاز احمد فاروقی کا افسانہ "ایک غیر مرئی الہ آباد" اسی قسم کی چیز ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں عجیب پراسرار سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس میں کچھ باتیں کہہ دی ہیں اور بہت سی چھوڑ دی گئی ہیں۔ اس کے باوجود یوں لگتا ہے کہ ساری باتیں کہہ دی گئی ہیں۔ یہ افسانہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔ "علذرہا" میں ایجاز و اختصار و ایمائیت نے اس تحریر کو ایک اچھا افسانہ بنا دیا ہے۔ ضیا بٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خالد صدیقی نے ایک عام سے خیال کو غور و فکر کا موضوع بنا کر ایک خوبصورت افسانہ تلاش کر لیا ہے۔ خدا کرے وہ آئندہ بھی ایسے افسانے لکھتے رہیں۔ خورشید رضوی کا "سائن بورڈ" بھی ایک بھرپور افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے فنی تقاضوں کا خاص خیال رکھا ہے اور کہانی کے ڈھانچے کو بکھرنے سے بچائے رکھا ہے۔ "زندگی کے موڑ" کی قسم کا افسانہ میں نے پہلے بھی کہیں پڑھ رکھا ہے تاہم میں طاہر نقوی پر سرقہ کا الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ انھوں نے اچھی سی کوشش کی ہے۔ زبان

حسب حال ہے اور افسانوی تاثر کو ابھارتی ہے۔ زین العابدین کا "بابلو" دکھی کر دینے والا افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے ساری حساسیت اس کہانی کے بدن میں انڈیل دی ہے۔ میں بھی اس کہانی کار کی طرح اس صبح کے طلوع کا انتظار کر رہا ہوں جب دھرتی کی کوکھ دکھوں سے خالی ہو جائے گی اور ظلم و ستم کی داستانیں دہرائی جانی بند ہو جائیں گی۔ "مسٹر عبدلمنان" ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو انسان کے مرتبے سے واقف ہے۔ دو پڑوسیوں کے کردار کے تضاد سے نیلوفر اقبال ایک قابل مطالعہ افسانہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ طارق محمود ایک بیوروکریٹ ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے مقام و منصب کے بل بوتے پر افسانہ نگاری کے میدان میں بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن جو لوگ ان کے افسانوں کا باقاعدگی اور گہرائی سے مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی فنی جانکاری ان کے افسانوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ "مخبر" اول الذکر لوگوں کے خیال کی نفی کرتا ہے۔ اس افسانے میں رات، دن اور چوکیدار کی علامتیں قاری کی فکر کو مہمیز لگاتی ہیں، اور اس کی نگاہوں کے سامنے کتنی ہی تکلیف دہ حقیقتوں کے در وا کر دیتی ہیں۔ افسانہ نگار نے پلاٹ کی ترتیب اور زیر بحث مسئلہ کو جس خوش سلیقگی سے کہانی کا روپ دیا ہے وہ داد کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز کا افسانہ "شیشے پر کراس" ایک نئے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میں سوویت یونین کی اس خاتون سے کیونکر زیادہ بچھ دار ہو سکتا ہوں جو خلاؤں میں سفر کرنے کا اعزاز حاصل کر چکی ہے۔ محض اس لیے کہ میں مرد ہوں۔ محمد صفدر خاں کا "سیڑھی" نہایت مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔ راجہ محمد ریاض الرحمن کا افسانہ "روشنی اور سانپ" انسان کی نہایت ہی بچگانہ خواہش پر مبنی ہے۔ افسانہ نگار نے روشنی زلف اور سانپ کے بطن سے خوبصورت کہانی نکال ڈالی ہے۔ میری رائے میں عرفان علی شاد کا افسانہ غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ عبد التوحید نے "آخری سطر" میں طبقاتی سماج کی بات کی ہے اور نچلے طبقے کے لوگوں کی حیثیت کو علامتی انداز میں موضوع بنایا ہے۔ کہانی میں کہیں کہیں جواب مضمون کا سا انداز آ گیا ہے جس سے کہانی کی فطری روانی متاثر ہوئی ہے۔

مسعود مفتی کا رپورتاژ "ہم نفس" افسانے کی طرح دلپذیر ہے اور وطن کا درد رکھنے والے قاری کو جھنجھوڑتا ہے اور اسے احساس دلاتا ہے کہ اب اس ملک میں مشرقی پاکستان کی المناک داستان کبھی نہ دہرائی جائے۔

قتیل شفائی، شہزاد احمد، مظفر حنفی، ارشد ملتانی، انور شعور، عبداللہ جاوید، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، ستار سید، خالد احمد، صفدر سلیم سیال اور پروین شاکر کی غزلوں کے بعض اشعار نشتر ہیں۔ اور انجم ترازی کی غزل پڑھ کر سمجھ میں آیا کہ جدید غزل کیا ہوتی ہے۔

خیر الدین انصاری (جھنگ)

"فنون" کے اس ضخیم اور وقیع نمبر میں جمیل ملک کا حمدیہ اور نعتیہ کلام سر سبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے حمد و نعت کے سرمایے میں معقول اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ نعتوں کے اشعار میں جو سوز و گداز، تپش، شیفتگی اور دلکشی ہوتی ہے وہ حمد کے اشعار میں نہیں ہوتی۔ کیا اس کی وجہ ہماری خوئے مجاز تو نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تو شاعر کہہ سکتا ہے ع

کالی زلف تے اکھ مستانی اے

مگر ظاہر ہے کہ خدا کے بارے میں تو ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ دراصل مولائے کریم تو ورا الورا ہیں لیکن ان کے رسولؐ بہترین اوصاف بشری سے متصف ہونے کی وجہ سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں لطیف الزماں صاحب کا مضمون اچھی تاثراتی تحریر ہے۔ اس مضمون میں جناب کالی داس گپتا رضا کی غالب شناسی کا ذکر کیا ہے۔ آج سے چند سال پہلے مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کی شاعری پر بھی ایک مضمون انھوں نے لکھا تھا جو المیزان بمبئی

میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ادبی لحاظ سے بہت اچھا تھا۔

ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے "ریٹائرمنٹ" کی کیفیت کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ریٹائرڈ حضرات کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیئے۔ بطورِ خاص یہ اقتباس:

"ریٹائرمنٹ میں ایک سایہ اس طرح دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے کہ اس سے نجات پانا بہت مشکل ہے اور وہ سایہ PERSONA یا نقاب کا ہے جو سرکاری افسر اپنے عہدے کی نمائش کے لیے پہنے رہتے ہیں۔ آپ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو بھی چکے ہیں مگر یہ نقاب پیچھا نہیں چھوڑتا اور قدم قدم خود نمائی کی علامتیں ڈھونڈتا ہے۔۔۔ ژنگ نے کہا تھا کہ شخصیت کی نشوونما کے لئے PERSONA یا نقاب کا ٹوٹنا بہت ضروری ہے۔ ریٹائرمنٹ میں نقاب ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ اس کی آزمائش میں اگر کامیاب ہو جاؤں تو سمجھوں گا ریٹائرمنٹ کے ذریعے ہی آخری نجات حاصل ہو گئی۔"

"انڈا اوجی" اور "دو آہوئے تشنہ در نمک زار" بہت محنت سے لکھے گئے ہیں۔ محمد ارشاد صاحب کا یہ ارشاد کہ قرۃ العین طاہرہ شاعری میں رومی اور حافظ کی صف میں شامل ہے اور غالب سے بلند ہے، مبالغہ سے خالی نہیں۔ غالب فارسی کی حد تک بہت اونچے درجہ کے فنکار تھے۔ اُن کا اور طاہرہ کا موازنہ کسی طور بھی مناسب نہیں۔

"سائنس اور سائیکی" کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ "گیسوئے اردو" اب "منت پذیر شانہ" کے مرحلہ سے گذر چکا ہے۔ اور اب وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور ترقی یافتہ زبان ہے۔

محترم شریف کنجاہی صاحب کا مضمون "گلشن راز قدیم و جدید" فکر انگیز تو ہے لیکن بہت مختصر ہے۔ اس کے مطالعہ سے قاری کی تشنگی اور بڑھتی ہے۔ انھیں چاہیئے کہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں اور ایسا وہ کر سکتے ہیں۔

مسعود مفتی صاحب کا رپورتاژ "ہم نفس" بہت کچھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اُن کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں اسے کامیابی سے قارئین تک پہنچانا جانتے ہیں۔ ایک ننھی سی بات ہے جسے وہ مولویانہ بات کہہ کر ٹال بھی سکتے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ "سنت اور حدیث" کے الفاظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے منسوب ہیں اور انھیں استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے حسنِ ادب کا یہی تقاضا ہے۔

حصۂ نظم میں خالد احمد کی نظم "لحد تیار ہے" اور رِلکے کے پہلے نوحے کا ترجمہ از عبدالعزیز خالد بہت پسند آئیں۔ حصۂ غزل بہت جاندار ہے۔

سید نور محمد قادری (ضلع گجرات)

نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء کا "فنون" اپنی روایتی تابناکی کے ساتھ شائع ہوا۔ فہرست مندرجات سے ہی شمارے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ مگر فنون کی اشاعت میں تاخیر کی تلافی ضخامت میں اضافے سے ممکن نہیں۔

آغاز میں حمد و نعت کا حسین گلدستہ دل و دماغ کی مہک کا سامان ہے۔ اشعار اس قدر صداقت سے لبریز ہیں کہ دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر نشاطِ روح کی دولت فراہم کرتے ہیں۔

ہم ایک دوجے کا خون پی کر پنپ رہے ہیں — یہ کیسے اترے ہوئے ہیں ہم پر عذاب تیرے (خاقان خاور)

یہ کیسا دور ہے کوئی بھی سچے دل سے تیرا نام نہ لے — پھر بپا ہو شورِ انا الحق پھر منصور نظر آئے (جمیل ملک)

باسیلِ رزقِ گدایانِ رضا سے مانگا — ہم نے جو مانگا فقط اپنے خدا سے مانگا (خالد احمد)

کس دید کے حریص ہیں اے شہرِ علم ہم — کس درج سے کیا پکار ترے روبرو کریں (خالد احمد)

اس حصہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی مصور صادقین فی الواقع درویش منش انسان تھے۔ صادقین کی قناعت پسندی اس جملے سے ظاہر ہے "جو لطف دولت کو ٹھکرانے میں ہے وہ اسے پانے میں نہیں"۔ صادقین کے شہپاروں کو دیکھ کر اُن کی لافانی صلاحیتوں کا لوہا ماننا پڑتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کے جسم میں کوئی جن حلول کر گیا ہو۔" اور درویش کی صدا گیا ہے" عقیدت و محبت کا حسین گلدستہ ہے۔

آؤ ماتم کریں، کھل کے روئیں
کہ اب رنگ و حرف کے درمیاں
وہ تعلق نہیں بن سکے گا
جسے معجزہ کہہ سکیں (قمر رضا شہزاد)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے تدریسی اور تحقیقی کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں ایسے لوگوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جنھوں نے اس آفتابِ علم کی ضیا پاشیوں سے اپنے ذہن منور کیے۔ وہ اردو زبان و ادب کے شیدائی اور سچے محبِ وطن تھے۔

شاید وہ کبھی قریۂ تنہائی سے لوٹ آئے — انبوہِ مضامین ہے اُس شخص کے در پر (صفدر صدیق رضی)

لطیف الزماں خاں نے اردو کے نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "عام انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حقیقتوں کا حال جس طرح بیدی بیان کرتے ہیں اردو کا کوئی افسانہ نگار نہیں کر سکا۔" اس بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، یہاں میں باقر مہدی کی رائے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔" بیدی کے فن میں بڑی گہرائی ہے مگر اتھاہ نہیں۔ بڑی بلندی ہے مگر اتنی نہیں کہ نگاہ نہ پہنچ سکے۔" یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مصائب و آلام کی بھٹی میں تپ کر ہی انسان کندن بنتا ہے۔ بیدی کے ہاں نیچرل ازم نہیں بلکہ حقیقت نگاری ہے۔ بیدی کے فن کے قصرِ عالی شان کی بنیاد مشاہدے اور تخیل کے نقطۂ اتصال پر رکھی گئی ہے۔ اُس نے ۱۹۴۲ء میں اساطیر کی مدد سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔"گرہن" اس کی مثال ہے اور اساطیری روایتوں سے استفادے کی راہ بیدی نے ہی دکھائی استعاراتی انداز بیدی کے فن کا ایک ستون ہے:

"بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان! ذرا بڑی ہوئی ماں باپ نے سسرال دھکیل دیا، سسرال والے ناراض ہوئے مائیکے لڑھکا دیا۔ ہائے یہ کپڑے کی گیند جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی۔"

لحد تیار ہے: واردات قلبی پر مبنی خون جگر سے لکھا ہوا مؤثر نوحۂ غم ہے:

مرے آقا
اجازت دیں لحد تیار ہے لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ آئے ہیں

مرے آقا
اجازت دیں میں اپنی ماں کو مٹی میں ملا دوں

یہ نظم بہت دردناک ہوتا ہے میں خالد احمد کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

"بیادِ فیض" سید منیر نے فیض احمد فیض کو شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔

بسمل آغائی کی دو غزلیں "فنون" کی زینت بنی ہیں۔ وہ عمدہ غزل گو تھے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں سے کتنے سایہ دار شجر ناپید ہو گئے اور کتنے طائرانِ خوش نوا ہمیشہ کے خاموش ہو گئے۔

"ریٹائرمنٹ" نہایت توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب کے تجربات اور مشاہدات آج بھی ہمارے لئے غور فکر کا سامان فراہم کرتے ہیں:

"جب وقت کی تلوار کاٹتی ہے تو اس کی برش ہمیں حوادث اور خارجی واقعات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے کسی کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تلوار کی کاٹ کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ تاکہ تم بھی تلوار بن جاؤ۔"

گلشن راز (قدیم و جدید) پر ایک نظر، کلام فیض ایک مطالعہ، انڈالوجی، دو آہوئے تشنہ در نمک زار، سائنس اور سائیکی اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے انتہائی مفید ہیں۔ فاضل مقالہ نگاروں کے تبحر علمی کا اعتراف ضروری ہے۔

جابر علی سید کی ادبی خود نوشت بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ مجید امجد کے شہر سے وابستہ اُن کی یادوں نے بہت متاثر کیا۔ یہ شہر اب بھی اپنی روایتی مہمان نوازی، سادگی اور خلوص کے لئے مشہور ہے۔ محبت تو یہاں سکۂ رائج الوقت ہے۔ اس میں وطن کی محبت بھی شامل ہے۔ یہاں کے لوگ مذہب کے شیدائی اور ایثار کی دولت سے مالا مال ہیں۔

جناب پروفیسر نظیر صدیقی صاحب کا مقالہ "رشید احمد صدیقی کے دیباچے اور مقدمے وغیرہ وغیرہ" تحقیق و تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ اردو ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے مجھے اس تحریر کے افادی پہلوؤں نے بہت متاثر کیا۔ رشید احمد صدیقی کے فکر و فن پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں تک خاکہ نگاری کا تعلق ہے رشید احمد صدیقی کے خاکے "گنج ہائے گراں مایہ" میں شامل محمد ایوب عباسی، اصغر گونڈوی اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن "نور خاں" بھی خاکہ نگاری کی مہارت کا پتہ دیتا ہے۔ مجھے رشید احمد صدیقی کے بے لاگ مقدمے اور دیباچے آج کے دور میں بھی اُن کے ذاتی وقار اور لائق رشک علمی فضیلت کا نشان نظر آتے ہیں۔

"علامتی افسانے میں اسلوب کا آہنگ" افسانے کی تکنیک اور ارتقا پر ایک پُرمغز مقالہ ہے۔ دنیا کا سب سے انمول رتن (۱۹۰۷ء) پریم چند کی سب سے پہلی کہانی ہے جو انھوں نے نواب رائے کے فرضی نام سے لکھی۔ دنیا کا سب سے انمول رتن ایک سمٹی ہوئی داستان ہے اس میں ایک سبز پوش بزرگ عاشق دلفگار کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور ملکہ دلفریب کی شرط یہ ہے کہ عاشق ملکہ کے حضور میں دنیا کا سب سے انمول رتن محبت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے۔ ظاہر ہے اس کہانی میں حقیقت کا سراغ لگانا حیران کن ہے۔ پریم چند کا حقیقت پسندانہ اسلوب گھیسو اور مادھو کی سیاہ فطرت میں عیاں ہے۔ مولانا عبدالماجد نے کہا تھا:

"ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس میں جہاں ـــــ محمد علی انصاری، ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔"

مختلف ادوار میں افسانہ نگاروں نے ہیئت اور اسلوب کے جو تجربات کئے اس کا ذکر کم ہے۔ اس کے باوجود افسانے پر یہ ایک مفید اور معلومات افزا مقالہ ہے۔

حصہ نظم حسن انتخاب کا اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے۔ ایک بات محل نظر ہے۔ ایک ہی شاعر کی نو یا دس غزلیں بیک وقت شامل اشاعت کرنے سے بہتر ہے کہ اُن کا مجموعہ کلام پڑھنے کی ہدایت کر دی جائے۔ شاید ضخامت بڑھانے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو لیکن مجھے یہ کہنے

کی اجازت دیں کہ سینکڑوں نوآموز شاعر اور ادیب آپ کی توجہ کے مستحق ہیں، اگر ان کی حوصلہ افزائی ہو تو ممکن ہے انہی میں سے کوئی مجید امجد، کوئی منٹو، کوئی احمد ندیم قاسمی بن سکے۔

"کتابوں پر تبصرے" "فنون" کا ایک نہایت اہم اور معلوماتی حصہ ہے۔ اس حصہ میں فاضل مبصرین کے بے لاگ تبصرے اردو ادب کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ہیں۔ رانا غلام شبیر (جھنگ شہر)

"فنون" کا شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء میرے پیش نظر ہے۔ "فنون" کا ادب کی دنیا میں بڑا نام ہے۔ اس میں جو میٹر چھپتا ہے اس کے معیاری ہونے کی یہی ضمانت کافی سمجھی جاتی ہے کہ اسے "فنون" میں چھپنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ زیر نظر شمارے میں غزلوں کے انتخاب میں ویسی احتیاط ملحوظ نہ رکھی گئی جو اس سے پہلے "فنون" کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ شاید آپ مصروفیات کی وجہ سے زیادہ توجہ نہ دے سکے ہوں۔ بعض شعرا کے منتخب اشعار مع تبصرہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

پروین شاکر ایک شہرت یافتہ شاعرہ ہے۔ شہرت حاصل کرنا جتنا مشکل ہے، شہرت برقرار رکھنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ پروین کا یہ شعر دیکھیے:

خوف مجھ کو ہی نہیں اس کے بچھڑ جانے کا ہے
رنج اس کو بھی کسی مشکل میں پڑ جانے کا ہے

مصرع اولیٰ میں دیکھیے "ہے" نے کیا گل کھلائے ہیں۔ شاید وہ اپنی صفائی میں غالب کا یہ شعر پیش کریں کہ

دیتا نہ اگر دل تمہیں، لیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

لیکن ناقدین نے ایسے اشعار کو غالب کے کلام پر بدنما داغ قرار دیا ہے۔ کلام میں ایسی خامی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پروین کا ایک اور شعر ہے:

کس سے پوچھوں کہ پسِ صحنِ چمن کیا گزری
میرے گھر میں تو ہوا بھر بہ لب آئی ہے

ہوا کو احوال جاننے کا ذریعہ قرار دینا کہاں تک درست ہے؟ کیا ہوا کسی کے گھر میں روداد چمن سناتی ہوئی داخل ہوئی ہے؟ یہ وضاحت بھی نہیں کہ کس پر کیا گزری[1]!

موصوفہ کی ایک غزل مستفعلن، مفاعلن، مستفعلن، مفاعلن کے وزن پر ہے لیکن اس غزل کے تین اشعار ملاحظہ فرمائیں اور باوزن ہونے کی سند عطا فرمائیں۔

گھر میں ابھی جل رہی[2] آگ سحر سفر کو کاٹنے
اُٹھنے لگے مرے قدم پھر اس ماہ[3] کے لئے

میری بھیجی ہوئی روداد بھی[5] گئی بیاں مگر
فیصلہ رک گیا[4] ایک اور گواہ کے لئے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں شہر پناہ کے لئے

"سحر سفر کو کاٹنے"، "گھر میں آگ کا جلنا"، "فیصلہ رک گیا" اور "شہر پناہ کی حفاظتیں ہونا" لسانی کمزوریاں ہیں جن پر پردہ ڈالنا مشکل ہے۔

محمد خان خلیل کا ایک شعر ہے:

ہنسی خوشی ترے خیمے اکھڑتے دیکھتے ہیں
پھر ایک لمحہ یہ منظر نظر میں رہتا ہے

"یہ منظر نظر میں رہنا" کہاں کی زبان ہے؟

---

[1] یہ محض ذوقِ شعری کا معاملہ ہے۔ (ادارہ)

[2] گھر میں ابھی جلی تھی آگ (اصل ملاحظہ فرمائیے) — (ادارہ)

[3] پھر اسی راہ کے لئے (اصل ملاحظہ فرمائیے) — (ادارہ)

[4] فیصلہ رک گیا ہے ایک (اصل ملاحظہ فرمائیے) — (ادارہ)

[5] دے بھی گئی بیان، مگر (اصل ملاحظہ فرمائیے) — (ادارہ)

اسلام عظمی نے ایک غزل میں "رہنے" کا قافیہ "نکلنے"، "کرنے" اور "چلنے" باندھا ہے۔

نذیر تبسم کا ایک مصرع ہے: روشنی تو ہوتی ہے ذہن کے اجالے سے

"اجالے سے روشنی ہوتا" چہ معنی؟

عباس تابش کا ایک مصرع دیکھیے: ایک رستہ تھا جسے شام کو گھر لے آئے

رستہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اٹھا کر گھر لایا جا سکے[1]

ذوالفقار تابش[3] کا یہ شعر:

سمندروں میں مرے بیج بہہ گئے سارے
تو پانیوں میں زمینیں اگانا بھول گیا

برائے شعر گفتن کی مثال ہے۔ بیج بہہ نہ گئے ہوتے تو کیا وہ پانیوں میں زمینیں اُگا لیتے؟

غلام حسین ساجد کا ایک شعر ہے۔

بجائے خاک اُڑتے ہیں ستارے میری آنکھوں میں[4]
کہ ہو جاتی ہے ایسے کام میں تاخیر مٹی کو

"آنکھوں میں ستارے اُڑنا" اور "ایسے کام" میں "مٹی کو تاخیر ہو جانا" کیسی جدت ہے؟

اشرف جاوید کا ایک مصرع دیکھیے: قدم قدم پہ ملا اور بچھڑ بچھڑ بھی گیا

"بچھڑ بچھڑ بھی گیا" اسے کوئی کیا سمجھے؟ جدائی یا محض جدا ہونے کا احساس!

اطہر سلیمی کا ایک مصرع ملاحظہ فرمائیں:

دھنک کی طرح سے جاگی ہیں چاہتیں کیا کیا

"دھنک کی طرح" ہونا چاہیے تھا۔ وزن برابر کرنے کے لئے غلط زبان استعمال کرنا درست نہیں۔

جاوید منظر کا یہ شعر دیکھیے:

برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے
میں بھی سنوں جو آپ سا لہجہ ملے کوئی

"برسوں گزر گئے" نادرست ہے۔ "کئی برس گزر گئے" یا "برسوں سے" ہونا چاہیے۔ "آپ سا لہجہ" کے بجائے "آپ کا سا لہجہ" ہوتا ہے۔

پیر اکرم کی غزل مستفعلن، مفاعلن، مستفعلن، مفاعلن[2] کے وزن پر ہے۔ مندرجہ مصرعے بے وزن ہیں۔

گردشِ وقت کے سبھی رنگ و جمال دیکھنا..... منزلِ شب کی راہ میں اک[2] دیا جلا تو ہے..... سنگ زنوں کی صف میں[2] ہاتھ میں پھول ہیں مگر ..... دشمن جاں کو ہے مرا کتنا خیال، دیکھنا..... بام کمال پر تھا جب، نور ہی نور تھا مگر۔

خاقان خاور کی ایک غزل کا شعر ہے:

جو میری جھیلوں سے، میرے دریاؤں سے اڑائے[4]
یہ ابر پارے وہ آب لے کر کہاں چلے ہیں

ابر پارے پانی لے کر نہیں چلتے بلکہ ابر پانی ہی کی تبدیل شدہ شکل ہے[5]۔

نقوی احمد پوری کا ایک مصرع ہے: میں نے شجر اگائے ہیں بنجر زمین سے

شاعر نے بنجر زمین "سے" شجر اگا دیئے۔ حالانکہ دوسرے لوگ زمین میں اگاتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔! اسلم راجا ایڈووکیٹ باغ (آزاد کشمیر)

---

۱ محض ذوقِ شعری کا معاملہ ہے۔ (ادارہ)
۲ ایک دیا (اصل ملاحظہ ہو) (ادارہ)
۳ ذوالفقار فرخ (ادارہ)
۴ محض ذوقِ شعری کا معاملہ ہے۔ (ادارہ)
۵ ؟ (ادارہ)

"فنون" کا تازہ شمارہ ملا۔ رفیق چوہدری صاحب کی کتاب "میری دنیا" پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ ایسے حقائق جو پہلے معلوم نہ تھے، وہ بھی منظر عام پر آئے۔ آپ نے "جنگ" کی کالم نویسی اس لئے ترک کی تھی کہ مرحوم ابراہیم جلیس سے دوستی کا حق ادا کریں۔ مگر وہ واپس "جنگ" میں یہ کہہ کر چلے گئے کہ تنگ آمد (باز) بجنگ آمد۔ اس کے علاوہ آپ نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی سیکرٹری شپ سے اس لئے استعفیٰ دیا کہ تنظیم فعال نہ رہی تھی۔ اس تبصرے سے یہ بھی واضح ہوا کہ آپ نے ترقی پسند ادیبوں کی ہر سطح پر خدمت کی۔ یہ باتیں ریکارڈ درست کرنے کے لئے ضروری تھیں ورنہ آنے والے دور میں تاریخ ادب پڑھنے والوں کو شخصیات کی صحیح تصویر نظر نہ آتی۔

شعری تخلیقات میں پروین شاکر کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔

ہم فقیروں میں کس طور شکایت تیری ——— لب پہ آئی بھی تو تا حد ادب آئی ہے

اس شعر کا مصرع اولیٰ وزن میں نہیں۔* یہ غزل فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن کے وزن پر ہے مگر یہ مصرع اس وزن میں نہیں۔ غالباً کتابت کی فروگذاشت ہے۔

محب عارفی کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

ہوا غرق میں جس کو دریا سمجھ کر ——— روانی تو ہے اس میں پانی نہیں ہے

اس شعر سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اگر دریا میں پانی نہیں تو پھر روانی کس طرح ہو سکتی ہے جب پانی نہیں تو روانی اور اس میں غرق ہونا تو دونوں باتیں ابہام پیدا کرتی ہیں۔ اگر عارفی صاحب یہ کہتے کہ وہ سراب تھا جس کو میں دریا سمجھ کر غرق ہوا تو اور بات تھی۔

شہناز پروین کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

میں نے وہاں گلاب کا اک پھول بو دیا ——— اک پیڑ گر گیا تھا جہاں آندھیوں کے دن

پھول بونا، کا استعمال درست نہیں البتہ، پودا لگانا استعمال ہوتا ہے۔

شمارے میں اچھے اشعار بھی پڑھنے کو ملے ہیں ان کا تذکرہ کرنا بھی مناسب ہوگا۔ نثار سید صاحب، رؤف امیر، عباس تابش اور مبین مرزا ندیم کے چند اشعار بہت اچھے لگے۔ زید اللہ فہیم (باغ، آزاد کشمیر)

"فنون" کا خاص نمبر نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء ملا تو دل خوش ہو گیا۔ اس مہنگائی کے دور میں اتنا ضخیم نمبر نکالنا بڑے دل گردے کی بات ہے حصۂ مضامین بہت جاندار ہے، اس کے مطالعے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مسعود مفتی کا رپورتاژ (ہم نفس) تو مجھے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرا۔ موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے یہ رپورتاژ انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ نظموں میں ادا جعفری، سید قمر ہاشمی، امجد اسلام امجد اور ناہید قاسمی کی نظموں نے بہت متاثر کیا۔ حصۂ غزل بہت جاندار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل اپنی ارتقائی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں "فنون" جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔

افسانوں میں غلام محمد کا افسانہ "مقبرہ" اور زین العابدین کا افسانہ "بابلو" مجھے سب سے زیادہ پسند آئے اور "فنون" کے موجودہ شمارے کی جان معلوم ہوئے۔ رام لعل کا "بکھیڑو" بہت دل نشیں ہے۔ جس منظر کا "اوپر والی" ماحول کی عفونت پر زبردست طنز ہے۔ رفعت مرتضیٰ کا "شکایت" بڑے لطیف جنسی پہلو کی نشان دہی کرتا ہے۔ قیوم راہی کا "وہی کتا" بہت اچھا اظہار ہے اس مادہ پرستی کا جہاں محبتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اعجاز احمد فاروقی کا "ایک غیر مرئی الہ آباد" مقصدیت کے لحاظ سے اچھا ہے لیکن اس کی بنت افسانوی

---

* غلطی کتابت کی ہے شاعرہ کی نہیں۔ (ادارہ)

نہیں ہے۔ ضیابٹ کا "عذرہا" ایک گرگِ جہاندیدہ کی پشیمانی کا مظہر ہے۔ طاہر نقوی کا "زندگی کے موڑ" ہمارے معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات کی اچھی ترجمانی ہے۔ محمد سعید شیخ کا "اداس بستی" بہت اچھا ہے لیکن یہ افسانہ اگر یہیں ختم کر دیا جاتا تو اس کا تاثر بھرپور رہتا "بوڑھی عورت شمشان گھاٹ کی اینٹوں کی طرح اداس ہو گئی"۔ اس کے بعد کی پانچ چھ لائنیں اس افسانے کے تاثر کو کم کر دیتی ہیں اور خصوصاً یہ جملہ "وہ بھی اب اندر سے اپنے کمرے کو تالا لگا کر سوتا ہے"۔ اس افسانے کو کمزور کر دیتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بینک منیجر کو جبراً ایک خول میں اتارا جا رہا ہے۔ علی تنہا کا افسانہ "آدم بو" اندر سے ٹوٹتے ہوئے سفید داڑھی والے قاضی کا اچھا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ عرفان علی شاد کا "آسیب" علم کی روشنی اور جہالت کے اندھیرے کی تمیز کراتا ہے۔

مظفر حنفی کے اس شعر میں لفظ نہیں مجھے کھٹکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ردیف نے انھیں بے بس کر دیا ہے:

مظفر بغاوت نہ کرتے اگر
تو ان کو زمانہ نہیں مانتا

افضل پرویز کے اس شعر پر

صاحباں کو کہتی ہے کیا ہوا نیلی کا سوار؟
باگ پر ہاتھ نہیں، پاؤں رکابوں میں نہیں

نہ جانے مجھے غالب کا یہ شعر کیوں یاد آ گیا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

راسخ عرفانی کے اس شعر میں ردیف نے ساتھ چھوڑ دیا ہے

بہ رنگِ پیکرِ انساں سجے ہوئے پتھر
نظر نواز ہیں چہرے ہنر کسی کا ہو

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

جدا ہیں رنگ و نمائش میں بیریوں کے درخت
مزا بھی کا ہے یکساں ثمر کسی کا ہو

یہ شعر خلافِ فطرت ہے۔ جس طرح بیریوں کے درخت رنگ و نمائش میں جدا ہوتے ہیں اسی طرح ان کے ثمر کا ذائقہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ کچھ بیر کھٹے ہوتے ہیں، کچھ میٹھے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن سے گلا گھٹنے لگتا ہے۔

انور شعور کے اس شعر سے مجھے اتفاق نہیں

قیدی نہیں رہتا یا صیاد نہیں رہتا
دنیا میں کوئی زنداں آباد نہیں رہتا

میرا مشاہدہ تو یہی ہے کہ زنداں تو ہمیشہ آباد رہتے ہیں، یہ اور بات کہ قیدی یا صیاد بدلتے رہتے ہیں۔

روحی کنجاہی کا ایک شعر ہے

ہر آئینے کو ٹوٹنا ہوتا ہے ایک روز
دل آئینے کو توڑ دیا دیکھ بھال نے

اس شعر کو پڑھ کر میرے ذہن میں سیماب اکبر آبادی کا یہ شعر گھوم گیا۔

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

افتخار بخاری کے اس شعر پر

زنداں میں بھی نہ جا سکا آوارگی کا شوق
چکر وہاں بھی شام و سحر کاٹنے پڑے

میرے ذہن میں غالب کا یہ مصرع اٹکا ہے

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

اور پھر غالب ہی کا یہ شعر میرے سامنے آکھڑا ہوا

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں ایطا ہے:

پتے پتے پر تحریریں میں کیا بولوں اس کی دنیا، اس کی باتیں ریں کیا بولوں (خلیل رامپوری)

کیسے کاٹیں گے تنہائیوں کا سفر جان جاں سوچنا ایک منزل کے دو اجنبی ہمسفر جان جاں سوچنا (پیرا کرم)

حصار بن کے مرے رتجگوں میں رہتی ہیں جو صورتیں میری تنہائیوں میں رہتی ہیں (فضل اکبر کماں)

قیامت کو گزرتے دیکھنا ہے پہاڑوں کو پھسلتے دیکھنا ہے (اختر حسین شیخ)

کبھی خود میں کبھی خوشبو کے رم میں ڈھونڈتے رہنا یونہی آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو سوچتے رہنا (ایوب خاور)

ہر گھڑی سیماب، پا حرکت میں رہنے کی طلب پیچھے ہٹنے کی کبھی آگے نکلنے کی طلب (اسلام عظمی)

کوئی جو پوچھے تو کہہ دیں گے اس نے بھیجے ہیں وگرنہ پھول تو اپنے لئے خریدے ہیں (افتخار نسیم)

ایک مرتبہ ایک محفل میں عیوب قافیہ کے سلسلے میں بات چل نکلی تو یاروں نے مندرجہ بالا صورتوں میں استعمال ہونے والے قافیوں کو کھلا قافیہ بتلایا تھا لیکن میرے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ ایک روز میں سید عابد علی عابد (مرحوم) کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نغز گو شاعر، علم عروض کے ماہر اور مستند نقاد تھے۔ انھوں نے عیوب قافیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ ہم تو مطلع میں 'چراغاں' اور 'گلستاں' کا قافیہ بھی معیوب گردانتے ہیں۔ 'چراغاں'، 'چراغ' سے بنا ہے اور 'گلستاں'، 'گل' سے بنا ہے اور ظاہر ہے کہ 'چراغ' اور 'گل' ہم قافیہ نہیں ہیں۔ میری دانست میں ان کی یہ رائے معتبر ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ کلام کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ صوری اور معنوی لحاظ سے آراستہ ہو۔

خالد علیم کا یہ مطلع بڑا زوردار ہے:

میرے چاروں طرف نفرتوں ہی کے خیمے گڑے تھے چاہتوں کے مکاں ایک مدت سے خالی پڑے تھے

اس غزل میں "گڑے" اور "پڑے" کے بعد انھوں نے جو قوافی "بولتے" "ہوگئے" اور "روگئے" وغیرہ استعمال کئے ہیں وہ ناروا ہیں۔

نقوی احمد پوری (احمد پور شرقیہ)

"فنون" کی اشاعت اور اس کی بھرپور تخلیقات پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں نے اس کا ہر ہر صفحہ انتہائی شوق و انہماک سے

پڑھا ہے۔ ماشاءاللہ بہت ہی جامع اور نفیس شمارہ ہے۔ ندیم صاحب! مجھے آپ سے ذہنی اور قلبی لگاؤ ہے مگر ایک شکایت بھی سنیے۔ آپ "فنون" کے تقریباً ہر شمارے کے آغاز میں خصوصاً پہلے ہی پیراگراف میں جو تاخیر کی معذرت کرتے ہیں تو آپ کا یہ "فعل" مجھے بالکل پسند نہیں۔ کیا مستقبل قریب میں ایسا ممکن ہے کہ آپ وثوق سے یہ لکھ سکیں کہ "آج میں معذرت نہیں چاہوں گا کہ اس بار شمارہ بروقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔" میں تمام جملہ مسائل و مشکلات کو خوب سمجھتا ہوں لیکن جب انسان ارادہ کر لے تو غیر ممکن بھی اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

ایک اور شکایت یہ ہے کہ "فنون" کے اس تازہ شمارے کی تمام کتابت نہایت خوبصورت ہے لیکن مندرجہ ذیل صفحات کے کاتب کو بدل دیجیے: ۵۲ تا ۵۷، ۹۸ تا ۱۰۷، ۱۱۶ تا ۱۲۹، ۱۴۳ تا ۱۴۵، ۱۸۳ تا ۱۹۰، ۱۹۱ تا ۱۹۵، ۲۱۹ تا ۲۲۶، ۳۷۵ تا ۳۸۰، ۴۸۹ تا ۴۹۳۔ یہ کتابت غیر معیاری ہے۔

لقمان ابومریم (لاہور)

ترقی پسند ادب کی تحریک

رفیق چودھری کی کتاب "میری دنیا" پر تبصرہ پڑھا تو میرے ذہن میں کتنی یادیں متحرک ہو گئیں — انجمن کے آخری سکریٹری جنرل احمد ندیم قاسمی کا یہ جملہ پڑھ کر تو دل خون ہو گیا کہ "بہر حال مجھے اس دفاع کا جو اجر خود ترقی پسندوں کی طرف سے ملا، اس کا بھی تاریخِ ادب میں کوئی جواب نہیں ہے" — کتنا کرب ہے اس جملے میں — ! ذہن میں احسان ناشناسی کی کیسی اندوہناک تصویر ابھرتی ہے اس جملے سے — !

احمد ندیم قاسمی انجمن ترقی پسند مصنفین کے صرف سکریٹری جنرل یا روحِ رواں ہی نہیں تھے بلکہ وہ ترقی پسند ادب کے چراغ کو وحشی جھونکوں سے بچانے کے لیے خود کو ڈھال بنائے ہوئے تھے — وہ ہر وار اپنے جسم پر سہتے تھے۔ ترقی پسند ادب کی طرح وہ وقت کے تقاضے کو بھانپ کر ادب اور ادیب کا دفاع بھی کرتے تھے — غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ میں گنگارام ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ کبھی کبھار چھپ کے بعض مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا اور موقع مل جاتا تھا تو دوست احباب سے بھی مل لیتا تھا۔ ایک دن میں ندیم صاحب کے مکان پر پہنچا (اُن دنوں اُن کا مکان نسبت روڈ پر تھا) ان کے مکان سے باہر ایک پولیس کانسٹبل کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو غالباً ظہیر باہر آئے۔ وہ اس وقت کم عمر تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ندیم صاحب ہوں تو انھیں اطلاع کر دیں کہ نقوی احمد پوری آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے اور کہا کہ ندیم صاحب کہتے ہیں: "اس وقت پولیس میری خانہ تلاشی میں مصروف ہے۔ ممکن ہے مجھے ساتھ لے جائے۔ تم بیمار ہو فوراً ہسپتال واپس چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ دھر لیے جاؤ۔" پولیس کی موجودگی میں یہ پیغام انھوں نے کیسی رازداری سے دیا ہو گا۔ انھوں نے میری علالت کے پیشِ نظر اس وقت کس طرح میرا دفاع کیا — میں یہ بات کس طرح بھول سکتا ہوں — یہ تو خیر انفرادی حیثیت کی ایک معمولی مثال ہے۔ اجتماعی صورت میں جس طرح انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کا دفاع کیا ہے وہ اہلِ نگاہ سے مخفی نہیں — اور اس دفاع کی سزائیں وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ اور اس کے گواہ رجعت پسندوں کے روزنامے اور رسالے ہیں۔

راولپنڈی سازش کیس کے بعد جب تمام ترقی پسند ادیب عتاب کے شکنجے میں کسے جانے لگے تو یہ دام دور دور تک پھیلائے گئے۔ میں ان دنوں بہاولپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے کنوینر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک رات پولیس نے میرے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے تو وہ لوگ مجھے تھانہ کوتوالی لے گئے اور پھر دن کو مجھے جیل بھیج دیا۔ ظہور نظر کی نظر اس سلسلے میں بہت تیز تھی۔ اس کے بھی وارنٹ جاری کیے گئے تھے لیکن وہ روپوش ہو گیا تھا۔

میں اکثر جیل میں پڑا ہوا سوچتا رہتا تھا کہ میرا قصور کیا ہے؟ — میں تو شاعر ہوں — ایک تخلیق کار — اور پھر میں تو امن و سلامتی کی بات کرتا ہوں — میں بم تو نہیں بناتا — میرے پاس اسلحہ ساز فیکٹری تو نہیں ہے — پھر کیا میری یہ بات بھی جرم میں شامل ہے کہ اس نوزائیدہ مملکت کو ایک ایسے شجر کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں جس پر پھول اور پتے اپنی بہار دکھا رہے ہوں؟ میں ان جونکوں سے نفرت کرتا ہوں

جو معصوم جسم کے خون کو اپنی اشتہا کا ایندھن بنا رہے ہیں۔ میں ان بھاری بھرکم جسموں کو کر: سمجھتا ہوں جو اپنے اختیارات یا سرمائے کا سہارا لے کر ہمارے مکان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میرے پاس صرف سوال ہی سوال تھے کوئی جواب نہیں تھا ____ میں جیل سے واپس آیا تو اپنی بہترین کوششوں کے باوجود انجمن کے مردہ جسم کو زندگی کی حرارت نہ دے سکا ____ یہ جمود صرف بہاولپور میں نہیں تھا بلکہ مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں میں تھا۔ تحریک مفلوج پڑی تھی ____ ہر طرف اداسی راج کر رہی تھی ____ ادیبوں اور شاعروں کو خوف و ہراس نے کھا لیا تھا۔

احمد ندیم قاسمی جو سکریٹری جنرل تھے، اس صورت حال سے پریشان تھے۔ وہ تحریک جو پُرعزم دریا کی طرح موجوں کو آگے بڑھا رہی تھی اب اس میں اڑتی ہوئی ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں انجمن کی جو شاخیں بہت ہی فعال تھیں اب ان کی کوئی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب جسم میں خون ہی نہ رہے تو دل اپنی دھڑکن کو کب تک برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ندیم صاحب انجمن سے مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں انھوں نے کہا کہ انجمن کی شاخیں بے حس اور غیر فعال ہو گئی ہیں۔ میں اپنے عہدے سے چمٹا نہیں رہنا چاہتا، اگر کوئی ساتھی اس منصب کو قبول کرے تو مجھے اس میں خوشی ہوگی اور میں اس کا ساتھ دوں گا۔ اس وقت کوئی بھی آگے نہ آیا ____ کسی کی رگ حمیت نہ پھڑکی۔

ندیم صاحب کے استعفی سے کچھ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ وہ حکومتی دباؤ سے متاثر ہو کر مستعفی ہوئے ہیں ____ معاملہ اس کے بالکل اُلٹ تھا۔ انھوں نے تو وقت کے کتنے چیختے چنگھاڑتے سیلاب دیکھے تھے۔ کتنے وحشی بگولوں کے رقص دیکھے تھے۔ کتنے چرکے کھائے تھے۔ کتنی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ان کے پائے استقامت میں ذرہ بھر لغزش نہیں آئی تھی۔ وہ طوفانی جھکڑوں میں ترقی پسند ادب کے چراغ کو روشن کئے ہوئے تھے۔ وہ جس انجمن کا اہم ترین عہدہ سنبھال کر بیٹھے تھے جب اس کی شاخیں ہی کملا گئیں تھیں تو وہ نام نہاد سکریٹری جنرل بن کر کرسی پر کیسے بیٹھے رہتے۔ ان کا دل صاف، ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ بڑے بڑوں کے جمود نے انھیں بے بس کر دیا تھا اور سوائے مستعفی ہونے کے ان کے سامنے اور کوئی معقول راہ نہیں تھی ____ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جب انجمن کے بہی خواہ ____ شکوک و شبہات سے بالاتر ____ بڑی بڑی قد آور شخصیتیں موجود تھیں تو ان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر اس خلا کو پورا کیوں نہ کیا ____ کیا وہ دانشور کام کا بیڑا اُٹھانے کی بجائے صرف ندیم صاحب کو مطعون کرنے کے لئے رہ گئے تھے؟ انہوں کی اس روش نے اغیار کے حوصلے بڑھائے اور وہ لوگ جو ترقی پسند ادب کے مخالف تھے آہستہ آہستہ پر پرزے نکالنے لگے۔ کبھی انھوں نے ترقی پسند ادب کے بعض گوشوں پر اوچھے وار کئے تو کبھی مختلف زاویوں سے ترقی پسند ادیبوں کو ہدف بنایا۔ مگر یہ صرف اور صرف ندیم صاحب تھے جو ان بدخواہوں سے بھی چومکھی لڑتے رہے ____ یہی تو وجہ ہے کہ رجعت پسندوں کا نزلہ آج بھی ندیم ہی پر گرتا ہے ____ ورنہ ندیم سے بزعم خود بڑے ترقی پسند بھی اسی سرزمین پر موجود تھے اور موجود ہیں۔

نقوی احمد پوری (احمد پور شرقیہ)

Regd. L. No. 7579 THE "FUNOON" MONTHLY Phone No. 321527